کیفی اعظمی

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی مرحوم

کے۔ یس۔ شفیق

ادارۂ ادبیاتِ اردو

حیدرآباد

سن اجراء: ۱۹۳۸ء　　به یادگار سید محی الدین قادری زور　　فون: 310469۔

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۵۰　○　جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۵ء　○　شمارہ: ۳-۲-۱

اس شمارے کی قیمت = بیس روپے

فی پرچہ	: ۷ روپے	مشرق وسطی اور امریکہ	: ۳۰ ڈالر
زر سالانہ	: ۷۵ روپے	پاکستان، برما، سری لنکا	: ۱۵ ڈالر
کتب خانوں سے	: ۱۰۰ روپے	انگلستان	: ۱۲ پونڈ

ناشر: ادارہ ادبیاتِ اردو پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۴۸۲

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے انتخاب پریس عابد روڈ میں طبع کروا کے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

گوشہ محمد اکبرالدین صدیقی

کتاب

گوشہ کیفی اعظمی

گوشہ اقبال متین

شخصیت

مقالہ

نظمیں

غزلیں

افسانے

ڈاکٹر محمد علی اثر

جناب محمد اکبرالدین صدیقی (مرحوم)

۲۱/ جنوری ۱۹۹۵ء کی صبح، دکن کے نامور محقق اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے شاگرد رشید جناب محمد اکبر الدین صدیقی کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت وہ ۸۲ سال کے تھے لیکن خرابی صحت کے باوجود وہ تصنیف و تالیف کے کام میں برابر لگے ہوئے تھے۔

صدیقی صاحب اردو کے ایک خاموش خدمت گزار تھے اور جامعہ عثمانیہ کے ان اساتذہ میں ایک امتیازی مقام رکھتے تھے، جنھوں نے نہ صرف درس و تدریس کی بیش بہا خدمات انجام دیں بلکہ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ وہ ۱۵/ نومبر ۱۹۱۳ء کو بھینسہ، ضلع عادل آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ ایک عرصے تک حیدرآباد کے مختلف کالجوں میں جزوقتی لکچرار کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور ۱۹۵۷ء میں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے اور اسی جامعہ سے ۱۹۷۳ء میں ریڈر کی حیثیت سے وظیفۂ حسن خدمت پر سبک دوش ہوئے۔ صدیقی صاحب کی حیات ہی میں ان کی "حیات اور کارنامے" کے موضوع پر جامعہ بنگلور اور جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ فل کے تحقیقی مقالے لکھے گئے۔

اکبر الدین صدیقی کو بابائے اردو مولوی عبدالحق "ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری جیسے یکتائے روزگار دکنی ادب کے ماہرین کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی ادبیات کی تحقیق و ترتیب اور تدوین متن کے سلسلے میں صدیقی صاحب نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی مرتبہ و مولفہ اہم کتابوں میں "چندر بدن و مہیار"، "دیوان عشق"، "کلمۃ الحقائق"، "بجھتے چراغ"، "کشف الوجود"، "ابلیس نامہ"، "ارشاد نامہ"، "انتخاب محمد قلی"، "پھولبن"، "تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو (جلد ششم)" اور "محمود" خوش دہاں اور ان کا کلام "قابل ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا کتب میں "چندر بدن و مہیار" دکنی ادب کی ایک بے مثال مثنوی ہے جو دبستان بیجاپور کے ممتاز شاعر مقیمی کے ذہن کی پیداوار ہے، جسے اکبر الدین صدیقی صاحب نے ۱۹۵۶ء میں مرتب کر کے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے، اپنے ۴۷ صفحات پر مشتمل عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ ۳۳۰ اشعار پر مشتمل اس مقبول ترین عشقیہ داستان کی ترتیب و تدوین میں صدیقی صاحب نے چھ قلمی نسخوں سے استفادہ کیا تھا۔

دکنی ادب کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں ان کا ایک اور اہم کارنامہ حضرت میراں جی شمس العشاق کے صاحبزادے حضرت برہان الدین جانم کے نثری رسالے "کلمۃ الحقائق" کی اشاعت ہے۔ اس کتاب کو صدیقی صاحب نے چھ قلمی نسخوں سے استفادہ کر کے ۱۹۶۱ء میں "ادارہ ادبیات اردو" کی جانب سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ مرتب نے اپنے عالمانہ مقدمے میں نہ صرف قلمی نسخوں کا تفصیلی تعارف کروایا ہے بلکہ حضرت جانم کے واقعات حیات کے تاریک گوشوں پر سب سے پہلے روشنی ڈالی ہے۔

"کلمۃ الحقائق" کے علاوہ حضرت جانم کی مشہور مثنوی "ارشاد نامہ" کو صدیقی صاحب نے ۱۲۵ صفحات پر مشتمل اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ ۱۹۷۱ء میں شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے تحقیقی مجلے "قدیم اردو" میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے مقدمے میں حضرت جانم کی تمام شعری تصنیفات اور نثری رسالوں کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ صدیقی صاحب کی متذکرہ دونوں کتابیں ہندوستان کی مختلف جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔

۱۹۶۵ء میں پروفیسر مسعود حسین خان کی ادارت میں جب شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے "قدیم اردو" کے نام سے ایک تحقیقی مجلے کا اجرا ہوا تو اس میں تحقیق اور تدوین متن کے جدید اور سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں قدیم ادبیات کے منتخب متون کو مختلف دستیاب نسخوں کے تقابلی مطالعے کے بعد مرتب کرنے کی پہلی بار ایک کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ "قدیم اردو" کے ابتدائی چند شمارے آج بھی تحقیق و تنقید اور تدوین متن کے مستند نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مجلے میں مدیر کے علاوہ جن محققوں نے دکنی ادبیات کی ترتیب و تدوین کے

مثالی نمونے پیش کیے ہیں، ان میں پروفیسر غلام عمر خاں، جناب محمد اکبر الدین صدیقی، پروفیسر سیدہ جعفر، جناب ابو النصر محمد خالدی، جناب مبارز الدین رفعت اور ڈاکٹر حسینی شاہد کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس مجلے (قدیم اردو) کے پہلے شمارے ہی میں دیگر متون کے علاوہ محمد اکبر الدین صدیقی صاحب کی مرتبہ مثنوی "کشف الوجود" بھی شامل تھی۔ "کشف الوجود" حضرت شاہ داول بیجاپوری کی ۴۶۶ اشعار پر مشتمل مثنوی ہے جس کے مقدمے میں مرتب نے شاعر کے حالات زندگی کے علاوہ اس مثنوی کے موضوع پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

صدیقی صاحب نے متذکرہ اہم کتابوں کے علاوہ دکنی و دکنیات کے موضوع پر بے شمار تحقیقی اور تنقیدی مضامین سپرد قلم کیے تھے جو وقتاً فوقتاً برصغیر ہند و پاک کے موقر علمی و تحقیقی رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیش تر مضامین کو "میٹھے بچن سناؤں" کے عنوان سے ادارہ ادبیات اردو کے ترجمان "سب رس" میں مختلف اوقات میں شائع کیا تھا۔ "بجھتے چراغ" صدیقی صاحب کے دکنی ادب سے متعلق تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ۲۳ مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب میں صدیقی صاحب نے دکنی کے بعض اہم اور غیر معروف شاعروں کی منظومات کو مرتب و مدون کر کے انھیں ضائع ہونے سے بچالیا ہے۔

دکنی ادب کی متذکرہ گیارہ کتابوں کے علاوہ صدیقی صاحب نے مزید ایک درجن سے زائد کتابیں مرتب و مدون کر کے شائع کی ہیں جن میں "مشاہیر قندہار" "پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری"، "کلام بے نظیر" "خطوط عبد الحق"، فہرست مطبوعات ادارہ ادبیات اردو (جلد اول تا سوم) "صحیفۂ اہل بدیٰ"، کلیات ممنون" اور "شام غریباں" اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ "سیف الملوک و بدیع الجمال" (دیوناگری رسم الخط میں) اور "نقش دل پذیر" (دکنی شعرا کا کلام انگریزی ترجمے کے ساتھ) بھی شائع کیے۔

بحیثیت مدیر "سب رس" صدیقی صاحب نے کئی ایک اہم شمارے مرتب کیے ہیں جن میں ڈاکٹر زور نمبر، غالب نمبر، عنایت جنگ نمبر، بشیر النسا بشیر نمبر اور نصیر الدین ہاشمی نمبر غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ موصوف نے سید مبارز الدین رفعت کے اشتراک سے "ابلیس نامہ" اور راقم الحروف کے اشتراک سے "تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو کی چھٹی جلد مرتب کی تھی۔ صدیقی صاحب کی بعض کتابیں دکنی ادب کے موضوع پر کتب حوالہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ موصوف نے باوجود زوال صحت کے تصنیف و تالیف کا سلسلہ حال تک جاری رکھا تھا۔ چناں چہ دو ماہ قبل ہی انھوں نے ادارہ ادبیات اردو کے ترجمان "سب رس" میں ملک الشعرا نصرتی بیجاپوری کا غیر مطبوعہ کلام کے عنوان سے ایک اہم مضمون سپرد قلم کیا تھا۔

صدیقی صاحب نہ صرف ڈاکٹر زور کے عزیز شاگردوں میں شمار ہوتے تھے بلکہ انھوں نے ادارہ ادبیات اردو کے انتظامی امور میں ایک فعال نمائندے کی حیثیت سے اپنے طالب علمی کے ہی زمانے سے ڈاکٹر زور کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ادارہ ادبیات اردو کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش رہی ہیں۔ وہ بیک وقت ادارے کے مختلف شعبوں سے وابستہ رہے۔ ایک طویل عرصے تک معتمد شعبہ امتحانات کی حیثیت سے انھوں نے ادارے کے امتحانات کو نہ صرف آندھرا پردیش بلکہ دوسری ریاستوں میں بھی منعقد کیا۔ علاوہ ازیں شعبہ کتب خانہ و میوزیم اور شعبہ تصنیف و تالیف کے لیے انھوں نے گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ دو سال قبل ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے مرحوم کو ان کی ۸۰ سالہ خدمات کے اعتراف کے طور پر سپاس نامہ اور توصیف نامہ پیش کیا گیا تھا۔ حال ہی میں آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے موصوف کی مجموعی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تحقیق کے زمرے میں انھیں ادبی ایوارڈ سے نوازا تھا۔

○ ○ ○ ○ ○

وقار خلیل

محمد اکبر الدین صدیقی کی یاد میں

دکنیات اور اردو ادب کے ممتاز محقق جناب محمد اکبر الدین صدیقی ۲۱/ جنوری ۱۹۹۵ء کی صبح ۸۲ سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ صدیقی مرحوم جامعہ عثمانیہ میں شعبہ اردو کے ریڈر تھے اور ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کے رکن اور رفیق ادارہ بھی۔ انھوں نے برسوں ادارہ کے کتب خانہ اور شعبہ امتحانات ادارہ کی اعزازی معتمدی کے فرائض انجام دیے۔ تقریباً ۱۱ سال وہ ادارہ کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" کے رکن اور مرتب بھی رہے۔ بانی ادارہ پروفیسر محی الدین قادری زور کے شاگرد رشید اور ادارے کے علمی کاموں میں قابل اعتماد رفیق اور معاون بھی رہے۔

ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے صدیقی مرحوم کی ۸۰ سالہ ادبی خدمات کا بہتم بالشان اعتراف کیا گیا اور ان کی خدمت میں ۱۹۹۲ء میں توصیف نامہ، شال اور مومینٹو پیش کیا گیا تھا۔ جس کے داعی ادارہ کے نائب صدر جناب میر عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" تھے۔ ڈاکٹر زور نے اپنی زندگی میں چیدہ چیدہ دکن کے قلم کاروں، شاعروں اور دانشوروں کی قدر شناسی کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ جس کا تسلسل جشن امجد، جشن مخدوم اور جلسہ تہنیت اکبر الدین صدیقی تک چلا، امید ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ برقرار رہے گا۔

جناب صدیقی، صلہ وستائش سے بے نیاز، اخباری سرخیوں اور جلسہ وجلوس کے ہنگاموں سے زندگی بھر دور ہی رہے، بقول پروفیسر یوسف سرمست "وہ بڑی خاموشی، انہماک اور لگن سے اردو زبان اور ادب کی خدمت کرتے رہے" اپنے قلم اور ذہن کو وسیلۂ اظہار بنا کر مضامین، کتابیں اور رسالے لکھتے رہے، تحقیق اور تنقید، متن کی گتھی سلجھاتے رہے انگلیاں فگار ہوتی رہیں۔ تقریباً ستر برس قلم اور کاغذ ان کا رفیق اور ساتھی رہا۔ گزشتہ دس برسوں سے صدیقی مرحوم نے رعشہ اور ضعف بصارت کے سبب گوشہ نشینی اختیار کی تھی، پھر بھی وہ دکنیات کے کسی نہ کسی نئے گوشے کی تلاش اور جستجو میں رہے۔ بہ حیثیت استاد اردو صدیقی مرحوم نے بے لوث طریقے پر اسکالرس کی رہنمائی کا بطریق احسن حق ادا کیا۔

حلیم محمد قطب الدین فاروقی نے عثمانیہ یونیورسٹی سے "محمد اکبر الدین صدیقی حیات اور کارنامے" کے زیر عنوان ایم۔ فل کے لیے مقالہ تحریر کیا تھا جو ۱۹۹۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا اس مقالے کے باب اول میں صدیقی صاحب کی حیات پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے اور فاضل مصنف نے شخصیت کے مختلف گوشوں کو صدیقی صاحب کی حیات میں ترتیب دینے کی سعی مستحسن کی ہے۔ ذیل میں ہم حیات اور شخصیت کے بارے میں اس مقالہ کی روشنی میں چند اہم امور تحریر کریں گے۔

محمد اکبر الدین صدیقی ۱۵/ نومبر ۱۹۱۳ء کو قصبہ بھینسہ تعلقہ مدہول ضلع عادل آباد (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئے، آبائی گاؤں قصبہ پان گاؤں تعلقہ مومن آباد ضلع بیڑ (مہاراشٹرا) ہے۔ جہاں آپ نے زندگی کے آخری دنوں میں ایک مسجد بھی تعمیر اور آباد کی۔

صدیقی صاحب کے والد کا نام محمد اکرام الدین تھا، وہ ناظر عدالت اور پھر سررشتہ دار عدالت کے عہدے پر کارگزار رہے۔ دوران ملازمت ۶/ جون ۱۹۳۱ء کو باون سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ اکرام الدین صاحب کو اردو شعر وادب کا ذوق تھا اور وہ شعر بھی کہتے تھے۔ صدیقی صاحب میں شاعری کا ابتدائی ذوق اکرام صاحب کے سبب روشن ہوا۔ اکبر تخلص کرتے تھے۔ چند غزلیں اور نظمیں مختلف رسائل و

جرائد خصوصاً "المومن" اور "سب رس" میں شائع ہو چکی ہیں۔

اپنے نام کے ساتھ "صدیقی" کا سبب اکبر الدین صاحب نے فاروقی صاحب کو بتلایا کہ صدیقی لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ مڈل اسکول میں ہمارے ساتھ ایک اور ہم نام وہاں موجود تھے اور امتیاز پیدا کرنے کی خاطر میں نے اپنے نام کے ساتھ والد سے دریافت کر کے "صدیقی" کا لفظ استعمال کرنا شروع کیا۔"

اکبر الدین صدیقی صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، ناظرہ قرآن مجید کی تدریس و تکمیل قندھار اور بھینسہ میں ہوئی، جہاں آپ کے والد صاحب بہ سلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے بھینسہ (عادل آباد) سے اردو مڈل میں کامیابی حاصل کی اور پھر آگے کی تعلیم کے لیے حیدرآباد آگئے اور مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج میں داخلہ لیا۔ ڈاکٹر زور کے ہم محلہ اور پڑوسی رہے، خاندانی تعلقات کی وجہ سے قربت میں اضافہ ہوتا گیا۔ میٹرک کے بعد صدیقی صاحب کی تعلیم سٹی کالج میں جاری رہی اور ۱۹۳۴ء میں آپ نے اسی درس گاہ سے انٹرمیڈیٹ میں کامیابی حاصل کی اور دو سال بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۴۲ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور "پریم چند کی افسانہ نگاری" پر مقالہ لکھا۔ جس کی نگرانی ڈاکٹر زور نے کی۔ جامعہ عثمانیہ کے جن اساتذہ سے اکبر الدین صدیقی صاحب فیض یاب ہوئے ان میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، ڈاکٹر سید سجاد اور پروفیسر سید محمد کے نام قابل ذکر ہیں۔

اکبر الدین صدیقی کی ابتدائی ملازمت سررشتہ کروڑگیری میں صرف ایک ماہ رہی اور پھر ۱۹۳۶ء میں وہ بہ حیثیت استاد اردو سٹی کالج سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں لکچرار شعبہ اردو بنائے گئے اس سے قبل ۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک وہ بدورد کا کالج میں جزوقتی لکچرار رہے۔ سٹی کالج سے اردو کی برخواستگی کے سبب ۱۹۵۷ء میں آپ کا تبادلہ سیف آباد سائنس کالج پر ہوا، سن ۱۹۶۰ء میں حیدرآباد ایوننگ کالج کے لکچرار ف ہوئے، پانچ سال بعد ایوننگ کالج ورنگل تبادلہ عمل میں آیا اور پھر ۵ / فروری ۱۹۷۴ء کو ریڈر شعبہ اردو کی حیثیت سے بہ عمر ساٹھ سال وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوئے۔

اکبر الدین صدیقی صاحب نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۴ء تک بقول قطب الدین فاروقی "سینکڑوں اسکالرس اور اپنے شاگردوں کی علمی و ادبی رہنمائی کی۔ آپ کے ارشد تلامذہ میں محمد منظور احمد، پروفیسر یوسف سرمست، ڈاکٹر قیوم صادق، پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، ڈاکٹر طیب انصاری، سعد حسین سعد (آئی اے ایس ریٹائرڈ) حمید الدین محمود ریم باکاریڈی (یم پی) پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، قابل ذکر ہیں۔

محمد قطب الدین فاروقی نے صدیقی مرحوم کی شخصیت کا خاکہ اپنی کتاب میں تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔ ان چند اقتباسی سطور کے تناظر میں اکبر الدین صاحب مدتوں یاد رہیں گے۔ "شکل و شباہت کے اعتبار سے موصوف کا رنگ سرخ و سپید، روشن آنکھیں، متوسط فربہ جسم، نرم دم گفتگو گرم دم جستجو کے مصداق، خوش پوش، خوش اخلاق، سنجیدہ طبع، نرم لہجہ، اگلی شرافتوں کا نمونہ، تحقیقی مزاج، استادانہ شفقت سے بھرپور، چہرے کے خدوخال سے بزرگی عیاں اور جہاں بینی و جہاں دانی نمایاں، ان کی شخصیت کا خمیر واقعی شرافت، وجاہت اور مشرقیت سے عبارت تھا۔ ظاہری رکھ رکھاؤ، تکلف اور تصنع سے عاری مزاج، جھوٹی شان و شوکت اور ظاہری نام و نمود سے دور رہے علمی اور ادبی سطح پر مشرقی انداز فکر اور دیانت داری و راست بازی ان کا کردار رہا۔ تحریر میں سلاست، شستگی اور شگفتگی کے نقوش روشن، تحقیق کے باب میں مدلل بحث و تمحیص کے قائل اور سچائی نیز تحقیقات متن کے طرفدار، تفہیم و تشریح کے باب میں بھی اکبر الدین صدیقی صاحب نے ذہن رسا پایا تھا۔

اکبرالدین صدیقی صاحب دکنیات اور ادبیات کے نامور محقق اور اردو افسانے کے رمز شناس نقاد، عدیم المثال استاد، اسکالر اور مشرقی کلچر کے پاسدار تھے۔ انھوں نے بہت سے ادیبوں، نقادوں اور پروفیسروں کی طرح شاعری کو بھی اپنایا تھا۔ غزل اور نظم پر اچھی خاصی دسترس تھی۔ ستھرے اور کلاسیکی لہجے کے سخن ور تھے مگر انھوں نے زندگی میں اپنی شاعری کو کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ حضرت امجد، ڈاکٹر زور، صاحبزادہ میکش پر ان کی نظمیں ان اصحاب سے دلی رفاقت کی آئینہ دار ہیں۔ چند اشعار نمونتہً پیش ہیں:

ہزار بار مناؤں، میں لاکھ کھاؤں
مگر زبان سے ان کی نہیں، نہیں جاتی

○

ستاتے ہیں گو مجھ کو آلام دہر
مگر ان کو ٹھوکر لگاتا چلا ہوں
میں ہوں اور میدان جدوجہد کا
میں تکبیر اکبر لگاتا چلا ہوں

○

ہزاروں اشک خوں ہیں اور ملا ہے اک تبسم بھی
گلہ میں کیوں کروں تجھ سے کہ محروم مسرت ہوں

○

کلیم افسوس ہے تم اور تقاضا
زباں لے جاتی ہے سبقت نظر سے

○

ظالم کے مظالم کو تو کوئی نہیں گنتا
اور عرش کو رہتی ہے فقط آہ رسا یاد

○

جبیں اب خواہ کچھ ہو، ہم نے رکھ دی آستانے پر
زمین پیروں تلے سرکے یا سر سے آسمان گزرے

جناب ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے قطعہ تاریخ وفات تحریر کیا جو سنگ مزار پر کندہ کیا گیا۔

جہاں سے اٹھ گئے وہ نیک سیرت
بشارت ان کو جنت کی ملی ہے
علی، کہتے پہ یہ تاریخ لکھ دو
کہ تربت اکبر الدیں کی یہی ہے

○ ○ ○ ○ ○ ○

محمد خلیل احمد صدیقی

آہ پھوپا حضرت

جانے والے کبھی نہیں آتے جانے والوں کی یاد آتی ہے

جب کہ انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ زندگی مختصر ہونے کے علاوہ ایک دن ختم ہونے والی بھی ہے اور انسانی رشتے ناطے سب ختم ہونے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کل نفس ذائقۃ الموت۔اس کے باوجود انسان صبر کا مادہ نہیں رکھتا اور دنیا سے رخصت ہونے والوں کی یاد کو تازہ کر کے غم کے سمندر میں غوطے لگاتا ہے۔اس کی خاص وجہ یہ ہوتی ہے کہ چند دنیا سے رحلت کر جانے والے بہت ہی زیادہ خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں اور اپنے پیچھے اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

قلم کے ذریعے اردو کی خدمت انجام دینے والوں کی کمی نہیں اگر کمی ہے تو صرف عملی خدمت انجام دینے والوں کی۔ عملی خدمت انجام دینا گویا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ڈاکٹر زور کی طرح پروفیسر الحاج محمد اکبر الدین صدیقی مرحوم نے بھی خندہ پیشانی کے ساتھ اردو کی خدمت انجام دیتے ہوئے لوہے کے چنے چبائے اور اردو ادب کی خدمت کو زندگی کا مقصد بنایا۔اپنی تخلیقی و اختراعی صلاحیت سے اپنے معاصرین اور آنے والی نسلوں کو متاثر کیا۔وہ اختراع اور اکتساب کے میدانوں میں نت نئی سمت اور نئے امکانات کا تعین کرنے میں مدد دیتے تھے۔ان میں فکر و بصیرت کے ساتھ اعلیٰ ذوق موجود تھا۔

پروفیسر مرحوم کا شمار ان ادیبوں میں کیا جاتا ہے جو علمی و ادبی زندگی کو ہی زندہ رہنے کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔یہی وجہ تھی کہ آپ بڑی خاموشی اور انہماک اور لگن سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔جب آپ کی عمر صرف ڈھائی سال تھی آپ کے سر سے آپ کی ماں کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اٹھ گیا۔اس وقت آپ کے والد محترم قندھار میں ملازم تھے۔اس لیے آپ کی ابتدائی تعلیم قندھار میں ہوئی۔والد صاحب کا تبادلہ بھینسہ پر ہوا تو آپ بھی بھینسہ آگئے اور مڈل کا آخری سرکاری امتحان بھینسہ سے کامیاب کیا جس کی سند آج تک محفوظ ہے۔مڈل کا آخری امتحان کامیاب ہوتے ہی والد محترم نے آپ کی شادی ۱۹/ مئی ۱۹۳۰ء کو قاضی محمد خلیل الدین صدیقی پان گاؤں کی لڑکی سے کردی (جو راقم الحروف کی پھوپی ہیں) شادی کے ایک سال بعد ۱۹۱۳ء کا سیاہ دن نمودار ہوا جب آپ کے سر سے والد کا سایہ بھی چھن گیا اور مشکلات و تفکرات نے حملہ بول دیا۔پر آپ نے ہمت نہیں ہاری بلکہ محنت و مشقت سے اپنی تعلیم جاری رکھی اور میٹرک و انٹر سٹی کالج سے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۵ء میں، جامعہ عثمانیہ سے بی اے ۱۹۳۷ء میں اور ایم اے ۱۹۴۳ء میں کامیاب کیا۔

مرحوم کی ادبی زندگی کا آغاز کم عمری میں ہی ہوا تھا۔جب آپ میٹرک میں تھے اس وقت آپ کے افسانے بمبئی، حیدرآباد، کراچی، لاہور کے مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوا کرتے تھے۔آپ کی ساری زندگی ڈاکٹر زور کے نقش قدم پر گزری۔آپ کی علمی ادبی زندگی میں ایک اہم موڑ ادارہ ادبیات اردو سے وابستگی ہے جس کے تمام امور کو آپ نے ذاتی سمجھ کر انجام دیے۔ڈاکٹر زور کے دیکھے ہوئے خوابوں کو تعبیر کا روپ دینا اپنا شعار بنایا اور خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے میں لگے رہے۔

ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات کو عثمانیہ یونیورسٹی سے منظور کرانے میں آپ نے اہم رول ادا کیا۔آپ ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو امتحانات کو مسلمہ حیثیت حاصل ہے۔پروفیسر مرحوم نے ادارہ ادبیات اردو کی وساطت سے نہ صرف قدیم ادب کی نشاۃ ثانیہ کی بلکہ بہت

سے گم نام ادیبوں اور شاعروں سے زمانے کو روشناس کروایا۔ یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ بہت سے قدیم و گم گشتہ ادیبوں اور شاعروں اور ان کے کارناموں کو آپ کی ہی کوششوں سے حیات جاوید ملی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی نوازا۔ پہلا سفر حج آپ نے اپنی اہلیہ کے ساتھ ۱۳۹۴ھ میں کیا جس کی تاریخ آپ کے عزیز شاگرد نواب شبیر حسین خاں عزم (مرحوم) بنیرہ نواب حسام الدین شوکت جنگ نے یوں نکالی:

" پروفیسر ادب الحاج محمد اکبر الدین صدیقی صاحب ایم اے "

خدائے پاک نے اپنی رحمتوں میں پھر ایک بار لیا اور آپ نے اپنی اہلیہ کے ساتھ دوسرے حج کی سعادت بھی حاصل کرلی۔ اس موقع پر آپ کے دوست صاحب (مرحوم) نے دو تاریخی قطعات تحریر فرمائے:

○

دوبارہ حج سے لوٹے اکبر الدیں — مبارک ہو فروغ دیں مبارک
نشاط آگیں ملی تاریخ صاحب — مبارک حج آخر ہیں مبارک

○

حریم پاک سے واپس ہوئے ہیں — وہ رکھتے ہیں پر پرواز شاہیں
ملی تاریخ صاحب یہ سنادو — مبارک حج بذوق اکبرالدیں

پروفیسر مرحوم نے حج بیت اللہ کے طواف کے ساتھ ہی اپنے ارکان اسلام کی تکمیل کردی پر دینی و مذہبی جذبے نے خدمت کی ترغیب دی اور آپ نے اسے بھی پورا کیا جس کا ثبوت یا زندہ مثال آپ کے آبائی وطن پان گاؤں ضلع لاتور کی ایک مسجد ہے جو خستہ حالت میں تھی۔ آپ نے اس کی تعمیر نو کرائی جو مسجد نورانی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ مسجد کے دوران تعمیر آپ بذات خود مع اہلیہ اپنے آبائی وطن پان گاؤں میں اپنے ایک عزیز قاضی محمد قائم الدین صاحب کے مکان پر مسلسل تین ماہ قیام پذیر رہے (جو راقم الحروف کے والد محترم ہیں) اور اپنی نگرانی میں مکمل کام کروایا۔ حالاں کہ آپ کے لیے یہ قیام تکلیف دہ تھا چوں کہ صحت ساتھ نہ دیتی تھی۔ اسی کے ساتھ ہی آپ کے آبائی وطن کی محبت کا اظہار ہو گیا اور وطن کا حق بھی پورا کر دیا۔

مسجد کی تعمیر کی تاریخ آپ کے دوست اور ہم جماعت نواب سید مظفر الدین خاں تخلص صاحب مرحوم نے نکالی تھی:

اکبر الدیں نے اسے بنوادیا — باخدا جو مرد حق آگاہ ہے
بعد سجدہ سال صاحب نے کہا — فرش نورانی عبادت گاہ ہے

پروفیسر الحاج محمد اکبر الدین صدیقی مرحوم ایک مشفق و مہربان اور کنبہ پرور انسان تھے۔ آپ اولاد کی نعمت سے محروم تھے لیکن گھر اہل خاندان سے ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔ خاندان کے کئی بچوں نے آپ کے پاس رہ کر تعلیم مکمل کی۔ جب بھی کوئی علمی، ادبی، عصری مدد کا طلب گار آپ کے پاس پہنچ جاتا تو آپ بخوبی اس کی تشنگی کو دور کر دیتے تھے۔ آپ کی شہرت کا یہ حال تھا کہ دنیا کے کسی بھی کونے سے پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی چار قندیل آغاپورہ حیدرآباد لکھ کر خط ڈال دیا جائے تو براہ راست آپ کی خدمت میں پیش ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنی کسی بھی کتاب میں گھر کا نمبر درج نہیں کیا۔

(آگے ص ۳۶ پر)

کتاب: مرزا غالب

مصنفہ: نتالیا پری گارنا

ترجمہ: اسامہ فاروقی

باب: ٦

اوراق پژمردہ

"تقلید سے پرہیز کرو، نابغہ روزگار انوکھا ہوتا ہے اور اس کی بڑائی خود اس کی عظمت میں مضمر ہوتی ہے"۔ براتینسکی

دہلی میں مرزا اسداللہ خاں کا طرز زندگی وہی تھا جس کے وہ آگرے میں عادی ہو چکے تھے، شاہ خرچی کرتے، رنگ رلیاں مناتے اور مے نوشی کرتے، قمار بازی کرتے اور طوائفوں سے دل بہلاتے۔ ان کی اہلیہ امراؤ بیگم سخت اخلاقی اصول کی پابند اور راست باز بی بی تھیں، بڑی دین دار تھیں اور اس میں شک نہیں کہ اپنے مقاصد زندگی اور نوجوان شوہر کے طور طریقوں کے مابین عدم مطابقت کی وجہ سے انھیں کافی دکھ بھی جھیلنے پڑتے تھے۔ مزید برآں ان کی قسمت میں کڑی آزمائشوں سے گزرنا بھی لکھا تھا: سات بچے پے در پے ہوئے مگر ان میں سے کوئی بھی دو برس سے زیادہ نہیں جیا۔ شاید اسی وجہ سے مرور زمانہ کے ساتھ ان کی خدا پرستی کٹر پن میں تبدیل ہو گئی اور یہ بات ظاہر ہے کہ مرزا کو پسند خاطر نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک بار ان کو نماز میں مصروف دیکھ کر غالب نے جھنجھلا کر اپنے جوتے سر پر رکھے اور اسی شکل میں بیوی کے پاس کھڑے ہو گئے۔ امراؤ بیگم نے اس تماشے سے متعجب ہو کر پوچھا "یہ کیا؟" غالب نے جواب دیا کہ "بات یہ ہے کہ یہ گھر تو اب مسجد ہو گیا، تو پھر اگر کوئی قدم رکھے تو کہاں رکھے اور کرے تو کیا کرے"۔ یہاں غالب کا اشارہ گھر کے اندر پوری طرح سے سرایت کیے ہوئے مذہبی ماحول کی طرف تھا۔ چوں کہ مسجد میں جوتے پہن کر داخل نہیں ہوتے اور دہلیز پر انھیں چھوڑنا بھی مناسب نہ تھا تو بھلا ان کے لیے خود اپنے سر سے بہتر جگہ مرزا غالب کو کہاں مل سکتی تھی!

مرزا کو معلوم تھا کہ ان کے استعمال میں آنے والے کھانے پینے کے تمام برتن ناپاک سمجھ کر بیوی نے اپنے برتنوں سے الگ کر دیے ہیں۔ مرزا جوابی کارروائی سے کب باز آنے والے تھے، اپنے تاہل کو ہمیشہ ظرافت کا نشانہ بنانے رکھتے، اکثر صرف دل لگی کے لیے لیکن کبھی کبھی ان کی گفتگو میں خاصی تلخی بھی ہوتی۔ پیرانہ سالی میں علاء الدین خاں علائی کے نام اپنے ایک مشہور خط میں مرزا از راہ مزاح شکایت کرتے ہیں "ساتویں رجب ۱۲۲۵ ہجری کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا"۔ لفظ "بیڑی" پر سبھی مبصرین ستارے کا نشان لگاتے ہیں اور تصریح کرتے ہیں کہ "بیڑی سے مراد بیوی ہے"۔ یہاں غالب ان دو الفاظ کی ہم آہنگی سے کام لیتے ہیں لیکن زندگی کے اس مرحلے پر جس کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں، مستقبل میں اس خاتون کو بہت سی کڑی آزمائشوں سے گزرنا تھا اور اپنی راست بازی اور مستقل مزاجی کی وجہ سے ہی وہ انھیں جھیل سکیں۔ فی الحال میاں بیوی اپنے اپنے جداگانہ راستوں پر چل رہے تھے۔

لا متناہی لڑائیوں، حملوں اور تباہی کے بعد شہر دہلی ایک حد تک سنبھل چکا تھا اور اس زمانے میں نسبتاً امن و امان کی زندگی بسر کر رہا تھا، گو کہ پوری طرح سے بحال بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے زیادہ تر مضافات کھنڈر میں تبدیل ہو چکے تھے۔ دہلی سے ذرا سا شمال کی طرف ہریانہ کے جنگلوں میں اب بھی شیر گھومتے تھے، جن کی گرج شکاریوں کا دل گرماتی اور عام لوگوں کو دہشت زدہ کرتی تھی۔

سلطنت کے برائے نام سربراہ اکبر شاہ ثانی دہلی کے مغل حکمران تھے۔ ان کا اپنا دربار تھا جس کی مدد سے انگریز اپنی حکومت چلاتے تھے۔ دربار میں رسائی رکھنا اور لال قلعے کی زندگی میں دخیل ہونا اب بھی نام ور خاندان کے ہر نوعمر رکن کا نصب العین اور سماج کے اعلیٰ طبقات سے تعلق رکھنے والے ہر ذہین اور تعلیم یافتہ مسلمان کا مطمحِ نظر تھا۔ پرسی وال اسپیر اپنی تصنیف "دہلی" میں لکھتا ہے "بلاشبہ شاہی محل دہلی کی سماجی زندگی اور مغل سلطنت کی ڈھلتی ہوئی شام کا مرکز تھا۔ انحطاط اور تنگ دستی کے اس دور میں بھی جس کی وجہ شاہی نسل کے تقریباً دو ہزار شاہزادوں کی موجودگی تھی، آخری مغل بادشاہ اچھے خاصے طمطراق کی زندگی بسر کرتے اور آرام طلبی میں اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ جہاں تک ممکن تھا پرانی درباری روایات کی پابندی کی جاتی۔ جشن کے موقعوں پر بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر جامع مسجد جاتے۔۔

اپنے مضمون "غالب کے عہد کی دہلی" میں اسپیر، بادشاہ کے جلوس کی تفصیل لکھتا ہے:

"وزرا، شہزادے اور مرزا بادشاہ کے جلو میں ہوتے ہیں۔ آگے اور پیچھے محافظ پیادہ سپاہیوں کا بے قاعدہ ہجوم ہوتا ہے۔ نفیری نواز نفیری بجاتے اور خوش خواں بادشاہ کی شان میں قصیدے سناتے ہیں۔۔۔۔۔ ممکن ہے کہ موسیقی بعض سننے والوں کو بے سُری اور نظر فریب چمک بھڑک دیکھنے والوں کو پھیکی لگے لیکن عام طور سے تماشا آنکھوں کو اچھا لگتا ہے اور عوام جلوس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ بادشاہی ہاتھی بڑے ٹھسے سے آگے آگے چلتے ہیں۔ ایک دفعہ بگھی میں جتے ہوئے گھوڑے نے شور شرابے سے بھڑک کر سواریوں یعنی تین انگریز عہدے داروں کو گرا دیا۔ یہ سچ ہے کہ ان کو کوئی گزند نہیں پہنچی لیکن رپورٹ میں درج کیا گیا کہ "جنٹل مین بے حد خفا ہوئے"۔ بادشاہ مسلمانوں کی عید کے موقع پر اونٹ کی قربانی دیتے۔ ہندوؤں کے تیوہار بھی منائے جاتے، خصوصاً ہولی۔ نوروز کے موقعے پر بادشاہ کو سات قسم کے اناج سونے اور مونگے سے تولنے کی ایرانی رسم کی پابندی بھی کی جاتی تھی (سلطنت کے اچھے دنوں میں یہ کام سونے، چاندی اور جواہرات سے لیا جاتا تھا)۔۔۔۔ پچاس سال میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کا ذکر میں نے ایک بار بھی نہیں سنا۔۔ دربار اب بھی منعقد ہوتے اور امرا کو خطاب عطا کیے جاتے۔ لیکن آخری مغل بادشاہوں کی نمایاں اور قابلِ تعریف خصوصیت فنون اور ادبیات کی سرپرستی تھی۔ دہلی میں کتب بینی کے عملاً سبھی شائقین کے لیے عمدہ کتب خانوں کے دروازے کھلے تھے۔ ہاتھی دانت اور کاغذ پر مختصر تصویروں اور شبیہوں کی نقاشی اور مصوری کو فروغ ملا۔ دربار میں شاعری کی بے حد قدر تھی۔

اس عہد کے ایک مورخ کے الفاظ میں، سیاسی میدان عمل سے بے دخل ہو جانے کے نتیجے میں مغلیہ دربار نے سیاست کا بدل ادبی ساز باز میں تلاش کر لیا اور آس پاس دوسرا ہی طرزِ زندگی جڑیں پکڑ رہا تھا۔ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر کا احساس اسی امر سے ہو سکتا تھا کہ دہلی کی آبادی کا ایک قابلِ لحاظ حصہ اب یورپی نوواردوں پر مشتمل تھا۔ دریا گنج کے علاقے اور کشمیری دروازے کے اس پار تعمیر کا کام زوروں پر چل رہا تھا۔ اسپیر آگے لکھتا ہے کہ "انگریزوں کے وسیع و عریض بنگلوں کی قطار ٹیلے کے قریب تک چلی گئی تھی اور ان کی فٹنوں اور بگھیوں، ان کے شکار اور ان کے گیند بلّے کے کھیل، ان کی امارت پرستی اور حیثیت پر گھمنڈ، ان کی سنک سے دلی کے عوام برہم بھی ہوتے تھے اور محظوظ بھی۔۔ لیکن صرف حیثیت پر گھمنڈ اور سنک ہی عوام کی برہمی کا باعث نہیں تھی۔ برطانوی شیر ببر کے بھاری بھرکم پنجے کے دباؤ کا احساس روز بروز بڑھ رہا تھا۔ انگریزوں کی موجودگی کے نتیجے میں زندگی میں ظہور پذیر ہونے والی تبدیلیوں کے تعلق سے ہندوستانی سماج کے

مختلف طبقات، ملک کے مختلف علاقوں اور بالآخر مختلف مذہبی گروہوں کا رد عمل مختلف نوعیت کا تھا۔ چوں کہ مسلمان خصوصاً مغل سلطنت کی پشت پناہ تھے ان کے لیے اس سلطنت کی خطرناک حالت کو شدت سے محسوس کرنا لازمی تھا۔ ساتھ ہی ساتھ جب تک مغل سلطنت برائے نام ہی سہی باقی تھی، ہندوستان کے دیگر مذہبی گروہوں کے مقابلے میں ان کے لیے اس خوش فہمی میں نسبتاً دیر تک مبتلا رہنا فطری تھا کہ حالات حسب معمول ہیں اور سب کچھ پہلے ہی کی طرح چل رہا ہے۔ مسلمانوں کی تحریک نشاۃ ثانیہ کی تاریخ شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۷۶۲ء) سے شروع ہوتی ہے لیکن ان احیائی رجحانات کی نوعیت میں پشت در پشت تبدیلی آتی گئی۔ شاہ ولی اللہ کے فرزندگان شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر ممتاز علماء دین تھے اور ان مسلمانوں میں سے بہت سے جنھوں نے بعد میں عظیم جنگ آزادی ہند میں حصہ لیا، ان کے شاگرد تھے۔ غالب کے قریبی دوست فضل حق خیر آبادی، مومن خاں مومن، آزردہ اور دوسرے نوجوان بھی جن کا شمار ۱۸۲۰ء کے دہے کے آغاز کی نوجوان نسل کے بہترین نمائندوں میں کیا جا سکتا ہے، ان کے شاگرد تھے۔

مسلمانوں کی نظریاتی تحریکوں کی نمایاں خصوصیت ہمیشہ اصلاح معاشرہ اور عہد حاضر کے تقاضوں سے اسلام کو مطابق بنانے کی کوشش میں ماضی کی طرف رجعت رہی ہے۔ بارہا "اسلام کی حفاظت" کا مسئلہ پیدا ہوا، خصوصاً ہندوستان میں، جہاں کی مذہبی اعتبار سے زرخیز زمین اسلام کو بہ آسانی خود میں جذب کر لینے یا اس کے تخم سے اکبر کے "دین الٰہی"، سکھ مت یا بھگتی جیسا کوئی پیوندی پودا اگانے کے لیے تیار تھی۔ مزید برآں خود اسلام ہندوستان میں اپنی کلیتہً خالص شکل میں رائج بھی نہیں تھا، یہ اسلام کی، تصوف کی ٹہنی سے نکلی ہوئی "گجی" شاخ تھی۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں نشو و نما پانے والی اجنبی بیزاری ایک بیماری تھی اور وہاں، جہاں مسلمان برسر اقتدار اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی اقتدار سے محروم اقلیت میں بھی تبدیل ہو سکتے ہیں، وہ بھی ایک ایسے ملک میں، جہاں آبادی کی اکثریت "بت پرست" ہے، یہ بیماری کافی خطرناک تھی لیکن پھر بھی ہندوستانی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی ساتھ کی بود و باش طویل عرصے تک پر امن تھی۔ مسلمانوں کے لیے اسٹیج پر عیسائی حکم رانوں کی آمد کے مفہوم کا صحیح ادراک نسبتاً مشکل تھا۔ اسی لیے دہلی میں انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں انگریزوں کے تسلط کے خلاف جد و جہد نے سب سے پہلے مذہبی اعتبار سے عدم قبولیت کی شکل اختیار کی۔

صورت حال کی تبدیلی پر اسلام کے رد عمل کی ایک شکل فتویٰ یعنی علمائے دین کی تحریری یا زبانی رائے ہوتی ہے۔ فتوے کے ذریعے سچے مسلمانوں کو غیر معمولی صورت حال میں ایک معین طرز عمل کی ہدایت دی جاتی ہے اور ان افعال کی ممانعت کی جاتی ہے جو علما کی نظر میں دین اسلام کے اصول کے برخلاف ہوں۔

شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶۔ ۱۸۲۳ء) تحریک آزادی کی تاریخ کا ایک جزو ہیں۔ اپنی کتاب "ہندوستان اور پاکستان کے سماجی افکار میں اسلامی رجحانات" میں پلونسکیا ان میں سے ایک فتوے کا حوالہ دیتی ہیں جس میں شاہ عبدالعزیز ہندوستان میں انگریزوں کے مقبوضہ علاقوں کو "دارالحرب" یعنی دشمن کی سرزمین قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اس شہر (یعنی دہلی۔ مصنفہ) میں اب مسلمان امام کسی امر میں بھی صاحب اختیار نہیں رہا، نصاریٰ بے روک ٹوک حکومت کرتے ہیں۔ ان کے اس بالفعل مسلمہ اقتدار کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے نظم و نسق، زمین کے لگان اور تجارتی محاصل کی وصولی، نوکروں اور چوروں کی سرزنش اور دوسرے مختلف جرائم کی سزا کے تعین سے متعلق تمام امور میں فیصلہ کن رائے دینے کا حق غیر مسلموں کو حاصل ہے۔ اگر چہ کہ وہ مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرائض کی ادائیگی میں مزاحم نہیں ہوتے ...... لیکن اس کی درحقیقت کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔" لیکن اس زمانے میں فقہا کے بحث و مباحثے کو کم ہی لوگ روایتی اصول کی اندھی تقلید سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور مرزا کو روایتی اصول کی اندھی تقلید میں کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ کسی بھی مذہب کو وہ کوئی

خاص اہمیت یا ترجیح نہیں دیتے تھے اور کائنات پر اس کی بے نظمی اور انتشار کی وجہ سے طنز کرتے تھے۔ حالی لکھتے ہیں: "ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے "جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے، اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ ستاروں کو تو دیکھو، کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں۔ نہ تناسب ہے نہ انتظام ہے، نہ بیل ہے، نہ بوٹا ہے، مگر بادشاہ خود مختار ہے، کوئی دم نہیں مار سکتا۔"

اپنے احباب کی صحبت میں غالب کا مذہبی موضوعات پر مباحث میں شریک ہونا ناگزیر تھا۔ وہ ان مباحث کے پس پشت جو حقائق تھے ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے اور اگر ایک بار وہ کسی طرح بحث میں کھینچ لیے گئے تو اس میں بھی شک نہیں کہ وہ مسئلے کی تہہ تک پہنچتے اور تمام سوالات کا پر مغز اور انوکھا جواب تلاش کر لیتے۔ حالی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مرزا کے دوست اور معروف شاعر شیفتہ شاہ ولی اللہ کے ایک فارسی رسالے کا، جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، مطالعہ کر رہے تھے اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ مرزا سے رجوع ہوئے۔ انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

جیسا کہ حالی اور ان کے بعد تمام سوانح نگار زور دے کر لکھتے ہیں ابتدائی دور میں غالب پر آزردہ اور فضل حق اور کچھ بعد کے دور میں شیفتہ سے دوستی کا گہرا اثر پڑا۔ ظ۔ انصاری تو یہاں تک کہتے ہیں کہ زرتشتی عبدالصمد کو نہیں بلکہ فضل حق، آزردہ اور شیفتہ کو غالب کا استاد سمجھنا چاہیے: فضل حق غالب کے ہم عمر تھے اور آزردہ ان سے عمر میں کچھ بڑے۔

دلوں کو مسخر کرنے والی ملنساری اور دوست داری مرزا کی امتیازی خصوصیت تھی۔ اپنی سلامت روی کی وجہ سے وہ مناقشوں میں پڑنے سے بچتے تھے۔ جیسا کہ مرزا کے ہم عصر اور واقف کار بیان کرتے ہیں فضل حق کا اصرار تھا کہ غالب مذہبی موضوع پر لکھی ہوئی اپنی اس مثنوی میں ترمیم کریں جو انھوں نے ختم نبوت یعنی رسول اسلام حضرت محمد کے خاتم النبیین ہونے کے بارے میں لکھی تھی۔ اس بارے میں اسلام کے مختلف فرقوں کے عقائد میں اختلاف تھا۔ نتیجتاً اس طرح کے مباحث کے تعلق سے علما کا رویہ نہایت متشددانہ تھا۔ قرآن میں حضرت محمد کی بہ حیثیت خاتم النبیین جو توصیف کی گئی ہے اس کی مختلف تشریحیں کی جاتی ہیں۔ ایک تشریح کے مطابق حضرت محمد ایک خاتم یا مہر کی طرح اپنے پیش رو تمام نبیوں کی حقانیت کی توثیق کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ (مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق توریت و انجیل میں مذکور آدم اور ان کے بعد کے تمام انبیا رسول برحق ہیں)۔ دوسری تشریح کے مطابق "خاتم النبیین" کا مطلب سلسلہ نبوت کا اسی طرح سے اختتام ہے جیسے کسی دستاویز پر مہر کی موجودگی اس کی تکمیل کی علامت ہوتی ہے۔ غالب نے مثنوی میں جو رائے ظاہر کی تھی وہ اصلاح پسند وہابی فرقے کی رائے کے مطابق تھی: اگر خدا چاہے تو اس عالم جیسے دوسرے عالم اور وہاں محمد خاتم النبیین جیسے دوسرے خاتم النبیین خلق فرما سکتا ہے۔ اس خیال کی اصل وہابیوں کا یہ مرکزی عقیدہ ہے کہ خالق عالم کی قدرت کے امکانات لامحدود ہیں۔ اس پر فضل حق، جن کو وہابیوں سے شدید مخالفت تھی، سخت ناراض ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ اتنی صاف سیدھی سی بات کم از کم مرزا کی سمجھ میں تو آجانی چاہیے کہ خدا بے مثل ہے اور نہ اپنا مثل پیدا کر سکتا ہے اور نہ خاتم النبیین محمد کا۔

غالب نے تھوڑی بہت مزاحمت کی، ان کو وہابی نظریے سے منتج ہونے والی یہ الٹی بات دل چسپ معلوم ہوتی تھی کہ اگر محمد کے خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے خدا اس عالم میں دوسرا نبی نہیں پیدا کر سکتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دوسرا عالم خلق کرنے سے اور وہاں دوسرا نبی مثل محمد بھیجنے سے قاصر ہے۔ فضل حق نے آگ بگولہ ہو کر کہا: "یہ تم نے کیا بکا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں؟ نہیں، بلکہ اگر لاکھ عالم بھی خدا پیدا کرے، تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہوگا۔ پس اس مضمون کو مثنوی میں سے بالکل نکال ڈالو، اور جس طرح میں کہتا ہوں، اس طرح بیان کرو۔" دوست کی رضا جوئی کے

لیے غالب نے مثنوی کی اصلاح کر دی، لیکن جیسا کہ حالی نے صراحت کی ہے اس کو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں۔ آگے چل کر فضل حق نے نہ صرف ایک عالم دین اور حدیث و سنت پر سلسلہ رسائل کے مصنف کی حیثیت سے شہرت پائی بلکہ تقریباً چار ہزار ابیات بھی ترکے میں چھوڑیں۔ وہ عربی میں قصائد بھی لکھتے تھے۔ سب جانتے ہیں کہ غالب نے انھیں کے اثر سے "مشکل اسلوب بیان" سے کنارہ کشی اختیار کی۔ مزید برآں بہت سوں کا خیال ہے کہ اگر فضل حق نہ ہوتے تو غالب کے حق میں میر کی یہ پیشین گوئی کہ کامل استاد نہ ملنے کی صورت میں یہ لڑکا مہمل بکنے لگے گا شاید سچ ثابت ہوتی۔ غالب کے اسلوب کے تعلق سے ایسی سخت گیری کا مظاہرہ کرنے میں فضل حق اکیلے نہیں تھے۔ آزردہ جیسے سخن سنج اور سادگی کے شیدا نے بھی غالب کو اظہار خیال کے دوسرے وسائل کی تلاش کی ترغیب دی۔ جیسا کہ غالب کے ایک تذکرہ نگار لکھتے ہیں ان کے اثر سے نہ صرف اسلوب شاعری میں بلکہ شاعر کے مزاج میں بھی سلامت روی پیدا ہوئی۔

فضل حق کی طرح آزردہ نے بھی دینی تعلیم پائی تھی اور مفتی کی خدمت پر مامور تھے یعنی عدالت میں اپنے معینہ فرائض انجام دیتے تھے، مختلف مذہبی اور ساتھ ہی ساتھ قانونی معاملوں کے تعلق سے فیصلے صادر کرتے تھے۔ حالی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رمضان، یعنی مسلمانوں کے روزے کے مہینے میں، آزردہ مرزا سے ملنے ان کے گھر آئے۔ اس وقت مرزا صاحب گھر کی چھت پر ایک کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے۔ مرزا کو اس قابل اعتراض تفریح میں مشغول دیکھ کر ان کے اندر کا قانون داں چپ نہ رہ سکا اور انھوں نے از راہ مزاح کہا کہ "ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا"۔ لیکن غالب حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں پیچھے رہنے والے کہاں تھے، انھوں نے جواب دیا: "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے، وہ یہی کوٹھری تو ہے"۔ حالی غالب کے اسلوب اور اشعار کی سادگی اور پیچیدگی کے بارے میں آزردہ کی رائے کے تعلق سے ایک اور لطیفہ بیان کرتے ہیں۔ آزردہ اعلی درجے کے سخن فہم تھے اور انھیں بہت سے اشعار زبانی یاد تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ غالب کے اشعار اپنی پیچیدگی اور الجھاؤ کی وجہ سے بہ آسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔ ایک دفعہ کہیں انھوں نے یہ شعر سنا:

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

سچ پوچھیے تو ہم کو تو یہی شعر مبہم اور پیچیدہ دکھائی دیتا ہے لیکن حالی اس کو "سہل ممتنع" کی ایک ایسی عمدہ مثال قرار دیتے ہیں جس سے آزردہ بھی دھوکہ کھا گئے۔ حالی شعر کی تشریح کرتے ہیں کہ یہاں عاشق و معشوق کے ایسے تعلق باہمی کا ذکر ہے جو انسان کو پوری طرح سے اپنے بس میں کر لیتا ہے۔ شعر کا مفہوم معشوق کے "لاکھوں لگاؤ" اور "نگاہ کے ایک چرانے" اور پھر معشوق کے "لاکھوں بناؤ" اور اس کے عتاب میں "ایک بگڑنے" کے تقابل میں پنہاں ہے۔ یہ شعر سہل ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیوں کر ایسے دو ہم پلہ مصرع بہم پہنچ گئے، جن میں حسن ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجیے تو ہر ایک مصرع میں ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقعی عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ مشرقی شاعری کی روایات کے مطابق معشوق بے مہر بھی ہے اور کم آمیز بھی، لیکن کبھی کبھی تمام قاعدوں کے برخلاف وہ عاشق پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال ہی لیتا ہے اور یہ ادا اسے عاشق کی نظروں میں بدرجہا دل فریب بنا دیتی ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بے شک دوبالا ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ بناؤ سنگار سے لاپروائی برتے تو اس سے بھی اس کے حسن میں اضافہ ہی ہوتا ہے کیوں کہ شاعری کے اصول کے مطابق معشوق کا غصے میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوش نما اور دل ربا معلوم ہوتا ہے۔

شعر کے تجزیے کو اختتام پر لاتے ہوئے حالی لکھتے ہیں کہ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں۔ اس صل خوبی وجدانی ہے جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا (حالی کا اشارہ غالباً شعر کی اس ممکنہ تشریح کی طرف ہے تصوف کے نقطہ نظر سے کی جا سکتی ہے)۔

حالی آگے لکھتے ہیں کہ "ایک روز مولانا آزردہ کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا۔ چوں کہ مولانا نہایت صاف اور سریع ہم اشعار کو پسند کرتے تھے، اس لیے مرزا کا کلام سن کر اکثر الجھتے تھے اور ان کی طرز کو نام رکھتے تھے۔ مگر اس روز اس شعر سن کر وجد کرنے لگے، اور متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے؟ کہا گیا: مرزا غالب کا۔ چوں کہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف میں کرتے تھے اور اس روز لاعلمی میں بے ساختہ ان کے منہ سے تعریف نکل گئی تھی، غالب کا نام سن کر بطور مزاح کے یسی کہ ان کی عادت تھی، فرمایا: "اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے، یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ شعر ی معناً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے، جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک ہم کو علوم ہے یہ اسلوب بیان آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔"

یہ تو اس وقت کی بات ہے جب غالب کی شہرت دہلی کی حدود کے باہر بھی پہنچ چکی تھی لیکن ۱۸۳۲ء میں جب "منتخب ام" شائع کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنے اشعار جمع کیے اور ۱۸۴۱ء میں جب پہلی بار انھوں نے اپنا "دیوان اردو" سائع کیا وہ ملک کے چوٹی کے شاعر کی شہرت حاصل کرنے کے لیے جد و جہد میں لگے ہوئے تھے، گو کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ س میں وہ پوری طرح کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے، ان کو بالعموم، اور خاص طور سے دہلی کے ادبی حلقوں میں، درجہ استناد حاصل ہو چکا تھا۔ چناں چہ جب انھوں نے اپنے فارسی کلام کو اردو کلام سے برتر قرار دیا تو سی کو کوئی خاص تعجب نہیں ہوا۔

نیست نقصاں یک دو جزوست ار سواد ریختہ
کاں دژم برگی ز گلستان فرہنگ من است

(اس میں کیا ہرج کہ ریختہ کے اشعار میرے کلام کا ایک مختصر سا حصہ ہیں۔ آخر وہ میرے گلستان معانی کے کچھ وراق پژمردہ ہی تو ہیں۔)

مصرعہ اول میں اشارہ اس طرف ہے کہ "منتخب کلام" میں غالب کے اردو کلام کا محض ایک مختصر سا حصہ شامل نیا گیا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت بھی تھی۔ لیکن شعر و ادب سے دل چسپی رکھنے والے غالب کو ایک عرصے سے جانتے تھے۔

غالب کے "دیوان اردو" میں وہ کلام شامل کیا گیا جو انھوں نے کم و بیش تیس سال کے عرصے میں لکھا تھا۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں دیوان میں غزلیں ردیف وار، حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق شامل کی جاتی ہیں۔ چناں چہ اگر ردیف معلوم ہو تو مطلوبہ غزل کو تلاش کرنے میں عموماً کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس کسی غزل کی تاریخ تحریر کا پتہ چلانا عملاً ناممکن ہوتا ہے، جب کہ شاعر کی زندگی کی حکایت کو اس کے دل کی آپ بیتی کی حیثیت سے دیکھنا ہو تو کم از کم اتنی واقفیت تو ضروری ہے کہ کون سا کلام اس نے کب لکھا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں خود غزلوں سے کوئی مدد نہیں مل سکتی، خاص طور سے اس لیے کہ روایتی اصول شاعری کی رو سے شاعر کی زندگی کے واقعات سے بے تعلقی کو اس کے کلام کی بلند پروازی کی نشانی مانا جاتا ہے۔ غالب کے ابتدائی کلام پر نقد و نظر کا کام ابھی تک اتنی گہرائی اور گیرائی سے نہیں ہوا ہے کہ اس کی مدد سے شاعر کی فطری قابلیت کے ارتقا میں اس کی ابتدائی تخلیقات کی اہمیت کو سمجھا جا سکے۔ اس کی ذمہ دار غالب کے ابتدائی عہد کے کلام کی وہ ناکافی قدر شناسی بھی ہے، جس کی ابتدا حالی اور ان کے ہم عصر نقادوں سے ہوئی۔ چناں چہ اردو ادب کی مشہور و معروف تحقیقی کتاب

"آب حیات" کے مصنف محمد حسین آزاد اپنی سخن سنجی اور شاعری پر گہری نظر کے باوجود، اس تذبذب میں ہیں کہ برتر قرار دیں، غالب کو یا درباری شاعروں کے میر کارواں اور اپنے وقت کے شاعر اعظم کے طرۂ امتیاز کے حصول میں غالب حریف ذوق کو، انھیں ذوق کو جنھوں نے جیتے جی درباری حلقوں میں غالب کی رسائی کا راستہ مسدود رکھا اور جو، جیسا کہ بالکل واضح ہے، غالب سے بدرجہا کم تر درجے کے شاعر تھے۔ جہاں تک غالب کی ابتدائی شاعری کا تعلق ہے، تو آزاد لکھتے

"اس میں ہزار معنی بلند ہیں لیکن بسا اوقات ان کی بلندی اتنی زیادہ ہے کہ وہاں تک ہمارا ذہن نارسا پہنچ نہیں پاتا۔"

غالب کے اردو کلام کے بارے میں بنیادی اور مقبول عام روایت یہ ہے کہ غالب نے اپنے احباب فضل حق، اور شیفتہ کی تحریک پر، ۱۸۳۲ء میں اپنے کلام کا "انتخاب" مرتب کرتے ہوئے، اپنے ابتدائی دور کے کلام میں سے دا کے قریب نکال ڈالا۔ اس کے باوجود اس روایت کے مطابق اس بچے کھچے کلام کا دو تہائی از حد پیچیدہ اور بعید از فہم اش مشتمل تھا۔

یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ دیوان غالب میں صرف نسبتاً بعد کے دور کا اور نتیجتہً پختگی کو پہنچا ہوا کلام شامل کیا گیا کہ خام اور ناقص ہونے کی وجہ سے ابتدائی دور کے کلام کو اس میں جگہ نہیں ملی۔ اس کلیتہً غیر علمی خیال کے پیدا ہو۔ غالبیات میں اس کے تادیر قائم رہنے کی وجہ کلام غالب کے متن پر ایسے کسی سنجیدہ تحقیقی کام کا فقدان تھا، جس کی بن "دیوان غالب" کی غزلوں کی ترتیب زمانی کا تعین کیا جا سکتا۔

جیسا کہ اب معلوم ہو چکا ہے بہت سے ایسے اشعار اور بعض غزلیں، جو "منتخب کلام" اور "دیوان اردو" میں ش ہیں 1819ء سے پہلے لکھی گئیں۔ غالب کے کلیات کے مرتب عرشی نے ابتدائی کلام مجموعے کے اس حصے میں شامل کی جس کا نام انھوں نے "گنج معانی" رکھا ہے اور بعد کا کلام، دوسرے حصے "نوائے سروش" میں۔ موخر الذکر متداول ا کے مستند متن کے مطابق ہے لیکن اس میں کسی قسم کی تبدیلی سے گریز کرتے ہوئے عرشی نے وہ سارا کلام جوں ک برقرار رکھا جس کا تعلق، حالیہ تحقیقات کے مطابق، ابتدائی دور سے ہے، البتہ ان اشعار کو "گنج معانی" سے خارج کر دیا۔

اس طرح سے فی الحال ایسی کوئی بھی تصنیف نہیں ہے جس سے غالب کے ابتدائی کلام کی متن کے اعتبا معتبر تصویر ہماری نظروں کے سامنے آجائے۔ یہ بے قاعدگی اتفاقی نہیں ہے، یہ اسی ایک ڈھرے پر چلنے کے رجحان اور ا کے شعری ورثے کے تعلق سے غیر علمی رویے کا نتیجہ ہے۔ اس بیچ میں اب بہت سے محققین کی یہ رائے بھی سنائی دیتی ہے کہ "غالب کے ابتدائی کلام پر فخر کرنا چاہیے"، اور یہ کہ کلام غالب کا انتخاب کرنے والے، غالب کے "مرتبین" کے بہ ح مجموعی کلام غالب پر اثر کو حد سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ایک لغو سی بات ہے۔

بہ حیثیت شاعر غالب کی فطری قابلیت کے ارتقا اور پختگی کو پہنچنے کی صحیح تصویر صرف سنجیدہ تاریخی اصول تحق بنیاد پر دوبارہ مرتب کی جا سکتی ہے اور اس طرح کے کام کو ہندوستان اور پاکستان میں کہیں اب جا کر کچھ استحکام ملا ہے۔

لیکن اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے کہ سارے مطلوبہ مواد کا صرف ایک حصہ ہی اب تک اکٹھا ہے اور ان بنیادی مخطوطات کی دریافت، جن کی وجہ سے غالب کے بارے میں ہمارے نظریات میں ایسا انقلاب آیا، م صدی کے آغاز اور وسط میں عمل میں آئی۔ پہلا سنسنی خیز واقعہ شہر بھوپال میں، سنہ 1919ء میں مخطوطے کی دریافت تھی قلب ہندوستان میں واقع یہ شہر اپنی تہذیبی زندگی کی گہما گہمی کی وجہ سے ہمیشہ ہی سے شہرت کا حامل رہا ہے، جب کہ اس "شب مالوہ" کی مدح سرائی کرتے رہے ہیں، جس کی خوش آیند ٹھنڈک دن کی کڑی دھوپ کی شدت سے سب کو را پہنچاتی ہے۔ اور اب اس میں، ہندوستان کے اور شہروں کی طرح، لاجواب باغوں اور ڈیوڑھیوں سے ملحق میدانوں کی کھلی کے دوش بہ دوش از منہ وسطیٰ کی یاد دلانے والے محلے بھی ملیں گے، وہ محلے جن کی پہچان ٹیڑھی میڑھی گلیوں کی

بھلیاں ہے، لوگوں سے گنگجاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بازار اور دکانیں ہیں، رکشے اور عہد حاضر کے تمدن کی تازہ ترین ایجاد : سکوٹریں ہیں اور کرائے پر چلنے والے، ناپ اور میٹر سے لیس آٹو رکشا ہیں۔

ان گلیوں میں پہنچ کر، جن میں ایسا لگتا ہے کہ سارا شہر دن رات جیتا اور دنیا کے جھمیلوں سے نپٹتا رہتا ہے، اس تاثر سے چھٹکارا پانا مشکل ہوگا کہ کہیں آپ پریوں کی کہانی کے طلسمات میں تو نہیں آ پہنچے ہیں۔ غیر متوقع طور پر بغیر کھڑکی کی ایک دیوار میں، دو دکانوں کے درمیان جن میں گاہکوں کے مشاہدے کے لیے طرح طرح کا مال آویزاں ہے، ایک خواب آلود، جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے ہوئے باغ میں داخل ہونے کا دروازہ کھلتا ہے۔ کھجور کے درخت آسمان سے باتیں کرتے ہوئے کھڑے ہیں، بوگین ویلیا کی، زرد، گلابی اور بنفشئی رنگ کے درتی پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں گلاب کے پودوں پر جھکی ہوئی ہیں، نارنجی نسترن کی بیل ارغوانی رنگ کے پھولوں والے کسی جنگلی پیڑ سے لپٹی ہوئی ہے۔ فوارے کی چھپل چھپل سنائی دے رہی ہے اور پانی ایک چہار پہلو حوض میں اکٹھا ہو رہا ہے۔ صحن کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے ایوان کی چھت بوسیدہ ستونوں پر قائم ہے۔ ایوان کی طرف کھلنے والے نیم تاریک کمروں میں خنکی اور ایک پر اسرار کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔

یہاں کبھی ایک شاعر رہتا تھا...... مگر غالب نہیں: غالب کو بھوپال آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اس کے باوجود غالب شناسوں کے لیے اس شہر کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں ادبی زندگی کی روایات اب تک مستحکم ہیں۔ "انجمن ترقی اردو" بڑے چاؤ سے شاعرانہ صلاحیت کی سرپرستی کرتی ہے۔ یہاں شام غزل اور مشاعروں کے موقع پر ہزاروں شائقین اکٹھا ہو جاتے ہیں، اور دیکھنے کا سماں ہوتا ہے جب جنوب کی فرحت بخش رات کی مخملی چھتر چھایا تلے، وسیع و عریض میدان میں، روایتی مشرقی انداز میں آلتی پالتی مار کر، شاعری کے شائقین مرد اور خواتین، علاحدہ علاحدہ صف در صف بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ شوخ رنگ کی ساڑیاں، مسلمان خواتین کے سیاہ برقعے اور مردوں کے سفید پیراہن، دھنک کے سبھی رنگوں کی پگڑیاں، جلتے ہوئے عود و لوبان کی بھینی بھینی خوش بو، خنک ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اور شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے جوق در جوق آتے ہوئے لوگ، منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔

یہاں شاعروں کی اپنی "برادری" کے لیے مخصوص شعری محفلوں کا بھی رواج ہے، جہاں وہ اسی طرح سے ایک دوسرے کو اشعار سناتے ہیں، جیسے شاید سو سال پہلے بھی سناتے رہے ہوں گے۔ ایوان کی طرف کھلنے والی بیچی کھڑکیوں والے ایک کشادہ کمرے میں پتھر کے فرش پر شطرنجی بچھی ہوئی ہے۔ شعرا فرش پر اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ عورتیں نہیں ہیں۔ کلام سنانے والا شاعر کمرے کے وسط میں شہ نشین پر اپنی نشست سنبھال لیتا ہے اور جب کلام سنا چکتا ہے تو قد آدم کھڑے ہوئے بغیر جھکے جھکے اپنی پرانی جگہ واپس آجاتا ہے اور شہ نشین پر اس کی نشست اپنا کلام سنانے کے لیے دوسرا شاعر سنبھالتا ہے۔ شاعر اپنا کلام سناتا ہے اور حاضرین دھیمی آواز میں مصرع اٹھاتے ہیں، یعنی اس کا شعر دہراتے ہیں۔ اگر کوئی شعر زیادہ پسند آتا ہے تو واہ واہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ شاعر اظہار تشکر کے طور سے، اپنا ہاتھ پیشانی کی طرف اٹھاتا ہے اور حاضرین کے پسندیدہ شعر کو دو بار اور کبھی کبھی تین بار دہراتا ہے۔ سفید گھنگریالے بالوں والے، روپہلی شیروانی میں ملبوس ایک بنے سنورے خوش وضع شاعر، بڑی تمکنت کے ساتھ شہ نشین پر رونق افروز ہوئے اور انھوں نے غم عشق اور اس کی نامرادیوں اور اپنی دشت نوردی اور آبلہ پائی کے بارے میں اشعار سنانے شروع کیے۔ حاضرین کے جوش و خروش کی کوئی حد نہیں تھی اور واہ واہ کے نعروں کی وجہ سے شاعر کو کئی بار بیچ میں رکنا پڑا۔ اس کے بعد ایک پروفیسر صاحب نے، جو بمبئی سے تشریف لائے تھے، اپنی تقریر میں شاعروں کے کلام کا تنقیدی تجزیہ کیا، اور جیسا کہ حالی کے وقتوں سے ہوتا چلا آیا ہے، مقامی شاعروں کو قصوروار ٹھہرایا کہ ان کے مضامین سب کے سب پرانے، خیالات فرسودہ اور اشعار ناگفتہ بہ ہیں۔

لیکن بھوپال میں، شاعری کے سبھی دل دادہ ہیں اور غالباً قسمت کا لکھا تھا کہ اس شہر میں، رئیس وقت کے بیٹے

فوجدار محمد خاں کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کتب میں، سنہ ۱۹۱۹ء میں غالب کے دیوان، مرقومہ ۱۸۲۱ء کا قلمی نسخہ دریافت ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں اس مخطوطے کی صد سالہ سال گرہ کے موقع پر اسے مفتی محمد انوار الحق نے عبدالرحمن بجنوری کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس اشاعت میں غالب کے ۱۸۴۱ء والے متداول دیوان کے اشعار بھی شامل کیے گئے۔ ریاست بھوپال کے ایک اعلیٰ عہدہ دار محمد حمیداللہ خاں نے اس کام میں بڑی اعانت کی اور انھیں کے اعزاز میں اس مجموعے کو نسخۂ حمیدیہ کا نام دیا گیا۔ مخطوطے کی ابتدا میں فارسی زبان میں حضرت علی کی شان میں ایک طویل قصیدہ تھا (یہ پیغمبر اسلام کے داماد اور چوتھے خلیفۃ المسلمین تھے جن سے اہل تشیع کو خصوصی عقیدت ہے)۔

مخطوطے کے خاتمے پر شاعر کے نام کی مہر تھی، جس پر "اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ" کندہ تھا۔ تاریخ ۱۲۳۱ ہجری یعنی ۱۸۱۶ء کندہ تھی۔ (کاتب غالب نہیں کوئی اور تھے)۔

نسخۂ حمیدیہ میں وہ "دو ثلث" کلام یعنی ۲۶۸ غزلیں شامل ہیں جو ۱۸۴۱ء والے اپنے "دیوان" سے غالب نے حذف کر دی تھیں۔ غزلیات میں شاعر کے دونوں تخلص اسد اور غالب ملتے ہیں۔ اس کی طرف اشارہ مخطوطے کے اختتام کی تحریر میں بھی ملتا ہے۔ "دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب......."

حال حال تک حتمی طور سے یہ کہنا مشکل تھا کہ مرزا نے غالب تخلص کب اختیار کیا۔ بارے ۱۹۶۸ء میں اس کی صحیح تعیین ممکن ہوئی۔ قسمت میں لکھا تھا کہ یہ مسئلہ بھی بھوپال ہی میں حل ہو گا اور ۱۹۶۸ء میں وہاں ایک پرانی کتابوں کی دکان میں خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ ملا۔ اس کے حاشیے پر ۱۲۳۵ ہجری یعنی ۱۸۱۹ء کی کوئی کاروباری عبارت تھی اور اختتام پر یہ تحریر تھی۔

"بہ تاریخ چہار دہم رجب المرجب، یوم سہ شنبہ، سنہ ہجری، وقت دو پہر روز باقی ماندہ فقیر بے دل، اسداللہ خاں، عرف مرزا نوشہ، متخلص بہ اسد، عفی اللہ عنہ، از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ....

(بہ تاریخ چہاردہم رجب المرجب بہ روز سہ شنبہ سنہ ہجری، دو ساعت دوپہر کو فقیر بے دل اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد اپنے دیوان حسرت عنوان کی کتابت سے فارغ ہوا۔)

اس اختتامی تحریر کی خصوصیت اس میں سنہ کتابت کی غیر موجودگی ہے، جو بادی النظر میں "فقیر بے دل" کی بے خیالی کا نتیجہ ہے۔ لیکن چوں کہ باقی تمام معلومات اختتامی تحریر میں درج ہیں تو صورت حال ایسی تباہ کن بھی نہیں تھی۔ اسلامی تقویم متحرک ہے اور بس حساب لگانے کی ضرورت تھی کہ حاشیے میں مذکرہ سنہ ۱۲۳۵ ہجری سے قبل کس سنہ میں رجب کی چار تاریخ بدھ کو پڑی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ سنہ ۱۲۳۱ ہجری (۱۸۱۶ عیسوی) تھا، یعنی وہی سال جب کہ، ہو سکتا ہے کہ خاص طور سے اسی موقع کے لیے، وہ مہر بنوائی گئی تھی، جس کی چھاپ، ۱۲۳۷ ہجری (۱۸۲۱ عیسوی) کے مخطوطے پر تھی۔ (ان دو مخطوطوں کے درمیان کا عرصہ چھ ہجری سالوں کے برابر ہوتا ہے، جب کہ عیسوی تقویم کے حساب سے پانچ سال ہوتے ہیں۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ ایک تو ہجری سال کی مدت نسبتاً کم ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ دوبارہ حساب لگانے کے عمل میں کچھ انحراف بھی ممکن ہے)۔

اس طرح سے غالب کا وہ دیوان اردو دریافت ہوا، جو تمام قاعدوں کے مطابق اس وقت مرتب ہوا تھا، جب شاعر کی عمر انیس سال کی تھی۔ اس میں فارسی کی تیرہ رباعیاں شامل ہیں مگر ایک بھی فارسی غزل نہیں ملے، جس سے مالک رام وثوق کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب اس وقت تک فارسی میں غزلیں نہیں لکھتے تھے ورنہ وہ انھیں بھی اس قلمی نسخے میں شامل کرتے۔ اصل متن کی اردو غزلوں کی کل تعداد ۲۴۰ ہے جن میں کل ۱۵۲۱ اشعار ہیں اور حاشیے پر ۱۲۴ اشعار یعنی

ید ۱۳ غزلیں ہیں، یہ مخطوطے کے مشمولات ہیں۔ ۱۳ فارسی رباعیوں کے علاوہ اس میں گیارہ اردو رباعیاں بھی شامل ہیں۔ لیات میں اسد تخلص استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح سے مرزا کے تخلص کی تبدیلی کی تاریخ ۱۸۱۹ اور ۱۸۲۱ء کے درمیان قرار تی ہے۔

۱۸۲۱ء کے بعد مرزا نے ہمیشہ غالب تخلص استعمال کیا۔ ۱۸۲۹ء میں جب مرزا کلکتے میں تھے، حکام کسی شاعر کی تلاش یں تھے، جس کا تخلص بھی اتفاق سے غالب ہی تھا۔ وہ اپنا تخلص بدل کر جستجو میں لگے ہوئے حکام کی نظروں سے او جھل ہو گیا۔ نہ معلوم کیسے حکام کو یہ شبہ ہوا کہ مرزا غالب ہی وہ شاعر ہیں جس کی انھیں تلاش ہے۔ تب مرزا نے ۱۸۱۹ء کی مہروالا ۱۸۱ء کا ایک مخطوطہ پیش کیا، جس میں ایک ہی تخلص اسد ہے اور اس طرح سے الزام سے اپنی براءت ثابت کی۔

ایک اور مستند قلمی نسخے کا بھی علم ہے، جو نسخہ شیرانی کے نام سے معروف ہے۔ یہ نسخہ محمود خاں شیرانی (متوفی ۱۹۴۶ء) کی ملکیت میں تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے قلمی نسخوں کی ترتیب و تزئین کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ کاتب متن کی گتھی ہوئی ترتیب کا خاص یال رکھتے تھے: کتاب کے صفحے پر چوکھٹے کی شکل کا خط محیط کھینچتے اور متن کی کتابت اس چوکھٹے کے اندر کرتے، باہر حاشیے چھوڑے جاتے۔ تاہم بہ شرط ضرورت جگہ کی کفایت کے خیال سے حاشیوں میں بھی از اول تا آخر اشعار کی کتابت کی جاتی، حاشیوں میں سطریں عموماً ترچھی لکھی جاتیں۔ نسخہ حمیدیہ میں حاشیوں پر بھی عبارت ملتی ہے، جب کہ نسخہ شیرانی میں یہ عبارت چوکھٹے کے اندر اصل متن کے ساتھ ساتھ درج ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اس مخطوطے کی کتابت نسخۂ حمیدیہ کے بعد کی ہے۔

مالک رام کا خیال ہے کہ یہ قلمی نسخہ بہ ظاہر غالب کے کسی قریبی دوست یا رشتہ دار کی ملکیت میں تھا۔ بات یہ ہے کہ اس نسخے کے حاشیوں پر بھی عبارت کا اضافہ کیا گیا ہے۔ تاہم ان میں وہ اشعار درج ہیں جو غالب نے اپنے سفر کلکتہ کے دوران لکھے اور مکتوب الیہ کے پاس بھیجے تھے۔ بعض غزلوں کے نیچے صراحت کی گئی ہے: "مرسلہ از باندہ"۔ کبھی خود غزلیات ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کہاں لکھی گئیں۔ غالب اس نسخے سے واقف تھے۔ بہت سی جگہوں پر غالب کے اپنے ہاتھ کی اصلاحیں ملتی ہیں اور انھیں کے خط میں اس غزل کا بھی اضافہ کیا گیا ہے:

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو جینا تو مرنے کا مزہ کیا

اور بالآخر ۱۹۷۰ء میں غالب کے سب سے پہلے اور گم شدہ سمجھے جانے والے مجموعہ کلام "گل رعنا" کے قلمی نسخے کی اشاعت عمل میں آئی۔ قلمی نسخہ حیدرآباد میں ملا۔ اس میں اردو اور فارسی کلام دونوں شامل ہیں۔ تاہم اگر اردو کلام کی ترتیب دیوان کی طرح ردیف وار ہے تو فارسی کلام میں کسی خاص ترتیب کا التزام نہیں ہے۔ فارسی اشعار بہ ظاہر اس بیاض سے نقل کیے گئے ہیں جس میں جیسے جیسے وہ کہے گئے بغیر کسی خاص ترتیب کے درج کر لیے گئے۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس وقت فارسی کلام کے، دیوان کی شکل میں مرتب کیے ہوئے قلمی نسخوں کا وجود نہیں تھا۔

سنہ ۱۹۵۰ء کے دہے میں مالک رام ہندوستان کی مرکزی حکومت کے ایک محکمہ تجارت میں معمولی سے عہدہ دار تھے ان کے افسر اعلیٰ سید نقی بلگرامی نے اپنے اس نوجوان ماتحت پر، جس کا اوڑھنا بچھونا کلام غالب تھا، اپنی خاص توجہ مبذول کی۔ ایک دفعہ کسی کام سے حیدرآباد روانہ ہوتے ہوئے نقی بلگرامی نے اپنے ماتحت عہدہ دار سے دریافت کیا کہ وہ حیدرآباد سے ان کے لیے کیا لائیں تو مالک رام نے ان سے درخواست کی کہ وہاں کے قدیم باشندوں سے وہاں کے کتب خانوں میں محفوظ، غالب کے قلمی نسخوں کے بارے میں ذرا پوچھ گچھ کریں۔ دکنی تہذیب کے خزانے حیدرآباد کے کتب خانوں اور عجائب

گھروں کے نہاں خانوں میں اب بھی اردو اور فارسی شاعری کے مخطوطوں کے عظیم الشان ذخیرے محفوظ ہیں۔ ان کی تدوین و ترتیب کا کام سالہا سال سے چل رہا ہے لیکن ابھی تک کوئی نہیں جانتا کہ ان ذخیروں کی چھان بین کرنے والوں کو حیرت سے سکتے میں ڈال دینے والی کون سی چیز وہاں ان کا انتظار کر رہی ہے۔ ذاتی کتب خانوں میں تلاش کا کام ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہے۔ اسی لیے بلاشبہ مالک رام کو خاص طور سے حیدرآباد میں کامیابی کی توقع ہو سکتی تھی۔

سفر سے واپسی پر افسر اعلیٰ نے عہدے دار موصوف کو اپنے اجلاس پر طلب کیا، ان کو بیٹھنے کو کہا اور ان کے سامنے میز پر دو کتابیں اوپر تلے رکھیں، ایک کچھ چھوٹی تقطیع کی تھی اور دوسری اس سے کچھ بڑی، اوپر والی بالکل صحیح حالت میں تھی جب کہ نیچے والی کتاب کی حالت کافی سقیم تھی، جلد کا کپڑا بوسیدہ ہو چکا تھا اور اس کے چھوسڑے ہر طرف لٹک رہے تھے۔ آگے مالک رام لکھتے ہیں: "میں نے دونوں کتابوں پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور خاموش ہو رہا۔ فرمایا: میں نے وہاں بعض احباب سے آپ کی فرمائش کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے لیکن میں نے خیال کیا کہ خالی ہاتھ واپس کیا آؤں۔ دادا جان مرحوم کا کتاب خانہ تو، آپ کو معلوم ہے، ان کی وصیت کے مطابق ہم نے عثمانیہ یونیورسٹی اور آصفیہ لائبریری میں تقسیم کر دیا تھا۔ پھر بھی چند کتابیں ادھر ادھر پڑی رہ گئی تھیں۔ انھیں میں سے یہ دو میں آپ کے لیے تحفہ لیتا آیا ہوں۔ (اوپر کی کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے) یہ ان کی ذاتی بیاض ہے۔ خوب خوب شعر ہیں اس میں۔ میں نے کتاب ہاتھ میں لے لی۔ اس میں بیشتر کلام فارسی کے کلاسیکی اساتذہ کا تھا۔ اس کتاب کے اٹھا لینے سے نیچے کی کتاب اب پوری کی پوری نظر آنے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے وسط میں سفید کاغذ کی چپپی لگی ہے جس پر لکھا تھا: متفرق کلام غالب۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اس سے میرے دل میں کوئی کشش نہیں پیدا ہوئی۔ یہی خیال ہوا کہ ان کے دادا جان مرحوم نے غالب کے کلام سے اپنی پسند کے کچھ متفرق اشعار انتخاب کر کے اس میں لکھ لیے ہوں گے۔ میں ابھی بیاض کے ورق الٹ پلٹ رہا تھا کہ کہنے لگے: اس (دوسری کتاب) میں غالب کے شعر بہت غلط لکھے ہیں۔ اس پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ جیسے آنکھوں کے سامنے بجلی کوند جائے: اچانک میرے ذہن میں خیال گزرا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان کے دادا جان نواب عماد الملک مرحوم نے شعر غلط لکھے ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس میں غالب کا ابتدائی کلام ہو۔ چناں چہ میں نے جلدی سے بیاض ہاتھ سے رکھ دی اور وہ پتلی کتاب اٹھالی۔ جوں ہی میں نے اسے کھولا اور خصوصاً آغاز و انجام کے صفحے ایک نظر دیکھے، میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میں کتاب ہاتھ میں لیے فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور بلگرامی صاحب سے اپنے کمرے میں جانے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے جانے کی اجازت تو دے دی، لیکن میری کیفیت دیکھتے ہوئے پوچھا کہ خیر تو ہے، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ خدا معلوم میں نے کیا جواب دیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شاید میں نے ان کی بات بھی پورے طور پر نہیں سنی تھی۔ میں لپک کر کمرے پر آیا اور اپنے چپراسی سے کہا کہ دیکھو، اگر بلگرامی صاحب بلا بھیجیں تو خیر، مجھے اطلاع دے دینا، ورنہ کوئی اور صاحب پوچھیں، تو میں موجود نہیں ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ اب میں نے اطمینان اور احتیاط سے یہ پتلی سی کتاب دیکھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ "گل رعنا" ہے۔ غالب کا اولین انتخاب، جو اب ناپید ہو چکا تھا۔ اس کا وحید قلمی نسخہ میرے ہاتھ میں تھا۔ آپ میری مسرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔"

نقی بلگرامی جسے کتابت کی غلطیاں سمجھ رہے تھے وہ غالب کے اشعار کی دراصل ابتدائی شکلیں تھیں جن سے قارئین ابھی تک واقف نہیں تھے۔ یہ قلمی نسخہ ۱۸۲۸ء سے قبل کا مرتب کیا ہوا نہیں ہو سکتا اور اس طرح سے اس کی مدد سے غالب کی زندگی کے ۱۸۲۲ تا ۱۸۲۸ء چھ اہم سالوں کے بارے میں بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان چار (اور نسبتاً کم اہمیت کے حامل مزید دو) قلمی نسخوں نے اس بنیاد کا کام دیا جس پر غالب کے ابتدائی کلام کی باقاعدہ، ترتیب زمانی کے ساتھ تدوین کا کام اور قابل اعتبار متن کو سامنے رکھتے ہوئے غالب کی شاعری کے ارتقا کا مطالعہ ممکن ہو سکا۔

یہ امر کافی دل چسپی کا باعث ہے کہ کس طرح مرورِ زمانہ کے ساتھ الفاظ کے تعلق سے غالب کے رویے میں تبدیلی آتی ہے اور اپنے تخلیقی سفر کے دو انتہائی اہم سنگ ہائے میل یعنی فارسی شاعری اور اردو شاعری کے اسلوب کی تبدیلی کی طرف ان کی پیش رفت کس نوعیت کی تھی۔

ہم غالب کے ابتدائی کلام کے "عجمی رنگ" کے بارے میں حالی کے الفاظ کا حوالہ دے چکے ہیں۔ بات یہاں صرف اس نظریاتی تسلسل اور تراکیب لفظی کے تواتر کی نہیں تھی جس پر ہم کافی تفصیل سے بحث کر چکے ہیں: اردو کی شعری لفظیات کی خصوصیات کی بدولت غالب کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ایک سے معانی، مضامین اور خیالات کو مختلف "لفظی پوشاکوں" میں پیش کریں، یعنی چاہیں تو فارسی لفظیات کے پورے پورے ٹکڑوں پر مشتمل، فارسی آمیز پوشاک میں یا پھر اردو تراکیب لفظی کے لباس میں۔ کبھی تو ان کے اشعار میں صرف افعال رابطہ سے اردو کا پتہ چلتا ہے اور جب جملہ اسمیہ ہو تو یہ سہولت بھی نہیں رہتی۔ کبھی تو غالب غیر فارسی الاصل اور غیر عربی الاصل اسما کے بعد بالکل خلاف قاعدہ فارسی علامت جمع جوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح کے بہت سے اشعار بعد میں انھوں نے ان کی "فارسیت" کو منطقی نتیجے تک پہنچاتے ہوئے فارسی غزلوں میں شامل کر لیے۔

ان کی وہ اصلاحیں بھی بہت دل چسپ اور معقول ہیں، جہاں پیش نظر مقصد اس کے بالکل برعکس، یعنی بیان کو فطری رنگ دینا ہے۔ اس صورت میں وہ بلند اسلوب کی چھاپ والی تراکیب الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ اردو محاورے اور روزمرہ استعمال کرتے ہیں، مرکب افعال سے پرہیز کرتے ہوئے، فطری بول چال کے لیے مخصوص سادہ افعال کو ترجیح دیتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ افسوس ہے کہ یہاں ہم اس موضوع پر مزید روشنی نہیں ڈال سکتے، اس پر علاحدہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ غالب کے ابتدائی کلام کو شاعر کی شخصیت اور ان کے انوکھے اور لاجواب فن شعر کی تشکیل کے ایک مرحلے کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ پاکستانی محقق سید فیاض محمود غالب کے اس تخلیقی دور کے بارے میں لکھتے ہیں: "اس معاشرے میں، جہاں نفاست اظہار کو قادر مطلق کا درجہ حاصل تھا، جہاں کرم خوردہ خیالات کی بھڑکیلے لباس میں نمائش کو مستحسن سمجھا جاتا تھا اور جہاں جذباتی طرز خیال پر پابندی تھی، غالب کے پاس وجد کیف آور اور کافرانہ زندہ دلی سے دست بردار ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ بھی تاسف کی بات ہے کہ انھوں نے انسانی نفسیات کے تاریک گوشوں کا مطالعہ بھی ترک کر دیا، جہاں خدا اور سماج کی چکیاں روح انسانی کو پیس کر خاک کر دیتی ہیں۔ بہرحال اردو میں تو انھوں نے اس موضوع پر لکھنا بند کر دیا۔ مزید برآں انھوں نے یہ مان لیا کہ ظہوری نظیری سے بہتر ہے اور یہ کہ عبارت کا عام فہم ہونا غور و فکر پر مجبور کرنے والے تجربے سے بہتر ہے۔ اپنی اس قلب ماہیت کی بدولت انھیں ہزاروں مداح تو مل گئے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا واقعی یہ اردو شاعری کی اتنی بڑی خوش قسمتی تھی، جتنا کہ عام طور سے باور کرایا جاتا ہے۔"

نتالیا پری گارنا

پیدائش 8/ مئی 1934ء بہ مقام ماسکو
1956ء میں ماسکو یونیورسٹی کی لسانیات کی فیکلٹی کے شعبہ ایران شناسی سے بہ حیثیت ماہر لسانیات و مستشرق سند تکمیل حاصل کی۔
1960ء سے روسی سائنسی اکادمی کے ادارہ شرقیات میں برسر کار ہیں۔
1967ء میں آپ کو تحقیقی مقالے "محمد اقبال کی فلسفیانہ غنائی شاعری کے چند پہلو۔ (بہ حوالہ "پیام مشرق") پر پی ایچ - ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔
متعدد بین الاقوامی علمی مجالس اور مذاکروں میں شرکت کی ہے۔ مثلاً 1972ء میں تاریخ ادبیات مشرق کے موضوع پر وارسا (پولینڈ) میں منعقدہ مذاکرہ، 1983ء میں بہ مقام ٹوکیو (جاپان) CISHAAN کی اکتیسویں علمی مجلس، 1985ء میں دہلی (ہندوستان) میں منعقدہ غالب مذاکرہ، 1985ء میں "ہندوستان اور عالمی ادب" کے موضوع پر دہلی میں منعقدہ مذاکرہ، 1985ء میں کلکتے (ہندوستان) میں منعقدہ اساتذہ فارسی ادبیات کی کل ہند کانفرنس، 1991ء میں قرطبہ (ہسپانیہ) میں "قرطبہ میں اقبال" کے موضوع پر منعقدہ بین الاقوامی مجلس اقبال۔
تحقیقی کام کا بنیادی موضوع ہندوستان کا فارسی ادب اور ادبیات اردو ہے۔
مطبوعہ علمی تصانیف: "محمد اقبال کی شاعری (1900 تا 1924ء)"، ماسکو، 1972ء "کلام اقبال کی شعریات"، ماسکو، 1987ء، "مرزا غالب"، ماسکو، 1986ء، علمی تصنیف "سبک ہندی اور فارسی ادبیات میں اس کا مقام" مکمل ہو چکی ہے۔
ڈاکٹر محمد اقبال، مرزا غالب، حافظ شیرازی اور امیر خسرو دہلوی کے بارے میں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ متعدد کتابوں اور مجموعوں کی ترتیب و تدوین کی ہے۔ مثلاً "کلام اقبال"، ماسکو، 1982ء، "تصوف، اسلامی تہذیب کے تناظر میں"، ماسکو، 1989ء، "باغ گل یکتا"، ماسکو، 1991ء۔
تراجم "مرزا غالب۔ انتخاب"، ماسکو، 1980ء، پیش لفظ اور حواشی از نتالیا پری گارنا، ترجمہ کلام علی ایف اور گلیوف کی شرکت میں۔

نوٹ

ہم محترمہ نتالیا پری گارنا کے شکر گزار ہیں کہ ہماری درخواست پر انھوں نے اپنے علمی مشاغل کے بارے میں ضروری تفصیلات فراہم کیں۔ محترمہ کے جس مکتوب کے ساتھ ہمیں یہ تفصیلات موصول ہوئی ہیں اس میں انھوں نے یہ جاننے کی بھی خواہش ظاہر کی کہ قارئین "سب رس" کی ان کی تصنیف "مرزا غالب" کے بارے میں کیا رائے ہے۔ کتاب کے کل چودہ میں سے سات باب بالاقساط قارئین "سب رس" کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ بہت سے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور اردو ادبیات کے فاضل اساتذہ نے اس منفرد تصنیف کے مندرجات کے بارے میں دوران گفتگو بہت اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اگر وہ اپنے ان خیالات کو ضبط تحریر میں لائیں اور تبصرہ ہمارے پاس بھیجیں تو اس کی ایک نقل مصنفہ کتاب کے پاس ان کی خواہش کے مطابق ارسال کی جائے گی۔ خاص طور پر اس لیے کہ محترمہ کتاب کے اردو ایڈیشن میں کچھ اضافے اور تبدیلیاں کرنا چاہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر قارئین "سب رس" کے گراں قدر خیالات اور مشوروں کو بھی ملحوظ رکھیں گے۔

معذرت۔ کتاب غالب کا ساتواں باب گزشتہ شمارے میں شائع کیا گیا۔ چھٹا باب سہوا چھوٹ گیا تھا وہ اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

***

مغنی تبسم

کیفی اعظمی کا شعری سفر

(جھنکار سے آوارہ سجدہ تک)

کیفی اعظمی نے جس زمانے میں شعر کہنا شروع کیا، ترقی پسند شعرا کی پہلی نسل منظر عام پر آچکی تھی۔ یہ وہ شعرا تھے جو آغاز شعر گوئی میں اختر شیرانی، جوش اور کسی حد تک اقبال سے متاثر تھے۔ ان کی عشقیہ شاعری اختر شیرانی کے رنگ میں رچی ہوئی تھی۔ اس عشق میں ارضیت کے ساتھ افلاطونی عشق کی ماورائیت بھی شامل تھی۔ ان کی منظریہ اور سیاسی نظموں پر جوش کی چھاپ تھی۔ کہیں کہیں اقبال کی لفظیات در آئی تھی۔ اختر شیرانی کے اثر سے وہ جلد نکل گئے لیکن جوش اور اقبال کا اثر تا دیر قائم رہا۔ کیفی اعظمی نے اختر شیرانی کا کچھ اثر بالواسطہ طور پر قبول کیا۔ جوش اور اقبال سے وہ براہ راست متاثر رہے اسی کے ساتھ انھوں نے انیس کا اثر کچھ تو براہ راست اور کچھ جوش کی وساطت سے قبول کیا جوش کے اسلوب کی بعض خصوصیات ان کی منظر کشی اور تشبیہ نگاری میں جھلکتی ہیں۔ لیکن جوش کی لفظیات سے انھوں نے کم کم ہی استفادہ کیا ہے۔ وہ گھن گرج بھی ان کے کلام میں کم ملتی ہے جس سے جوش کا لہجہ پہچانا جاتا ہے۔

کیفی کی شاعری میں ابتدا ہی سے زبان کے استعمال کا ایک خاص سلیقہ دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے علوم مشرقیہ کی تحصیل کی تھی جس میں کلاسیکی ادب اور شاعری کا مطالعہ شامل تھا۔ زبان کی صفائی اور پختگی، روانی اور نغمگی، لفظوں کی خوش آہنگ و روبست اور صناعت اسی مطالعے کی دین تھی۔ کیفی کو ابتدا ہی سے اظہار کے نئے پیرایوں کی جستجو رہی جس میں زبان سازی کا عمل شامل ہے۔ اس کا کسی قدر اندازہ ان کی وضع کردہ تراکیب سے لگایا جاسکتا ہے۔ جیسے: چشم قبول، ولولۂ سنگ، دامن قصد تبسم، ضعف عشرت، مذاق تفریق، نشاط بے حسی وغیرہ۔ کیفی کو صنعتوں کے استعمال سے بھی شغف رہا۔ بالخصوص ایسی صنعتیں جن سے الفاظ کی تکرار کلام میں زور اور نغمگی پیدا کرتی ہے۔

بطور نمونہ چند شعر ہیں:

میرا ہی عکس حسن ہے یہ میرے گھر کی چاندنی
اے میرے گھر کی چاندی لے کے یہ چاندنی نہ جا
دیدہ نیم باز میں خواب جواں ہے لالہ کار
نیند پکڑ رہی ہے پاؤں نیند میں جھومتی نہ جا

شکستہ شکستہ یہ رنگ مسرت
چکیدہ چکیدہ یہ اشک زلالی
پریدہ پریدہ یہ چہرے کی رنگت
رمیدہ رمیدہ یہ رخ کی بحالی

ان کی دنیا میں سبھی کچھ ہے مصیبت کے سوا
میری دنیا میں مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

ایک دل کش معنی آفریں صنعت قطار البعیر کا جھنکار کی نظموں میں کئی جگہ انھوں نے استعمال کیا ہے۔ اس صنعت میں پہلے مصرعہ کے آخر میں جو لفظ آتا ہے دوسرے مصرع کا آغاز اسی لفظ سے کیا جاتا ہے اور اس تکرار کے ذریعے مضمون کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ کہیں کہ قدرے انحراف کرتے ہوئے پہلے مصرع کے آخری لفظ سے دوسرا مصرع شروع کرنے کی بجائے پہلے مصرع کے آخری حصے میں آنے والے لفظ کو دوسرے مصرع کے ابتدائی حصے میں دوہرایا ہے اور اس کے ذریعے پہلے مصرع کے مضمون کو ترقی دی ہے:

زمیں دہلی ، ابھر آئے دفینے
دفینوں کو ہوا ٹھکرا رہی ہے

دھنک کی رنگین دھاریوں پر بھی ڈال دی تھی گھٹا نے چادر
گھٹا کی چادر میں بھی کھلتی ہوئی دھنک جگمگا رہی ہے

اور سب کچھ ہے تم نہیں لیکن
تم نہیں ہو تو کچھ نہیں پیارے

ان اشعار میں صنعت قلب کا اعجاز بھی شامل ہے اور ایسی صناعت بھی ہے جس کی علم بدیع میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ یعنی یہ کہ صنعتوں کا استعمال بھی تخلیقی سطح پر ہوا ہے۔

کیفی نے قول متناقض (PARADOX) کو ابتدا ہی سے ایک پیرایۂ اظہار بنایا ہے اور اس سے کہیں طنز نگاری اور کہیں ملی جلی متضاد کیفیات کی پیکر تراشی کا کام لیا ہے۔ اس پیرایۂ اظہار کا نمونہ وہ وصفی مرکبات ہیں جو کیفی نے اختراع کیے ہیں: بجھی ہوئی آندھی۔ خوشتر بھیڑیں۔ یخ بستہ بجلی۔ چنچل جھجک۔ تعمیری تباہی۔ نور افزا سیاہی۔ تشنہ سمندر۔ سیم ریز و خزاں پاش بہار۔ تاریک چمک۔ زندہ میت۔ وغیرہ۔

محاکات نگاری اور پیکر تراشی ابتدا ہی سے کیفی کے اسلوب کا نمایاں وصف رہے ہیں۔ انھوں نے بصری، سمعی اور لمسی پیکروں کے علاوہ حرکی پیکروں سے بطور خاص کام لیا ہے جن کی وجہ سے ان کی نظموں میں اکثر ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی۔ جامد مرقع ان کے ہاں بہت کم ملیں گے۔ کیفی کی شاعری میں یہ وصف آپ کو ہر جگہ دکھائی دے گا۔ جھنکار کی نظموں سے چند مثالیں پیش ہیں:

سلونے ہونٹوں کی لرزشوں میں تھی پر فشاں روح میکدے کی
نظر کی سرشاریوں میں تخئیل سا مری تھر تھرا رہی تھی
کبھی نظر سے نظر ملا کر۔ کبھی نظر سے نظر بچا کر
ڈبو رہی تھی، مٹا رہی تھی، پلا رہی تھی، چھکا رہی تھی

(آوارہ نغمہ)

تیزی سے جنگلوں میں اڑی جارہی تھی ریل
خوابیدہ کائنات کو چونکا رہی تھی ریل
مڑتی ، اچھلتی ، کانپتی ، چنگھاڑتی ہوئی
کہرے کی وہ دبیز روا پھاڑتی ہوئی
پہیوں کی گردشوں میں مچلتی تھی راگنی
آہن سے آگ بن کے نکلتی ہوئی راگنی

(کہرے کا کھیت)

گونجے ترانے صبح کا اک شور ہوگیا
عالم تمام رس میں شرابور ہوگیا
پھولی شفق فضا میں حنا تلملا گئی
اک موج رنگ کانپ کے عالم پہ چھاگئی
چھوڑا سحر نے تیرگی شب کو کاٹ کے
اڑنے لگی ہوا میں کرن اوس چاٹ کے

(دوشیزہ مالن)

یہ سیہ فام چمنی سے اٹھتا دھواں
کارخانے کا ڈھلا ہوا آسماں
ابر کی طرح گردوں کے لب چومتا
اژدہے کی طرح اینڈتا جھومتا
لوں کی مانند دامن جھٹکتا ہوا
زہر بن کر فضا میں چھلکتا ہوا
بجلیاں آستیں میں سنبھالے ہوئے
بوجھ سا دوش ہستی پہ ڈالے ہوئے

(دھواں)

کیفی نے اردگرد کی زندگی کے مشاہدات، خارجی تجربات اور داخلی واردات سے اپنی شاعری کے موضوعات تراشے ہیں اور انھیں فن کاری کے ساتھ نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے زندگی کو خانوں میں نہیں بانٹا۔ ان کا ایک خاص زاویۂ نگاہ اور طرز احساس ہے جو زندگی کے متنوع پہلوؤں اور گوناگوں تجربوں کو باہم مربوط کرتا ہے۔ جھنکار، کی شاعری کا واحد متکلم (Protagonist) ایک ایسا نوجوان

ہے جس کا جمالیاتی شعور بیدار ہے۔ وہ فطرت کے جمال اور نسائی حسن کی جلوہ طرازیوں سے مسحور ہوتا ہے اور جب وہ عام انسانوں کی زندگی پر نظر ڈالتا ہے تو وہ حسن اسے وہاں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ایک حسین اور خوش حال معاشرے کا خواب دیکھتا ہے جس میں سماجی اور معاشی نابرابری، محنت کا استحصال اور جبر واستبداد نہ ہو۔ وہ سماج کو بدلنا چاہتا ہے اور اس کے لیے سیاسی جدوجہد کا راستہ اپناتا ہے۔ وہ خود عمل بھی کرتا ہے اور فن کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہاں پہنچ کر خیال حسن اور حسن عمل ایک ہو جاتے ہیں اور "عورت" جیسی نظم تخلیق پاتی ہے۔ وہ محبوبۂ دل نواز کو محض ایک حسینہ کے روپ میں نہیں دیکھتا بلکہ وہ ہندوستان کے قدامت پسند پدرسرانہ سماج میں پروان چڑھنے والی ایک عورت ہے جس کو اس کے بہت سے انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی محبوبہ صحیح معنوں میں رفیقۂ حیات بنے اور جہد حیات میں اس کا پوری طرح ساتھ دے۔ کیفی اس نظم میں عورت کو اس کی انفرادی ہستی کا احساس دلاتے ہوئے سماج سے بغاوت کی ترغیب دیتے ہیں۔ انھوں نے اقبال ہی کی لفظیات استعمال کرتے ہوئے ان کے فرسودہ تصورِ زن پر ضرب لگائی ہے:

توڑ یہ عزم شکن دغدغۂ پند بھی توڑ
تیری خاطر ہے جو زنجیر وہ سوگند بھی توڑ
طوق یہ بھی ہے "زمرد کا گلوبند" بھی توڑ
توڑ پیمانۂ مردان خرد مند بھی توڑ
بن کے طوفان چھلکنا ہے، ابلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تو فلاطون وارسطو ہے تو زہرا پرویں
تیرے قبضے میں ہے گردوں تری ٹھوکر میں زمیں
ہاں اٹھا، جلد اٹھا پائے مقدر سے جبیں
میں بھی رکنے کا نہیں وقت بھی رکنے کا نہیں
لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

یہ نظم ایک طرح سے آزادیِ نسواں کی تحریک کا اعلان نامہ ہے۔ یہ تحریک کوئی ساٹھ ستر برس پہلے شروع ہوئی تھی لیکن آج بھی عورت کی سماجی حیثیت میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ نظم آج کے حالات سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ اس کی اثر انگیزی کم نہیں ہوئی۔ اس کے قطع نظر شعری اور فنی محاسن کی وجہ سے یہ ایک زندہ رہنے والی نظم ہے۔

"جھنکار" میں دیگر سماجی اور سیاسی موضوعات پر بھی نظمیں شامل ہیں۔ کیفی اعظمی آغاز شعر گوئی ہی سے اشتراکی نظریے اور ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ وہ طلبہ تحریک سے وابستہ رہے اور سیاسی جدوجہد میں عملی حصہ لیا۔ انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی اور نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے سرمایہ داری، سامراجیت اور فاشزم کے خلاف نظمیں لکھیں اور اپنے مخصوص انداز میں جلسوں اور مشاعروں میں سنائیں۔ اس وقت یہ نظمیں دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ بعض نظمیں اپنی کشش کھو چکی ہیں لیکن چند نظمیں اپنے شعری محاسن کی وجہ سے ہماری توجہ کو کھینچتی ہیں اگرچہ کہ ان کے موضوعات فرسودہ ہو چکے ہیں۔

جھنکار کی اشاعت کے تین سال بعد کیفی کا دوسرا مجموعۂ کلام "آخرِ شب" شائع ہوا۔ آغاز میں عشقیہ اور رومانی نظمیں شامل کی گئی ہیں یہ سدا بہار نظمیں ہیں۔ حسن کی والہانہ تحسین کے ساتھ جذبات عشق کے بے ساختہ اظہار نے ان نظموں میں خاص کیفیت سمودی ہے۔ نادر تشبیہوں، تازہ استعاروں اور صفات و متعلقات فعل کے ذریعے پیکر تراشی کا عمل، الفاظ کی رعایت اور قول متناقض کے استعمال سے شعر کو معنی خیز بنانا، تکرار الفاظ کے ذریعہ نغمگی پیدا کرنا، اور صنعت تتابع اور صنعت قطار البعیر کی لحاظ کاری، یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی نشان دہی ہم جھنکار کی شاعری میں کر چکے ہیں۔ "آخرِ شب" کی شاعری بالخصوص عشقیہ نظموں میں زیادہ نکھار آگیا ہے۔ زبان کا استعمال بھی زیادہ خلاق کے ساتھ ہوا ہے۔ تفصیلی تجزیے سے گریز کرتے ہوئے مختلف نظموں کے چند منتخب شعر بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں جن میں کیفی کے اسلوب کی متذکرہ بالا خصوصیات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے:

کلی کا روپ ، پھول کا نکھار لے کے آئی تھی
وہ آج ، کل خزانۂ بہار لے کے آئی تھی
جبین تابناک میں کھلی ہوئی تھی چاندنی
وہ چاندنی میں عکس لالہ زار لے کے آئی تھی
وہ سادہ سادہ عارضوں کی شکریں ملاحتیں
ملاحتوں میں سرخیٔ انار لے کے آئی تھی
وہ گاتی گنگناتی نوجوانی کی خوشیاں
خوشیوں میں وقت کی پکار لے کے آئی تھی

(ملاقات)

جاگ اٹھی ہے فطرت فن کار
اب کدھر جا رہی ہے جان بہار
میری تصویر کھینچتا ہے مجھے
اور آہستہ اے خنک رفتار
بیل جاتی ہوئی منڈیروں پر
دھوپ چڑھتی ہوئی سر دیوار
پھول سے جسم پر سفید لباس
چاندنی اوڑھ کر کھڑی ہے بہار

(نقش و نگار)

جھک گئی ہوگی جواں سال امنگوں کی جبیں
مٹ گئی ہوگی مہک ڈوب گیا ہوگا یقیں

چھا گیا ہوگا دھواں گھوم گئی ہوگی زمیں
اپنے پہلے ہی گھروندے کو جو ڈھایا ہوگا

اس نے گھبرا کے نظر لاکھ بچائی ہوگی
مٹ کے اک نقش نے سو شکل دکھائی ہوگی
میز سے جب مری تصویر ہٹائی ہوگی
ہر طرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہوگا

(اندیشے)

"آخرِ شب" میں زیادہ تر نظمیں سیاسی ہیں جن کے موضوعات اس دور کی ملکی اور عالمی سیاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تہہ میں اپنے وطن کو آزاد اور خوش حال دیکھنے کی تمنا اور دنیا کو سرمایہ داری، سامراجیت اور فاشزم سے نجات دلانے کا جذبہ کارفرما ہے۔ ان نظموں کا تخلیقی رویہ عشقیہ نظموں سے مختلف ہے۔ یہاں ان کے مخاطب عوام اور قومی رہنما ہیں جنھیں وہ فوری طور پر متوجہ اور متاثر کرنا چاہتے ہیں ان نظموں میں غنائیت کی جگہ خطابت نے لے لی ہے۔ انھیں پڑھتے ہوئے ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور فاشزم کے خلاف روس اور اتحادی طاقتوں کی لڑائی کے مختلف موڑ نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان نظموں میں خالی خولی نعرہ بازی نہیں ہے بلکہ گہری دردمندی ہے جو کبھی طنز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان میں سے بیش تر نظمیں اب تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں اور ان کی تاثیر کم ہو گئی ہے۔ اپنی شاعری کے جواز میں اور اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیفی اعظمی نے ایلیا ایہرن برگ کا جو قول نقل کیا ہے اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا:

"ایک ادیب کے لیے یہی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لیے ہو۔ اسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی چاہیے جو صرف ایک لمحے کے لیے ہو اگر اس ایک لمحے میں اس قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔"

کیفی اعظمی کا تیسرا مجموعۂ کلام "آوارہ سجدے" ہے جسے شائع ہوئے بیس برس گزر چکے ہیں۔ "آوارہ سجدے" اور "آخرِ شب" کے درمیان تیس برس کا طویل وقفہ ہے۔ اس عرصے میں ملک کے سیاسی حالات اور عالمی سیاست میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے زبردست ترقی کی جس نے زندگی کے دھارے کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ علوم و فنون اور فکر و فلسفہ کی بنیادیں تبدیل ہو گئیں۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد سیاسی سطح پر بڑی اتھل پتھل ہوئی۔ کمیونسٹ پارٹی نے مسلح جدوجہد کانگریسی حکومت کے خلاف بھی جاری رکھی اور کچھ عرصہ بعد جمہوریت کا راستہ اپنایا۔ پھر کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی۔ جو نسل آزادی کی جدوجہد میں شریک تھی اور جس نے آزادی کے بعد ملک میں اشتراکی انقلاب کے خواب دیکھے تھے اسے سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑا۔ کمیونسٹ پارٹی اگر متحد رہتی تو ملکی سیاست میں اہم رول ادا کر سکتی تھی اور اشتراکی نصب العین کے حصول میں جلد یا بدیر کامیاب ہوتی۔

کمیونسٹ پارٹی کے انتشار سے کیفی بہت دل گیر ہوئے۔ نظم "آوارہ سجدے" میں انھوں نے اپنے احساسات کو موثر انداز میں پیش

کیا ہے۔ یہ اہم بات ہے کہ انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام بھی "آوارہ سجدے" رکھا۔ اس مجموعے کی نظموں میں خارجی، بیانیہ اور خطیبانہ اظہار کی کچھ ہی باقیات رہ گئی ہیں۔ چند نظموں میں کیفی کا اسلوب بالکل بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ ان میں برہنہ حرف گوئی کی جگہ ایمائیت اور اشاریت نے لے لی ہے۔ اس کی عمدہ مثال نظم "مکان" ہے جس میں انسانی ارتقا کی مختلف منزلوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ یہ نظم نعرہ بازی کے بجائے شعور کو بیدار کرتے ہوئے بغاوت پر اکساتی ہے۔ مقصدیت اپنی جگہ اس سے ہٹ کر یہ ایک ایسا فن پارہ ہے جو اپنی آزاد جمالیاتی قدر بھی رکھتا ہے۔ کسی سیاسی یا نظریاتی وابستگی کے بغیر بھی اس کی تحسین کی جا سکتی ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہوں:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند اور بلند، اور بلند
بام و در اور ذرا اور سنوارے ہم نے

نظم کی بڑی خوبی اس کا دلکش ایمائی اظہار ہے جس سے ابہام کا حسن پیدا ہوا ہے۔ ابہام ایسا نہیں کہ باذوق قاری کی فہم سے بالا ہو۔ پہلے بند کے تیسرے مصرع نے ساری نظم میں ڈرامائی کیفیت پیدا کر دی ہے:

سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو

اس مصرع کو پڑھ کر فٹ پاتھ کا سارا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ بھی کہ ایک شخص ان سے مخاطب ہے اور انھیں اٹھنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ "اٹھو" یہاں ذو معنی ہے۔ اٹھنا یعنی نیند سے بیدار ہونا اور اٹھنا کھڑا ہونا۔

"آوارہ سجدے" کی دیگر کئی نظموں میں بھی کیفی اعظمی کا تخلیقی رویہ اور اسلوب بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ نظم "عادت" ایک ڈرامائی تمثیل ہے جس میں یوسف اور زلیخا کے کرداروں کو علامت کا روپ دیا گیا ہے۔ نظم کا ابہام غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور ایک سے زیادہ رد عمل کی گنجائش فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح نظم "دائرہ" علامتی اظہار کا عمدہ نمونہ ہے جس میں پر لفظ لغوی سطح سے ہی نہیں بلکہ استعاراتی حد بندیوں سے بھی باہر نکل آتا ہے۔ ریت، دھوپ، سایہ، سراب، زلزلہ، قوس، پیمانہ، مسجد، میخانہ، سمندر، قطرہ، رام اور راون یہ سب

علامتیں معانی کا ایک نیا جہاں آباد کرتی ہیں ۔ نظم میں اظہار کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ بہت سی باتیں بین السطور بیان کر دی گئی ہیں ۔ ذ
کے اقتباس سے اس بیان کی کسی قدر وضاحت ہو جائے گی:

روز بڑھتا ہوں جہاں سے آگے
پھر وہیں لوٹ کے آجاتا ہوں
بارہا توڑ چکا ہوں جن کو
انھیں دیواروں سے ٹکراتا ہوں
روز بستے ہیں کئی شہر نئے
روز دھرتی میں سما جاتے ہیں
زلزلوں میں تھی ذرا سی گرمی
وہ بھی اب روز ہی آجاتے ہیں

جسم سے روح تلک ریت ہی ریت
نہ کہیں دھوپ نہ سایہ نہ سراب
کتنے ارمان ہیں کس صحرا میں
کون رکھتا ہے مزاروں کا حساب

نبض بجھتی بھی بھڑکتی بھی ہے
دل کا معمول ہے گھبرانا بھی
رات اندھیرے نے اندھیرے سے کہا
ایک عادت ہے جیے جانا بھی

بہروپنی ، دوسرا طوفان ، ابن مریم اور گرہھ وتی وغیرہ بھی اسی قبیل کی نظمیں ہیں جن میں علامت نگاری کے ساتھ اساطیر کی باز تخلیق
گئی ہے ۔ کیفی کا یہ ایک نیا اور منفرد اسلوب ہے جس سے ان کی شاعری میں نئی جہت کا اضافہ ہوا ہے ۔

○ ○ ○ ○ ○ ○

راشد آذر

کیفی اعظمی کا شعری آہنگ

کیفی اعظمی کے شعری آہنگ کو سمجھنے کے لیے ان کے تین مجموعے "جھنکار"، "آخر شب" اور "آوارہ سجدے" کافی نہیں ہیں۔ اس کے لیے وہ سارا کلام بھی ضروری ہے جو انھوں نے لکھا، لیکن ان تینوں مجموعوں میں شامل نہیں کیا۔ ان کے کلام کو ادوار میں تقسیم کرنا گمراہ کن ہوگا کیوں کہ وہ آہنگ جو "جھنکار" میں ملتا ہے، اس کی جھلکیاں "آخر شب" میں نکھری ہوئی شکل میں ملتی ہیں اور "آوارہ سجدے" میں بھی۔ یکایک تبدیلی یا اپنے تخلیقی آہنگ سے انحراف کی کوئی جھلک کیفی کے کلام میں نہیں ملتی۔ "آوارہ سجدے" کیفی کے "آخر شب" کے بعد کے کلام کا نمائندہ مجموعہ نہیں ہے کیوں کہ اس میں بعض ایسی نظمیں نہیں ہیں جن میں ان کے کلام کی پہچان کے نقوش ہیں۔ شاید اسی لیے "آخر شب" اور "آوارہ سجدے" میں سرسری طور پر اور سطحی انداز سے پڑھنے والے قاری کو فاصلے کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک کا آہنگ دوسرے سے مختلف ہے لیکن بغور مطالعہ کریں تو وہ خصوصیات جو "جھنکار" میں ملتی ہیں وہ "آخر شب" میں بھی ہیں اور "آوارہ سجدے" میں بھی۔ مثلاً سیاسی رہنماؤں اور قائدین پر جو تنقید ہم کو "جھنکار" میں ملتی ہے، "آخر شب" میں بھی ہے اور "آوارہ سجدے" میں بھی۔ وہی حسیاتی (SENSUOUS) عنصر جو "جھنکار" میں ہے وہ "آخر شب" میں بھی ہے اور "آوارہ سجدے" میں بھی۔ وہی علامتی پیکر تراشی کے پہلو بہ پہلو راست طرزِ اظہار جو "جھنکار" میں ہے وہ "آخر شب" میں بھی ہے اور "آوارہ سجدے" میں بھی۔ سیاسی شعور کی پختگی جو "جھنکار" میں ہے وہ "آخر شب" میں بھی ہے اور "آوارہ سجدے" میں بھی۔ کیفی کی شاعری کے ان پہلوؤں پر تبصرہ کرتے وقت میں مثالوں سے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کروں گا۔ یہاں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ فکر و عمل، حسن و انقلاب، عقل و جنوں، خیالات و جذبات، سیاست و محبت، عاشق و معشوق کا ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہونا، کیفی کی شاعرانہ بصیرت کے اہم اجزا ہیں۔

کیفی پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کی بیش تر شاعری بیانیہ ہے اور وضاحت ان کی شاعری کا کمزور پہلو ہے۔ یہ الزام کیفی کی چند نظموں پر ضرور لگایا جاسکتا ہے اگر نقاد ان کی شاعری کو اپنی سطح ادراک سے پرکھنے کی کوشش کرے، لیکن کیفی کی نظر میں ان کی نظموں کو عالمانہ سطح اور منطق اور جمالیات کی بنیادوں پر جانچنے والا قاری کبھی نہیں رہا۔ ان کے سامنے ہمیشہ جذباتی سطح پر ڈرامائی انداز سے محسوس کرنے والا قاری رہا ہے، اس لیے ان کی شاعری پڑھنے سے زیادہ سننے کی شاعری رہی اور کاغذ پر لکھے جانے سے زیادہ ڈرامائی تخاطب کا وسیلہ رہی۔ بقول میر انیس

بزم کا رنگ جدا، رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے، زخموں کا گلستاں ہے جدا

کیفی کے سامنے عورت کی محبت کا باعمل پہلو بھی رہا ہے اور سیاست کی رزم گاہ بھی اور بار بار ان کا انداز تخاطب ڈرامائی انداز سے ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

تمھارے ہمراہ فتح و نصرت، تمھارے قدموں میں کامرانی
مجاہدو ، وہ ہے راجدھانی
(آوارہ سجدے۔ تلنگانہ)

سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی
(آوارہ سجدے۔ مکان)

اٹھو ، دیکھو ، وہ آندھی آرہی ہے
(جھنکار۔ آندھی)

لے ، وہ چھوٹے جی ، وہ اکھڑے پاؤں ، وہ ٹوٹا حصار
لے ، وہ پھینکے اسلحے ، وہ بھاگ نکلے حیلہ کار
وہ پھٹے بادل دھوئیں کے ، وہ جھکا ظلمت کا
لال پرچم جھلملایا ، وہ ، فضا کے دوش پر
ہاں ، وہ گونجی ، ہاں وہ چھائی فتح و آزادی کی لے
دیکھ یہ جراءت ، یہ پامردی ، یہ استقلال ہے
(جھنکار۔ استقلال)

دیکھ اے جوشِ عمل ، وہ سقف ، یہ دیوار ہے
ایک روزن کھول دینا بھی کوئی دشوار ہے
(آخرِ شب۔ تلاش)

اس طرح کے اندازِ تخاطب کے لیے ہاتھ کا اشارہ ایک اہم ضرورت بن جاتا ہے اور اس طرح کے کلام کا مخاطب آرام کرسی پر بند کمرے میں چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے بیٹھنے والا نہیں بلکہ وہ عوام ہیں جو زندگی کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں عملی طور پر مصروف ہیں۔

"مجاہدو، وہ ہے راجدھانی۔"

یلغار پر اکسانے کی بہترین مثال ہے۔ اسی طرح مندرجہ بالا مثالوں میں دعوت عمل اور خصوصاً انقلابی عمل پر اکسانے کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں جن کی ڈرامائی اہمیت قابل غور ہے۔ کیفی کی شاعری کے اس ڈرامائی اندازِ تخاطب پر شاید بہت کم نقادوں نے لکھا ہے۔ یہ ڈرامائی اندازِ بیان میر انیس کے گہرے اور ناقدانہ مطالعے سے کیفی نے حاصل کیا ہے اور اسے ایک نئے انداز سے اپنایا اور برتا ہے۔

قائدین اور رہنماؤں پر تنقید کا جو انداز "جھنکار" کی نظموں میں ملتا ہے وہ نکھرے ہوئے طنز کے ساتھ "آخرِ شب" اور "آوارہ سجدے" میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ طنز "جھنکار" میں "لیڈر کی آمد" میں، "آخرِ شب" میں "سپردگی"، "قوم حکمران"، "تاریکی میں" اور "ناقص بھرتی" جیسی نظموں میں اور "آوارہ سجدے" میں "لینن" میں پوری طرح ابھر کر آتا ہے۔

کیفی کا سیاسی شعور ان ہی مراحل سے گزرا ہے جن مراحل سے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا سیاسی شعور مجموعی طور گزرا ہے لیکن اور شعرا کے مقابلے میں کیفی نے صاف طور پر سبھاش چندر بوس کی سیاسی دریوزہ گری کی مخالفت اپنی نظم "بر کا چاول" اور "قطعہ" میں کی ہے جو "جھنکار" میں ہیں۔ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ کیفی واحد شاعر ہیں جنھوں نے سمجھا

چندر بوس کی سیاسی حکمت عملی پر تنقید کی اور اس کو قابل مذمت ٹھہرایا کیوں کہ وہ انقلاب کو درآمد کرنے کے مترادف تھی۔

کیفی نے بڑی معنی خیز نئی نئی ترکیبیں تراشی ہیں جن کا تعلق راست زندگی اور جذبات سے ہے۔ یہ تراکیب خالص ذہنی اختراع کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ زندگی کے تجربے سے تخلیق پا کر جذباتی شعور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ کیفی کی یہ صلاحیت "جھنکار" میں صاف طور پر ہمارے سامنے آتی ہے اور "آخر شب" اور "آوارہ سجدے" میں بھی موجود ہے۔ مثلاً بند قدامت، ضعف عشرت، وہم نزاکت، جنت زر، مونس اخلاص پناہ، دامن قصد تبسم (یہاں تبسم اور قصد تبسم کے لطیف فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، مصرع ہے۔ "دامن قصد تبسم میں سمیٹے ہوئے آہ")، شہباز سفر، فردوس ہوس، عمل سوز سیاست جمود بے دلی، نشاط بے حسی، پشیمان تبسم، محاط مذمت، بالا قساط بغاوت، وغیرہ۔ کیفی کی شاعری کے اس پہلو کے نظرانداز کیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اکثر ناقدین نے اپنی زیادہ توجہ ان کی سیاسی شاعری کے بیانیہ پہلو پر مرکوز کی اور بعض اس کو سراہتے رہے اور بیشتر تو اس پر تنقید کرتے رہے اور ان کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں کو نظرانداز کر دیا۔ ان کے ناقدین میں معترضین اور معترفین، دونوں کے اس رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ کیفی کی شاعری کے بعض اہم پہلو پس پشت رہ گئے، خصوصاً کیفی کے لطیف طنز کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ شاید ہی کسی نقاد نے "آوارہ سجدے" کی پہلی نظم "دعوت" کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے یہ اشعار قابل غور و ستائش ہیں۔

راز کو ہے کسی ہم راز کی مدت سے تلاش
اور دل صحبت ہم راز سے گھبراتا ہے
شوق یہ ہے کہ اڑے وہ تو زمیں ساتھ اڑے
حوصلہ یہ ہے کہ پرواز سے گھبراتا ہے
تیری تقدیر میں آسائش انجام نہیں
اسئے کہ تو شورش آغاز سے گھبراتا ہے

محولہ بالا اشعار کے لطیف طنز کا حسن کیفی کی طبیعت کی لطافت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے کلام میں اس طرح کے لطیف طنز کے نشتر ہم کو جا بجا ملتے ہیں لیکن ان پہلوؤں پر توجہ دینے اور ان کو نمایاں کرنے کی بجائے ان کے کلام پر لیبل چسپاں کر کے تنقید کے منصب سے پہلو تہی کرنا ان کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے اور ایسا کیفی کے ناقدین ہی نے نہیں کیا بلکہ ان کے قارئین اور سامعین نے بھی یہی کیا۔ اس کا ایک سبب شاید کیفی کی بعض نظموں کی غیر معمولی مقبولیت ہے۔ ان کے نام کے ساتھ ان کی ان مقبول نظموں کے عنوانات اس طرح منسلک کر دیے گئے کہ ان کی شاعری کے دوسرے محاسن سے توجہ ہٹ گئی۔

کیفی کی شاعری کا ایک خوبصورت اور قابل توجہ پہلو بدن چھونے کے حسیاتی اظہار کا حسن ہے جس پر کم ہی نقادوں اور قارئین نے توجہ دی ہے۔ مثلاً۔

آ، قریب آ، کہ یہ جوڑا میں پریشاں کر دوں	(نیا حسن)
گرم بوسوں سے تراشا ہوا نازک پیکر	(نذرانہ)
لب شیریں کا نمک، عارض نمکیں کی مٹھاس	
اپنے ترسے ہوئے ہونٹوں سے چرالوں نہ کہیں۔	(احتیاط)
لب شیریں پہ مری تشنہ لبی کا انعام	
جانے انعام ملے گا، کہ چرانا ہوگا	(پیار کا جشن)

اس سے پہلے کہ مری بیوی کے ہونٹ
میرے ہونٹوں سے تپش پی جائیں (آوارہ سجدے۔ چراغاں)

کیفی نے اپنی زندگی کے کسی بھی موڑ پر اپنی حسیت کا سودا کیا اور نہ اپنے نظریے کا۔ ان کی شاعری میں ان کا نظریہ اس طرح جھلکتا ہے جیسے وہ ان کی فکر اور ان کے نقطہ نظر کا اٹوٹ حصہ ہو، پیوند نہیں۔ کیفی وقتی طور پر حالات سے مایوس ہونے بھی تو ان حالات کے روشن پہلوؤں کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ انھوں نے مایوسی کو ترک کر کے نئی راہوں کو تلاش کیا۔ انقلاب کے سماجی اور سیاسی امکانات موہوم ہو گئے تو انھوں نے اپنے گاؤں کا رخ کیا اور ترقیاتی کاموں کا بیڑہ اٹھایا۔ کیفی عورت کو زندگی کے ہر موڑ پر، ہر مرحلے پر، ہر منزل پر مرد کے دوش بدوش چلتا دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی نظریے کو انھوں نے گاؤں کے ترقیاتی کاموں میں بھی اپنایا ہے۔ اس طرح ان کا نظریہ ان کی شاعری ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی عملی زندگی کا حصہ ہے۔

کیفی کی رومانی شاعری میں جو حسی پیکر ہم کو ملتے ہیں ان میں صرف مرد ہی عورت کے لیے نہیں تڑپتا، بلکہ عورت بھی تڑپتی ہے، مرد ہی عاشق نہیں، عورت بھی عاشق ہے۔

وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا
میز سے جب مری تصویر ہٹائی ہوگی
ہر طرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہوگا
نام پر میرے جب آنسو نکل آئے ہوں گے
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہوگا

(آخرِ شب۔ اندیشے)

اور پھر ان کی نظم "عورت" تو اس رویے کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

اب میں اپنا مضمون کیفی کی ایک نظم پر ختم کرتا ہوں اور چونکہ اس کے ہر مصرع میں حسین پیکروں کا اجتماع ہے اس لیے مکمل نظم سنانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ دیکھیے اس نظم کے عنوان سے ہر مصرع کس طرح جڑا ہوا ہے۔ نظم کا عنوان ہے "تصور" اور یہ نظم "آخرِ شب" میں ہے:

یہ کس طرح یاد آرہی ہو، یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو
کہ جیسے سچ مچ نگاہ کے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو
یہ جسم نازک، یہ نرم بانہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو
ہزاروں جادو جگا رہی ہو

یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

گلابی لب ، مسکراتے عارض ، جبیں کشادہ ، بلند قامت
نگاہ میں بجلیوں کی جھل مل ، اداؤں میں شبنمی لطافت
دھڑکتا سینہ ، مہکتی سانسیں ، لوا میں رس ، انکھڑیوں میں امرت
بہ حلاوت ، بہ ملاحت ، بہ ترنم ، بہ نزاکت
چہک چہک گنگنا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

تو کیا مجھے تم جلا ہی لوگی ، گلے سے اپنے لگا ہی لوگی
جو پھول جوڑے سے گر پڑا ہے ، تڑپ کے اس کو اٹھا ہی لوگی
بھڑکتے شعلوں ، کڑکتی بجلی سے میرا خرمن بچا ہی لوگی
گھنیری زلفوں کی چھاؤں میں مسکرا کے مجھ کو چھپا ہی لوگی
کہ آج تک آزما رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

نہیں محبت کی کوئی قیمت جو کوئی قیمت ادا کرو گی
وفا کی فرصت نہ دے گی دنیا ، ہزار عزم وفا کروگی
مجھے بہلنے دو رنج و غم سے ، سہارے کب تک دیا کرو گی
جنوں کو اتنا نہ گدگداؤ ، پکڑلوں دامن تو کیا کرو گی
قریب بڑھتی ہی آرہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

(18/ مارچ 1984 ء کا مضمون اضافے اور ترمیم کے ساتھ ملکھنو کے جشن کیفی،23/ اکتوبر 1994 ء کے سمینار کے لیے لکھا گیا۔7/ اکتوبر 1994 ء)

سلسلہ ص (۱۰)

علمی و ادبی دوستوں اور شاگردوں کے علاوہ کثیر تعداد میں رشتہ داروں کے خطوط آتے تھے جن کا جواب اپنی اولین فرصت میں کرتے تھے۔ اہل خاندان سے تقریباً آخری لمحے تک آپ نے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا تو خط و کتابت کردی لیکن ادبی مقالے برابر لکھتے اور تصحیح کرتے رہے۔

خادم اردو اور رفیق ڈاکٹر ذور ہونے کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا دیا جاسکتا ہے کہ آپ کے ہاتھ باوجود لرزہ ہونے کے مسلسل دس سال اردو کی تحریریں لکھتے رہے۔ ایک ہاتھ سے قلم تھامنے کی طاقت نہ تھی تو قلم کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر لکھا کرتے تھے۔

پروفیسر مرحوم نے اپنے پیچھے شاگردوں کی کثیر تعداد چھوڑی ہے جو ملک کے علاوہ بیرون ملک میں مختلف خدمات انجام دے رہے جو آپ کی یاد تازہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

آپ کی ادبی خدمات کا جائزہ لینا کوئی معمولی بات نہیں ایک طویل وقت درکار ہے تب بھی جاکر شاید ہم ان کے ادبی کارناموں کے ساتھ صحیح صحیح انصاف نہ کرسکیں گے۔

پروفیسر الحاج محمد اکبرالدین صدیقی مرحوم میرے حقیقی پھوپا حضرت تھے اور مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔

خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے۔

کیفی اعظمی

ملاقات

کلی کا روپ، پھول کا نکھار لے کے آئی تھی
وہ آج کل خزانۂ بہار لے کے آئی تھی
جبینِ تابناک میں کھلی ہوئی تھی چاندنی
وہ چاندنی میں عکسِ لالہ زار لے کے آئی تھی
تمام رات جاگنے کے بعد چشمِ مست میں
یقیں کا رس، امید کا خمار لے کے آئی تھی
گلابی انکھڑیوں کی سحرکاریوں میں خندہ زن
غرورِ فتح و رنگِ اعتبار لے کے آئی تھی
وہ سادہ سادہ عارضوں کی شکریں ملاحتیں
ملاحتوں میں سرخیٔ انار لے کے آئی تھی
لبِ شگفتہ و حسیں میں گدگدی شراب کی
شراب میں گھلے ہوئے شرار لے کے آئی تھی
درازِ زلف میں گندھی ہوئی تھی مالوے کی رات
سیہ لٹوں میں شامِ بادہ خوار لے کے آئی تھی
وہ قامتِ بلند جیسے بھیرویں کی مست تان
وہ لوچ جیسے موجِ جوئے بار لے کے آئی تھی
خرام جیسے پینگ لیتی ہیں نئی جوانیاں
قیام جیسے دولتِ قرار لے کے آئی تھی
مژہ مژہ پہ جگمگا رہے تھے اخترِ امید
پلک پلک پہ شامِ انتظار لے کے آئی تھی
نفس نفس میں نغمۂ صبح کی حلاوتیں
نظر نظر میں مرہمی وقار لے کے آئی تھی
ادا ادا میں خسروانہ بانکپن رچا ہوا
نقوش ما مرا تاجِ شہریار لے کے آئی تھی

ہر ایک لغزشِ حسیں. سلونا پن لیے ہوئے
سلونے پن میں صبحِ کوہسار لے کے آئی تھی
وہ گاتی، گنگناتی نوجوانی کی خموشیاں
خموشیوں میں وقت کی پکار لے کے آئی تھی
بسنتی ساری میں چھپا ہوا سادہ جواں بدن
جواں بدن پہ ریشمی بہار لے کے آئی تھی
وہ صندلیں کلائیاں وہ سبز و سرخ چوڑیاں
سہاگ لے کے آئی تھی سنگار لے کے آئی تھی
پسینے کی ہر ایک بوند میں تھے ضوفشاں نجوم
جبیں پہ جگنوؤں کی اک قطار لے کے آئی تھی
چٹک رہی تھی قہقہوں میں ہر سنگھار کی کلی
ہنسی میں نور و رنگ کی پھوار لے کے آئی تھی
لہک رہے تھے انکھڑیوں میں گلستاں ہی گلستاں
نگہ میں بہار ہی بہار لے کے آئی تھی
مری اجاڑ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں
وہ گیسوؤں کا ابرِ عطر بار لے کے آئی تھی
جلی جلی روش کو دے رہی تھی مژدۂ نمو
تپی تپی زمیں پہ آبشار لے کے آئی تھی
اداس اداس زیست کو سنا رہی تھی بانسری
گھٹے گھٹے سکوت میں ستار لے کے آئی تھی
نگہ و دل کا ذکر کیا تڑپ کے روح رہ گئی
کچھ اس ادا سے دعوتِ قرار لے کے آئی تھی

●●●

کیفی اعظمی

اندیشے

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوز محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

وہ کہاں اور کہاں کاہشِ غم ، سوزشِ جاں
اس کی رنگین نظر اور نقوشِ حرماں
اس کا احساسِ لطیف اور شکستِ ارماں
طعنہ زن ایک زمانہ نظر آیا ہوگا

جھک گئی ہوگی جواں سال اُمنگوں کی جبیں
مٹ گئی ہوگی للک ، ڈوب گیا ہوگا یقیں
چھاگیا ہوگا دھواں گھوم گئی ہوگی زمیں
اپنے پہلے ہی گھرندے کو جو ڈھایا ہوگا

اس نے گھبرا کے نظر لاکھ بچائی ہوگی
مٹ کے اک نقش نے صورت جو دکھائی ہوگی
میز سے جب مری تصویر ہٹائی ہوگی
ہرطرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہوگا

دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پیے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر اُبھر آیا ہوگا

بے محل چھیڑ پہ جذبات ابل آئے ہوں گے
غم پشیمان تبسم میں ڈھل آئے ہوں گے
نام پر میرے جب آنسو نکل آئے ہوں گے
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہوگا

زلف ضد کرکے کسی نے جو بنائی ہوگی
روٹھے جلووں پہ خزاں اور بھی چھائی ہوگی
برق عشووں نے کئی دن نہ گرائی ہوگی
رنگ چہرے پہ کئی روز نہ آیا ہوگا

۱

کیفی اعظمی

عورت

اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قلبِ ماحول میں لرزاں شررِ جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولۂ سنگ ہیں آج
حسن اور عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج

جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خمِ گیسو میں نہیں
جنّت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں

اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

گوشے گوشے میں سلگتی ہے چتا تیرے لیے
فرض کا بھیس بدلتی ہے قضا تیرے لیے
قہر ہے تیری ہر اک نرم ادا تیرے لیے
زہر ہی زہر ہے دنیا کی ہوا تیرے لیے

رُت بدل ڈال اگر پھولنا پھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں

اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑکر رسم کے بُت بندِ قدامت سے نکل
ضعفِ عشرت سے نکل وہمِ نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل
قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل

راہ کا خار ہی کیا گُل بھی کچلنا ہے تجھے اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ یہ عزم شکن دغدغۂ پند بھی توڑ
تیری خاطر ہے جو زنجیر وہ سوگند بھی توڑ
طوق یہ بھی ہے زمرد کا گلوبند بھی توڑ
توڑ پیمانۂ مردانِ خرد مند بھی توڑ

بن کے طوفان چھلکنا ہے ابلنا ہے تجھے اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تو فلاطون و ارسطو ہے تو زہرا پروین
تیرے قبضے میں ہے گردوں تری ٹھوکر میں زمیں
ہاں اٹھا جلد اٹھاپائے مقدر سے جبیں
میں بھی رکنے کا نہیں وقت بھی رکنے کا نہیں

لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

کیفی اعظمی

بہروپنی

ایک گردن پہ سینکڑوں چہرے
اور ہر چہرے پہ ہزاروں داغ
اور ہر داغ بند دروازہ
روشنی ان سے آنہیں سکتی
روشنی ان سے جانہیں سکتی

سرد ہوجاتا ہے لہو
بند ہوجاتی ہیں کھلی آنکھ
ایسا لگتا ہے جیسے دنیا م
سبھی دشمن ہیں ، کوئی دوست نہ
مجھ کو زندہ نگل رہی ہے زم

تنگ سینہ ہے حوض مسجد کا
دل وہ دونا پجاریوں کے بعد
چاٹتے رہتے ہیں جسے کتے
کتے دونا جو چاٹ لیتے ہیں
دیوتاؤں کو کاٹ لیتے ہیں

ایسا لگتا ہے راکشس کو
ایک گاگر کمر میں لٹکا
آسماں پر چڑھے گا آخرِ شہ
نور سارا نچوڑ لائے
میرے تارے بھی توڑ لائے

جانے کس کوکھ نے جنا اس کو
جانے کس صحن میں جوان ہوئی
جانے کس دیس سے چلی کم بخت
ویسے یہ ہر زبان بولتی ہے
زخم کھڑکی کی طرح کھولتا ہے
اور کہتی ہے جھانک کر دل میں
تیرا مذہب ، ترا عظیم خدا
تیری تہذیب کے حسین صنم
سب کو خطرے نے آج گھیرا ہے
بعد ان کے جہاں اندھیرا ہے

یہ جو دھرتی کا پھٹ گیا س
اور باہر نکل پڑے ہیں جلو
مجھ سے کہتے ہیں تم ہمارے
میں اگر ان کا ہوں تو میں کیا ہو
میں کسی کا نہیں ہوں اپنا ہ

مجھ کو تنہائی نے دیا ہے
میرا سب کچھ اکیلے پن سے
کون پوچھے گا مجھ کو میلے
ساتھ جس دن قدم بڑھاؤں
چال میں اپنی بھول جاؤں

یہ اور ایسے ہی چند اور سوال
ڈھونڈنے پر بھی آج تک مجھ کو
جن کے ماں ، باپ کا ملا نہ سراغ
ذہن میں یہ انڈیل دیتی ہے
مجھ کو مٹی میں بھینچ لیتی ہے

چاہتا ہوں کہ قتل کردوں اِسے
وار لیکن جب اس پہ کرتا ہوں
میرے سینے پہ زخم ابھرتے ہیں
میرے ماتھے سے خوں ٹپکتا ہے
جانے کیا میرا اس کا رشتہ ہے

آندھیوں میں اذان دی میں نے
سنکھ پھونکا اندھیری راتوں میں
گھر کے باہر صلیب لٹکائی
ایک اک در سے اس کو ٹھکرایا
شہر سے دور جاکے پھینک آیا

اور اعلان کردیا کہ اٹھو
برف سی جم گئی ہے سینوں پر
گرم بوسوں سے اس کو پگھلادو
کرلو جو بھی گناہ وہ کم ہے
آج کی رات جشنِ آدم ہے

یہ مری آستین سے نکلی
رکھ دیا دوڑ کے چراغ پہ ہاتھ
مَل دیا پھر اندھیرا چہرے پر
ہونٹ سے دل کی بات لوٹ گئی
در تک آکے برات لوٹ گئی

اس نے مجھ کو الگ بُلا کے کہا
آج کی زندگی کا نام ہے خوف
خوف ہی وہ زمین ہے جس میں
فرقے اُگتے ہیں ، فرقے پلتے ہیں
دھارے ساگر سے کٹ کے چلتے ہیں

خوف جب تک دلوں میں باقی ہے
صرف چہرہ بدلتے رہنا ہے
صرف لہجہ بدلتے رہنا ہے
کوئی مجھ کو مٹا نہیں سکتا
جشنِ آدم منا نہیں سکتا

●○●

کیفی اعظمی

گربھ وتی

سُن رہا ہوں یہی بے صوت کراہیں کب سے
ہے مگر کرب ہمیشہ سے سوا آج کی رات
نہ تو سویا ہے نہ سوئے گا خدا آج کی رات
اس تذبذب سے تھکے ذہن کو مل جائے نجات
بے اثر جو ہے دوا ، کام دعا تو کرجائے
ماں سے کچھ خوف نہیں ، کوکھ میں بچہ مرجائے

دائی خاموش کھڑی گھول رہی ہے افیون
گھنٹیاں بجتی ہیں ، مسجد میں دعا ہوتی ہے
نیند ہی ایسے مریضوں کی دوا ہوتی ہے
اور جرّاح یہ کہتے ہیں کہ یہ پاپ کا پھل
آج اکیلا نہیں مرتا ہے تو ماں بھی مرجائے
اور یہ کش مکشِ سود و زیاں بھی مرجائے

پہلے بچے میں ہُوا کرتی ہے تکلیف اکثر
آخری ہوکے اٹھا رکھا ہے طوفان اس نے
کردیا ماں کو بھی ، دائی کو بھی ہلکان اس نے
یہ بھی ممکن ہے کہ بچہ جسے ہم سمجھے ہیں
پیٹ کھلنے پہ وہ جلتا ہوا پھوڑا نکلے
خون بہتا ہے بہے ، زہر تو تھوڑا نکلے

ایسے مولود سے دنیا کا بھلا کیا ہوگا
کُلبُلانے سے ہمکنے کا ہے انداز جُدا
ماں سے انجام جدا ، باپ سے آغاز جُدا
کچھ دوا سے نہ ہوا ہے ، نہ دعا سے ہوگا
میز تیار کرو ، گربھ وتی کو لے آؤ
پیٹ کو چاک کرو ، کوکھ پہ نشتر برساؤ

کوکھ سے اس کی بہرحال بدُامید رہیں
کہتے ہیں گربھ وتی اتنی بھی معصوم نہیں
راکشس ہوگا کہ اوتار ، یہ معلوم نہیں
کون سا وقت تھا ، دن کیسے تھے ہاں یاد آیا
جنگ اُس وقت تھی ، اب جنگ کی تیاری ہے
تب سے اب تک وہی منحوس عمل جاری ہے

شَل ہوئے جاتے ہیں جرّاحوں کے دست و بازو
پیٹ میں لگتی ہے آری ، نہ چھری دھنستی ہے
میز پر لیٹی ہوئی ، گربھ وتی ہنستی ہے

کیفی اعظمی

مکان

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گذارے ہم نے

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند، اور بلند، اور بلند
بام و در اور، ذرا اور سنوارے ہم نے

آندھیاں توڑ لیا کرتی تھیں شمعوں کی لویں
جڑ دیے اس لیے بجلی کے ستارے ہم نے
بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورشِ تعمیر لیے

اپنی نس نس میں لیے محنتِ پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لیے
دن پگھلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لیے

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

●●●

کیفی اعظمی

دائرہ

روز بڑھتا ہوں جہاں سے آگے
پھر وہیں لوٹ کے آجاتا ہوں
بارہا توڑ چکا ہوں جن کو
انھیں دیواروں سے ٹکراتا ہوں
روز بستے ہیں کئی شہر نئے
روز دھرتی میں سما جاتے ہیں
زلزلوں میں تھی ذرا سی گرمی
وہ بھی اب روز ہی آجاتے ہیں

جسم سے روح تلک ریت ہی ریت
نہ کہیں دھوپ ، نہ سایہ ، نہ سراب
کتنے ارمان ہیں کس صحرا میں
کون رکھتا ہے مزاروں کا حساب
نبض بجھتی بھی بھڑکتی بھی ہے
دل کا معمول ہے گھبرانا بھی

رات اندھیرے نے اندھیرے سے کہا
ایک عادت ہے جیے جانا بھی
قوس اک رنگ کی ہوتی ہے طلوع
ایک ہی چال بھی پیمانے کی
گوشے گوشے میں کھڑی ہے مسجد
شکل کیا ہو گئی میخانے کی
کوئی کہتا تھا سمندر ہوں میں
اور مری جیب میں قطرہ بھی نہیں
خیریت اپنی لکھا کرتا ہوں
اب تو تقدیر میں خطرہ بھی نہیں
اپنے ہاتھوں کو پڑھا کرتا ہوں
کبھی قرآں ، کبھی گیتا کی طرح
چند ریکھاؤں میں سیماؤں میں
زندگی قید ہے سیتا کی طرح
رام کب لوٹیں گے ، معلوم نہیں
کاش راون ہی کوئی آجاتا

●●●

کیفی اعظمی

دوپہر

یہ جیت ہار تو اِس دَور کا مقدّر ہے
یہ دور جو کہ پرُانا نہیں نیا بھی نہیں
یہ دور جو کہ سزا بھی نہیں جزا بھی نہیں
یہ دور جس کا بہ ظاہر کوئی خدا بھی نہیں

تمھاری جیت اہم ہے نہ میری ہار اہم
کہ ابتدا بھی نہیں ہے یہ انتہا بھی نہیں
شروع معرکۂ جاں ابھی ہوا بھی نہیں
شروع ہو تو یہ ہنگام فیصلہ بھی نہیں

پیام زیرِ لب اب تک ہے صُورِ اسرافیل
سُنا کسی نے، کسی نے ابھی سُنا بھی نہیں
کیا کسی نے کسی نے یقیں کیا بھی نہیں
اٹھا زمیں سے کوئی اور کوئی اٹھا بھی نہیں

یہ کارواں ہے تو انجامِ کارواں معلوم
کہ اجنبی بھی نہیں کوئی آشنا بھی نہیں
کسی سے خوش بھی نہیں ہے کوئی خفا بھی نہیں
کسی کا حال کوئی مڑکے پوچھتا بھی نہیں

اقبال متین

باتیں ہماریاں

یادیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں، کہاں تھم جاتی ہیں۔ کہاں سناٹوں میں چھپ کر بالکل ذہن کا حصہ نہیں رہتیں جیسے کسی ماؤف دماغ نے زندگی کا ایک حصہ ایسے بھی کاٹ دیا کہ اطراف میں کوئی نہیں رہا۔ بچپن کیا اور اس کی روزمرہ زندگی کیا۔ بندھے ٹکے، مسائل۔ ڈانٹ اور گھرگی سے بچ کر جی لینے کی خواہش۔ تعریف کے دو بول، بھلا کر گول گپا بنا دیں۔ ایسے میں یہ اعزاز کیا کم ہے کہ خاندان میں کسی نے کہہ دیا: "اپنی بگڑی ہوئی اولاد کو راہ راست پر لانا ہے تو اسے مجھلے بھائی کے پاس بھجوا دو۔ ان کی محبت، دلہن شہزادی (میری امی جو خاندان میں زیادہ تر اسی اپنائیت سے پکاری جاتی تھیں) کی تربیت اور اقبال جیسے لڑکے کی صحبت، جو ہر سال کلاس میں اول آتا ہے۔ وہ بھلا اس کی کتابیں بھلی۔ کہے دیتا ہوں، تمہارا لاڈلا، سدھر جائے گا۔"

بڑھ چڑھ کر بولنے والے تھے سلطان محی الدین نسیم قاسمی، میرے سب سے چھوٹے چچا۔ میری سب سے چھوٹی پھوپی جیلانی بیگم کو عزیز رکھتے تھے لیکن ان کی اولاد سے غیر مطمئن تھے۔ ان کے لیے کچھ کرنے کا وقت آیا تو بڑی بے دردی سے انھیں نظرانداز کر دیا۔ لیکن زندگی بھر اپنے کیے پر پچھتاتے رہے۔ نہ ان کا یہ گھاؤ بھرا نہ سلے ہوئے لب اعتراف شکست کے لیے کھل سکے۔

کسی اور کا لاڈلا اقبال جیسے لڑکے کی صحبت میں سدھر سکا یا اور بگڑ گیا یہ باتیں بہت بعد کی ہیں۔ لیکن ایسی سیسے کی گولیاں سنا ہے کہ جب خاندان بھر میں داغی گئیں تو جانے کس کو لگیں، کس کو نہیں لگیں۔ میاں اقبال متین کو ضرور لگ گئیں۔

ایسی فوقیت ساتھ کے دوسرے بچوں پر ٹھونسی جائے تو کھیل کود کے سارے دن زنگ پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔ کون اس محفل میں اپنے قہقہے قربان کرے۔ جہاں دبے پاؤں کتاب ہو جاتی ہو۔ کوئی بچوں کا رسالہ کوئی کتھا، کہانی وارد ہو جاتی ہو۔

میں بچپن میں اپنی ہی بسائی ہوئی اس دنیا میں خوش تھا۔ کیسی طمانیت حاصل ہوتی تھی جیسے مجھے کچھ کرنا آگیا ہے۔ کیا آگیا ہے؟ وہی جو میرے ساتھ کے بچوں کو نہیں آتا۔

یہ چاٹ مجھے چھٹ پن سے میری مماں نے ڈالی تھی۔ وہ میری ملاتی ماں تھیں، لیکن ان کی چاہتیں کچھ ایسی تھیں کہ اس بدنام زمانہ رشتے کو سرے سے جھٹلا دیا تھا۔ اکیلی رہتی تھیں۔ اولاد ہوئی، لیکن رہی نہیں۔ بانجھ ہوتیں تو اس دکھ سے بچ جاتیں۔ یہ اور بات ہے کہ نہ پانے کا غم سہتی رہتیں لیکن پا کر کھو دینے کے رنج و محن کو سہن کر جانا اتنا آسان نہیں۔ صرف کلیجہ نہیں پھٹ جاتا، پتا بھی پانی ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے جیسے ہم خاندان کے ہر ظلم کے آگے سر جھکا لینے کو پیدا کر دیے گئے تھے۔ میں نے شاید غیر شعوری طور پر مماں سے اپنے بچپن کا سودا کر لیا تھا۔

ابا ہفتے میں ایک آدھ دن ان کے پاس آ جاتے تو وہ کہہ سن کر اپنے بڑے صاحب (ماں لاڈ سے کبھی اس طرح پکارتی تھیں کیوں کہ میں بڑا بیٹا تھا) کو یا اپنے اگو جانی (لاڈ پیار میں اقبال کی بگڑی ہوئی صورت) کو اپنے پاس روک لیتیں۔ وہ بھی ایسے میں جب، میں ابا کے ساتھ ہوتا اور جو ساتھ نہ ہوتا تو پھر ابا کے جانے کے بعد ان کی تنہائیاں۔

کبھی وہ ابا سے کہہ کر بڑے چاؤ سے مجھے بلوا لیتیں۔ امی جیسے سوچ میں پڑ جاتیں کہ ان دونوں میں میری حقیقی ماں کون ہے۔ ابا کے کہنے پر مجھے وہ کسی ملازم کے ساتھ مماں کے پاس بھجوا دیتیں اور میں دنوں وہاں رہ جاتا۔ وہ میری خواہشیں پوچھ پوچھ کر پورا کرتیں، اس طرح جیسے خواہش پیدا کر رہی ہوں اور پورا کر رہی ہوں۔ یہ سب کچھ ہو جاتا تو کہانیوں کے تانے بانے ان کے اور میرے اطراف بنے جاتے۔ ایسے دل چسپ پیرائے میں کہانیاں سناتیں کہ میں ڈاکوؤں اور لٹیروں سے یہاں تک کہ جنات سے بھی لڑ بھڑ کر شہزادے کو ان کے چنگل سے چھڑا لاتا۔ اور نہلانہ بیٹھتا۔ خیالوں میں اڑان بھرنے والا میرا ننھا سا دل پریوں کی تلاش میں نکل جاتا۔ ذرا بڑا ہوا تو میں نے منیرہ کی صورت میں پری تلاش کر لی۔ کھیل کھیل میں کچھ ہاتھ لگا تو وہ آنسوؤں کے موتی تھے۔ میں نے ان موتیوں کو بہت سنوارا۔ بہت دولت سمیٹی۔ اتنا غنی ہوا کہ منیرہ بھی دیکھتی رہ گئیں

اور سنیے۔ سننے کی بات تو یہی ہے۔ چھٹی جنوری ۱۹۹۵ء کی صبح میں نے ایک ایسے کارے شیشہ گراں کا قصد کیا جو اپنے بیٹوں کی قبریں بنوانے سے شروع ہوتا تھا۔ مماں کی قبر بھی لگے ہاتھوں بنانے کی سوچی تو قبر غائب تھی۔ معدوم ہو کر زمین بن گئی تھی۔

کسی قبر کا زمین بن جانا اہالیانِ اسلام کے لیے عربستان کی روایت بھی ہو سکتی ہے طریقت بھی۔ لیکن یہاں ہندوستان میں صرف اور صرف ندامت و قباحت ہے کہ متعلقین نے مرنے والے کو مٹی تو دی، مٹی کا ایک ادنی سا تودہ نہیں دیا۔ یہ سلوک کسی نے کیا ہو کہ نہیں کیا ہو۔ میں نے اپنی مماں کے ساتھ کیا ہے۔

پریاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر میرے ہاتھوں میں ہاتھ دلانے والی میری مماں۔ جب منیرہ کا ہاتھ میں نے تھام لیا تو ہر مزاحمت کے خلاف اپنی ہتھیلیوں کی دوب میں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعاؤں کی سوغات لیے جیسے در در پھرتی رہیں۔ کبھی امی کے پیر چھوتے کبھی ابا کے آگے ہاتھ جوڑے اور میں ہوں کہ آج اسی مماں کی قبر ڈھونڈھتا پھر رہا ہوں جو کبھی میری آہیں منیرہ کی نم آنکھوں میں دیکھ کر رو پڑتی تھیں۔

خواجہ بھائی، چھوٹے بھائی کو یقین دلا رہے ہیں کہ یہ جو بے نشان زمین ہے۔ یہی جو چبوترے پر چڑھنے کا راستہ بن گئی ہے، یہی تو قبر ہے۔ چھوٹا بھائی کسی اور ہی شکستہ قبر کی بات کر رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ مماں آواز کیوں نہیں دیتیں۔

بڑے صاحب، میں یہاں ہوں

میں یہاں ہوں اکو جانی

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے۔

دیکھیے یادیں اسی طرح کھینچے لیتی ہیں۔ میرا بچپن تو وہاں کبھی کھیل کے میدان میں تھا، کبھی کہانی کی کتاب یا رسالے میں۔ وہاں سے چھلانگ لگائی تو 6/ جنوری 1995ء کی صبح تک آ پہنچا۔ مٹی ہوئی قبریں تلاش کرنے میں شاید یگ بیت جاتے ہیں۔

چلیے عاقبت سنوارنا تو مجھے آیا نہیں، پھر بچپن کی عافیت ہی سنوارتا ہوں اور وہیں چلتا ہوں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا، مجھے کچھ آ گیا تھا۔ دیوانگی تھی یا شعور کی پہلی سیڑھی، لیکن جو میرے ساتھ کے بچوں کو آتا تھا اس میں بھی تو میری دل چسپی تھی۔ گلی ڈنڈا ابا کو پسند نہیں تھا، کھیلنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ لیکن آنکھ مچولی، لون پاٹ، چرکی بلا، انگوٹ چا، جھاڑ بندر، کانا بھائی، کبڈی اس دنیا میں کیا نہیں تھا۔ تیراکی میں مجھے اتنی دل چسپی نہ تھا کہ ذکر کروں۔ پانی میں گر جاتا تو نکل سکتا تھا۔ لیکن گھڑسواری کا تو میں بھی دیوانہ تھا میرا چھوٹا بھائی سلامی بھی۔

میں اپنی بسائی ہوئی نیم حقیقی اور نیم خیالی دنیا کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، لیکن اس دنیا سے بھی کٹ کر جینا میرے بس میں نہیں تھا جس میں میرے ساتھی کے سانس لیتے تھے اور دل جمعی کے سارے ہی سامان فراہم کر لیتے تھے۔ میں اس چھوٹی سی بے آزار دنیا سے جلد ہی اوب جاتا تھا۔ لیکن ایک کھلنڈری برابر میرا پیچھا کرتی۔ یہ میری پھوپھی زاد بہن منیرہ تھی۔

چلونا، کھیل میں مزہ نہیں آتا

چلونا، صرف گھنٹے بھر ہی کا تو کھیل ہے۔

چلونا، جی چاہتا ہے تمہاری کتابیں، رسالے سب جلادوں۔

اس ایک گھنٹے کے کھیل نے زندگی بھر آنسو چھپانے اور ٹوٹے پھوٹے کھلونے سینے میں چھپانے رکھنے کے کیسے کیسے جتن سکھلا دیے۔

ایک طرف یہ تھا کہ چھٹ پن میں کسی دوسرے کے لیے رونا زندگی کی چلت پھرت سے، چہل پہل سے، آوک جاوک سے ہٹا کر بڑے مکھے مکھے، سرمئی سرمئی دن پو پھٹتے ہی ساتھ کرتا تھا۔ دوسری طرف یہ تھا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب زور نے کسی ادبی جلسے میں تقریر کی تو بچوں کے سب رس کے اچھے ادیب اور شاعری کی حیثیت سے دو نام لیے۔ سید مسیح الدین متین اور معین الدین احمد انصاری۔ یہ تقریر اخباروں میں چھپی۔ چچا تمکین سرمست صاحب نے خاص طور پر ابا اور امی کو چھپا ہوا نام بتلایا۔

ابا اور امی نے خوشیاں دبالیں اور تمکین صاحب جان گئے کہ اس ادب و شعر کا کاروبار زیاں نہ منجھلے بھائی کو پسند ہے نہ دلہن شہزادی کو۔ تمکین صاحب خوش تھے کہ انھیں اقلیم سخن کا کوئی ایسا وارث مل جانے گا جو ان کے ساتھ دور تک چل سکے لیکن ابا اور امی نے چھپا چھپا کر زور صاحب کی تقریر پڑھی اور اخبار جتن سے رکھ لیا اور چچا صاحب مجھے پہلے ہی دکھا چکے تھے

اب تو میری اپنی بسائی ہوئی چھوٹی سی دنیا میں کچھ کرنیں سی پھوٹیں اور میں ان کرنوں کے اجالوں کو اپنے اطراف لپیٹ کر مگن ہو گیا۔ خاندان کے بچوں میں بھی بات کچھ اس طرح چلی جیسے انھیں بھی خوشیاں ملی ہیں۔ اقبال بھائی کا نام اخباروں میں آیا ہے۔ سب سے زیادہ خوش ہونے والوں میں مولوی کریم الدین صاحب تھے۔ ہمارے اتالیق۔ انھوں نے دوسرے شاگردوں کے مقابلے میں مجھ سے سلوک مسلوک میں بھی شفقت بڑھا دی اور فوقیت بھی دی۔

یہی فوقیت بچپن سے آج تک بڑا گھاٹے کا سودا رہی ہے لیکن میں اس سے بے نیاز ہو گیا۔ کبھی یہ نہ سوچا کہ دلوں میں پرورش پانے والا حسد، حاسدوں کہاں کہاں لے جا کر مارتا ہے۔ چاہتوں کا دم بھرنے والے آہستہ آہستہ اس وقت سامنے آنے لگے جب ان کے حسد نے ان کے سینوں میں دبی دبی آگ کو یہاں تک بھڑکایا کہ انھوں نے مجھ پر نطق و تکلم کے انگارے پھینکے، شعلے پھینکے۔ میں نامراد تو اس طرح تھا کہ مجھے اس اپنی بسائی ہوئی دنیا کے طمطراق نے صرف سناٹے دیے، تنہائیاں دیں۔ سب ٹوٹنے، رفاقتوں کا دم بھرنے والے منہ پھیر کر گزرنے لگے۔ لیکن یہ سب کچھ کیوں۔ کبھی اس دیوانے نے تم سے تو راست کچھ نہیں مانگا تھا۔ یہ بھی نہیں کہا تھا کہ بھائی میں یہاں ہوں مجھے دیکھو تو۔ لیکن میرے چاہنے والوں نے، جب بھی وہ مجھ سے ملے اپنی ہی فوقیت مجھ پر لادی۔ اپنا خود ساختہ ذہن، اپنی پروردہ بے بضاعت انا۔ Wit اور ظرافت نکتہ سنج کے نام پر اپنی خیالی کا بوسیت۔ علم کے نام پر اپنی بے علمی، مزاح فرحت آگیں کے نام سے اپنی ناقابل برداشت بوریت۔ باتیں ایسی جن کے ہر لفظ سے ان کا میں جھانکے اور زندگی کے کسی کنارے پر بھی کسی ہنر کے وسیلے سے ڈھونڈھتے پھرو تو ان کا "میں"۔ سرے سے ملے ہی نہیں اور اگر ملے تو صرف انھیں کو ملے۔

بہرحال ناقدری زیست کا حاصل ہو جانے تو سانس لینے کی طمانیت چھن جاتی ہے لیکن جو محرومیاں حصے میں آتی ہیں

وہی تحریر کو ایسی نزاکت اور صلابت بہ یک وقت عطا کرتی ہیں کہ موم کو فولاد بنالو، فولاد کو موم۔ کوئی مسکراہٹ چاہے تو اسے مل جائے۔ آنسو چاہے تو اسے میسر آجائیں۔

میرے لیے تو یہی سزا بہت تھی کہ کسی نے خاندان بھر میں پلٹ کر نہیں دیکھا اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ بھی لیا تو اپنے "بیمار" "میں" کی مجہولیت بطور نذریں درمیان میں رکھ دی۔ ایک ایک چہرہ آنکھوں میں پھرتا ہے۔ ایک ایک کے آگے اپنی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے تو مجھ کھائی کے نشیبوں میں راستہ ڈھونڈنے والے کی نظریں کو سہار نشیبوں پر کمندیں پھینکنے کی جسارت نہیں کرپاتیں اور پھر عافیت اسی میں تو ہے کہ ہر اس برتری کو سہتے جاؤ جو تسلیم نہیں کی جاسکتی اور میں سہتا ہوں۔ اس لیے کہ میرے ارفع خاندان میں اتنے "میں" ملتے ہیں کہ کمر دوہری کرکے کورنش بجالاتے، ہاتھ شل ہوگئے اور کمر ٹوٹ گئی، لیکن کیا کیجیے کہ یہی مقدر ہے۔

ایک ہی شخص ملنگ نکلا۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ غنیمت سے زیادہ نہیں۔ نام ہے یوسف شریف الدین۔ آج یوسف سرمست کے نام سے اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ اردو ادب میں اس کی شناخت مسلم ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہ بھی میری طرح نیچے نیچے جھرنے والے پانیوں میں پاؤں تلے کبھی ہریالی میں، پرواز سیکھتے پرندوں کی ڈار میں، چٹانوں کے درمیان سے پھوٹتے انکھوؤں کی بالیدگی میں، مسکراہٹوں کو بھگوتی ہوئی آنکھوں کی نمی میں اپنی "میں" کو تلاش کرتا ہوگا۔ مجھے تو ہاتھ نہ آیا کچھ، اس سے ملوں تو پوچھوں گا۔

ایک شخص اور تھا، میرا جانی دوست، سگا خالہ زاد بھائی۔ نام تھا غضنفر۔ کتابوں کی دوستی میں کتابیں ازبر کرلیں۔ مسدس حالی کے بند کے بند یاد۔ اشارہ پاتے ہی شکوہ، جواب شکوہ اس طرح فر فر سنانا شروع کرتا کہ شعر خوانی کی صحت پر کوئی حرف نہ آنے۔ آٹھ نو سال کی عمر میں اس کے حافظے نے خاندان کے بڑوں، بزرگوں سے بھی داد پائی اور اساتذہ سے بھی۔ ہم عمروں کے منہ فق کرکے خراج تحسین اس طرح لیا جیسے لوہا منوالیا ہو۔ میں بھی بہت متاثر تھا اس سے۔ لیکن وہ برابر میرے حوصلے بڑھاتا۔ عجیب عجیب باتیں کرتا۔ اس کی میری عمر میں کچھ مہینوں کا فرق تھا۔ وہ بڑا تھا۔ ہم نے مل جل کر شعور کے دیکھے، ان دیکھے، راستوں پر قدم بڑھایا۔ بلا کا حافظہ تھا اس کا۔ متقدمین و متاخرین شعرا کے برجستہ شعر سناتا۔ ہمیشہ تحت میں۔ آواز بہت خراب تھی اس کی۔ گنگناتا نہیں، ہنہناتا تھا۔ مجھ سے کہتا:

"میں فوری پہچانا جاتا ہوں۔ تجھے پہچاننے میں اپنے خاندان کو بہت دن لگ جائیں گے۔ دیکھ نا۔ نہ مجھے تیری طرح شعر کہنا آئے نہ نثر لکھنا۔ تیرا یہی ہنر حاصل کرنے کے لیے دوسروں کی کتابیں پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی پسند آجائے تو بہت کچھ ازبر بھی کرلیتا ہوں۔ مگر جہاں تیرا گھوڑا دوڑتا ہے وہاں میرا ٹٹو نہیں چلتا۔ کیا تعجب کل تجھے بھی ازبر کرکے تجھے سناؤں گا۔ لیکن تو نہیں بن سکوں گا۔ اس کی بڑائی کے آگے میرا ذہن انکار کرے بھی تو دل جھک جھک جاتا تھا۔ اپنے تعلق سے اتنا انکسار برت کر اپنی ہی علمی فوقیت کو تمسخر بنالینا اسی کا ظرف تھا۔ میری کہانیاں میری نو عمری ہی میں ادب لطیف، ادبی دنیا اور بنگلور کے نیا دور میں شائع ہوئیں تو اس کی، لطیف ساجد اور حسینی شاہد کی مسرتیں دیدنی تھیں۔ جیسے یہ معرکہ میں نے نہیں ان تینوں نے ہی سر کیا ہے۔ میری ان کہانیوں کی اشاعت سے پہلے ہی غضنفر نے مجھ سے عزیز احمد کے افسانے "مدن سینا اور صدیاں" کی بات کی تھی۔ اس کے کہنے پر میں نے ادب لطیف کا خاص نمبر نکال کر اس کہانی کو پھر پڑھا تھا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ غضنفر نے مجھے عزیز احمد کی قدر شناسی سکھائی ہے۔

غضنفر، پاکستان بنتے ہی اس قدر شتابی سے، آندھی میں بگولے کی طرح ہندوستان کے حدود سے نکل کر پاکستان چلا گیا اور یہ یکسر بھول بیٹھا کہ ہندوستان نام کا کوئی ملک بھی اسی زمین پر ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی کٹر مسلم لیگی تھا۔ سیاست میری اور اس کی محبتوں کے درمیان کبھی حائل نہیں ہوئی۔ میں اس کا معترف تھا۔ وہ میرا مداح۔ لیکن وہ چلا

گیا تو اس طرح گیا جیسے اس نے ہندوستان نہیں چھوڑا، دنیا ہی چھوڑ دی۔ یہاں کی زندگی کے کوئی آثار ہی نہیں رکھے۔ مجھے اس کی یہ سفاکی بہت اکھرتی ہے۔ میں تو آج بھی یہی سوچ سوچ کر رہ جاتا ہوں کہ ولاؤں کو سرشت بنا کر جھٹیں نبھانے والا غضنفر مر کر بھی چین نہیں پا سکتا تھا۔ یہ کیا ہو گیا کہ آج زندہ رہ کر بھی وہ بے چین نہیں ہے۔ مجھے وہ اکثر یاد آتا ہے کسی نہ کسی بہانے یاد آجاتا ہے۔ قمر رئیس کا خط آتا ہے تو غضنفر اپنی علمی تفضیلت اور بد خلقی سمیٹ کر میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ قمر رئیس کا تبحر علم، تنقیدی بصیرت اور ادبی وسعت نظر کو اس کی تحریروں نے وہاں وہاں دوام عطا کیا ہے۔ جہاں جہاں اردو نے تخلیقی گھیراؤ کیا۔ مشرق ہو کہ مغرب کوئی تخصیص نہیں صرف اردو کا درمیانی ربط سب کچھ ہے اور اس سب کچھ کے باوجود کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ قمر رئیس کے ہاتھ میں برو کا قلم دے کر یک زانو بٹھا دوں اور کہوں کہ قمر میاں چلو شروع ہو جاؤ۔ ا۔ ب۔ ت۔ ٹ۔ سارے نوک پلک درست کر لو۔ مردانہ وجاہت، صورت کی معصوم سی موہنی، تقریر کی کاٹ سب کچھ رکھنے والا قمر رئیس اس ضرب المثل کی زندہ مثال ہے جب اس کا خط آپ کے ہاتھ میں ہو کہ "نام بڑے اور درشن چھوٹے"۔ میں اسی لیے یہاں بھی خط اور تحریر میں فرق کر رہا ہوں کہ تحریر کا لفظ وسعتوں کے کتنے ہی امکانات اٹھا لیتا ہے۔ بس یہی حال غضنفر کا تھا۔ مکوڑے کو سیاہی میں ڈبو کر سفید کاغذ پر چھوڑ دو۔ قمر رئیس اور غضنفر صاف نظر آئیں گے۔

غضنفر نے ایک اور جل دیا۔ اس کے بعد تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس شخص نے فنا میں ہی ثبات تلاش کر لی ہے اور صبر جمیل کی تفسیر بن گیا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ آخر کیوں؟ مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ پاکستان جانے کے بعد بھی درس و تدریس کے پیسے کی ہی روٹی کھاتا ہے۔ میں کتنا خوش ہو گیا تھا کہ جنم جنم اکل حلال کو زندگی ماننے والا اپنی روٹی کا پاس اس طرح بھی رکھے گا کہ اپنی ادبی صلاحیتوں کو تساہل کا زہر پلا کر مارنے کی بجائے قلم لے کر دنیائے ادب میں پل پڑے گا۔ مجھے تو آج بھی شبہ ہوتا ہے کہ غضنفر قلم اور کاغذ کی رفاقتوں کا راز داں نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ خاموش خاموش کیے جا رہا ہے۔ ایک دن کسی ایسی کتاب کی صورت میں ورق ورق روشنیاں پھینکے گا کہ بہ یک وقت ہندو پاک کی ادبی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔

پھر بھی خود ہی اپنی سوچ کے پر کتر دیتا ہوں۔ غضنفر زندگی کا ثبوت نہ فراہم کرے نہ سہی۔ مجذوب قسم کا ملنگ آدمی جانے کیا چھوڑ جانے گا۔ پیار بھرے خط کا دل دکھانے والا جواب تو دے۔ وہ جو کسی کا دل نہیں دکھاتا تھا۔ اس کی خاموشی نے کتنے دلوں کو مجروح کیا ہے۔ کیا اسے کسی بات کا کچھ پتا نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو وہ تڑپتا کیوں نہیں۔ موت اور زندگی میں فرق کیوں نہیں کرتا۔ کیا اس کے ذہن رسا نے زندگی میں ہی عفونت کی پنہائیاں ناپ لی ہیں؟

کتنی یادیں ساتھی بنی رہتی ہیں، ساتھ ساتھ چلتی بھی ہیں۔ مگر میاں بڑے رکھ رکھاؤ سے غیر مرئی تجسیم کا حسن ہیولوں اور پرچھائیوں کو سونپ دیتی ہیں تو یادیں معدوم ہوتی ہوئی بھی ذہن میں ارتسامات چھوڑ رہتی ہیں۔

مجھے میری زندگی کا پہلا سانحہ کچھ اس طرح یاد ہے کہ میں اپنی انابی کی گود میں چڑھا ہوا بنگلے کی کھلی چھت سے مغل پورہ کے آبائی مکان کی بارہ دری کا نظارہ کر رہا ہوں اور رو رہا ہوں کہ ان کو صندوق سے نکالو۔ یہ "ان" کا اشارہ میرے چچا سید دستگیر الدین نادر کی لاش کی طرف تھا جو شاید نہلا دھلا کر ڈولے میں سلا دی گئی تھی۔ یہ ڈولا نہ سکھپال تھا، نہ محافہ، نہ صندوق۔ تابوت تھا جیسے اس کی بناوٹ یا ساخت کو ملحوظ رکھ کر دکن کا کھلا تابوت کہا جا سکتا ہے جیسے ہم یہاں ڈولا بولتے ہیں۔ لیکن میری یادیں ٹوکتی ہیں کہ یہ ڈولا نہیں تھا باضابطہ تابوت تھا۔ اور یہاں تابوت کے استعمال کا چلن نہیں۔ بزرگوں میں کوئی رہ نہیں گیا کہ ان سے اس بات کی ٹوہ لگاؤں کہ ڈولے کی جگہ تابوت نے کیسے لی۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میرے ناپختہ ذہن نے اپنے ہی تصورات میں یہ تفریق مقادی ہے۔ کچھ ہو، مجھے جو عون آشام کہانی چھپی ڈھکی ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ نادر صاحب بیٹا بیٹی سے محروم تھے۔ ان کی بیگم کی گود ان کی زندگی میں ہری نہ ہوئی۔ بعد میں ہوئی جب ان سے میرے سب سے چھوٹے چچا سلطان محی الدین نسیم قاسمی نے عقد کیا۔ ان سے ایک لڑکی ہوئی سلطانہ۔ میں نے میرے خاندان میں ایسی صابر و شاکر لڑکی

نہیں دیکھی۔ اپنی محبت کو جان کا آزار بنایا تو اس طرح کہ اپنے ہو سے اپنے زخموں کی چمن بندی کرتی رہی اور آج مٹی میں مل کر زمین بن گئی ہے تو وہ بنگلا بھگت جو چاہت کے نام پر اسے بالا قساط مارتے رہے، کچھ نہیں رہے۔ کچھ اتراتے پھرتے ہیں۔ اس کی ماں نے تو بہت پہلے ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

ہاں تو نادر صاحب نے میرے ابا، امی سے کہہ سن کر مجھے اپنا لیا تھا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ گود لے لیا تھا اور جان چھڑکتے تھے۔ اپنے وقت کے وسیع اور مقبول ڈرامہ نگار کی حیثیت سے شہرت پا رہے تھے۔ ان کے کئی ڈرامے اسٹیج کیے جا چکے تھے۔ ایک رات دیر گئے گھر لوٹے۔ میرے لیے گلاکسو (GLAXO) بسکٹ کا بڑا سا ٹین کا ڈبہ جو لندن میں بنا تھا لے آئے تھے۔ یہ بسکٹ ان دنوں لندن سے آتے تھے اور میری بہت مرغوب غذا تھے۔ گھر میں داخل ہوئے تو آنگن میں کوئی پیڑ کے پیچھے چھپتا ہوا نظر آیا۔ پیچھا کیا تو صحن میں دھرے چوبی تخت سے ٹکرا گئے اور اسی پر گرے تو بسکٹ کا ڈبہ زیر ناف کچھ اس بری طرح چبھ کر رہ گیا کہ زخم کی تاب نہ لا سکے۔ تلی پھٹ گئی اور وہیں تڑپ کر جان بحق ہوئے۔

جگ مگاتی بارہ دری میں دھرے اس صندوق سے ان کو نکالنے کی ضد کرکے روتا ہوا میں انا بی کی گود میں سو گیا۔ اور یہ کہانی ختم ہوئی لیکن میرا بچپن یہیں سے شروع ہوا۔

ایک اور واقعہ جو سانحہ بنتے بنتے رہ گیا ذہن میں پورے وثوق کے ساتھ اپنی ساری جزئیات کو لیے محفوظ ہے۔ یہ سانحہ ہمارے گھر میں پلک پلک جھپکاتے جھپکاتے ماتم بن سکتا تھا لیکن خوشیاں ہی خوشیاں پھینک گیا۔

بشیر آباد (نا دندگی) پائیگاہ آسمان جاہی کا ضلع تھا۔ میرے ابا ان دنوں ابھی تحصیل دار تھے۔ تعلقدار تھے کرامت علی بیچارے بڑے بھولے بھالے تھے۔ بے سینگ کی گائے تھے لیکن کولھو کے بیل کے نام سے فوری پہچانے جاتے تھے۔ ان کے بہت سارے ایسے قصے مشہور تھے کہ بہ حیثیت ناظم عدالت فیصلہ صادر کرتے تو فریقین کے وکلاء فیصلہ پڑھ کر ششدر رہ جاتے، ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ فیصلہ مدعی کے موافق ہے یا مدعا علیہ کے۔ دونوں وکلا موصوف سے رجوع کرتے تو وہ ہنس کر فرماتے۔

B

"دیکھا لیَا فیصلہ کیا ہے مدعی بھیؔ خوش، مدعا علیہ بھیؔ خوش۔"

ان تعلقدار صاحب کا چھوٹا بیٹا ولایت علی میرا دوست تھا۔ شریر تھا اور اس کے منہ میں گھی شکر کی بجائے گالیاں بھری رہنے کی بددعا شاید اسے لگ گئی تھی۔ اس عمر میں ایسی ایسی چنندہ گالیاں دیتا تھا کہ میرے ابا جیسے ثقہ آدمی سن لیں تو گردن ناپ دیں۔

سعادت حسین منٹو نے باری علیگ کے تعلق سے لکھا تھا کہ باری صاحب عالم سکر میں ہوتے تو پنجابی زبان کے گن گاتے، کہتے کہ وہ زبان جس میں ایسی ایسی گالیاں ہوں جس کا کسی دوسری زبان میں جواب نہیں ہے۔ بہت وسیع ہوتی ہے اور اسی وسعت میں اس کی مقبولیت کا راز ہے۔ ہم میاں ولایت کو باری صاحب کی بزرگی کے آگے گنجی بھر کر چھوڑ سکتے تھے کہ باری علیگ اردو کی لسانی برتری کے بھی قائل ہو جاتے۔ ویسے منٹو نے یہ بھی لکھا ہے کہ باری صاحب جب نشے کی سرحدوں کو چھوتے تو اردو کی مٹھاس کے قائل ہو جاتے اور پنجابی کو اجڈ گنواروں کی زبان ٹھہراتے۔

منٹو اور باری صاحب تو بیچ میں آدھمکے۔ چناں چہ یہ خدشہ ایک دن پورا ہو کر رہا اور ابا نے چپراسیوں کو حکم دے کر اس کا آنا جانا بند کروا دیا۔ مجھے بھی اس کی گالی گلوچ کی گفتگو میں بے تکلف مداخلت ناپسند تھی اور میں اسے ٹوکتا رہتا تھا۔ مزاج کی دوریوں نے اس کے نہ آنے کا کچھ ایسا رنج مجھے نہیں پہنچایا کہ بچپن کی صحبتوں میں کسی کی کا احساس ہوتا لیکن وہ کچھ ہی دنوں بعد چھپ کر آنے لگا۔ چپراسیوں کی منتیں کیں اور انھیں ہموار کیا۔ وہ بھی جانتے تھے کہ تعلقدار وقت کا بیٹا ہے۔ نرمی برتی اور مسدود راستہ کھل گیا۔

گھر بڑا تھا۔ بچوں کے کمرے میں وہ آکر مجھ سے مل جایا کرے تو امی کو پتا بھی نہ چلتا تھا اور ابا تو اس وقت دفتر میں ہوتے تھے۔

ایک روز ولایت آیا تھا اور ہم لوگ اپنے کمرے میں جھجو کھیل رہے تھے۔ برابر کے کمرے میں میری سنجھلی بہن امت السلام بیگم صغری سو رہی تھی جو بعد میں صغری نکہت ہوئی۔ یکایک اس کمرے میں چڑیاں بہت شور سے چہکار کرنے لگیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی ان ہونی بات ہونے والی ہے۔ میرے احساس نے جانے کس طرح مجھے جھنجھوڑ دیا۔ دیکھو چھت گرانے والی ہے۔ یہ خیال ذہن میں آیا اور میں برابر کے کمرے میں لپک کر پہنچنے کے لیے اٹھا۔ ولایت نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کہاں جاتے ہو۔ پتہ پھینک کر جاؤ۔ میں نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا۔ کمرے میں داخل ہوا۔ چھت پر نظر کی۔ درمیان کی ناٹ تڑخ رہی تھی جس پر چھت کا سارا بوجھ تھا اور اب آن واحد میں چھت نیچے آنے والی تھی منی بہن صغری بے نیاز، بے خبر، گہری نیند سو رہی تھی۔ میری عمر اتنی تھی کہ میں اس کو اٹھا کر تیز بھاگ نہیں سکتا تھا۔ چھریرا اور دھان پان بھی تھا۔ صغری توانا اور بھاری بھر کم تھی۔ امی مقابل کے کمرے میں تھیں۔ میں بگٹٹ بھاگا۔ گھر بڑا تھا۔ اور یہ کمرہ لگا بسگانہ تھا۔ دالان طویل تھا جسے عبور کر کے جانا تھا۔ میں نے جتنا فاصلہ طے ہو سکتا تھا طے کیا اور امی کو چلا کر آواز دی۔

امی صغری کو لایئے چھت گر رہی ہے

امی چیل کی طرح جھپٹیں۔ میں بھی ان کے پیچھے اضطرار سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ امی نے ادھر ادھر کہیں نظر نہیں کی۔ صغری کو اٹھا کر بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں بھی ان کے پیچھے نکلا اور چھت بیٹھی۔ بس کچھ یوں تھا جیسے چھت ہمارے کمرے سے باہر نکل جانے کی منتظر تھی۔ یہ صرف ایک پل کا معاملہ تھا۔ ہماری بسی بسائی زندگی اجڑنے سے بچ گئی۔

امی کے ہوش ٹھکانے ہوئے تو انھوں نے صغری کو اپنی بانہہ میں جھلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے مجھے چمٹا لیا پھر وہیں فرش پر بیٹھ کر میرا چہرہ آنسوؤں سے دھوتی رہیں اور چومتی رہیں۔

"تو کیوں پیچھے پیچھے آگیا تھا میرے لال۔ تو کیوں آگیا تھا۔ تو ہمارے بعد کمرے سے باہر آیا۔ میں صدقے تیری شان کے میرے اللہ۔ تو نے کیسا فضل کر دیا ہم پر۔۔

اور میں مبہوت کھڑا تھا، امی نے احساس دلایا تو مجھے خیال آیا واقعی میں کیوں اندر چلا گیا تھا۔ یہ کہانی بھی یہاں ختم ہوئی اور یہ میری دوسری زندگی تھی۔

دن بیتے زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی۔ اپنی ولایت کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا۔ کون تھا وہ جس نے مجھے دیوار حائل ہونے کے باوجود گرتی ہوئی چھت جتلا دی تھی۔ کون تھا وہ۔ کہاں رہتا ہے۔ کس وقت نکل آیا ہے۔ میں تو اتنا عصیاں پسند ہوں کہ کبھی اس کی تمنا بھی نہیں کی لیکن وہ زندگی میں بار بار آتا رہا۔

میں فرید سے چھپ کر اسکول تک اس طرح اس کا پیچھا کرتا رہا کہ فرید کو میرے پیچھے پیچھے آنے کی خبر نہ ہو۔ ڈاکٹروں نے کہہ رکھا تھا کہ اس کو یہ احساس ہی نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے اسکول کے ساتھیوں سے کسی طرح کم ہے۔ اس کا باپ اس کا پیچھا اس لیے کرتا ہے کہ وہ "دورہ پڑنے" سے کہیں راستے ہی میں گر نہ جائے۔ میں نے زندگی بھر اس کا پیچھا کیا لیکن اس کے آخری سفر میں، اس کی میت میں اس کے ساتھ کیوں نہیں گیا میں۔ وہ اکیلا چلا گیا۔ اس کو زمین میں چھپا دیا گیا۔ میں نے تو اسے تخت پر لیٹا ہوا آخری بار اس وقت دیکھا جب اس کو کفنانے سے پہلے سنوارا گیا تھا، دلہا بنایا گیا تھا۔ اس کا میرا ایسا کوئی پیمان تو نہیں تھا کہ میں زندگی بھر چھپ چھپ کر تمہارا پیچھا کروں گا۔ چودہ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے تم یہ کام اپنے ذمے لے لینا اور میری زندگی بھر اسی طرح چھپ چھپ کر میرا پیچھا کرنا۔ آج بھی تلسنکرات میں آسمان کی بلندیوں پر اڑتی ہوئی رنگ برنگی پتنگوں کو نظر بچا کر اس طرح دیکھ لیتا ہوں جیسے سب کی سب زمین پر بچھی بچھی میری جھکی جھکی نظروں

کے لیے اڑ رہی ہوں۔ کیا مزہ ملتا ہے جب پتنگیں زمین پر اڑتی ہیں۔

میں دل ہی دل میں، سہما سہما پپن کے بنگلے کی سیڑھیاں گنتا رہا۔ ہر بڑے ڈاکٹر نے کہا کہ اس کو کوئی بھی عارضہ نہیں ہے۔ وہ تو بالکل نارمل ہے۔ کتنے بی ای۔ سی جی نکلے لیکن وہ خالہ کے گھر مہمان گیا تو آج تک لوٹ کر نہیں آیا۔ خالہ کے گھر ہی سے اس نے آخری سفر کی ٹھان لی۔

ایک بار اس کے سر میں چوٹ لگی تھی۔ میں اسے سرکاری دواخانہ لے گیا تھا۔ آوٹ پیشنٹ (OUT-PATIENT) پر زخم دھوکر پٹی باندھ دی گئی۔ زخم دھوتے وقت وہ رویا تھا۔ اس نے اپنا ہی زخم شاید میرے سینے میں رکھ دیا ہے لیکن میں نہیں روتا۔ دیکھیے کیسی غیرت ماری گئی ہے میری۔ کیسے مزے میں زندہ ہوں۔ جب میں اس کو سیکل پر بٹھا کر دواخانے سے گھر لوٹ رہا تھا تو وہ سیکل کے راڈ (ROD) پر بیٹھا ہوا، اتنا سا تھا کہ مجھے جھک کر اس کے سر کا پیار لینا پڑتا تھا اب وہ بہل گیا تھا۔

میں جھک کر اس کے سر کا پیار لیتا اور بولتا۔

"او میرے۔۔

تو وہ کہتا۔ ڈھیلے حنن

او میرے۔ ڈھیلے حنن

او میرے۔ ڈھیلے حنن۔ میں اسے پیار سے حنن بھی پکارتا تھا پپن بھی۔ پپن تو سب ہی پکارتے تھے۔ ڈرپوک یا چھوٹی سی چوٹ پر پریشان ہونے والے کے لیے شاید اس نے ہی یہ لفظ ڈھیلے وضع کرلیا تھا۔ یا پھر کہیں ساتھ کھیلتے بچوں یا ہم جماعتوں میں سنا ہوگا کیوں کہ دکن کی کھڑی بولی میں بزدل کو ڈھیلے بھی بولتے ہیں۔ او میرے۔ ڈھیلے حنن۔

میں نے سب ہی تصویریں اپنے میز کے سامنے شلف پر سجا رکھی ہیں۔ اگر ان کو تکتے رہنے کا موڈ کبھی بن جائے تو ان سے باتیں کرلیتا ہوں۔

سید معید اقبال نوشاد پپن کی تصویر پر نظر پڑتی ہے تو میں آج بھی کہتا ہوں۔

"او میرے"

اور وہ آج بھی جواب دیتا ہے۔

"ڈھیلے حنن"

اس کے باوجود زندگی اچھی لگتی ہے۔ ہنسی کم کم سہی مل تو جاتی ہے۔ میرے خاندان میں قلب کی وسعتیں سکڑ گئیں ہیں۔ میں بہت بری طرح مجروح ہوا ہوں تو اب دوست احباب کو کھنگالتا ہوں۔ بکھری بکھری خوشیاں سمیٹ لیتا ہوں۔ ہم سب میں رہتے ہیں، خواہ دوستوں میں ہوں کہ رشتے داروں میں تو اپنا اپنا "آپا" اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ خود کو تج کر ملتا آدمی شاید بھول گیا ہے۔ وہ جب بھی ملتا ہے اس طرح ملتا ہے کہ دوسرے آدمی کو جھک کر ملنے پر مجبور کرے۔ خود سے جھک کر ملنے میں بڑا لطف ہے اور جھکانے والوں کے آگے اکڑ جانے میں بڑا مزہ۔ بہرحال دیکھیے زندگی کیسی پیاری بلا ہے۔ میں نے بارہا کہا ہے۔ کوٹھے پر ناچتی ہوئی ایسی بیسوا ہے زندگی جس نے پیر میں گھنگرو باندھ لینے سے کچھ ہی پہلے آنچل سے آنسو پونچھے تھے۔ اور بھول گئی۔

اب اس شخص کا ذکر ہے جس کا سایہ میں تھا یا وہ میرا سایہ تھا کچھ پتا نہیں۔ ۱۷ سال کا حسین و جمیل نشید اس طرح گیا کہ ریل کی پٹریاں سینے میں بچھا کر رکھ دیں۔ اپنی پھوپی کے گھر مہمان جانے والا پھر میرے گھر نہیں آیا۔ چھوٹی پھوپی کے پاس سے چلا تو مجھلی پھوپی کے گھر پہنچا۔ گویا دونوں پھوپھیوں کے گھروں سے ہو کر اس کو آخری سفر کے لیے جانا تھا۔ جب

وہ آیا نہیں اس کو لایا گیا تو میں فلم دیکھنے میں مگن تھا۔ رائل ٹاکیز میں۔ جو، اب نہیں رہی۔

آدمی عمارتیں تعمیر کرتا ہے، گرا دیتا ہے، پھر تعمیر کرتا ہے لیکن اللہ میاں نشید جیسے شخص کو جو ہر طرح بے مثال تھا، زندگی دے کر سترہ سال میں اس سے زندگی چھین لیتے ہیں۔ یہ گھاؤ کوئی ان کے سینے میں لگا نہیں سکتا۔ وہ صبر دینے والے بھی ہیں شکر کے مستحق بھی ہیں۔ سب ان کا ہے، ہمارا کیا ہے۔ چپ رہو۔ ورنہ کفر کی سرحدیں دو ایک قدم ہی رہ گئی ہیں۔ بہرحال وہ ساقی ازل ہے۔ کچھ نہ کہو کہ یہ سوء ظن ہے۔

کوئی نچاتا ہے۔ ہم ناچتے ہیں۔ نہ زمین ہے نہ زمین کالمس۔ بس گہرائیاں ہیں، پہنائیاں ہیں، آنکھوں کی، ذہن و دل کی زمیں بھی اسی لیے ہے۔ ہم کو اس کی پہنائیوں میں اترنا ہے۔ بس دیکھتے رہو، سوچتے رہو۔ سوچتے رہو، دیکھتے رہو۔ کیا یہ ممکن تھا کہ نشید بھی میرا نہ رہے۔ مواج دریا ٹھہر سکتا تھا۔ چٹانیں چٹخ سکتی تھیں فولاد پگھل سکتا تھا اگر اللہ میاں اس غم سے ان کی آزمائش کرتے لیکن شیشے سے زیادہ نازک دل اپنی دھڑکن کبھی نہ بھول سکا۔ میں تو رستوں کا آدمی ہو گیا۔ مجھے آج بھی چھوٹے بڑے فاصلے پیدل ناپنے میں جانے کیا ملتا ہے۔ یہاں تک کہ پیر شل ہو جاتے ہیں۔ میرا قلم میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں خودکشی کر لیتا۔ خودکشی کتنی آسان ہے ایسے جینے سے کتنی آسان۔ لوگ اسے ہمت کا کام سمجھتے ہیں تو حیرت بھی نہیں ہوتی۔ آنسو بہہ سکیں کہ نہ بہہ سکیں زندگی کا جز بن جاتے ہیں تو مزہ ملتا ہے۔ رونے کی لذت عجیب لذت ہے نہ عمر دیکھتی ہے نہ توانائی اور خودکشی کو مشکل بنا دیتی ہے۔ اب اسی کو دیکھیے۔ ان دنوں جب کہ میرے جانے کے دن تھے، میں نے جیسے چکمہ دے کر عرفان کو بھیج دیا۔ کیسا ملنسار، کیسا پیارا سا، کتنا معصوم کہ بار بار دل میں رکھ لینے کو جی چاہے۔ شاید میں نے اس کے کان میں کہہ دیا جاؤ۔ اپنے بھائیوں کا جی بہلاؤ۔ ان سے کھیلو۔ خوش رہو۔ یہ دنیا بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ تھوک دو اس پر۔ اس نے چپ کے سے میری بات مان لی۔ میں شاید اس کے پاس اسی لیے گیا تھا۔ مجھ سے مل کر بہت خوش تھا وہ میں اس کے پاس اپنا چھاتا بھول کر لوٹا تو وہ چھاتا اٹھانے میرے پیچھے بھاگتا آیا۔ مجھے روک کر چھاتا ہاتھ میں تھماتا ہوا مسکرا دیا اور پلٹ کر مر گیا۔ نہ کسی موٹر سے ٹکرایا نہ اس پر چھت گری۔ دھڑکنے والا دل یک لخت ٹھہر گیا۔ میرا دل نہیں ٹھہرا، اس کا دل ٹھہر گیا۔ پنّن اور نشو کی طرح اس کا دل بھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی بیماری نہیں ہے کی رٹ لگا رکھی تھی۔ میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ انکار فضول ہے۔ لیکن۔ اب لیکن ویکن چھوڑو بھی۔ جی چاہتا ہے کبھی قیصر سے پوچھوں۔ اپنے کندھوں پر اپنی بے گور و کفن لاش اٹھانے اٹھانے پھرنے میں کیا کیا مل جاتا ہے کیا کیا کھو جاتا ہے؟ اب تم مجھے بتا سکتے ہو۔ جاؤ بھی۔

ضبطِ گریہ ہے نوازش تری، لیکن جاناں
میں ہنسا لیتا ہوں جب خود کو تو غم روتا ہے

اب دیکھیے نا وہ چھت جو بچپن میں مجھ پر اور صغری پر نہیں گری تھی بنجارہ ہلز کے ایک گھر میں، شاید وہ صغری کا بھی گھر تھا یکم اگست 1991ء کو ہم پر گر پڑی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں اور صغری آج بھی ملبے کے نیچے دبے ہوئے نہیں کراہ رہے ہیں۔ پہلے کبھی میں نے یہ تاریخ غلط لکھ دی تھی شاید یکم اگست کی بجائے 5/ ستمبر لکھی تھی۔

اب وہ بات بھی تو یاد آتی ہے کہ میں نے اپنے بچپن کی ولامت کتنی آسانی سے اٹھا کر اپنے دوست ولامت علی کو دے دی۔ آج اپنی اہمیت کو خود ہی گھٹا لینے کا خمیازہ اس طرح بھگتتا ہے کہ ابا، امی نے اس واقعے کا ذکر کم کم ہی کسی سے کیا جو آن واحد میں ہمارے گھر کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیتا اگر تین لاشیں ملبے سے برآمد ہوتیں۔

کرامت علی صاحب تعلقدار کا بیٹا ولایت علی جو میرا دوست تھا اور ابا کا معتوب۔ میں نے ابا کے عتاب کو کم کرنے کے لیے ایک سچے واقعے میں ایک جھوٹ، دروغ مصلحت آمیز کے طور پر شامل کر دی۔ ابا اور امی سے کہہ دیا کہ ولامت علی

(آگے ص ۶۹ پر)

اقبال متین

تعویذ

امی نہ رہیں تو صرف اتنا ہی ہوا نا کہ اپنے کمرے میں نہ رہیں۔ ہمارے گھر میں نہ رہیں۔ اس دم دمے میں بھی نہ رہیں جس کے زنانی دروازے سے سواری گھر جانے پر وہ پردہ داری کی لاج رکھتیں اور راہ گیروں کی نظروں سے خود کو چھپا کر چھپاک سے گھر کی چار دیواری میں ہو جاتیں۔

میں نے اب بے چون و چرا یہ تسلیم کر لیا تھا کہ وہ ابا کے بعد کچھ دن رینگ کر چپ کے سے دنیا سے اٹھ گئیں۔ لیکن چھوٹم نہیں جانتا تھا۔ وہ کہتا تھا بھیا، امی ضرور ابا کے کمرے میں بند ہو گئی ہیں۔ میں ذرا اور بڑا ہو جاؤں تو قفل توڑ کر انھیں باہر نکال لاؤں۔

آج میرا ایسا سا احساس مجھے سمجھاتا ہے کہ ہم لوگ شاید یہ اچھا نہیں کرتے۔ بچوں کے معصوم ذہن کو موت کے خیال سے اس طرح بچاتے ہیں جیسے وہ جان جائیں تو ان کے ذہن پر موت کی پرچھائیں موت بن کر پڑے گی۔ چناں چہ چھوٹم کو زمانے تک امی کی قبر سے واقف نہیں کرایا گیا تھا بلکہ اس کو قبروں کی پہچان تک نہیں تھی۔ مجھے اپنے بڑوں کی یہ حرکتیں بہت اکھرتی تھیں۔ میں صرف سوچ کر رہ جاتا تھا۔ خود بھی اتنی اہلیت نہیں رکھتا تھا کہ انھیں یہ بتاؤں کہ موت کے تصور کے بغیر زندگی کا جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا حسن نکھرتا ہی اس تصور سے ہے۔ تتلی کے پر پردوں پر اپنا رنگ نہ چھوڑ جائیں تو وہ پلاسٹک کی ہو جائے گی۔ موت کو ہم نے خوفناک بنا رکھا ہے ورنہ وہ تو زندگی پر ایسی رنگ برنگی چھینٹ اڑھاتی ہے کہ کبھی کبھی اس کے آنچل کا سایہ زندگی کو سنوار دیتا ہے۔ شاید یہ بھی اپنا اپنا سوچنے کا انداز ہو۔ لیکن ایسا بھی کیا کہ جس ہونی کا نہ ہونا ممکن نہیں۔ جس کا زندگی سے چولی دامن کا ساتھ ہو اس کا ایک حصہ چھپا کر زندگی کو معصوموں کے ہاتھ میں تھما دینا کہ لو اس سے کھیلو۔ بھلا یہ کھیل کتنے دن کھیلا جا سکتا ہے۔

امی کی کھلی آنکھوں پر ابھی کسی ہاتھ نے پپوٹے نہیں ڈھانکے تھے کہ چھوٹم کو رشتے داروں میں کہیں دور بھجوا دیا گیا۔ میرے ساتھ یہ سازش کوئی کر نہ سکا۔ امی جب گھر سے جانے لگیں تو ہنس اٹھی اور میں بین کرتی عورتوں اور انتظام میں مصروف مردوں کی دھکا پیل سے بچ نکلا۔ اپنے سانس کو قابو میں کرنے سے پہلے ہی میں نے خود کو ایک ایسی موٹر کار کی پچھلی سیٹ پر چھپا لیا جو امی کے ساتھ جانے والی موٹروں کی قطار میں شامل تھی۔ مجھے یقین ہوا کہ امی نے ہی کار کا پٹ کھول کر مجھے اندر ڈھکیل دیا ہو گا۔ وہ ہماری خدمت کا کچھ ایسا ہی طریقہ نکال لیتی تھیں کہ صرف ان کو معلوم ہو اور ہمیں معلوم ہی نہ ہو کہ وہ ہمیں محفوظ کر رہی ہیں۔ نیند میں بستر پر لوٹ پوٹ ہونے سے میرا بدن کھل کھل جاتا تھا۔ وہ اس طرح اڑھاتیں جیسے اپنا آپا اڑھا رہی ہوں اور میری دو کھی سوئی نیند کو منا رہی ہوں۔ وہ اکثر کہتیں، تو رات بھر بستر پر سوتا ہے یا نیند کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ان کا یہ اندازِ اظہار مجھے اچھا لگتا۔ ویسے میرے تعلق سے یہ بات مشہور تھی کہ میں کلاس میں سو جاتا ہوں محفلوں میں سو جاتا ہوں۔ شادی کی باراتوں میں سو جاتا ہوں۔ یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان کھڑا کھڑا سو جاتا ہوں۔ اپنی مدماتی آنکھوں کی یہ باتیں سن سن کر کان پک گئے تھے لیکن بستر پر نیند کو ڈھونڈنے کی بات صرف امی ہی کرتیں اور ابا یہ سن کر مسکرانے کی کوشش کرتے۔

چھوٹم گھر واپس آیا تو ڈھیر سارے کھلونے اس کے ساتھ تھے۔ وہ خاندان کے دوسرے بچوں میں جو امی کے گھر

سے چلے جانے کے بعد دوسرے ہی دن آہستہ آہستہ اپنے اپنے بزرگوں کے پاس آگئے تھے مگن تھا۔ ایک ایک کھلونے کی چابی گھما کر اس کی نمائش کرتا۔ ان دنوں الکٹرانک کھلونے نہیں نکلے تھے۔ چابی گھمانے کا کاروبار تھا۔ بڑے بزرگ اسی چابی کو کھلونوں کے لیے بھی استعمال کرتے اور شاید کھیلنے والے بچوں کے لیے بھی۔ اسی لیے بچے زیادہ معصوم تھے اور بزرگ کم آشنا۔

میں کچھ زیادہ ہی سوچتا تھا۔ نہیں معلوم یہ سوچ کی مظلومیت میرے بچپن ہی میں کہاں سے دبے پاؤں مجھ میں داخل ہوگئی تھی۔ چھوٹم کی یہ حرکتیں مجھے دل ہی دل میں روہانسا کرنے لگیں۔ اس نے میری طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ جی چاہا اس کے سارے کھلونے لے کر امی کی قبر پر رکھ دوں۔ ان سے کہوں لو اب ان کی حفاظت کرو۔ گردن جھنے دو ان پر اور چھوٹم سے کہوں جا سارے کھلونے مٹی کے اس تودے پر سے اٹھالا جس پر میں نے رکھے ہیں اور اسی میں امی دبی پڑی ہیں۔ تجھ سے بن پڑے تو انھیں بھی مٹی ہٹا کر نکال لے اور تیری اس موٹر سیکل سے جڑے کیریر میں ٹھونس لا جو تیرے پہنچنے کی مدد سے اس لیے بنا ہے کہ تیری اس موٹر سیکل کا توازن کر سکے۔

چھوٹم کی یہ موٹر سیکل بڑی شاندار تھی۔ بڑے دالان میں جہاں امی کی میت رکھی گئی تھی دوڑتا ہوا بڑا سا چکر مار کر بھی آہستہ آہستہ چلتا رہتا تھا۔ چابی ختم نہ ہوتی تھی جیسے چھوٹم کے ہاتھوں کی گرفت کی منتظر ہو۔ اور چھوٹم لپک کر اسے اٹھالیتا۔ سب دوسرے بچے تالیاں پیٹتے۔ مجھے محسوس نہیں یقین ہونے لگتا کہ امی بہت بے چین ہوں گی۔ چھوٹم کی موٹر سیکل کو وہ اس جگہ کا طواف کرتے کس طرح دیکھ سکتی ہیں۔ جہاں ان کی آنکھ نہ کھلنے کے لیے آخری بار لگی تھی۔ وہ بھی موٹر سیکل کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی ہوں گی کہ فٹ سے اٹھا کر چھوٹم سے کہیں۔ یہاں نہیں۔۔ کہہ رہی ہوں، یہاں نہیں۔۔ بھاگ یہاں سے۔۔ وہاں اتنا بڑا آنگن پڑا ہے، گھما اس میں اپنی موٹر سیکل۔

امی بھی کتنی بھولی ہیں۔ کیا نہیں جانتیں کہ صحن کی اوبڑ کھابڑ زمین پر چابی کی موٹر سیکل نہیں بھاگتی؟۔۔۔ اور چھوٹم اگر اس جگہ کے چکر کاٹے تو کیا ان پر تصدق ہو جائے گا۔

میرا جی چاہا یہ جو امی کو میں چھوٹم کی موٹر سیکل کے ساتھ بھاگتا ہوا صاف دیکھ رہا ہوں منٹ بھر کو پکڑ کر موٹر سیکل کی چابی انھیں تھمادوں۔ کہوں یہ چابی تم لے جاؤ ورنہ یہ چابی چھوٹم کے ذہن کو سوچ سے عاری کر دے گی۔ اور امی ۔۔ سنو امی دیکھو، وہ زندگی بھر کھلونوں کے پیچھے بھاگتا رہے گا۔۔ دیکھو نا کیسا مگن ہے۔ میں روہانسا ہوں تم نے اتنی دور جا کر ذرا بھی دراز میں سے ہاتھ نکالی نہیں کہ پھر بھاگ آئیں۔ مجھے چھوٹم سے کوئی بیر نہیں ہے۔ تمھارے لاڈ پیار کا بھی میں نے کبھی برا نہیں مانا۔ تم غلط سمجھتی رہیں۔۔ اس نے پتھر پھر کا کر مجھے مار دیا تھا کیسا تڑپ کر رہ گیا تھا میں۔ اس پہ جھپٹا تو تم آڑے آگئیں۔

"جانے بھی دے بیٹا۔ چھوٹا بھائی ہے۔۔

"تو کیا اب بڑا ہو گا ہی نہیں۔۔

بس برا مان گئیں تم۔۔ "زبان سے ایسے الفاظ کیوں نکالتا ہے۔۔ میری چوٹ نہیں دیکھی۔ ہو گئیں اسی کی حمایتی۔

ایسے دم دلاسے کسی بچپن کو مرنے سے بچالیتے ہوں گے لیکن زندگی کو مر مر کر جینے سے نہیں بچا سکتے۔ چھوٹم میرا بھی ہے امی، اور اب تو تم سونپ گئی ہو مجھے۔ لیکن کیا کروں کہ مجھے یہ اتھلا تھلا جینا اکھرتا ہے۔ اسی لیے شاید مجھے اس وقت چھوٹم کی خوشی بھی بری لگتی ہے۔۔۔ امی۔ کیا ہم پر قیامت نہیں ٹوٹی؟۔۔ اور ہم جھولا جھول رہے ہیں۔ کیا ہم کھلونے دے کر بہلانے کے لیے رہ گئے ہیں۔ آپ بھی عجیب ہیں امی۔ مجھے آپ یاد آرہی ہیں۔ آپ کی باتیں یاد آرہی ہیں۔

"آخر تو کیا بنے گا رے۔ کیا بنے گا آخر۔ ہمیشہ ہی الٹی سیدھی سوچتا ہے۔۔۔۔۔ "چونچ سے دانہ اٹھانا آنے نہیں۔ کہے چونچ ہی توڑ پھینکوں۔۔

اچھا اب چھوڑ یے بھی مجھے۔ کہیں جا کر رولوں گا۔ آپ پیچھا کریں گی تو چین سے رو بھی نہ سکوں گا۔ اچھا ہے آپ اپنے چھوٹوں کے ساتھ رہیں۔ کیسا مگن ہے وہ۔ آپ سے میری نہیں بنتی۔

ایسی باتیں امی سے زندگی بھر ہوتی رہیں۔ میں برا بھی مانتا رہا۔ لیکن آج وہی باتیں اچھی محسوس ہو رہی ہیں تو زبان کو لفظ نہیں ملتے۔ آنکھوں کو آنسو نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی جینا ہوا کہ آنسو بھی اپنے نہ رہے۔

لیکن یہ سب کچھ کتنے برسوں کا تھا۔ وقت زخموں کا اندمال کرتا ہے۔ اس حقیقت سے مفر نہیں لیکن اتنا ہی ہوتا ہے کہ ہرے زخم ہرے نہیں رہتے۔ درد بن کر نس نس میں سرایت کر جاتے ہیں۔ مرہم لگانا چاہو تو دکھائی نہیں دیتے۔ میرے کالج میں پہنچنے تک ابا اور امی کسک بن کر رہ گئے تھے۔ میں نہ چوٹ لگی تو بلبلاتا تھا نہ گھایل ہوتا تو پلکیں بھیگتیں۔ یہ ٹھہراؤ کچھ عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ جیسے جوانی نے خود کو بڑھاپے کے حوالے کر دیا ہے اور بہت شانت ہو گئی ہے۔ قہقہے ہنسی میں بدلے اور ہنسی مسکان بن کر بھی ہونٹوں سے بچ نکلی۔ اتنا ضرور ہوتا کہ کبھی کبھی ہونٹ اس بھولی بسری مسکراہٹ کو پکڑ لاتے۔۔ لوگ کہتے، میں مسکراتا ہوا اچھا دکھائی دیتا ہوں۔ مجھے امی کا وہ جملہ یاد آتا۔ "تو رات بستر پر سوتا ہے یا نیند کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔۔

میں نہیں جانتا ان دونوں جملوں میں کہیں کوئی مماثلت ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں بستر پر زیادہ ہی بے آرام رہنے لگا تھا۔ محفلوں میں، مسافروں سے بھری بس میں، یہاں تک کہ ایک اچھا طالب علم ہونے کے باوجود کلاس میں سو جانا میرے لیے کوئی بات نہیں تھی۔

سوتے جاگتے زندگی بیت جاتی ہے۔ لیکن وہ آنکھیں جانے کیوں میرے حصے میں آگئیں جو تنہائی میں جاگتی رہتی ہیں اور محفلوں میں سو جاتی ہیں۔ بالکل اس کمرے کی طرح جس کو امی نے ابا کے بعد بند کر رکھا تھا اور چھوٹو کہتا تھا کہ امی اسی میں بند ہیں اور ایک دن وہ اسی کمرے سے انھیں برآمد کر لے گا۔ آج ہم یہی کر رہے ہیں۔ امی کو اپنے اندر سے برآمد کرتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، پھر اپنے اندر چھپا لیتے ہیں۔ اب ہم ہی وہ کمرہ ہو گئے ہیں جسے پھوپی امی مقفل رکھتی ہیں۔

پھوپی امی نے امی کے جہلم کے بعد اس کمرے کو کھول کر عود اور لوبان کا دھواں دلوایا تھا۔ اور کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہلائے بغیر جھاڑ جھٹک کر اپنے ہاتھوں صفائی کر دی تھی۔ اس دوران کبھی کبھی ان کا پلو ان کی پلکوں کی نمی جذب کر لیتا تھا۔

پھوپی امی نے اس کمرے میں سات دن تک تلاوت قرآن خود بھی کی اور قریبی اہالیان خاندان خواتین کو بھی اس موقع پر اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ جب قرآن کا ورد ہوتا، مجھے ایسا لگتا جیسے کمرہ ویران سا ہو گیا ہے، یا بین کر رہا ہے، یا اونگھ رہا ہے۔ میں آج سوچتا ہوں، ان دنوں اس احساس کی کوئی توضیح نہ کر پاتا تھا۔ شاید ہمارے بڑوں نے اللہ سے پیار کرنا ہمیں نہیں سکھایا۔ اس سے اس درجہ خوف دلایا کہ ہمارے سرکار پر اتارا ہوا قرآن، طاق کی زینت تو بن کر رہ گیا، دل میں اتر کر اس کو منور نہ کر سکا۔ ہاتھوں کے رحل تو بنے، پڑھا بھی گیا تو طوطے کی طرح۔ مذہب نے انسانیت کے رشتے ضرور تلاش کیے تھے لیکن غم کو ناآسودگی سے زیادہ اہمیت ہی نہیں دی اور وہ جذبہ جو خدا کی پہچان تک لے جا سکتا تھا صبر کے نام سے خوف کی نذر ہوتا رہا۔ یہ اوٹ پٹانگ باتیں میں آج سوچتا ہوں، ان دنوں میرا ذہن صرف اس بات پر کڑھتا تھا کہ پھوپی امی مجھے اور چھوٹو کو اس کمرے میں داخل ہونے سے روکتی تھیں۔ چناں چہ میں بھی چھوٹو کو روکنے لگا تھا۔ چھوٹو نے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ۔۔۔ "بھیا مجھے ڈر لگتا ہے، تم ساتھ رہو تو امی کو اس کمرے میں ڈھونڈیں۔

میں نے بپھر کر اسے ڈانٹ پلائی تھی اور کہا تھا۔ "امی مر گئی ہیں، اب کبھی نہیں آئیں گی۔۔

اس نے روہانسا ہو کر کہا تھا۔ "مر گئیں تو مر گئیں مگر اس کمرے میں تو رہ جاتیں۔۔

میں نے اپنی بڑائی کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔ "تو بدھو ہے۔ مر گئی ہیں تو پھر۔ یہاں کیسے رہ سکتی ہیں۔۔

ہاں، اس نے کہا تھا۔۔ لوگ کہتے ہیں مرجانے کے بعد کوئی کبھی نہیں آتا۔ لیکن یہ لوگ جو زندہ ہیں مرنے والوں کو پکڑ کر کیوں نہیں روک لیتے۔

میں جانتا تھا کہ خدائی میں کوئی دخل نہیں دے سکتا لیکن چھو ٹم کو یہ بات کیسے سمجھا سکتا تھا میں۔ ہاں خدائی سے مجھے خود خوف آنے لگا تھا۔ میں یہ بات کسی کو بتلا بھی نہیں سکتا تھا۔

چھو ٹم نے بھی زیادہ حجت نہیں کی۔ کہا۔ "بھیا آخر امی جی کہیں رہتی تو ہوں گی۔۔

میں نے کہا۔۔ "ہاں رہتی ہیں۔

"تم جانتے ہو اور ملتے بھی ہو۔۔

"مجھے چھوڑ کر اکیلے ملتے ہو بھیا۔ مجھے ملاؤ نا۔۔

میں نے کہا۔ ایک دن لے چلوں گا تجھے۔۔ دیکھ لینا امی ایک چھوٹے سے کمرے میں کس طرح رہتی ہیں۔

چھو ٹم اپنے دوست و نکٹ مرلی اور اس کی چھوٹی بہن کی طرح امی کو امی جی پکارنے لگا تھا۔ ابا کے بارے میں کچھ کہتا تو ابا جی کہتا۔

میں نے چھو ٹم سے رازداری میں کہا کہ یہ ساری باتیں پھوپی امی کو بتلانا نہیں۔ ہم کو چھپ کر امی سے ملنے جانا ہو گا۔ چھوٹے نے خوشی خوشی مجھ سے وعدہ کرلیا۔

میں ان دنوں بس ایک بات بڑی شدت سے محسوس کرتا تھا کہ کمرے کے دروازے کے دونوں پٹ پھوپی امی دا بھر کھلے رکھتیں۔ شام ہوتے ہی پیتل کا بڑا سا چراغ جلا کر کمرے میں رکھ آتیں۔ ایسے میں مجھے یہ کمرہ بڑا آباد سا لگتا۔ بجلی، کمرے میں تھی ضرور لیکن کٹ گئی تھی۔ میں نظریں بچا کر کبھی دن میں کبھی شام کے بعد کمرے میں گھس جاتا اور ایک ایک چیز غور سے دیکھتا۔ ہوا کھلانے کے لیے پھوپی امی الماری کے پٹ ادھ کھلے رکھتیں۔

ایک قمیص اور پاجامہ الماری میں نفاست سے تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ نوٹ بک کے ایک پورے صفحے پر امی نے بڑے حروف میں لکھا تھا، اور پنوں سے یہ کاغذ تہہ کیے ہوئے جوڑے پر ٹانک دیا تھا۔ لیکن میں نے غور سے دیکھا تھا کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ لکھا تھا "میرے صاحب انتقال کے وقت یہ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔۔ میرا جی چاہا یہ کپڑے چپکے سے پہن لوں اور چھو ٹم سے کہوں چل بھی امی سے مل آئیں۔ تو میرے کپڑے پہن لے۔ دیکھیں۔ اب وہ ہمیں پہچانتی بھی ہیں۔

پھوپی امی نے کبھی امی کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا۔ "بھائی صاحب کہتے تھے کہ میرے بیوی میری ساری بہنوں اور خاندان کی بزرگ خواتین سے زیادہ پڑھی لکھی ہے۔ اس کا املا اور انشا ان سب سے زیادہ درست ہے اور میں نے اردو کے ماسٹر صاحب سے "زیب تن" کے معنی پوچھ لیے تھے۔

آج میں امی کو زیادہ ہی سوچ رہا تھا۔ ذہن میں ہر طرف وہ تھیں اور آنکھوں میں ان کا کمرے میں سلیقے سے رکھا سامان۔ میری امی بڑی سلیقہ مند مشہور تھیں۔ لیکن سب سجا کر ہمیں چھوڑ گئی تھیں تو مجھے ان کے سلیقے سے شاید بیر ہو گیا تھا۔ میری نظر جزدان میں لپٹے ہوئے قرآن شریف پر پڑی تو میں نے بہت احتیاط سے قرآن شریف کو چھوئے بغیر جزدان کھول دیا۔ کتنے ہی سوکھے ہوئے پھول میرے قدموں میں بکھر گئے۔ میں نے جھر جھری سی لی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔۔ شاید یہ خوف ہی تھا کہ میں نے جھک کر پھول نہیں اٹھائے۔ احتیاط سے جزدان کو اسی طرح باندھ کر قرآن شریف کو دوسرے کمرے کے اوپری طاق میں رکھ آیا۔ بڑا سکون ہوا تھا مجھے جیسے میں نے اللہ میاں کو میرے اور امی کے درمیان سے ہٹا دیا ہے۔

گھر والوں کی آنکھ بچا کر اس کمرے میں گھس جانا میرا معمول ہو گیا تھا۔ قرآن شریف کو دوسرے کمرے میں رکھ

آنے کے بعد مجھے اس کمرے میں بڑا سکون ملنے لگا تھا۔

میں ایک ایک چیز کو چھونے بغیر اوپر ہی اوپر غور سے دیکھتا اور امی کے سلیقے کی دل ہی دل میں داد دیتا۔ بہت جی چاہتا تو کسی چیز کو احتیاط سے کھول کر دیکھ لیتا، پھر اسی طرح جگہ سے ہلائے بغیر رکھ چھوڑتا۔

محراب میں دھرے، لکڑی کے ایک چھوٹے سے قلم دان کو میں نے کئی بار دیکھا تھا۔ بہت جی چاہتا تھا کہ اسے کھول کر دیکھوں کہ آخر اس میں امی نے کیا رکھ چھوڑا ہے لیکن میرا ہاتھ محراب تک نہیں پہنچتا تھا۔ باہر دالان سے چوپائی اٹھا لانے اور اس پر چڑھ کر قلمدان کا ڈھکن کھولنے کے منصوبے میں کب سے بنا رہا تھا۔ پھوپی امی، مینہ باجی کے گھر مایوں میں دن سے ہی چلی گئی تھیں۔ میرے لیے یہ سنہرا موقع تھا۔ کمرے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور اگر بتیاں جل رہی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر چوپائی اٹھالی اور سیدھے محراب کے مقابل زمین پر رکھ دی۔ جلدی میں شاید دیوار سے اس قدر گھٹا کر رکھ دی تھی کہ میرا اس پر کھڑا ہونا محال تھا۔ ایک بار کوشش کرکے میں نے چوپائی کا دیوار سے فصل برابر کیا اور اس پر چڑھ کر اطمینان سے چوبی قلمدان کا ڈھکن کھولنا چاہا تو ڈھکن آدھا کھل کر محراب کی چھت کو چھو لیتا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ قلمدان کو محراب سے نکال لیا جائے۔ چناں چہ میں نے بڑی شتابی سے یہ کام انجام دیا اور چوپائی سے اتر کر قلم دان اس پر رکھ دیا۔ کھولا تو خوش بو کے بھبکے نے مجھے مسحور کر دیا۔ یہ تو عطر دان نکلا۔ کوئی بارہ عدد شیشیاں ترشے ہوئے چوبی فریم کے جال میں جکڑی ہوئی عطر دان میں دھری تھیں۔ عطر میں بھیگی ہوئی ایک چھوٹی سی پڑیا تھی۔ میں نے یہ پڑیا عطر دان سے نکالی تو میری ہتھیلی اور انگلیوں کی گرفت بھر گئی۔ میں نے احتیاط سے جیب میں ٹھونس لی کہ یہاں کھڑا رہ کر اس کا جائزہ لینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میری ہتھیلی، میری انگلیاں، خوش بو دار ہو گئی تھیں۔ اس پر بھی میں نے ایک ایک شیشی عطر دان سے نکالی، کوئی بالکل خالی تھی لیکن مہک رہی تھی۔ کسی میں پاؤ شیشی عطر تھا۔ نیلا نیلا سا۔ کارک کا ڈاٹ نکالتے ہی خس کی بو نے نتھنوں کو معطر کر دیا تھا۔ کسی میں ایک دم گہرے سرخ رنگ کا عطر تھا۔ تقریباً بھری ہوئی اس شیشی سے کوئی اچھی سی مانوس سی خوش بو آتی تھی۔ میرا اس خوش بو سے واسطہ سا لگتا تھا جیسے یہ میرے بچپن سے ساتھ ساتھ رہی ہو۔ جی چاہتا ہے، اس کا صحیح رنگ آپ کو سمجھا سکوں۔ یوں سمجھ لیجیے، چائے کا گہرا DECOCTION۔ بس یہ رنگ تھا اس کا۔ زیادہ شیشیاں خالی تھیں۔ دو ایک میں پیلا پیلا اور گلابی سا عطر تھا جو آدھی آدھی شیشی سے کم ہی تھا۔ میں نے ہر وہ نکالی ہوئی شیشی اس کی جگہ رکھ دی تھی جس کو کھول کر دیکھا تھا، سونگھا تھا اور اس طرح اپنا کام پورا کر آیا تھا۔ عطر دان کو دونوں ہاتھوں میں احتیاط سے پکڑ کر میں "اسٹول" پر چڑھ گیا اور طاق میں رکھ چکا تب بھی اطمینان کا سانس نہ لے سکا۔ کمرے سے باہر نکل کر میں نے دیکھا۔ عباسیہ کی ماں جو ہمارے گھر، اوپر کا کام کرتی تھی الگنی پر بھیگے ہوئے کپڑے، سکھانے کے لیے ڈال رہی تھی۔ اس نے مجھے مسکراتے ہوئے بغور دیکھا۔ میں ذرا سا بوکھلا گیا اور اس کی مسکراہٹ کو معنی پہنائے بغیر کمرے میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد جھانک کر باہر دیکھا تو وہ نہ تھی۔ چھپاکے سے میں نے باہر لے جا کر چوپائی اس کی جگہ رکھ دی۔

پیچھے سے کسی نے آہستہ سے کہا۔۔ "بیٹا! ماں یاد آتی ہیں نا۔۔

میں نے مہکتی ہوئی پڑیا کو جیب میں ہی دبوچ لیا جیسے اس کی مہک کو دبوچ رہا ہوں۔ پلٹ کر دیکھا۔ عباسیہ کی ماں تھی۔

میں نے کہا۔ "نہیں نہیں اور چلتا بنا۔۔

میں نے پڑیا اپنے لکھنے پڑھنے کی میز کے ڈرائر میں رکھ لی کہ کہیں باہر لے جا کر اور سب کی نظروں سے بچا کر اطمینان سے دیکھوں گا۔ کچھ دیر تک میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے میرا سکون چھن گیا ہے۔ جیب میں ٹھنسی پڑیا نے جیب سے الگ ہو کر اپنی خوش بو اور ذرا سی نمی جیب میں بسا دی تھی اور اس کی مہک مجھے میری امی کی یاد دلا رہی تھی۔

امی کے قرینے اور سلیقے کی باتیں تو کبھی خاندان بھر میں ہوا کرتی تھیں۔ ادھر بند کمرہ کھل کر جب میرا رازداں ہوا تھا تو میں نے بھی قدم قدم پر امی کا سلیقہ دیکھا تھا۔ ہر چیز کو جتن سے رکھنے والی امی مجھے محفوظ نہ کر سکیں۔ میں اسی کسک کو ان کی یادوں کا قرینہ سمجھنے لگا تھا اور مجبوری سے سمجھوتہ کیے جا رہا تھا لیکن چھوٹم کو دیکھ دیکھ کر امی سے کبیدگی کا احساس بڑھنے لگتا تو میں امی ہی کو بھول جانے کے جتن کرتا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ چھوٹم کو اتنا بے کس و نامراد چھوڑ کر امی موت کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔ ان کے سارے قرینوں سے مجھے بیر سا ہونے لگتا لیکن پھر فوری ہی ان پر ترس آنے لگتا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ موت ظالم ہوتی ہے۔

میں نے سوچا کہ ہاتھ اچھی طرح دھولوں اور کپڑے بدل لوں کہ امی کی خوش بو سے مجھے چھٹکارا ملے لیکن یکایک میرے ذہن نے فیصلہ کن انداز میں بات سمجھا دی کہ تم جب تک بند پڑیا کھول کر نہ دیکھ لوگے بے آرام رہو گے ۔۔ دیکھ لو۔ پھر صابن سے ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لینا۔ میں نے دیر نہیں کی۔ اپنی میز کے خانے سے پڑیا نکال کر پاجامے کے نیفے میں اڑس لی اور باہر چلا آیا۔ گھر سے اتنے فاصلے پر کہ کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ میں نے پشت راستے کی طرف کی اور پڑیا پھر سے ہاتھوں کی گرفت میں جکڑ کر کھول دی کہ جیسے وہ پھر سے کہیں اڑ نہ جائے گا۔

اس پڑیا میں چار چھوٹے چھوٹے سے تعویذ نکلے۔ میں سمجھ گیا کہ قرآن پاک کی آیتیں ہوں گی جو عطر میں بھیگ بھیگ کر پھول گئی ہیں۔ میں نے کھول کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اس میں ایک دانت تھا اور لپٹے ہوئے کاغذ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ جو عطر میں بھیگ جانے کے باعث پڑھا نہیں جاتا تھا۔ میں نے دوسرا تعویذ کھولا تو اس میں بھی ایک کلساٹ مائل دانت نکلا۔ کاغذ کی تحریر بغور دیکھنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر یہ دانت کس کے ہیں۔ اب تحریر سے میری دل چسپی صرف اس حد تک رہ گئی تھی۔ امی کی ہنستی ہوئی بنسی تصور میں کھل جاتی تو مجھے کسی کمی کا احساس نہ ہوتا۔ ان کے تو سارے ہی دانت موتیوں کی طرح چمکتے تھے۔ تیسرے تعویذ میں بھی یقین تھا کہ دانت ہی ہو گا۔ میں تعویذ کھولا تو دانت ہی نکلا۔ دونوں دانتوں سے اجلا تھا۔ تحریر صاف پڑھی جاتی تھی۔ جو پڑھا نہ جاتا تھا وہ ایسا تھا کہ اس نے جیسے اپنی اہمیت کھو دی ہے۔

"میرے صاحب کا تیسرا دانت جو عزیز از جاں چھوٹم سلمہ کی ولادت کے پورے دو ماہ دو دن بعد مسواک کرنے کے دوران نکل گیا تھا۔"

سات سال پہلے کی تاریخ درج تھی اور میں چھوٹم سے پانچ سال سے کچھ اوپر ہی بڑا تھا۔ میں چاہتا تو اس تاریخ کو بہ آسانی یاد رکھ سکتا تھا لیکن میری بھیگی ہوئی آنکھوں کو امی نے اپنے ہی حال میں چھوڑ دیا تو چھوٹم جیسے مجھ سے چمٹ کر رونے لگا۔ میں جان گیا تھا کہ چوتھے تعویذ میں بھی دانت ہے۔

امی نے ابا کے دانتوں کی تک حفاظت کی اور چھوٹم کو چھوڑ گئیں۔ لیکن کیا امی بے قصور نہیں ہیں؟ ہمیں چھوڑ رہی تھیں تو ان کے بس میں کیا ہو گا۔ میں نے چمٹے ہوئے چھوٹم کو جو مجھ سے دور رہ کر بھی چمٹا ہوا رہتا تھا، الگ کرنا چاہا۔ پھر جانے کس جذبے کے تحت کچھ سوچے بغیر دانتوں کے چاروں تعویذ سامنے بہتی ہوئی گٹر میں پھینک دیے۔ دو ایک کاغذ دانتوں سے الگ ہو کر گٹر میں تیر رہے تھے اور دانت ڈوب گئے تھے۔

امی جھپٹ پڑیں۔ میرے دونوں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے تھام لیے:

"یہ کیا کر دیا تو نے؟ یہ کیسے کر سکا تو۔"

میں نے جھٹکا دے کر امی کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ جدا کیے اور وہ بھیگی آنکھوں سے مجھے تکتی ہوئی چھپاک سے غائب ہو گئیں۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ کچھ سنبھل کر اپنی آنکھیں ہتھیلیوں سے پونچھی تھیں تو آنکھیں مع ہتھیلیوں سے جلنے لگی تھیں۔ میں نے صابن سے ہاتھ دھوئے تھے۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر قمیص بدل لی تھی۔ چھوٹم، عباسیہ کی ماں کی چٹائی پر پڑا پڑا مجھے مٹ مٹ دیکھ رہا تھا۔ قمیص بدل لینے سے بھی امی کی خوش بو نہیں گئی تھی۔ مجھے لگا تھا جیسے امی مجھ میں بس رہی ہیں اور چھوٹم میرے سارے راستے مسدود کر رہا ہے اور شاید میں نے اب کلاس میں سونا بھی چھوڑ دیا ہے۔

***

اقبال متین

○

(آبائی گورستان اصفیا باغ ــ متوبت "گوشۂ ناصر" کے پس منظر میں)

پس پندار کوئی شعلہ نم روتا ہے
میں نے خود جس کو تراشا وہ صنم روتا ہے

اب تو کم کم ہی تری یاد کبھی آتی ہے
اب تو میرا دلِ ناشاد بھی کم روتا ہے

ضبطِ گریہ ہے نوازش تری ، لیکن جاناں
میں ہنسالیتا ہوں جب خود کو تو غم روتا ہے

میں تو سائل ہوں ترے در پہ ٹھہرجاؤں گا
کیسے مانوں ترا اعجازِ کرم روتا ہے

اب نہ رشتے ہیں ، نہ مٹتی ہوئی قبروں کے نشاں
اب مرے بیٹوں☆ کو دیوار کا غم روتا ہے

میں نے جی لینے کا کیا ڈھنگ نکالا دیکھو
میں نہیں روتا ہوں جب میرا قلم روتا ہے

تار چھیڑوں بھی تو جھنکار سے محروم رہوں
اور جو مضراب سے چھولوں بھی تو سم روتا ہے

ظلم کی جب کوئی تاریخ نہیں لکھ سکتے
خون ہر سانس سے بہتا ہے ، ستم روتا ہے

فن کو فن کار کا انعام سمجھنے
نقشِ مانی پہ بھی ژولیدہ رقم روتا ہے

کچھ مرے دیدۂ پرآب پہ موقوف نہ
ان کے ہاتھوں گلِ شاداب کا نم روتا ہے

وہی حضرت تو پڑے پھرتے ہیں اقبال
جن کے اترانے پہ خود ان کا بھرم روتا

○○○

☆ سید فرید اقبال مرحوم (13 سال) سید رشید اقبال مرحوم (17 سال) سید سعید مرحوم (11 سال)

اقبال متین

○

میں دور دور رہا بھی تو تیرے پاس رہا
مگر یہ سچ ہے کہ جاناں بہت اداس رہا

نہ بچ کے جاسکا تیرے بدن کی خوش بو سے
ہوا کا جھونکا بھی آشفتہ حواس رہا

ملی نہ فرصتِ یک لمحہ اس کو اپنے سے
نظرشناس رہا وہ ، نہ غم شناس رہا

بہت عزیز تھی مجھ کو بھی اپنی برنائی
مگر وہ دردِ تہہ جام بے سپاس رہا

مگر وہ زعم ترے سامنے پنپ نہ سکا
مگر یہ رنج انا کی مری اساس رہا

یہ التفات بھی کیا کم ہے اس زمانے میں
تو تنگے پاؤں رہا ، میں بھی سبز گھاس رہا

متین روزنِ دل سے ذرا سا جھانک تو لے
وہ تو ہی ہے جو کسی وقت اپنا داس رہا

●○●

○

وعدہ کرکے نہ آنے والا ۰ آج بھی اب تک آیا نہیں
اس کو دیکھو ۰ آس کا مارا پگلا جی گھبرایا نہیں

بات ہماری جھوٹ لگے تو اس کی گلی میں جاکر پوچھو
شام ہوئی گھر سے نکلا تھا ۰ بھور بھئی گھر آیا نہیں

کاجل گالوں پر پھیلا ہے ۰ پیشانی بھی گیلی ہے
صبح کا چاند اور شام کا سورج ۰ کون گمن ۰ گہنایا نہیں

ندی کنارے بھیڑ لگی ہے ۰ بجرا کوئی کھیتا ہے
ڈوبنے والا ڈوب رہا ہے ۰ تو دیکھن کو آیا نہیں

کون اسے چھپ چھپ کر دیکھے ۰ کون اسے دل میں رکھ لے
وہ تو ایسا ہرجائی ہے آج تلک پچھتایا نہیں

بستی بستی آگ لگی ہے ۰ مسجد مندر سب ہی جلے ہیں
ایک زمین پر ایک گگن ہے ۰ اوم نہیں ہے خدایا نہیں

اس دھرتی پر باری باری ناچنے والے رہتے ہیں
ایسی دنیا دے کو بھگون ۰ تو ڈفلی بھی بجایا نہیں

اب یوں چپ چپ رہنا چھوڑو ۰ ہمری سنو اقبال متین
کوئی کسی کا میت نہیں یاں ۰ اپنا نہیں جو ۰ پرایا نہیں

●○●

کے۔ یس شفیق

شخصیات۔ مرحوم والدین

[جناب خواجہ شمس الدین شفیق محکمۂ لیبر کمشنر میں جائنٹ کمشنر رہے ہیں۔ وظیفے پر سبک دوش ہونے کے بعد نظام شگر گروپ آف انڈسٹریز میں چیف پرسونل مینیجر رہے۔ آج کل اپنا سارا وقت مطالعے اور تصنیف و تالیف میں گزار رہے ہیں۔ دینی، معاشی اور معاشرتی موضوعات پر آپ کے مضامین اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایم۔ اے کے لیے آپ نے صنعتی مزدوروں کی قرض داری پر مقالہ تحریر کیا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں آپ کی کتاب "صنعتی امن، پیداآوری اور مزدور قوانین ۔۔۔۔ ایک تنقیدی جائزہ" شائع ہوئی جس پر آندھرا پردیش اردو اکیڈمی اور اتر پردیش اردو اکیڈمی نے انعامات عطا کیے]

یہ ابتدائی باب میری زیر ترتیب کتاب "یادوں کی رہ گذر" (DOWN THE MEMORY LANE) کا جزو ہے۔ یہ خود نوشت سوانح عمری تو نہیں لیکن از ابتدا تا ایں دم زندگی کے اہم واقعات، کامیابیوں، ناکامیوں کی بصیرت افروز اور سبق آموز داستان ہے جو قارئین کے دل و دماغ کو یقیناً متاثر کرے گی۔

قبل اس کے کہ میں اپنے حالات زندگی اور محترم والدین کی سرپرستی و رہنمائی کے خوش گوار تاثرات قلم بند کروں مناسب ہوگا کہ حیدرآباد کے قدیم اور مشہور محلے خیریت آباد کے تعلق سے چند باتیں عرض کروں جہاں ۵ / اپریل ۱۹۲۳ء کو میری ولادت ہوئی۔ یہ محلہ تاریخی صنعتی، ادبی اور تفریحی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سترھویں صدی میں تعمیر کردہ شاندار قطب شاہی مسجد ہے جسے سلطان محمد قطب شاہ کی صاحبزادی خیرات النسا بیگم المعروف ماں صاحبہ نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ مسجد رقبے کے اعتبار سے شہر کی مشہور مکہ مسجد کے بعد دوسرے نمبر پر آتی ہے لیکن فن تعمیر اور خوش نمائی میں برتر و بالا ہے۔ ماں صاحبہ نے اس مسجد کے علاوہ اس کے متصل ایک گنبد اپنے استاد اور اتالیق اخند ملا عبدالملک کے لیے تعمیر کروائی تھی۔ یہ گنبد بے مزار ہے کیوں کہ اخند عبدالملک کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہو گیا تھا اور وہیں ان کی تدفین ہوئی۔ تفریحی اعتبار سے حسین ساگر اور کٹہ تالاب (ٹینک بنڈ) آج تک بھی چہل قدمی اور تفریح کے مراکز ہیں تالاب ماہی گیری کے شائقین اور پیشہ وروں کے لیے نفع بخش۔ محلہ خیریت آباد کے قریب ہی باغ عامہ ہے جہاں کے باغ اور چمن، ٹاؤن ہال اور جوبلی ہال نہ صرف سیر و تفریح کے مراکز تھے بلکہ علمی، ادبی نشستوں کے مراکز ہوا کرتے تھے اب ٹاؤن ہال آندھرا پردیش اسمبلی کی عمارت بن گیا ہے۔ فتح میدان حضور نظام کی سالگرہ کی پریڈ کے لیے مشہور تھا اور جس کا نظارہ ہم لوگ قریبی نوبت پہاڑ سے کیا کرتے تھے۔ خیریت آباد نامپلی اور سکندرآباد کے درمیان خیریت آباد کا ریلوے اسٹیشن تھا اور قریب ہی بس اسٹانڈ بھی۔ تعلیمی اعتبار سے ٹیچرس ٹریننگ کالج (تربیت گاہ اساتذہ) بھی خیریت آباد ہی میں تھا جس کے پرنسپل مشہور ماہر تعلیم سجاد مرزا صاحب تھے اور اسی کے تحت ششم جماعت تک کا مدرسہ مشقی تھا (Practicing school) جہاں میری ابتدائی تعلیم ہوئی۔ زیر تربیت اساتذہ بی۔ ایڈ کی ڈگری کے حصول کے لیے یہاں رجوع ہوتے تھے اور ماہر تعلیم پروفیسروں کی نگرانی میں ہمیں پڑھاتے تھے۔

صنعتی اعتبار سے محلہ خیریت آباد کی بڑی اہمیت تھی۔ آج سے زاید از نصف صدی قبل جب کہ ریاست حیدرآباد صنعتی پسماندگی شکار تھی اس محلے میں تین بڑی صنعتیں موجود تھیں۔ محکمۂ برقی اور اس کا بجلی گھر، محکمۂ دارالضرب (Mint) جہاں حالی سکے ڈھلتے تھے او محکمہ تعمیرات کا پی۔ ڈبلیو۔ ڈی ورکشاپ۔ محلے کے بیشتر اصحاب ان ہی صنعتوں میں کارگزار تھے۔ حیدرآباد پبلک سروس کمیشن کا دفتر اس محلے میں تھا اور ولی عہد بہادر اور پرنس اعظم جاہ کے محلات کے علاوہ معتمدی کے دفاتر بھی اسی محلے میں تھے اور اس اعتبار سے خیریت آباد محلہ گوناگوں اہمیت و مصروفیت کا حامل تھا۔

" پدرم سلطان بود " کا وسیلہ نہ صرف زمانہ سابق بلکہ امروز و فردا میں بھی بکثرت مستعمل ہے جو نہ صرف غیر واجبی ہے بلکہ اپنے احساس کمتری کی غمازی کرتا ہے اور بقول شاعر

" تھے آباء تمہارے پہ مگر تم کیا ہو

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

کی عکاسی کرتا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے بھی جنت کی نعمت کے حصول اور جہنم کی نامرادی و لعنت سے اغماض کے لے بندہ خاکی کو عمل اثباتی و کوشش پیہم کی تلقین کی ہے اور فرمایا ہے کوئی انسان بجائے خود نہ نوری ہے نہ ناری ہے بلکہ اس کی تعلیم و تربیت، عمل و جدوجہد ان زمروں کے حوالے کردیتی ہے اور یہ ایں وجہ تاریخ شاہد کہ اچھے ماں باپ کی اولاد ناقص و راندہ درگاہ نکلتی ہے اس کے برعکس درندہ صفت لوگوں کی اولاد علم و عمل کے بلند مرتبہ علم بردار بلکہ پیغمبر تک ہوئے ہیں۔

اس ضمن میں چند بلند مقام مفکرین کے ارشادات قابل غور و فکر ہیں۔ مولانا آزاد کاروان خیال (صفحہ ۴۴) میں رقم طراز ہیں کہ " انسان کے لیے معیار شرافت جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایات پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرف رفتہ کے محتاج ہوں۔ ارباب ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور اپنی رفعت و عظمت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا اپنا بنایا ہوا تھا۔"

" رشحات قلم " میں طیب بخش بدایونی بہ عنوان سوانح عمری یوں فرماتے ہیں کہ بقول ارسطو اگر کسی معمولی شخص کی زندگی سنجیدہ او مکمل ہے اور کسی عظمت کی حامل ہے تو اس کی سوانح عمری بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر سیموئیل جانسن نے کہا تھا کہ ایک معمولی آدمی کی سوانح عمری بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی سکندر اعظم کی۔ ہر شخص کی عظمت انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی اجتماعی عظمت ہی سوانح نگاری کا باعث ہوتی ہے۔

میرے مرحوم والدین (اللہ مغفرت فرمائے) کے اسمہائے گرامی محمد حسن صاحب، واحد النسا بیگم (سسرال کا دیا ہوا نام قمرالنسا بیگم) تھا اور والد صاحب محکمۂ تعمیرات سے وابستہ اور اس زمانے کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ آبائی وطن گدوال تھا۔ اس دور میں محکمہ تعمیرات میں صرف ایک چیف انجنیر (علی نواز جنگ) ہوا کرتا تھا۔ بعد میں دو چیف انجنیرس کرامت جنگ اور احسن یار جنگ کا اضافہ او اس کے بعد ایک اور چیف انجنیر حسن لطیف صاحب ہوئے۔ والد صاحب نواب احسن یار جنگ کے ماتحت تھے اور ان کی جاگداد اور ان کی بیگم صاحبہ (ریاست جاورہ کی حصہ دار تھیں) کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرنے کے سلسلے میں دفتر پر کم اور نواب صاحب کے گھر پر

ہی مصروف کار رہا کرتے تھے ۔ نواب احسن یار جنگ بہت شریف الطبع، بلند خیال اور ہمدرد انسان تھے ۔ خیریت آباد کی قطب شاہی مسجد فوجی عیدگاہ کہلاتی تھی اور فوج کے کمانڈران چیف دوسرے عہدہ دار اور فوجی وہیں عیدین کی نماز ادا کرتے تھے اور بعد نماز ۲۱ توپوں کی سلامی ہوا کرتی تھی ۔ نواب صاحب کے دو لڑکے وحید الزماں اور وقار الزماں ان کے ساتھ ہوتے تھے (خود نواب صاحب کا اسم گرامی احسن الزماں تھا) عید کی نماز کے بعد وہ جس طرح اپنے لڑکوں کو گلے لگاتے سر پر ہاتھ رکھتے اور دعائیں دیتے تھے بعینہٖ وہی سلوک وہ میرے بڑے بھائی خواجہ غیاث الدین عزیز اور میرے ساتھ کرتے تھے (والد صاحب دلی خواہش مند تھے کہ میں علم و نیک عملی میں حافظ شیرازی کے نقش قدم پر چلوں میرا نام اسی لیے خواجہ شمس الدین شفیق رکھا تھا جو حافظ شیرازی کا نام تھا ۔ شمس الدین محمد خواجہ) میں نے ۱۹۴۳ء میں بی ۔ اے پاس کیا اس وقت نواب احسن یار جنگ ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور فتح میدان کے روبرو ایک مکان میں ٹکنیکل مشاورت کا دفتر قائم کر رکھا تھا اور مجھے ملازمت کا پیشکش کیا تھا ۔ اسی طرح ہمارے محلے میں ایک صاحب افضل الدین حامی نئے قائم شدہ ٹرانسپورٹ کمشنر کے آفس میں منتظم تھے ۔ انھوں نے بھی ایک اہل کاری کی جائداد کی نشان دہی کی لیکن چوں کہ میں اپنے دوستوں سعید احمد جنائی اور آیت اللہ بیگ عارف کے ساتھ معاشیات میں ایم ۔ اے کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے یہ پیش کش قبول نہیں کی حالاں کہ گھر کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے ۔

احسن یار جنگ چوں کہ انجنیر تھے اس لیے والدین بالخصوص والد صاحب چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی انجنیر بنے اور انٹرمیڈیٹ میں مجھے سائنس اور ریاضی کے مضامین دلوانا چاہتے تھے ۔ لیکن میں نے اپنی پسند کے مضامین تاریخ، معاشیات و سیاسیات لے لیے اور والد صاحب نے خاموشی اختیار کی اور قطعاً ناراض نہیں ہوئے ۔ بی ۔ اے پاس کرنے کے بعد میں نے بدرجہ مجبوری مناسب یہی سمجھا کہ ملازمت کروں اور گھریلو اخراجات کی تکمیل میں والد صاحب کا ہاتھ بٹاؤں ۔ میں نے اپنی والدہ سے دریافت کیا تو انھوں نے مجھے والد سے اجازت لینے کے لیے کہا میں نے جب والد سے پوچھا تو انھوں نے فی الفور مجھے حکم دیا کہ نہیں بیٹے ایم ۔ اے کرو ۔ اپنی دلی خواہش کی اس بزرگانہ تائید و ہمت افزائی پر انتہائی خوشی ہوئی اور جب بھی خیال آتا ہے ان بزرگوں کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے ۔

ہمارے محلے میں والد کے ملنے والے سب ہی بزرگ چچا کہلاتے تھے اور ان کے ہمارے ہم عمر لڑکے ہمارے دوست ۔ لیکن جتنے بھی مسلمان بزرگ تھے ان کے کسی لڑکے نے اچھی تعلیم نہیں پائی صرف حاجی شیخ رحمان ہیڈ انجنیر کے لڑکے رحیم نے میٹرک کامیاب کیا ۔ علی گڑھ گئے اور انٹر پاس نہ کر سکے اور نظام اسٹیٹ ریلوے میں ملازمت کر لی ۔ اس لحاظ سے مسلمان لڑکوں میں سب سے پہلے انٹر میں نے کامیاب کیا اور بعد میں بی ۔ اے اور ایم ۔ اے ۔ اس کے برخلاف ہندو ہم محلہ اصحاب میں مالی پٹیل کا لڑکا راج ریڈی انکم ٹیکس میں عہدہ دار ہوا ۔ رام او تار اگروال ڈپٹی سکریٹری ہوا اور نربری ریڈی آیورویدک ڈاکٹر اور صدر شعبہ بنا ۔ میری بہن وقار النساء صفیہ مرحومہ غالباً لڑکیوں میں پہلی گریجویٹ تھی ۔

دینداری، صحیح العقیدگی، اخلاق اور کردار میں میرے والدین حالاں کہ اعلیٰ تعلیم سے مرصع نہ تھے لیکن صحیح راہ و روش پر گامزن تھے کبھی اخلاق و کردار سے ہٹ کر نہ کوئی عمل ان سے سرزد ہوتا تھا نہ وہ برداشت کرتے تھے اور اپنی اولاد پر سخت نگرانی رکھتے تھے اور صحیح لائحہ عمل پیش کرتے تھے ۔ محلے میں بنگلہ اور کاشیا دو مشہور کرانہ مرچنٹ تھے ۔ ہر ماہ کی ابتدا میں ہمارے پڑوسیوں کے گھر پر ان دو کان داروں کے ہرکارے بقایا رقم کی وصولی کے لیے آن موجود ہوتے تھے ۔ ہمارے گھر پر کبھی بھی کسی کو وصولی کے لیے آتا ہوا ہم نے نہیں دیکھا ۔ چار مینار

کے پاس آر۔آر۔ گوپال کی مشہور کپڑے کی دوکان تھی رمضان عید سے پہلے ہمارے والد وہاں یا اس کے مقابل کی دوکان سلیمان حاجی داداکے ہاں کپڑے خریدنے کے لیے ہم کو لے جاتے تھے۔دوکان کا منیم جب بل بنالاتا تو مالک دوکان وہ کاغذ جھپٹ لیتا اور اس میں مناسب کمی کر دیتا اور والد صاحب رقم ادا کر دیتے تھے۔ بغیر بھاؤ چکائے یا رقم کم کروائے۔یہی طرز عمل عابد شاپ کے جنرل مرچنٹ احمد حسین اور یونس کی دوکان پر ہوتا تھا۔

تحتانوی جماعت کے طالب علموں کو دو طرح کے وظائف دیے جاتے تھے رعایتی اور تعلیمی۔اچھے طالب علموں کو تعلیمی و ترغیبی وظیفہ دیا جاتا تھا اور اس کے لیے فارم پر کسی گزیٹیڈ عہدہ دار کی سفارش درکار تھی۔میری خواہش پر والد صاحب نے دار الضرب کے حاجی شیخ رحمان صاحب کے دستخط لا دینے کا وعدہ کیا تھا۔میری یاد دہانی پر والد صاحب نے قدرے خفگی کے ساتھ فرمایا کہ "بیٹے تمھارے تعلیمی اخراجات میں خود پورے کروں گا۔ تم ان جھگڑوں میں مت پڑو۔" وہ اپنے دوست کے زیر بار احسان نہیں بننا چاہتے تھے۔

میری خالہ صاحبہ (والدہ کی بڑی بہن)) رشید النسا بیگم کماریڈی کے اوورسیر تعمیرات سید عبدالرشید صاحب کی زوجہ محترمہ تھیں اور لاولد تھیں، ہم میں سے کسی ایک بھائی کو متبنیٰ بنانا چاہتی تھیں جب یہ بات والد صاحب تک پہنچی تو یہ کہہ کر کہ ایک کیا سبھی لڑکے انھیں کے ہیں، والد صاحب نے نہایت نرمی اور دانش مندی سے خواہش مسترد کر دی۔خالو صاحب (سید عبدالرشید)) نہایت اچھے عہدہ دار تھے دین داری کے علاوہ اسپورٹس مین تھے۔کماریڈی کلب کے روح رواں تھے۔داڑھی رکھتے تھے۔ٹینس کے کھلاڑی تھے اور بہت ہر دلعزیز تھے۔اس زمانے میں بی۔این رامن I.A.S کے والد ڈاکٹر نارائن تھے اور فرید انصاری I.A.S کے والد غوث صاحب کماریڈی میں کورٹ انسپکٹر تھے ان دونوں ہم عمروں سے میرے ملاقات کماریڈی پر ہی کوئی ساٹھ سال پہلے ہوئی تھی جو میری طرح گرمائی تعطیلات گزارنے اپنے والدین کے ہاں آئے ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کو مسبب الاسباب اور کارساز حقیقی ماننے کا عملی اور سخت اہتمام تھا اور غیر اللہ سے توقع رکھنے یا مانگنے کی کبھی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔پیر مریدی سے سخت نفرت روا رکھی گئی اور سود و رشوت خوری کو ہمیشہ ناجائز سمجھا گیا بدرجہ مجبوری بھی گوارا کرنے کی ازحد مخالفت کی گئی۔آج سے ساٹھ ستر سال پہلے قدیم حیدرآباد میں پلیگ، ہیضہ اور چیچک جیسی بیماریوں کا وہی زور شور تھا جیسا کہ آج کل ناسیاہنڈ قلبی امراض اور ایڈز وغیرہ کا ہے۔میرے چھوٹے بھائی اقبال کو چیچک نکل گئی۔والد اس زمانے میں منچریال پر مامور تھے۔والدہ اکیلی۔ہر چند علاج کیا گیا۔ضعیف العقیدہ مسلم پڑوسیوں نے والدہ کو بہ اصرار مشورہ دیا کہ محلے کے متمول زمیندار بچو میاں (حسینی میاں) کی طرح چیچک کی ماتا کے نام پر بکرا قربانی دیں۔والدہ نے سختی سے انکار کیا کہ مسلمان کے لیے سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کی مدد درکار نہیں اور دیوی دیوتا یا ماتا کو پوجنا یا ان کے نام پر مال و متاع کی قربانی ناجائز اور کفر کے مترادف ہے۔جاہل اور بے دین پڑوسیوں نے ہر طرح کے اعتراض کیے کہ چند روپیوں (اس زمانے میں بکرا چار یا پانچ روپے میں آتا تھا) کے لیے بچے کی جان خطرہ میں ڈالی جا رہی ہے۔بچے کے باپ کو کیا جواب دیا جائے گا اگر بچہ چیچک سے مر جائے۔والدہ نے دین داری اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور دیوی کے نام پر بکرا دینے پر رضامند نہ ہوئیں۔بالآخر بچہ فوت ہو گیا۔جاہل پڑوسیوں کا غیض و غضب اعتراض و نکتہ چینی میری والدہ کے لیے نہایت کٹھن اور صبر آزما آزمائش تھی لیکن وہ رو دھو کر ایمان اور عقیدے کی سلامتی کے لیے برداشت کر گئیں۔چند دن کے بعد بچو میاں کا بچہ بھی مرض چیچک کی وجہ سے فوت ہو گیا حالانکہ ماتا

دیوی کے لیے اس کی صحت و سلامتی کے لیے غیر اسلامی طریقے پر بکرا نذر کیا گیا تھا۔ والدہ کو اس حادثے سے ایمان پختگی کا تو یقین اور اطمینان ہو گیا لیکن دل خوش نہیں ہوا۔ کیوں کہ بچہ کی موت چاہے اپنا ہو یا بد عقیدہ پڑوسیوں کا بہر حال سانحہ تھا۔ پتہ نہیں بے دین و بد عقیدہ لوگوں نے راست بازی، دین داری کا سبق سیکھا کہ نہیں۔

محلے کی مسجد میں حافظ عبدالسلام صدیقی ماتوتہ بہار نپور کے رہنے والے، قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ میں نے کم عمری میں قرآن ختم کیا اور ایک شب مسجد میں ایک جلسے میں مشہور عالم دین شبیر احمد عثمانی تشریف فرماتے اور انھوں نے قل وغیرہ پڑھوا کر ختم قرآن کی رسم انجام دی اور سر پر ہاتھ رکھ کر علم کی فراوانی، دین داری اور درازی عمر کی دعا فرمائی۔ حاضرین مجلس، اہل محلہ کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ والد کے ملنے والے ایک بزرگ نے جنھیں ہم چچا کہتے تھے مجھے گود میں اٹھالیا اور فرط مسرت سے مسجد کے اطراف گھومنے لگے اور دوسرے بزرگوں سے ملانے لگے گویا ان کو اتنی خوشی تھی جتنی خود اپنے بچے کی کامیابی پر کسی باپ کو ہو سکتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ محلے کے اکثر بزرگ میری تعلیمی ترقی اور ذہانت پر اتنے ہی خوش ہوا کرتے، داد دیتے اور ہمت افزائی کرتے تھے اور ان بزرگوں میں سب سے اونچا مقام حکیم عبدالرحیم عباسی صاحب (مشہور صحافی شبلی یزدانی مرحوم کے والد محترم) کا تھا جنھوں نے ایک مرتبہ میری درسی کتاب پر یہ شعر لکھ کر دیا تھا کہ:

ہمت بلند دار کہ یزداں برائے خلق
دست ترا کلید در رزق آفرید

یہ ان بزرگ کی دعا تھی یا ایک تمنا کہ عملی زندگی میں لیبر ڈپارٹمنٹ کا اعلیٰ عہدہ دار ہونے کی وجہ سے میں نے اپنے اثر و نفوذ کو استعمال کر کے درجنوں ہونہار لڑکوں (اپنے کم اور پرائے زیادہ) کو دفتروں اور کارخانوں میں اچھے روزگار مہیا کیے تھے اور یقیناً یہ خدمت میرے اہل و عیال کے لیے باعث خیر و برکت ہوگی خود میرے لیے نجات اخروی کا ذریعہ۔

میں نے جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ والد مرحوم نواب احسن یار جنگ کے خانگی اور سرکاری کاموں میں بہت ساتھ دیتے تھے حضور نظام نے کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی میں بجلی کی فراہمی کے انتظامات کے لیے نواب صاحب کو سعودی عرب بھجوایا تھا اور اس مبارک و مقدس سفر میں والد صاحب بھی ساتھ تھے اور حج و زیارت کی سعادت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ نواب صاحب کے کسی اقتصادی مسئلے کی یکسوئی کے لیے والد مرحوم ایک دن ٹولی چوکی گئے تھے۔ محلے کے مشہور تانگہ راں تو لو کے تانگے میں مجھے اور بھائی عزیز کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ ملاقات راجہ بھاگیرجی کے عالیشان محل میں ہوئی تھی۔ یہ راجہ صاحب ۶ فیٹ اونچے سرخ و سفید رنگت رکھتے تھے اور راجہ دھن راج گیر کی طرح ساہو رئیس و زمیندار جن کے جانشین ان کے اپنے بیٹے نہیں بلکہ متبنیٰ ہوا کرتے تھے۔ سنا ہے کہ اب یہ طریقہ بدل گیا ہے اور اولاد بے انتہا دولت اور جائداد کی مالک ہونے لگی ہے۔ راجہ صاحب کا ایک بڑا عالیشان محل تھا اور اطراف بہترین باغ اور چمن۔ ہم دونوں والد صاحب اور راجہ صاحب کے ساتھ طویل گفتگو کے دوران باغ میں کھیلتے رہے۔ گفتگو کے اختتام پر والد صاحب کو وداع کرنے کے لیے راجہ بیر بھاگیرجی باہر تشریف لائے اور ہم دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے سر پر ہاتھ رکھا اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ ویسے انھوں نے میرا اور عزیز بھائی کا ہاتھ دیکھا اور فرمایا کہ میری قسمت میں تعلیم کی نعمت زیادہ نہیں ہاں البتہ بھائی عزیز بہت زیادہ تعلیم پائیں گے۔ یہ سن کر بھائی عزیز تو بہت خوش ہوئے لیکن دل ہی دل میں میں نے سوچا کہ بوڑھے راجہ صاحب خیال آرائی کر رہے ہیں انشاء اللہ میں بھی خوب پڑھوں گا۔ راجہ صاحب جب

سے کچھ کرنسی نوٹ نکال کر ہم کو دینا چاہ رہے تھے لیکن والد صاحب نے منع کر دیا کہ بچوں کو پیسے نہیں دینے چاہئیں عادتیں
خراب ہوتی ہیں وغیرہ۔ راجہ صاحب نے
فوری اپنی غلطی محسوس کر لی اور ملازم کے ذریعہ اندر سے بہترین چاکلیٹ منگوائے اور ہم دونوں کی جیبیں بھر دیں اور ہم لوگ خوش
گھر لوٹے۔

فال، رمل، نجوم اور جیش قیاسی اسلامی نقطۂ نظر سے ممنوع اور ناقابل قبول ہے اور یہ استنباط صحیح اور مبنی بر حقیقت ہے اور ہوا
ایسا ہی۔ بھائی عزیز میٹرک سے بڑھ کر تعلیم نہ پاسکے اور میں نے بغیر رکاوٹ کے ایم۔اے پاس کیا اور بالآخر حیدرآباد پبلک سروس کمیشن
کے مسابقتی امتحان میں جب کہ کرنل رحمان کمیشن کے صدر تھے اور پروفیسر حسین علی خاں اور پروفیسر ویرابھدر راؤڈو ممبران تھے۔
سرفہرست کامیاب ہوا اور لیبر آفیسر کے عہدے کے لیے منتخب کیا گیا اور اعلیٰ ترین عہدے پر بہترین کارکردگی کے بعد وظیفے پر سبکدوش

○ ○ ○ ○ ○ ○

سلسلہ ۹۲ سے آگے۔
کر رہی ہوں۔ نماز آخر پڑھی جا رہی ہے۔ سلام پھیرنے والے گواہ رہیں کہ خوابوں کو خدا جاننے والی خیال کی سلامتی کے ساتھ رخصت ہوئی
خاک خاک میں۔ راکھ راکھ میں۔ آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے۔ ابدی مکان کی گہرائی اور تماشائی۔ ہتھیلیوں سے داو کے بھرنے نہیں
پھوٹتے۔ ہاتھ خاک کا پردہ گراتے ہیں۔ تکمیل اپنے انت کو پہنچ رہا ہے۔ آنکھوں کو رکھ کے طاق پر دیکھا کرے کوئی۔ وقت، میر رقص کا اشارہ
دھرتی کا چھنتا ہوا کنارہ۔ خوابوں کا بھنور جال، ختم نہ ہونے والی نیند کا پاتال۔

○ ○ ○ ○ ○ ○

سلسلہ ۵۵ سے آگے
نے مجھ سے کہا۔
"چڑیوں کے شور مچانے اور ناش کے چرچرانے کی آواز کو فوری دیکھوں۔"
یہ نہیں کہا کہ وہ ہاتھ تھام کر مجھے بٹھا رہا تھا کہ پہلے جھجو کا بچہ پھینک جاؤں۔
ولایت بڑے سکون سے اس واقعے کے بعد ہمارے گھر آتا رہا۔ میں نے اس کا کارنامہ اسے بتا دیا تھا کہ مبادا ابا،
امی پوچھ بیٹھیں اور وہ کیے دھرے پر پانی پھیر دے۔ ولایت نے کہا تھا۔ "اب گالیاں نہیں دوں گا رے بھئی۔"
لیکن وہ ہمارے احاطے سے نکل کر دوسرے دوستوں کو اسی طرح گالی گلوج کرتا رہا۔ میرے ضمیر کو توبہ ہر صورت
اہرمن آسا ہونا تھا سو ہوا۔

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

سر نظامت جنگ کی مدت ملازمت میں توسیع

(سیرت کے چند پہلو)

سر نظامت جنگ بہادر حیدرآباد کی مردم خیز سرزمین سے ابھرنے والی عظیم شخصیتوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے انیسویں صدی کے آخر میں سابق ریاست حیدرآباد میں اپنے کیریر کا آغاز کیا اور بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں تک دو سلاطین حیدرآباد آصف سادس نواب میر محبوب علی خان اور آصف سابع نواب میر عثمان علی خان کی حکومتوں میں کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔ عدلیہ اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں سے بھی بڑھ کر ان کی شخصیت کی اہمیت شاعر اور دانشور کی حیثیت سے نمایاں ہوتی ہے۔ وہ سابق ریاست حیدرآباد کے ایک عدیم المثال اڈمنسٹریٹر ہی نہیں تھے بلکہ ہندوستان کے ان گنے چنے شعرا میں سے ایک تھے جنھوں نے ہندوستانی ہونے کے باوجود انگریزی کی شاعری کو بھی مالا مال کیا۔ نظامت جنگ ملک کی عظیم المرتبت ہستی اور انگریزی کی نامور شاعر سروجنی نائیڈو کے نہ صرف ہم عصر تھے بلکہ وہ بلبل ہند سے بے حد قریبی مراسم رکھتے تھے اور شاعری میں سروجنی نائیڈو کے ہم رتبہ تھے۔ انگریزی زبان پر نظامت جنگ کی ماہرانہ قدرت اور ان کی انگریزی شاعری کی دیگر اعلیٰ خوبیوں کے خود اہل زبان معترف ہیں۔ نظامت جنگ نے فارسی زبان میں بھی وسیع شعری سرمایہ چھوڑا ہے۔ انھوں نے قرآن مجید اور اسلامی علوم کا بڑا گہرا اور محققانہ مطالعہ کیا تھا۔

سر نظامت جنگ کو ریاست حیدرآباد میں مختلف اہم عہدوں پر خدمات انجام دینے کے بعد رکن عدالت العالیہ، میر مجلس عدالت العالیہ اور معتمدی سیاسیات کے عہدوں پر فائز کیا گیا۔ باب حکومت کے قیام پر ۱۹۱۹ء میں جو پہلی کابینہ تشکیل دی گئی تھی اس میں نظامت جنگ کو صدرالمہام سیاسیات مقرر کیا گیا تھا وہ اس نہایت اہم خدمت پر دس سال سے کچھ زیادہ مدت تک کارگزار رہے۔ انھیں اس خدمت پر تین سال آٹھ ماہ سے زیادہ مدت کے لیے توسیع دی گئی تھی۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ سر نظامت جنگ نے سوائے صدر اعظم کے عہدے کے ریاست حیدرآباد کے دیگر تمام عہدوں کی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔ محمد مظہر "تذکرہ باب حکومت" میں لکھتے ہیں کہ سر علی امام کی وزارت میں بڑی حد تک نظامت جنگ ہی لیڈر آف کونسل تھے۔ نظامت جنگ کے والد رفعت یار جنگ اول، چچا عماد جنگ اور بڑے بھائی رفعت یار جنگ ثانی طویل عرصے تک اہم خدمتوں پر فائز رہے۔ سابق ریاست حیدرآباد کے لیے اس خاندان کی خدمات بڑی ممتاز اور نمایاں رہی ہیں۔

سر نظامت جنگ کی مدت ملازمت میں توسیع سے متعلق جو مواد آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریکارڈز کے ذخائر سے دستیاب ہوا ہے اس کی بنیاد پر یہ مضمون قلم بند کیا گیا ہے۔ تین سال آٹھ ماہ سے زیادہ مدت کے لیے سر نظامت جنگ کی مدت ملازمت میں جو توسیع دی گئی تھی اس کارروائی سے متعلق سارا مواد پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے۔ اس کارروائی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سر نظامت جنگ 55 سال عمر کی تکمیل پر خدمت سے وظیفے پر سبک دوش ہونا چاہتے تھے۔ مدت ملازمت میں توسیع کے نہ تو وہ خواہش مند تھے اور نہ تو توسیع سے خوش تھے۔ جب کہ والی ریاست آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں انھیں ان گراں بہا ذمہ داریوں سے سبک دوش کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

سر نظامت جنگ کی مدت ملازمت میں توسیع سے متعلق آرکائیوز کے مواد کے غائر مطالعے سے ان کی سیرت اور شخصیت کے چند اہم پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

اس کارروائی کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

سر نظامت جنگ نے 55 سال کی عمر کی تکمیل پر ملازمت سے سبک دوش کیے جانے کے لیے حسب ذیل درخواست مورخہ ۴/اردی بہشت ۱۳۳۵ف م ۸/ مارچ ۱۹۲۶ء صدر اعظم کے نام روانہ کی۔

"بتاریخ ۱۱/خورداد ۱۳۳۵ف میری عمر ۵۵ سال کی ہو جائے گی اور میں وظیفے پر علاحدہ ہونے کا مستحق ہوں گا جس کا مجھے کئی سال سے انتظار ہے۔ اب میری استدعا یہ ہے کہ بارگاہ سرکار سے اس کا مجھے موقع عطا فرمایا جائے تاکہ میں اپنی عمر کا آخری حصہ علمی مشاغل میں صرف کر سکوں۔ براہ کرم میری یہ استدعا پیش گاہ سرکار تک پہنچائی جائے تاکہ وہاں سے جو حکم شرف صدور لائے حسبہٖ عمل کیا جاسکے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۱/ خورداد ۱۳۳۵ف سے حسب قاعدہ میری تنخواہ بند ہو جائے گی اس لیے میری خواہش یہ ہے کہ وظیفے کی کارروائی اگر ہو تو اس مہینے کے اندر وہ مکمل ہو جائے۔ وظیفے کی مقدار کے متعلق میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ حسب قواعد مل سکتا ہے اس سے ایک پیسہ زیادہ میں نہیں چاہتا۔ اس لیے اس مسئلے کے تصفیے میں نہ کوئی وقت پیش آسکتی ہے اور نہ زیادہ مدت کی ضرورت ہے۔

فقط

نظامت جنگ۔"

ولی الدولہ بہادر نے جو اس وقت منصرم صدر اعظم تھے اس سلسلے میں ایک عرض داشت مورخہ ۲/رمضان ۱۳۴۴ھ م ۱۷/ مارچ ۱۹۲۶ء آصف سابع کی خدمت میں پیش کی جس میں انھوں نے سر نظامت جنگ کی درخواست کا خلاصہ درج کر کے لکھا: "ضمائر سلطانی سے سلطنت کا جزو کل کوئی امر پوشیدہ نہیں ہے اور بہ خوبی روشن ہے کہ نظامت جنگ بہادر سے معاملات کونسل کی حد تک کیسی مدد ملتی ہے۔۔ لہٰذا بعد ملاحظہ معروضہ جو بھی حکم صادر ہوگا اس کی تعمیل کی جائے گی۔ جس روز عرض داشت پیش کی گئی تھی اسی روز آصف سابع کا فرمان صادر ہوا۔ آصف سابع نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ سر نظامت کی صحت اکثر خراب رہتی ہے انھیں سبک دوش ہونے کی اجازت نہیں دی اور ابتداء ان کی مدت ملازمت میں ایک سال کی توسیع منظور کی۔ اس سلسلے میں آصف سابع کا جو فرمان جاری ہوا تھا اس کا متن درج ذیل ہے:

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ نظامت جنگ کی صحت اکثر خراب رہتی ہے اور عمر بڑھنے سے انسان کے قویٰ زیادہ کام کے متحمل نہیں رہتے ہیں تاہم ان کے دیرینہ خدمات (جو قابل قدر ہیں) کے مدنظر میں ان کی مدت ملازمت میں ایک سال کی توسیع دیتا ہوں اور جب وہ وظیفے پر علاحدہ ہوں گے تو اس وقت حسب قواعد جاریہ و صواب دید میں خود ان کے پنشن کا تصفیہ کروں گا۔ سردست اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس حکم کی نقل اطلاعاً نظامت جنگ کے ہاں بھجوادی جائے۔"

آصف سابع نے صرف ایک سال کی توسیع پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فرامین مورخہ ۳/اپریل ۱۹۲۷ء اور ۱۲/اپریل ۱۹۲۸ء کے ذریعے نظامت جنگ کی مدت ملازمت میں مزید ایک ایک سال کی توسیع منظور کی۔ سہ سالہ توسیع کی مدت ختم ہونے سے کچھ پہلے نظامت جنگ نے آصف سابع کی خدمت میں حسب ذیل معروضہ مورخہ ۳/ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ م ۱۳/ ڈسمبر ۱۹۲۸ء پیش کیا۔ جس میں انھوں نے دوبارہ خدمت سے سبک دوش کر دیے جانے کی درخواست کی۔

"۵۵ سال کی عمر ہوتے ہی فدوی نے یہ عرض کیا تھا کہ عہدے کے فرائض سے سبک دوش کر کے آرام پانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے تو بعید از پرورش نہ ہوگا کیوں کہ ایک عمر کے بعد صحت کو قائم رکھنے کے لیے انسان کو آرام اور

بے فکری کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس وقت اجازت نہیں ملی اور بہ تعمیل حکومت سرکار فدوی اب تک کارگزار رہا۔ سرکار نے بہ کمال نوازش، فدوی کی ناچیز خدمات کی قدر افزائی فرماتے ہوئے مسلسل تین سال توسیع منظور فرمائی اور اس قدر افزائی کا فدوی جان و دل سے مشکور ہے۔ اب فدوی کی عمر 58 سال کی ہو چکی ہے جسمانی اور دماغی قوتوں میں فرق محسوس ہوتا جاتا ہے۔ اور حالات زمانہ کے لحاظ سے دل میں یہ خواہش بڑھتی جاتی ہے کہ گوشہ تنہائی میں علمی مشاغل میں مصروف رہ کر بقول حافظ یہ کہہ سکوں:

نہادہ ایم بار جہاں بردل ضعیف
این کاروبار بستہ بہ یک سو نہادہ ایم

پس اگر سرکار والا کی عنایت و نوازش سے اپنی اس امید میں کامیاب ہو جاؤں اور خورداد ۱۳۳۸ف سے جب کہ مدت توسیع حالیہ ختم ہوتی ہے اس قدر وظیفے پر جس کا از روئے قاعدہ مستحق قرار پاؤں، خدمت سے علاحدہ ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے تو یہ سمجھوں گا کہ سرکار کی اس رعایت سے (جس کو میرا دل کبھی نہیں بھول سکتا) میری عمر طبعی میں توسیع ہوئی۔ زیادہ حد ادب۔

خادم خیر خواہ

نظامت جنگ۔

مہدی یار جنگ جو معتمد سیاسیات تھے اور نظامت جنگ سے صدر المہامی کی خدمت کا جائزہ حاصل کرنے والے تھے اس وقت رخصت پر تھے اس لیے آصف سابع نے اپنے فرمان مورخہ ۲/ ذی قعدہ ۱۳۴۷ھ م ۱۳/ اپریل ۱۹۲۹ء میں مذکورہ بالا وجہ بیان کرتے ہوئے نظامت جنگ کو حسب دستور کام کرنے کی ہدایت کی۔

مہدی یار جنگ مقامات معتبرکہ کی زیارت سے مشرف ہو کر حیدرآباد واپس ہونے کے بعد رجوع خدمت ہوئے اور نظامت جنگ نے فوراً اپنی خدمت کا جائزہ مہدی یار جنگ کو دینے کی جانب توجہ کی چناں چہ معتمد فینانس اور امپیریل بنک آف انڈیا کے ایجنٹ کے نام دو مراسلے مورخہ ۱۴/ مئی ۱۹۲۹ء تحریر کیے گئے جن میں یہ اطلاع درج تھی کہ سر نظامت جنگ نے محکمہ سیاسیات کی صدر المہامی کی خدمت کا جائزہ دے دیا ہے لیکن یہ مراسلے جاری نہیں کیے جا سکے اور انھیں منسوخ کر دیا گیا۔ کیوں کہ اسی تاریخ آصف سابع کا فرمان صادر ہوا کہ سر راس مسعود نے حکومت ریاست حیدرآباد کے پولٹیکل سکریٹری کی خدمت کو قبول کر لیا تھا جس کی انھیں پیش کش کی گئی تھی مگر بعد ازاں انھیں تین سال کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ چوں کہ یونیورسٹی کے حالات اطمینان بخش نہیں ہیں اور وہ وہاں جا کر خدمت بجالانا چاہتے ہیں اس لیے انھیں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ ایسی صورت میں پھر پولٹیکل سکریٹری کی خدمت معرض بحث میں پڑ گئی ہے۔ لہٰذا اس کا انتظام ہونے تک نظامت جنگ پولٹیکل ممبر (صدر المہام سیاسیات) کی خدمت انجام دیتے رہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا فرمان صادر ہونے کے کچھ عرصہ بعد سر نظامت جنگ نے سبک دوش کیے جانے کے بارے میں آصف سابع کو زبانی طور پر یاد دلایا تھا لیکن آصف سابع نے لارڈ ارون وائسرے ہند کے مجوزہ دورہ حیدرآباد کے پیش نظر انھیں ڈسمبر ۱۹۲۹ء کے اختتام تک کارگزار رہنے کی ہدایت کی۔ سر نظامت جنگ نے اپنے معروضے میں یہ تحریر کرتے ہوئے کہ ان احکام کی تعمیل کی جائے گی، استدعا کی کہ انھیں معمولی اور غیر اہم کمیٹیوں میں شریک ہونے سے معاف فرمایا جائے تو ان کی صحت محفوظ رہے گی۔ انھوں نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ مال کے مقدمات کا مرافعہ سننے کے لیے انھیں صدر المہام مال کے ساتھ اجلاس منعقدہ میں شریک ہونا پڑتا ہے مگر بعض اوقات آصف سابع کی پیشی میں حا

رہنے کی وجہ سے وہاں نہیں جا سکتے جس کی وجہ سے کام ملتوی ہو جاتا ہے اس لیے انھیں اس اجلاس کی شرکت سے بھی معاف فرمایا جائے۔ اس معروضے پر آصف سابع نے ایک فرمان مورخہ ۳/ صفر ۱۳۴۱ھ م ۱۱/ جولائی ۱۹۲۹ء کے ذریعے باب حکومت کو لکھا کہ نظامت جنگ نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ درست ہے اور انھیں (آصف سابع) اس بیان سے اتفاق ہے۔ نظامت جنگ کی صحت کے مد نظر انھیں کچھ آرام لینا بھی ضروری ہے۔ اس فرمان کے منشا کی تعمیل میں باب حکومت نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۲/ جولائی ۱۹۲۹ء میں اجلاس متعلقہ کے کام کے لیے عقیل جنگ بہادر کو زائد رکن مقرر کرنے کی منظوری دی تاکہ سر نظامت جنگ بہادر کے شریک نہ ہو سکنے کی صورت میں اجلاس کا کام نہ رکے۔

لارڈ ارون وائسرے ہند کے دورہ حیدرآباد کے فوری بعد سر نظامت جنگ نے ۲/ جنوری ۱۹۳۰ء کو مہدی یار جنگ معتمد سیاسیات کو صدر المہامی سیاسیات کا جائزہ دے دیا۔

یہ صحیح ہے کہ نظامت جنگ نے اپنی ایک درخواست میں لکھا تھا کہ وہ وظیفے میں ایک پیسہ اضافہ نہیں چاہتے لیکن ان کی سبک دوشی کے صرف دو ڈھائی ماہ بعد آصف سابع نے تاریخ سبک دوشی سے سر نظامت جنگ کے ایک ہزار روپے ماہانہ وظیفے میں ۵۰۰ روپے زائد دیے جانے کے احکام صادر کیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دس سال سے زیادہ مدت تک اس اہم عہدے پر فائز رہتے ہوئے نظامت جنگ جو تنخواہ پا رہے تھے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا تھا اور انھوں نے عمر وظیفے کی تکمیل کے بعد بھی تقریباً چار سال تک خدمات انجام دی تھیں۔

سر نظامت جنگ کی شخصیت میں دانش ورانہ و فلسفیانہ مزاج، انا، خودداری، بے نیازی، استغنا اور عظمت کے جو دیگر پہلو مضمر تھے ان کی تلاش کے لیے ان کی سوانح عمری کے مطالعے کی بھی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس شخصیت کے بارے میں دیگر ارباب فکر و نظر کی رائے یا شہادت درکار ہے۔ یہ شخصیت خود اپنی تحریروں اور ان تحریروں کے جواب کے طور پر لکھی گئی تحریروں کے آئینے میں اپنی بڑائی اور بلندی کو منوالیتی ہے۔ میری مراد سر نظامت جنگ کے معروضوں اور ان پر آصف سابع کی جانب سے جاری کردہ فرامین سے ہے جن کے متن پیش کیے جا چکے ہیں۔

اچھے اچھے لوگ کرسی کے پیچھے دوڑتے دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کردار کی شان بے نیازی کا عالم یہ ہے کہ کرسی اس کے پیچھے دوڑتی ہے اور دوڑانے والے کوئی اور نہیں فرماں روائے وقت ہیں۔ آرکائیوز کے ریکارڈز سے یہ صاف ظاہر ہے کہ نظامت جنگ اپنی خدمت پر برقرار رہنے کی بجائے جلد از جلد علاحدہ ہو جانا چاہتے تھے۔ جب کہ آصف سابع ان کو اس خدمت سے جلد سبک دوش کر دینے کے حق میں نہیں تھے۔ اس نہایت اہم خدمت پر بہ دیر برقرار رکھنے کی کوششوں کا یہی مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ آصف سابع نہ صرف نظامت جنگ کے کام سے پوری طرح مطمئن تھے بلکہ ان پر مکمل اعتماد بھی رکھتے تھے۔

میر مجلس عدالت العالیہ کے عہدے پر انھیں دو ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ معتمد سیاسیات کی خدمت پر تقرر کے بعد بھی وہ یہی پاتے رہے اور صدر المہام سیاسیات بنائے جانے کے بعد بھی ان کی ماہانہ تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ دس سال سے زیادہ عرصے تک وہ ریاست کے اس اہم اور ذمہ دار عہدے پر فائز رہے اور یہی تنخواہ پاتے رہے۔ انھوں نے کبھی بھی اپنی تنخواہ میں اضافے کے لیے درخواست یا نمائندگی نہیں کی۔ حد تو یہ ہے کہ جب پہلی بار انھوں نے خدمت سے سبک دوش کیے جانے کی درخواست پیش کی تو اس میں یہ لکھا کہ وہ اپنے وظیفے میں ایک پیسے کا اضافہ نہیں چاہتے۔ اس طرح وہ ہمیشہ کرسی کے علاوہ مالی منفعت اور صلے کی خواہش سے بے نیاز و بے پروا رہے۔

عام طور پر شخصی دور حکومت میں معروضے حکمران وقت کی خوشامد، مدح سرائی اور تصنع سے پر ہوا کرتے ہیں۔ مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کے معاملے میں ذی حیثیت شخصیتیں بھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن نظامت جنگ نے مروجہ آداب و مراتب کو ملحوظ رکھنے سے ہٹ کر قصیدہ خوانی اور مدح سرائی نہیں کی اور کبھی اپنی

اعلیٰ دانش ورانہ سطح سے نیچے نہیں آئے۔

سہ سالہ توسیع کی مدت کے ختم ہونے سے کچھ قبل سر نظامت جنگ نے آصف سابع کی خدمت میں جو معروضہ پیش کیا تھا اس میں انھوں نے لکھا تھا "حالات زمانہ کے لحاظ سے دل میں یہ خواہش بڑھتی جاتی ہے کہ گوشہ تنہائی میں علمی مشاغل میں مصروف رہ کر بقول حافظ یہ کہہ سکوں:

نہ نہادہ ایم بار جہاں بر دل ضعیف
این کاروبار بستہ بہ یک سو نہادہ ایم

اس شعر کے تحریر کیے جانے پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھیں اپنے مقام اور اہمیت کا پورا پورا اندازہ تھا۔ واقعی اس احساس کے اظہار میں کوئی مبالغہ نہیں ہے لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ حکمران وقت کی خدمت میں پیش کیے گئے معروضے میں انھوں نے اپنے بارے میں یہ شعر تحریر کیا تھا جو واقعی جرات، ہمت اور حوصلے کی بات ہے۔

ان تمام اوصاف کے علاوہ زیر تبصرہ تحریریں صاف اور صریح انداز میں یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ سر نظامت جنگ کو سب سے زیادہ عزیز وہ تنہائی تھی جس سے وہ ایک مفکر اور دانش ور کی حیثیت سے لطف اندوز ہونا پسند کرتے تھے اور مطالعہ علمی مشاغل کے ذریعے اپنے ذوق کی تسکین چاہتے تھے۔

سر نظامت جنگ کی سیرت کے چند ایسے ہی پہلو انھیں اس دور کے حیدرآباد کی اہم شخصیتوں سے ممتاز اور نمایاں کرتے ہیں۔ سیرت اور شخصیت کے گہرے اور ان مٹ نقوش اور قابل قدر کارناموں کے باعث سر نظامت جنگ کا نام سابق ریاست حیدرآباد کی تاریخ میں زندہ اور باقی رہے گا۔

عزیز بانو

عہد بہمنیہ کا فارسی شاعر۔ عصامی

ادبی، سیاسی اور تمدنی اعتبار سے ہندوستان کے عہد وسطی کا کوئی حصہ مشترک تمدنی میراث اور ثقافتی ترکے سے اس قدر مالا مال نہیں ہے جتنا کہ دکن۔ اس عہد کی تعمیرات اور علم و ادب کے خزانے اس امر کے آئینہ دار ہیں۔

تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کی خلجیوں اور تغلقوں کے زمانے میں دکن کی فتوحات نے جنوب کی پوری سیاسی بساط الٹ دی تھی۔ مزید برآں سلطان محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء-۱۳۵۱ء) نے جب جنوبی ریاستوں کا دہلی کی حکومت کے ساتھ الحاق کیا اور دکن پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے ایک مرکزی دارالحکومت کی ضرورت پیش آئی تاکہ جنوبی ریاستوں کی بدانتظامی اور بغاوتوں کا سد باب ہوسکے تو سلطان نے ۱۳۲۷ء / ۷۲۷ھ میں دارالسلطنت کو مع آبادی دہلی سے دکن کے علاقے دیوگیر (دولت آباد) میں منتقل کیا۔

سلطان کے اس دور رس فیصلے نے دکن کی تقدیر میں ہمہ جہتی اور ہنگامہ خیز انقلاب برپا کر دیا۔ نہ صرف سیاسی بلکہ ثقافتی و علمی و ادبی میدان میں بھی یہ واقعہ ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیاسی مرکز ہونے کی وجہ سے دولت آباد بہت جلد ایک ثقافتی مرکز میں تبدیل ہوگیا۔

ان سینکڑوں تارکان دہلی میں اکثر علماء، فضلاء، شعراء، ماہران کمال و فن اور صوفی بزرگ شامل تھے جنھوں نے اپنی بود و باش کے اثر سے دولت آباد کو علوم اسلامی کا گہوارہ بنا دیا۔

دکن میں اسی عرصے میں سلطان محمد بن تغلق کی مطلق العنانی کے خلاف جدوجہد اور بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جس کے نتیجے کے طور پر سرزمین دکن میں ایک آزاد اور خود مختار سلطنت کا قیام عمل میں آیا اور سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ نے ۷۴۵ھ / ۱۳۴۷ء میں سلطنت بہمنیہ کی داغ بیل ڈالی۔

اگرچہ کہ سلطان حسن بہمن شاہ کا عہد سیاسی کشمکش کا دور رہا ہے۔ اس کے باوجود ایک نفیس الطبع اور علم پرور بادشاہ ہونے کی وجہ سے سلطان کا دربار علم و ادب کے فروغ کا مرکز بن گیا۔ اس کے دربار میں فارسی ادیب، شاعر، فلسفی، ماہر فلکیات، مورخ، صوفی، اور ارباب کمال موجود تھے۔ اس طرح بہمنی سلطان نے شمال کے خلجی اور تغلق سلاطین کی علمی اور ادبی روایات کو آگے بڑھایا۔

بہمنی عہد کی فارسی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کی فارسی شاعری کی اہم خصوصیت زبان کی سادگی اور انداز بیان کی سلاست اور لطافت، خیالات کی بلندی اور واقعات کی صحت ہے۔

عصامی سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے دربار سے منسلک تھا۔ یہ اپنے وقت کا ایک بلند پایہ شاعر اور وسیع النظر مورخ تھا۔ عصامی کو تاریخ نگاری سے لگاؤ تھا۔ "فتوح السلاطین" جسے "شاہنامہ ہند" بھی کہا جاتا ہے۔ شمال کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ابتدائی بہمنی دور کا اچھا مرقع ہے اور یہ عصامی کی شاعری اور تاریخ نگاری کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ چناں چہ تاریخ نویسی اور شاعری کے لحاظ سے عصامی کو اگر "ہندوستان کا فردوسی" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

عصامی نے "فتوح السلاطین" میں فردوسی کے تتبع میں "شاہنامہ" کی طرز پر ہندوستان میں مسلمان حکومت کے قیام کی ایک منظوم تاریخ لکھی ہے۔ یوں تو شاہنامہ "فردوسی کی نقل ایران کے کئی شاعروں نے کی لیکن ہندوستان میں عصامی سے قبل کسی نے فردوسی کی تقلید نہیں کی۔

عصامی کے دو دواوین دستبرد زمانہ کی نذر ہوگئے۔ اور "فتوح السلاطین" ہی ان کی واحد تصنیف ہے جو آج ہمیں دستیاب ہے۔

عصامی نے اپنی یادگار رزمیہ مثنوی "فتوح السلاطین" سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ، بانی سلطنت بہمنیہ کی ایما پر دولت آباد میں ۷۵۱ھ میں تصنیف کی۔ عصامی کے بیان کے مطابق اس کتاب کی تصنیف کا کام ۲۷/ رمضان ۷۵۰ھ میں شروع ہوا اور ۶/ ربیع الاول ۷۵۱ھ کو اختتام کو پہنچا۔

اس طرح پانچ مہینے نو دن اور چھ گھنٹوں کی کاوش کے نتیجے میں یہ ضخیم مثنوی جو تقریباً بارہ ہزار ابیات پر مشتمل ہے مکمل ہوئی۔

عصامی کی طبیعت میں سیر چشمی اور استغنا تھا۔ چناں چہ فتوح السلاطین کی تصنیف کا مقصد فردوسی کی طرح رنے کی حکومت یا دولت حاصل کرنا نہ تھا۔ اس کی غرض و غایت اپنی ایک معنوی یادگار چھوڑ جانا تھا۔ بادشاہ سے صلہ و انعام حاصل کرنا نہ تھا۔ خود عصامی نے بھی اس تصنیف کی غرض کا اظہار اپنے کلام میں کیا ہے۔

کہ مقصود من نیست جز اتباع
نہ رے خواہم از شہ نہ وجہ فقاع

اک اور جگہ فن تاریخ کو فروغ دینا اپنی تصنیف کا مقصد بتایا ہے:

ز تاریخ شاہان ہندوستان
نگارم یکے نامہ چوں بوستاں

فتوح السلاطین عہد مغلیہ سے قبل کے ہندوستان کی ایک مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ نظام الدین احمد بخشی صاحب طبقات ناصری، ملا عبدالقادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ، ابوالقاسم فرشتہ جیسے مشہور مورخین کے پاس اس کے حوالے ملتے ہیں۔

چوں کہ فتوح السلاطین عہد وسطی کے ہندوستان کی "واحد منظوم تاریخ" ہے۔ اس لیے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے اس مثنوی میں واقعات مستند، تاریخی ثبوت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ واقعات رزم کو نہایت تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

بہمنی عہد میں لکھی ہوئی تاریخوں میں سے صرف یہی ایک تاریخ دستبرد زمانہ کا شکار ہونے سے بچ گئی۔ اس طرح اس کتاب کی معاصرانہ اہمیت بھی ہے۔ فتوح السلاطین بہمنیہ سلطنت کے ابتدائی دور کا اہم ترین اور مستند ترین ماخذ ہے۔ عصامی ان تمام عوامل اور حالات سے بخوبی واقف تھے جو دکن میں رونما ہو رہے تھے۔ اور جو بالآخر ایک خود مختار سلطنت کی تشکیل پر منتج ہوئے۔

چودھویں صدی ہند کے سیاسی حالات اور نفسیاتی مزاج کے تعلق سے عصامی ایک نیا انداز فکر پیش کرتا ہے۔ اس کی مورخانہ اہمیت کے متعلق ایک مبصر نے اپنے خیالات کو یوں قلمبند کیا ہے۔

اگرچہ BRIGGS نے اس کو تاریخی افسانوں کی ایک غیر اہم کتاب قرار دیا ہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرون وسطی کے ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک بڑا ماخذ ہے اور اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عصامی کا یہ کارنامہ غیر معمولی تاریخی قدرو قیمت کا حامل ہے۔

فتوح السلاطین کی تصنیف سے عصامی کا منشا عوام کی اخلاقی حالت کو سدھارنا بھی تھا۔ چنانچہ اس بنا پر اس نظم کو اخلاقی نظم بھی کہا جاسکتا ہے۔ جس میں اس نے اعلی اخلاقی اقدار ابھارتے ہوئے غیر اخلاقی خواہشات سے نفرت دلانے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں موت وحیات، دنیا کی بے ثباتی جیسے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

عصامی ایک صوفی منش انسان تھا۔ اس نے اپنی کتاب فتوح السلاطین میں صوفیہ سے متعلق کئی دلچسپ اور عجیب قصے بھی درج کیے ہیں۔

فتوح السلاطین ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کے تین سو پچاس سال کے حالات پر مشتمل ہے جو سلطان محمود غزنوی کے عہد سے لے کر اس کی تصنیف کے زمانے تک محیط ہے۔

عصامی کی زبان میں لطافت، قلم میں زور اور کلام میں اثر ہے۔ اس کے اشعار میں فصاحت اور کلاسیکی نظم و ضبط پایا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان کے ادبی روایات کا نمائندہ شاعر ہے۔ اس کے انداز بیان کی جادو گری ایسی ہے کہ ہر شخص مسحور ہوجاتا ہے۔ اشعار میں ادبی کیف، حلاوت اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ اسلوب بیان سادہ اور برجستہ ہے۔ اس مثنوی کا ایک اہم وصف ڈرامائیت ہے۔

عصامی واقعات کا تسلسل بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے قائم کرتا ہے کہ تار سخن کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا۔ واقعات کی مختلف کڑیوں کے جوڑنے میں بڑی تعمیری بصیرت اور ادبی سلیقے کا مظاہرہ کرتا ہے۔

خیالات کی ترتیب اور تنظیم سے واقعات تاریخی کی قبا تیار کرتا ہے۔ تاریخ نگاری کا ملکہ بھی خداداد ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ فتوح السلاطین تاریخ اور شاعری کا دلکش امتزاج ہے۔ دراصل اس نے تاریخ کو ادب بنادیا ہے۔ ماضی کے گزرے ہوئے بے جان واقعات کو شاعری کی مسیحائی سے حیات نو عطا کی ہے۔

عصامی نے فتوح السلاطین میں اصناف سخن اور فن شاعری کے تعلق سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بڑی ادبی قدرو قیمت کے حامل ہیں۔ ان خیالات سے عصامی کی تنقیدی قوت پر روشنی پڑتی ہے اور شاعری کے جدید ر جحانات اور نظریات کی بھی ترجمانی ہوتی ہے۔

عصامی نے اپنے ان خیالات کا اظہار ایک مستقل عنوان "در فضیلت سخن و فضائل سخنور گوید" کے تحت کیا ہے۔

ادب میں عظمت خون جگر سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ عصامی نے فتوح السلاطین کے متعلق بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

شب و روز خون دل خویشتن
ہمہ آب کردم پئے این چمن

ایک اور جگہ رقم طراز ہے۔

بہ تحقیق افسانہ ہائے کہن
بہر دم بسے رنج در ہر سخن

عصامی ایک باکمال مصور ہے۔ اس کی شاعری جذبات انسانی اور مظاہر قدرت کے حسین و جمیل مرقعے پیش کرتی ہے اس کی واقعہ نگاری میں تسلسل، جوش اور روانی پائی جاتی ہے۔

وہ داخلی اور خارجی مظاہر کی نقاشی میں معنویت اور جان اپنے تخیل سے پیدا کرتا ہے۔ گویا وہ ان کو از سر نو زندہ اپنے شاداب اور زرخیز تخیل سے کرتا ہے اور جزئیات پر بھی اس کی نظر رہتی ہے۔ اس کی وجہ سے خیالی اور مادی مظاہر قاری کے آئینہ تخیل میں خاص شان دل فریبی سے جھلک دکھانے لگتے ہیں۔

فتوح السلاطین اپنی محاکات نگاری اور پیکر تراشی سے ایک شاداب اور شگفتہ چمن زار کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ مثلاً اس نے نظامی گنجوی سے خواب میں ملاقات کا نقشہ بڑے دل چسپ اور معنی خیز انداز میں کھینچا ہے۔

یکے مہمان خانہ دیدم بخواب ۔۔۔ منور تر از خانہ آفتاب
مسافر در و آمدہ بے شمار ۔۔۔ گرفتہ بہر کنج کنجے قرار
بگشتم درآن خانہ ہر چار سو ۔۔۔ نشستہ درو مردمان روبرو

اس کے علاوہ عصامی نے کیخسرو کے بعد کیقباد کے بادشاہ ہونے کا ذکر خاص انداز سے کیا ہے۔ اور اس کے عیش وعشرت کا نقشہ بہت پر لطف انداز میں کھینچا ہے۔

چو دیہیم کیخسروی کیقباد ۔۔۔ بہ نیروئے اقبال بر سر نہاد
ہمی راند کامے دران تخت گاہ ۔۔۔ بکارش کمربستہ ہر کشر کلاہ
شب و روز بزم طرب ساختے ۔۔۔ باشغال دیگر نپرداختے
بہ بزمش رواں ساقیان صبح و شام ۔۔۔ ہمہ شکرین لعل شیرین کلام
ہمہ عنبرین زلف و صندل بدن ۔۔۔ ہمہ سروقد و ہمہ سیم تن
شبہ شیرگیر اندران آہوان ۔۔۔ شب و روز بودے شکار افگنان

طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے مناظر اس کی ادبی مصوری کی بہترین مثال ہیں۔

چو از غرفہ شاہ فلک سر کشید
بہ قصد شب تیرہ خنجر کشید
شبانگہ کہ ایں ساقی صبح خند
مئے لعل در جام مینا فگند

عصامی کو مختصر الفاظ میں شخصیتوں کا خاکہ کھینچنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ زبان و بیان پر قدرت کی بنا پر بڑے جاندار، سچے اور موثر خاکے پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اچھے اخلاق شخصیت کو آب و تاب عطا کرتے ہیں۔
الحاصل عصامی ایک ایسا فنکار تھا جو قلم کی چند جنبشوں سے تصویر کو اجاگر کرنے اور اس میں جان ڈالنے میں ملکہ رکھتا ہے۔

ناصر الدین محمود بن التمش کی سیرت کا خاکہ کچھ اس طرح کھینچتا ہے۔

شنیدم کہ آن شاہ فرخندہ رائی ۔۔۔ یکے بود از خاصگان خدائی
بدو عادت بود تاج و سریر ۔۔۔ کہ بودے بکار پلاس و حصیر
شب و روز آن خوش تر از جان پاک ۔۔۔ بدے مست از ذکر یزدان پاک

اور جلال الدین خلجی کی کردار کشی میں اس امر کو نمایاں اہمیت دی ہے کہ اس کے زمانے میں کسی شخص کے دل کو تکلیف نہیں پہنچی۔

شہے بود الحق حلیم و کریم ۔۔۔ مزاجش بداد و دہش مستقیم

درآں ہفت سالے کہ او ملک راند   یکے خاطر آزردہ ازوے نماند

فتوح السلاطین کی سب سے نمایاں خوبی اس کا اسلوب ہے۔ عصامی نے شروع سے آخر تک ایک ہی قسم کی زبان اختیار کی ہے اور کہیں منطق، ثقیل اور نا مانوس الفاظ کے استعمال سے اپنے طرز ادا کی خوبی کو مجروح نہیں کیا ہے۔
عصامی کے طرز بیان میں کہیں آورد نہیں ہے اور نہ کہیں دور از کار تشبیہات و استعارات سے معانی و مطالب میں پیچیدگی پیدا ہوئی ہے۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن، عصامی کی زبان کے متعلق اپنے تاثرات اس طرح پیش کرتے ہیں:

"زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ عصامی نے ہزاروں اشعار کہے اور ہندوستان کے واقعات بیان کیے لیکن ہندی الفاظ، محاورات اور مصطلحات کہیں نہیں استعمال کیے ہیں حالاں کہ اسی عہد میں برنی اور خسرو اپنی زبان میں بھاشا کے الفاظ قبول کر رہے تھے۔"

اس طرح سے فتوح السلاطین نہ صرف تاریخی نقطہ نظر سے قابل التفات ہے بلکہ ادبی حیثیت سے اپنے عہد کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔ اس میں سلاطین ہند کی فتوحات کی رزمیہ داستان شروع سے آخر تک فردوسی کی تقلید میں بحر متقارب میں لکھی گئی ہے۔

عصامی کا اصل اعجاز میدان جنگ کی معرکہ آرائی، فوجی سرداروں کی نبرد آزمائی، لشکروں کی صف آرائی کی بہت ہی جیتی جاگتی تصویر کشی ہے۔ اس سلسلے میں اس کا زور بیان، قوت تحریر اور رزمیہ شاعری کا اثر کہیں بھی کم ہونے نہیں پاتا۔
عصامی کی "فتوح السلاطین" کا شمار اپنی صوری اور معنوی محاسن کی بنا پر ہندوستان کے ادبیات العالیہ میں ہوتا ہے۔ اس کو ہندوستانی فارسی کی رزمیہ شاعری کی پہلی مثال اور عصامی کو ہندوستان کے فارسی شعرا میں قابل قدر رزمیہ شاعر کہا جا سکتا ہے۔

حوالے

۱۔ مجمدار آر۔ سی دی ذیلہی سلطنت، بمبئی۔ ۱۹۴۰ء۔ ص ۶۱
۲۔ شروانی، ہارون خاں، دی بہمنیز آف دی دکن، ص ۲۰
۳۔ دیوارے، ٹی۔ این۔ اے ہسٹری آف پرشین لٹریچر ۱۹۶۱ء ص ۱۷
۴۔ شروانی، ہارون خاں، دی بہمنیز آف دی دکن ص ۴۸
۵۔ عصامی، فتوح السلاطین یعنی شاہنامہ ہند، (مرتب) آغا مہدی حسین، آگرہ ۱۹۳۸ء۔
۶۔ آغا مہدی حسین، دی فردوسی آف انڈیا پروسیڈنگس آف دی انڈین ہسٹری کانگریس، لاہور ۱۹۴۰ء ص ۲۰۱۔
۷۔ عصامی، فتوح السلاطین (مرتب) آغا مہدی حسین۔ ص ۲۱۔
۸۔ ایضاً ص ۵۸۲
۹۔ ایضاً ص ۵۷۷
۱۰۔ مہدی حسین "دیباچہ" فتوح السلاطین ص ۳۔
۱۱۔ عصامی، فتوح السلاطین (مرتب) مہدی حسین ص ۳۰
۱۔
۱۲۔ ایضاً ص ۱۱۔
۱۳۔ ایضاً ص ۱۱۲، ۱۱۴، ۲۰۹، ۲۱۲، ۲۲۷، ۲۳۰، ۲۳۳، ۲۴۲۔
۱۴۔ مہدی حسین، دیباچہ، فتوح السلاطین، ص ۵۔
۱۵۔ فتوح السلاطین ص ص ۱۵، ۱۶۔
۱۶۔ ایضاً ص ۵۷۷
۱۷۔ ایضاً ص ۵۷۹
۱۸۔ ایضاً ص ۱۸، ۱۹
۱۹۔ ایضاً ص ص ۱۸۰، ۱۸۱
۲۰۔ ایضاً ص ۱۵۰
۲۱۔ ایضاً ص ۲۲۰
۲۲۔ صباح الدین عبدالرحمن، سید "فتوح السلاطین" معارف ف شمارہ نمبر ۶ جلد نمبر ۴۴، ۱۹۳۸ء ص ۴۳۹۔

مصحف اقبال توصیفی

میں یہ چاہتا ہوں

میں یہ چاہتا ہوں سمندر کے ساحل
بھیگی ہوئی ریت پر گال رکھے
چند لمحے۔
اسی طرح لیٹا رہوں۔۔۔

مگر وقت کی بھیڑ میں۔
مرے پاس اپنے لیے
چند لمحے کہاں ؟
ہواؤں کے اس شور میں
میرے گریباں کی دھجیاں
اب کہاں ؟

سمندر کی آغوش میں اتنی لہریں ہیں۔۔۔
اک لہر ایسی نہیں
جو لے جائے مجھ کو بہاکر
اک ایسے جزیرے کی جانب
جہاں کوئی رہتا نہ ہو
جہاں پانیوں میں
مری استھیاں
زمیں پر
مرے نام کا کوئی سایہ نہ ہو!!

اسلم عمادی

بکھرتی سمتوں میں

جب سارے ابعاد بھر گئے ہوں پتھر کی دیواروں سے
جب دا ہیں جو کبھی بچھی تھیں، ہو جائیں
بالکل سے عمودی،
جب چہرے محلول بن گئے ہوں اور فضا ریتیلی
تب بھی ہم تیرے پرتو کو
لفظوں میں، گر لفظ حروف سے بے پروا ہوں،
رنگوں میں، گر رنگ نور کی پلکوں سے اڑ جائیں،
جو کھردری اور بے ربط سی ہوں،
دیکھیں گے۔
تو تو وہ بے معنی ہے،
جس میں ہم نے سب کچھ یوں ہی
غرق کر دیا۔
جس میں ہم نے
سب امروز و فردا پرزے پرزے کر کے بہا ڈالے
اب ہم تجھ بے معنی سے
اپنی شناخت کا زخم سنبھالے
محور پر بے ڈھنگی سی رفتار میں
گھوم رہے ہیں۔
تیرے پرتو کے ہر عکس کو چوم رہے ہیں۔

صفیہ اریب

نظم

اندھیروں کی
تہوں کو چیر کر
جب
سر اٹھاتی ہوں
روشنی کی
سرحدوں کو
کاٹ کر
پھر ڈوب جاتی ہوں
سرنگیں کھودنا
خندق بنانا
میرے ذمے ہے!
ازل سے
تا ابد
اس کام میں مصروف ہوں
لیکن ...
نہ جانے
کس طرح
بدل جاتے ہیں

لمحوں میں
حقائق
ٹھوس پتھر سے!
سرنگیں بند
کرتی ہوں
خندقوں کو
پاٹ دیتی ہوں!
اندھیروں کی
تہوں کو
چیر کر۔ پھر
سر اٹھاتی ہوں
میں خود کو
کلبلاتا دیکھتی ہوں
ایک
دلدل میں!

فاطمہ تاج

دریا دل کا

آج پھر خشک ہوا، دیکھیے دریا دل کا!
آج طوفان بہے کتنے ہی آنکھوں سے مری
پھیر لی مجھ سے نظر آج اجالوں نے یہاں
پھر اندھیروں نے چھپایا ہے مجھے
دامن میں
آج خاموش ہوں گم سم ہوں اسی سوچ میں
میں
ریت ہی ریت
یہ بہتے ہوئے دریاؤں کی
جانے کتنے ہی بگولوں کو اٹھالائے گی
مسکرائے گا یہ سورج کا اجالا لیکن
پیاس تو پیاس ہے
سینے میں اتر جائے گی
خاک بھی پیتا ہے لے لے کے مزہ مجھ کو یہاں
اور جلتی ہوئی راہوں پہ بھی
چلنا ہے مجھے
عمر کے لمحہ شاداں سے
گذرنا ہے مجھے
اور طے کرنا ہے صدیوں کا سفر
زندگی باقی ہے ان پیڑوں کی اب بھی
لیکن
جن پہ پتا بھی نہیں
پھول نہیں
پھل نہیں.......!!!

وقار خلیل

وابستگی

زمین کے رشتے میں تہذیب ماہ وسال کا کیف
زمین ہی سے عبارت
بدن کا رشتہ فشارِ حیاتِ عمرِ رواں
سکونِ دیدہ و دل • آبشارِ فکر وخیال
بدن کا ذریعہ قند و نبات سے بھی سوا
مگر یہ شرط کہ تہذیبِ آدمیت سے
اسے حیات کا ورثہ قرار دینا ہے
تو پھر زمین کا رشتہ بہت ضروری ہے

پروفیسر لیس چندر شیکھر

ترجمہ: ڈاکٹر مقبول فاروقی

اشک ندامت

جب موذن نے
انھیں آواز دی
(بستی کی) مسجد سے
خوش الحانی سے
رب کا نام لے کر۔
عبادت کے لیے
ان کو بلایا
لوگ مسجد میں جمع ہونے لگے۔
لیکن
دلوں کا حال تو
وہ (غیب داں ہی) جانتا ہے
نیک و بد کو بھی وہی پہچانتا ہے
اور اٹل انصاف ہے اس کا
پریشاں حال ہر دل
(بارگاہ رب میں) روتا ہے
(کہا جاتا نہیں کچھ بھی)
خموشی کا خلا
بھر جاتا ہے (اشک) ندامت سے!

شاعری

شاعری ہے اک جزیرہ
یہ زمین انگبیں
یوں جوتی جاتی ہے
کچھ ایسے بوئی جاتی ہے
کہ یہ پھر
بارش الہام سے
اور دھوپ سے افکار کی
سیراب ہو کر
(فکر و فن کی)
وہ سنہری فصل دیتی ہے
زمین و آسماں کے واسطے
جو ایک تحفہ ہے

حامد بن شبیر

فرقِ نظر

یارب مجھے مل جائے زمیں اور زماں اور
ہے رنگِ طبیعت مرا کچھ، رنگ جہاں اور
مشہود جو واحد ہے تو پھر فرقِ نظر ہے
اپنا ہے بیاں اور حدیثِ دگراں اور
گو لاکھ حقیقت پہ کوئی ڈال دے پردے
اٹھتے ہیں حجابِ نظر دیدہ وراں اور
بے مائگیِ سود و زیاں دیکھ کے بھی دوست
یہ دل ہے اسیرِ اثرِ سود و زیاں اور
نسبت ہے بہاروں سے کہاں اجڑے دلوں کو
آئیں جو بہاریں تو بڑھا رنگِ خزاں اور
دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ہیں وصل کے محتاج
ہے عشق کے ماروں کا مگر دردِ نہاں اور
اہل حرم و دیر کی پڑتی ہیں نگاہیں
شاید کہ ہے رسم ورہِ رندانِ جہاں اور
یاں بوریا بھی بے ریا ہوتا ہے مرے دوست
بکتا ہے جہاں زہد وہ ہوتی ہے دکاں اور
اک اف بھی زمانے کی سماعت پہ گراں ہے
بے سود تھا کرتے بھی جو فریاد و فغاں اور
اک عالمِ نو کی پڑے بنیاد الٰہی
صادر ترا فرماں ہو کوئی کن فیکاں اور

بشر نواز

○

دن ڈھلا سونے نگر روشن ہوئے
چاند چہرے بام پر روشن ہوئے

شام کے دامن میں کیسی آگ تھی
ہم ادھر۔ تارے ادھر روشن ہوئے

جابجا ابھرے جزیرے نور کے
رات کے آتے ہی گھر روشن ہوئے

دوریوں میں اور چمکی تیری یاد
دھوپ میں تتلی کے پر روشن ہوئے

سب نے اپنے طور برتی زندگی
سارے منظر آنکھ بھر روشن ہوئے

○

دن ڈھلا بے نام ڈر روشن ہوئے
جاگ اٹھیں موجیں بھنور روشن ہوئے

خون کے چھینٹے چراغاں کر گئے
شہر کے دیوار و در روشن ہوئے

کوئی خنجر بن گیا کوئی سپر
اس سفر میں ہم سفر روشن ہوئے

جن میں اپنے آنسوؤں کی جوت تھی
وہ دیے جانے کدھر روشن ہوئے

اپنے حصے میں دھواں ہے آگ ہے
کچھ مکاں شاید ادھر روشن ہوئے

ظلم خود اپنی گواہی بن گیا
بے زباں سر دار پر روشن ہوئے

○

ذکی بلگرامی

○

قیام کس طرح کرتے افق کنارے پر
زمین کے قرض میں جکڑے رہے ہمارے پر
کہیں ہو گئے رخصت تو پھر مکاں کیسا ؟
مجھے یقین نہیں اینٹ چونے گارے پر
انا کا گہرا سمندر تھا بیچ میں حائل
میں اس کنارے کھڑا تھا وہ اس کنارے پر
اکھڑ رہی تھی نفس ایک ایک تارے کی
میں رو رہا تھا شبِ ہجر کے خسارے پر
وہ ایک طائر تنہا نظر نہیں آتا
جو بیٹھا کرتا تھا مسجد کے اس منارے پر
بہاکے لے ہی گئی مجھ کو موجہ منہ زور
تڑپ رہا تھا مرا عکسِ جاں کنارے پر
زمیں نے پاؤں میں چٹکی بھری تو چونکا میں
جمی ہوئی تھی مری آنکھ اک ستارے پر
کبھی نہ ختم ہو یہ شوقِ عکس بندی مرا
میں روز سر کو نکالا کروں غبارے پر
پھر اس کے بعد تو ہر بندِ صبر ٹوٹ گیا
جھپٹ پڑے خس و خاشاک ہر شرارے پر
نہ جانے کتنے چراغوں کی لو کتر دے گی
یہ اک ہوا جو چلی ہے ترے اشارے پر
بکھر رہی تھی ذکی جائیداد پرکھوں کی
بھر آئی آنکھ زمینوں کے گوشوارے پر

○

یوں شبِ ہجر کا ماحول بنا رکھا ہے
شام سے ہم نے چراغوں کو بجھا رکھا ہے
شاید آجائے کوئی بیتی رتوں کا جھونکا
اسی امید پہ دروازہ کھلا رکھا ہے
اک ترے غم کی نوازش ہے کہ جی بہتے ہیں
ورنہ اس دورِ پرآشوب میں کیا رکھا ہے
میری عریانیِ قامت کو کڑی دھوپوں سے
تیری دیوار کے سائے نے چھپا رکھا ہے
مجھ کو شہر بہ درِ ظل الٰہی کردیں
میرا سامانِ سفر کب سے بندھا رکھا ہے
میں نوائے جرس جاں سے بھی محروم ہوا
گھر کے سناٹے نے کیا شور مچا رکھا ہے
تیری ہر آیت گل زینت جزداں گو
تیرا خامہ سرطراب حرا رکھا ہے
خلقت شہر اسے زخم سمجھتی ہے ذکی
میں نے جس پھول کو ماتھے پہ سجا رکھا ہے

پروفیسر مسعود سراج

○

تو میرا کوئی خیال مت کر
مشکل ہے بہت سوال مت کر

یادوں کو نہ چھین اور مجھ کو
محتاجِ متاع و مال مت کر

پلکوں پہ جوا تری ں خواب بہتر
کھو جائیں اگر ملال مت کر

گردش میں ہوں ماہ وسال کی میں
تو اور بھی خستہ حال مت کر

ماضی کے حوالے کر نہ خود کو
یوں دل کو شکستہ حال مت کر

●○●

عبدالرحیم نشتر

○

اپنے سینوں پہ لیجے وار کھلا
چلیے میدانِ کارزار کھلا

کوئی اندر بلا رہا تھا مجھے
بند دروازہ بار بار کھلا

بھول کر بھی نہیں رکھا اس نے
کوئی دروازہ بہار کھلا

دشمنِ جاں تو ہے وہی پھر بھی
لوگ کرتے ہیں اس سے پیار کھلا

چشم و دل فرش راہ کرتا ہوں
اب کہیں جاکے اعتبار کھلا

●○●

زاہدہ حنا

آنکھوں کو رکھ کے طاق پر دیکھا کرے کوئی

خوابوں کا بھنور جال ہے اور ختم نہ ہونے والی نیند کا پاتال۔ دل کی دھڑکن، مانیٹر کے اسکرین پر وحشیانہ رقص کرتا ہوا نقطہ۔ ناگ
ک سے زندگی مجھے ادھر بلاتی ہے جدھر رنگ ہیں، روشنی ہے، راگ ہیں، رقص سبھا ہے، چراغاں کی چکاچوند سے پرے حاضرین ہیں،
رین ہیں۔

وقت، میر رقص۔ زندگی اسی کے اشارے پر رقصاں۔ میں سمراٹ سے کے سامنے سر جھکاتی ہوں اور ریشم میں رسمساتے ہوئے
ں پر جلتی ہوئی روشنی میں آتی ہوں۔ رنگ بھوم کے فرش پر سفید لباس میں لچکتا ہوا میرا بدن۔ ریشمی جوتوں کی بندش میں پھڑکتی ہوئی
ہری پنڈلیاں۔ وقت کی وردی میرے لیے بج رہی ہے۔ زندگی کی بیج میرے لیے بج رہی ہے۔ میں زویاز۔ ٹوف، پرائما بیلے رینا۔ دائرے
کھینچتی ہوئی دامنی۔ میں روپ بدلتی ہوئی شہزادی، جولیٹ اور سینڈریلا ہوں۔ کبھی آنکھوں کی سوئیوں کے ساتھ سوتی ہوئی حسینہ ہوں۔ کسی
ظر میں ڈال سے بکھرا ہوا پرندہ ہوں۔ موسیقی کی لہروں پر تیرتا ہوا، تت کی ہنہ میں اترتا ہوا راج ہنس ہوں۔

فرش کو چھوتا ہوا دبیز ریشمی پردہ سرک رہا ہے۔ دیکھنے والے سروقد کھڑے ہوتے جاتے ہیں اور ان کی ہتھیلیوں سے داد کے جھرنے
ہوٹتے ہیں۔ شنگرفی مخملیں پردے کی سینکڑوں سلوٹوں کے پیچھے سے میں ناظرین کی نگاہوں میں طلوع ہوتی ہوں۔ پھول میرے قدموں میں
رہے ہیں۔ تیز فرشی روشنیوں میں سانس لے رہے ہیں۔ میں کورنش بجالاتی ہوں، تالیوں کی امڈتی ہوئی آواز پر سرو رواں کی طرح تیرتی ہوں۔
رشکن در شکن پردے کے پیچھے غروب ہو جاتی ہوں۔

غروب کی یادیں، بھوکے بھیڑیے۔ یسوع مسیح کے بعد کا برس ایک ہزار نو سو اکیانوے۔ اگست کا بیسواں دن غزاں بڑھی چلی آتی ہے
ریائے ماسکو کا کنارہ۔ نووآر باتسکی پل۔ ہاؤس آف سووئٹس۔ ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں۔ ہزاروں لوگ سڑک پر دھرنا دیے بیٹھے ہیں۔ میں
پانی جا رہی ہوں۔ سپاہیوں کے سر میرے لیے جھک رہے ہیں۔ ایک ٹینک کے دہانے میں ہنستا ہوا گلدستہ مجھے اپنی طرف بلاتا ہے۔ آٹو گراف
کے لیے سگریٹ کے پیکٹ اور نوٹ بکیں میری طرف اچھالی جا رہی ہیں۔ شہرت کی شراب اور ہنر کا حساب میرے اندر ہے۔ میں ڈھلے ہوئے
ولاد کی چکنی سطح پر دائرہ بناتی ہوں۔ تن کی کمان کھینچی ہوئی، حسن پر سان رکھی ہوئی۔ میں اترا رہی ہوں، مجھے داد دینے والے اترا رہے ہیں۔
م خوش گمانیوں میں گم کہ نیرنگی زمانہ ہمیں کبھی چھو کر نہیں گزرے گی۔ وقت مسکراتا ہے اور اپنی کمان چڑھاتا ہے۔ ہم اور ہماری آنکھوں
ں سانس لیتے ہوئے خواب اس کا شکار۔

مہابلی وقت کی تیر اندازی پر زمین و آسمان حیراں، شہر ویراں، انسان سر بہ گریباں، بادل جن کے مجرائی تھے ان کی گردنوں میں
سیاں، چوک میں کھڑا ہوا مارکس زمین بوس، لینن سر بہ زانو۔

جیب بھرے جہاں گردوں کے جھنڈ ہمارے شہروں پر اترتے ہیں۔ نیلامی آغاز ہوتی ہے۔ ہماری نخوتوں اور عصمتوں کی دیاسلائی کی
یک ڈبیا، ایک غلیظ بوسہ۔ ایک وقت کا کھانا، ایک رات کا عوض۔ اسکاچ کی بوتلیں اور ہماری کنواریوں کے بدن۔ کل تک ہماری
تماشتوں کے طلب گار، آج ہمارے خریدار۔ ہم تماشا، ساری دنیا تماشائی۔ بالشوئی بال، مایا کوسکی، پشکن اور گوگول تھیٹر، ہماری رقاصائیں

ور ہمارے اداکاروں کی عبادت گاہیں، سیاحوں کے عشرت کدے۔

جہاں پناہ وقت نے ہمیں پھیلایا اور پھر سمیٹ لیا۔ کیا ہم اسی سزا کے مستحق تھے۔ ہماری خطائیں کیا بے شمار تھیں اور ہمارے گناہ لیا ان گنت؟

یرمیاہ کی آواز در و بام پر نوحہ کرتی ہے۔ وہ خاتون اقوام بیوہ ہوئی۔ وہ رات کو زار زار روتی ہے۔ اس کے آنسو رخساروں پر بہتے ہیں۔ اس کے سب ممالک سنسان ہیں۔ اس کے کاہن آہیں بھرتے ہیں۔ اس کی کنواریاں مصیبت زدہ ہیں اور وہ خود غمگین۔

میں اس نوحے کو سنتی ہوں اور زاری کرتی ہوں۔ ہمارے دلوں سے خوشی جاتی رہی۔ ہمارا رقص ماتم سے بدل گیا۔ رقص، راکھ۔ اب، خاک، شہرت آنی جانی۔ پیروں کی چلت پھرت، انگلیوں کی ترت بھولی بسری کہانی۔

خوابوں کے ریزے کسی کہانی میں بیان ہونے والی آنکھوں کی سوئیاں ہیں جنھیں کوئی شہزادہ نکالتا جائے اور سوتی ہوئی شہزادی جاگتی جائے۔ زندگی کو ایک قرمزی خواب ماننے اور رقص کو اسی خواب کی توسیع جاننے والی میں، زویا زہتوف، پریما بیلے رینا کن قدموں سے چل کر سٹیج پر جاؤں۔ ذو معنی اشارے کس طرح دیکھوں۔ کسی غیر زبان کے وہ جملے سننے کے لیے، ہمت کہاں سے لاؤں جنھیں سمجھنے کے لیے کسی مترجم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ریشمی جوتے طاق پر۔ دماغ کے خلیے، بھڑکتے ہوئے چراغ۔ اعصاب، ٹوٹتی ہوئی طنابیں، ڈاکٹر ولادیمیر اولیانیوف، تین نسلوں سے ہمارا مسیحا۔ اسی نے مما کو پیدا کیا اور پھر مجھے۔ اب وہی دواؤں سے، دلاسوں سے مجھے زندہ رکھنے پر مصر۔

"جس خواب کے سوگ میں تم سب کچھ ترک کیے بیٹھی ہو، وہ اور میں ہم عمر ہیں۔"

"جانتی ہوں اور اسی نتیجے پر پہنچی ہوں کہ سب کچھ لاحاصل ہے۔۔"

"تم پریما بیلے رینا۔ ہماری عظیم رقاصہ اور تم بھی حاصل اور لاحاصل کا فرق نہیں جانتیں؟ دم توڑتے ہوئے راج ہنس کا روپ دھارنے والی غم کی طاقت سے واقف نہیں؟"

"رقص میرے بدن سے اور خواب میری آنکھوں سے رخصت ہوگئے۔"

"بدن سے رقص جدا ہو سکتا ہے لیکن خواب آنکھوں میں ہی رہتے ہیں۔ پرانے خواب نئے خوابوں کو جنم دیتے ہیں۔"

"مجھے تو ہر طرف اندھیرا نظر آتا ہے۔"

"اپنے اندر امید کو زندہ رکھو۔ وہی اندھیرے میں جگنو بن کر تمھیں راستہ دکھائی گی۔"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔"

"آج رات اپنی کھڑکی سے آسمان کو دیکھنا۔ تمھیں کئی ستارے ٹوٹتے ہوئے نظر آئیں گے لیکن آسمان پھر بھی جگمگاتا رہے گا۔ سات ستاروں کی ناؤ رات کے نیلگوں سمندر میں اسی طرح چلتی رہے گی۔

میں کلینک سے نکل کر سڑکوں پر پھر رہی ہوں۔ مجھے ڈاکٹر ولادیمیر اولیانوف، مما اور پاپا کے ساتھ گزاری ہوئی بھولی بسری راتیں، یاد آرہی ہیں۔ ہم وولگا کے کنارے ہیں۔ پاپا اور ڈاکٹر اپنے چاقوؤں سے خشک ٹہنیاں کاٹ رہے ہیں۔ میں زمین پر گرے ہوئے سوکھے پتے جمع کر رہی ہوں۔ مما شکار کی ہوئی مچھلیاں صاف کر رہی ہیں۔ یخنی میں ابلتی ہوئی مچھلیوں کی خوشبو ہے۔ کھانے کے بعد مما اور پاپا ٹہلتے ہوئے شاید دور نکل گئے ہیں۔ میں ڈاکٹر کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوں اور ستاروں کو تک رہی ہوں جو اونچے اونچے پیڑوں کی پھنگوں پر ٹکے ہوئے ہیں۔

شام ڈھلے دل کی بے قراری مجھے بالشوئی ہال تک لے جاتی ہے جس کی پیشانی رومن وضع کے آٹھ ستونوں پر قائم ہے۔ اس پیشانی پر حسن زندگی، روشنی اور شاعری کا دیوتا اپالو ہے۔ چار برقی گھوڑوں کے رتھ میں سوار۔ ایک پیڑ کی اوٹ سے میں اپنی عبادت گاہ کو دیکھتی ہوں جس پر جہاں گردوں کے غول منڈلا رہے ہیں۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے مجھے ٹوٹتے ہوئے تارے نظر آتے ہیں۔ وولگا کا کنارہ ہے اور گرتے ہوئے تاروں کی بجھتی ہوئی روشنی۔ رات سے دریا کی سرگوشیاں ہیں۔ ہواؤں کے جھولے میں خوشبو کی مدہوشیاں۔ دل کا جنگل ہے، خواہشوں کے خشک پیڑ ہیں۔ میں ان کی ٹہنیاں تراشتی ہوں اور الاؤ جلاتی ہوں۔

روشن الاؤ کے حاشیے پر ایک ننھی پری رقص کر رہی ہے۔

"کون ہو تم؟"

"میں ندیژدا ہوں۔ آپ مجھے نہیں پہچانتیں؟"

"کون ندیژدا؟"

"آپ کی امید۔"

اس کی آواز میرے دل میں ترازو ہو جاتی ہے۔ میں بے قرار ہو کر باہنیں پھیلاتی ہوں۔ "میں تم پر نثار ندیژدا۔ آؤ میرے پاس آجاؤ۔ وہ ہنستے ہوئے میری بانہوں میں آ رہی ہے۔ میں روتے ہوئے اسے چوم رہی ہوں۔ ندیژدا۔ امید۔ نئی زویا۔ میں اپنی بیٹی خواب کلیسا کے نام کروں گی۔ زمانہ مجھ پر نامہربان ہوا، اس پر مہربان ہوگا۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا۔ میری تخلیق، میری توسیع، میری تعبیر۔

تم جیت گئے اور تم ہار گئے ڈاکٹر ولادیمیر اولیانوف۔ تم مجھے زندہ رکھنے کے خواہاں اور تم ہی نے میری آنکھوں میں وہ خواب رکھ دیا جس کی قیمت زندگی ہے۔ برسوں پہلے تم نے بتایا تھا کہ میں اپنی زندگی دے کر ہی ماں بن سکتی ہوں۔ میرا دل پیدائش کے لمحے سے چھدا ہوا۔ تقدیر کا تیر اس میں پہلی سانس سے اترا ہوا۔ ایک نئی زندگی کے بارے میں پہلے کبھی سوچا بھی نہ تھا لیکن اب جب کہ سب کچھ رائیگاں ہے، جان دے کر نئی زندگی کی خریداری کا فیصلہ کس قدر سہل ہے۔

کچھ دنوں پہلے مجھ پر فدا ہونے والوں کی کمی نہ تھی لیکن اب ان میں سے کوئی نظر نہیں آتا۔ میری نگاہوں میں ریڈیو ماسکو کی اردو سروس سے وابستہ احمر کا چہرہ گھوم جاتا ہے۔ "رادوگا کتاب گھر" سے متعلق۔ احمر ان کے شعبے میں روسی سے اردو کا مترجم۔ صبح و شام ہمارے گھر آنے والا۔ میرا نروس بریک ڈاؤن ہوا تو اس نے اپنا ہر فارغ لمحہ میرے ساتھ گزارا۔ ہونٹوں سے کچھ نہ کہہ کر سب آنکھوں سے کہہ جاں نثار مہمان۔ دل شکستہ میزبان۔

میرا فیصلہ سب کو حیران کر دیتا ہے۔ رجسٹریشن آفس میں یکجائی کی کارروائی کے بعد شب کو ضیافت ہے۔ دوست ہیں، چند رشتے دار ہیں۔ مما بھی موجود ہیں، دل کا غبار چہرے پر پھیلا ہوا۔ ڈاکٹر ولادیمیر اولیانوف کی پیشانی پر شکن ہے وہ میرا ہاتھ تھام کر ایک طرف لے جاتا ہے "میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں لیکن ماں بننے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔ جان سے چلی جاؤ گی۔"

میں اسے دیکھتی ہوں اور مسکراتے ہوئے سر ہلاتی ہوں۔ ہنستا ہوا احمر شیمپئن کی بوتل کھولتا ہے۔ جھاگ اس کے ہاتھ پر گر رہا ہے۔ خوشیاں۔ شیمپئن کا ابال۔ احمر نہیں جانتا، ڈاکٹر ولادیمیر اولیانوف نہیں جانتا کہ آج سے میں وعدہ آن پہنچنے کا انتظار کروں گی۔

کئی مہینوں بعد دل کا پہلا دورہ۔ مفلسی نے ہم سب پر اپنے پنکھ پھیلا دیے ہیں۔ علاج اب عیاشی ہے سو میں چند ہی دنوں میں گم

جاتی ہوں۔ چند دنوں کی ندیژدا مجھ میں پرورش پارہی ہے۔ ندیژدا۔ امید۔ زندگی کا جگنو۔

میں ایک اجنبی ڈاکٹر کے کلینک کا رخ کرتی ہوں۔ "اس بوجھ سے فوراً نجات پاؤ، ورنہ مرجاؤ گی۔" وہ سنک پر ہاتھ دھوتے ہوئے کہتا ہے۔ میں فرماں برداری سے سرہلاتی ہوں اور رخصت ہوجاتی ہوں۔

ہفتے مہینوں میں بدل رہے ہیں۔ ڈاکٹر ولادیمیر اور ماما مجھ سے بے پناہ ناراض۔ ان دونوں نے احمر کو سب کچھ بتادیا ہے۔ وہ بھی ان کا ہم زبان۔ میں اسے جھوٹی تسلیاں دیتی ہوں۔ "ڈاکٹروں کا کیا ہے کچھ بھی کہہ دیتے ہیں۔ دل کی اسی حالت کے ساتھ آٹھ برس کی عمر سے رقص سیکھا ہے میں نے۔ روزانہ گھنٹوں کا ریاض کرتی ہوں۔ پیرس، لندن، نیویارک اور دلی کے دورے کیے ہیں۔"

احمر کی سمجھ میں نہیں آتا۔ میری مانے یا ڈاکٹر کی۔ وہ مجھے اپنی توجہ کے حصار میں رکھتا ہے۔

سورج ساتویں برج میزان میں آیا۔ چوتھی اکتوبر ۱۹۹۳ء کیوتوزوسکی پروسپکٹ کا علاقہ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے بھرا ہوا۔ ماسکو کی سڑکوں پر شہریوں اور فوجیوں کے درمیان جھڑپیں کئی دن سے جاری۔ "ہاؤس آف سوئٹس" جسے اب "وہائٹ ہاؤس" کہتے ہیں اس کے حاشیے پر اونچے اونچے پیڑوں کی قطار۔ تانبے کی رنگت کے پتوں کا رقص خزاں۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا۔ فضا تناؤ، طیش اور تمیر سے بھری ہوئی۔ عین اکتوبر کو ایک اور "خونیں اتوار" ہماری تاریخ کا حصہ بن چکا۔ پارلیمنٹ میں پناہ لینے والوں پر کھانا اور پانی بند۔ بجلی کٹ چکی۔ اس کی کھڑکیوں میں شمعیں جھلملاتی ہیں۔ ٹیلی ویژن ہاؤس کے سامنے آدھی رات کو مارے جانے والوں کی لاشیں بھی اٹھائی نہیں گئیں۔ خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے۔

رات احمر دیر تک جاگتا رہا، اب سو رہا ہے۔ میری بے قراری مجھے منہ اندھیرے نووآر باتسکی برج تک لے آئی ہے۔ صبح کے سات بج رہے ہیں اچانک دریا کے کنارے گولیاں چلتی ہیں۔ وھائٹ ہاؤس کی کھڑکیوں سے اس کا جواب دیا جارہا ہے۔ ٹینکوں کے دہانے گولے اگل رہے ہیں۔ سب مشین گنیں چل رہی ہیں۔ کھڑکیاں ریزہ ریزہ۔ نچلی منزلوں پر گہری آگ۔ کچھ فاصلے پر وہ ٹیکری ہے جس پر کھڑے ہو کر نپولین بوناپارٹ نے ماسکو کو جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج ٹیکری پر کوئی نپولین نہیں اور شہر جل رہا ہے۔ کپتان کی بیٹی۔ مردہ روحیں۔ اینا کرینے نینا۔ کرامازوف برادران۔ بیتے دن اور کنوارے کھیت جل رہے ہیں۔ حکایتوں کی تفسیریں اور روغنی تصویریں جل رہی ہیں۔ زمین کوئے جاناں آج پہچانی نہیں جاتی۔

پل پر کھڑے ہوئے کئی لوگ مارے جاچکے۔ احمر مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں آجاتا ہے۔ "چلو گھر چلو" وہ مجھے اس فلیٹ میں لے جاتا ہے جسے وہ "گھر" کہتا ہے۔

پانچویں اکتوبر۔ ہم دونوں فلیٹ کی کھڑکیوں سے دریا میں جھلکتی ہوئی روشنیاں دیکھ رہے ہیں۔

"میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

وہ چونک کر مجھے دیکھتا ہے۔ "ہم گھر میں ہی تو ہیں۔"

"میں تمھارے گھر کی بات کر رہی ہوں۔۔"

"وہ تو کراچی میں ہے۔"

"ہاں ۔۔۔۔ میں وہیں جانا چاہتی ہوں۔" رہیے اب ایسی جگہ چل کے جہاں کوئی نہ ہو۔ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو۔ ترک وطن، پاکستان کا سفر۔ ہوائیں اجنبی، فضائیں اجنبی۔ چہروں سے شناسائی نہیں، لفظوں سے آشنائی نہیں۔ احمر کے گھر والے

میرے ناز اٹھاتے ہیں۔

ریڈیو ماسکو سے احمر کا معاہدہ ختم ہونے میں ابھی کچھ دن ہیں۔ میں اس کے جانے سے پہلے ایک شاندار تقریب میں بہت سے لوگوں کے درمیان دلہن بنی ہوئی۔ احمر کے کئی دوست ڈاکٹر ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر ولادیمیر کے ہم زبان، ہم خیال۔

احمر کے بابا کی اسٹڈی، میرے لیے ایک حیرت کدہ۔ مارکس اور لینن ماسکو کی شاہراہوں پر زمیں بوس۔ یہاں وہ دونوں ایک اونچے طاق پر بیٹھے ہوئے مسکراتے ہیں۔ کتابیں قطار در قطار۔ مارکس ازم۔ لینن ازم۔ روسی ادب۔ زمانہ اس کمرے میں تھما کھڑا۔

ندیژدا کی آمد میں چند ہفتے۔ ہر لمحہ مشکل سے گذر رہا ہے۔ ہر گھڑی اذیت کی گھڑی ہے۔ پیدائش کے لمحے سے میرا چھدا ہوا دل، ہم دونوں کی سانسوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے تھکنے لگتا ہے۔ میں ڈاکٹروں میں گھری ہوئی۔ آکسیجن ماسک پہن کر روزانہ گھنٹوں گہرے سانس لیتی ہوئی۔ زندگی کی رہ جانے والی ساعتوں کا شمار کرتی ہوئی۔ خواہش کرتی ہوئی کہ موت مجھے میری امید، میری ندیژدا کو دیکھنے کی مہلت ضرور دے۔

بسمل کی تڑپ، آپریشن کے سوا چارہ نہیں وار اینستھیسیا کا استعمال ممکن نہیں۔ میرے بدن کو انجکشن سے سن کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹروں اور میرے درمیان ایک سفید اسکرین۔ تھکی ہوئی آنکھوں سے میں نقاب میں چھپے ہوئے چہرے، سروں کی جنبش، ہاتھوں اور آنکھوں کی حرکت اور چمکتے ہوئے نشتر دیکھتی ہوں۔ انجکشنوں کا اثر ختم ہو رہا ہے۔ درد میرے وجود کے چیتھڑے اڑا رہا ہے۔ میں اپنی کراہیں سن رہی ہوں۔ پھر ایک ننھی سی چیخ۔ ندیژدا کی ایک جھلک اور پھر گہری نیند۔

میں کچھ جاگ رہی ہوں کچھ سو رہی ہوں۔ سانس دو دھاری دھار کا خنجر ہے۔ ندیژدا میرے پہلو میں ہے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں اسے چھوتی ہوں۔ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اسے چومتی ہوں اور بے اختیار جہاں بلی وقت کے سامنے ماتھا ٹیک دیتی ہوں۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ اور مہلت۔ ندیژدا کو دیکھنے اور چاہنے کے لیے کچھ اور ساعتیں۔ فلک جاہ، گردوں پناہ وقت میرے جھکے ہوئے سر پر نظر ڈالتا ہے اور میری طرف سے منہ پھیر لیتا ہے۔

مانیٹر کے اسکرین پر وحشیانہ رقص کرتا ہوا نقطہ تھم رہا ہے۔ زندگی ہجرت کر رہی ہے۔ مما اور احمر ابھی تک نہیں آئے۔ ندیژدا ایک ہفتے کی ہو چکی۔ احمر کی اماں اسے گود میں لیے مجھ پر جھکی ہوئی ہیں۔ وہ اسے میرا چہرہ دکھا رہی ہیں۔ میں تیرتی ہوئی اس کی طرف بڑھتی ہوں۔ "تم خواب کلیسا کے نام کی گھنٹیں۔" میں اسے بتاتی ہوں۔ "اندھیری رات میں تم امید کا جگنو ہو۔" وہ مسکراتی ہے، میں اسے خوابوں کی ردا اوڑھا رہی ہوں۔

مانیٹر کے اسکرین پر گہری تاریکی ہے۔ نقطہ اندھیروں میں ڈوب گیا۔ سکوت کے دریا میں دائروں ایسی نیند ہے۔ اور میں ان دائروں میں اتر رہی ہوں۔ خواب برف کا بستر۔ نیند برف کی چادر۔ مما اور احمر کا انتظار ہو رہا ہے۔ میں برف میں سو رہی ہوں۔

چاروں طرف ہجوم ہے۔ میں تماشا، لوگ تماشائی، سیاہ پوش مما میرے سرہانے دو زانو۔ برف رخساروں، برف پیشانی اور برف آنکھوں کو چومتی ہوئی۔ اما پاولوا کے ساتھ اس کا راج ہنس کا سٹیوم گیا تھا تو پھر میں زویا زیتوف، پرائما بیلے رینا، زاد سفر کے بغیر کیسے چلی جاؤں؟ میں اپنے ریشمی جوتے، راج ہنس کی پوشاک اور سینڈریلا کی گرگابیاں مانگتی ہوں لیکن میری آواز کسی تک نہیں پہنچتی۔

ہتھوڑے کی آواز سینے میں کیل کی طرح اتر رہی ہے۔ شاہ بلوط سے بنے ہوئے سٹیج پر اڑان بھرنے والی، دیودار کے جنگل سے جلاوطن لکڑی کے تابوت میں سما رہی ہے۔ عروسی جوڑے کا زرتار دوپٹہ مجھ پر جھلملا رہا ہے۔ کوئی اوڑھے جتیں یا سوت ہے۔ میں اجنبی شانوں پر سفر

(ص ۶۹ پر)

رفیعہ منظور الامین

ڈیر فادر

نکلسن میرے برابر والے فلیٹ میں رہتا تھا بس ایک لکڑی کی دیوار ہمارے درمیان تھی۔ لندن میں رہنے والے لوگوں میں، نسبتاً میں نیا تھا۔ اکثر ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ ارلس کورٹ Earl.s court انڈر گراؤنڈ اسٹیشن پر وہ اور میں ساتھ ہی ٹیوب سے اترتے، کبھی کبھار ہماری بات چیت ہو جاتی لیکن اکثر علیک سلیک اور مسکراہٹ ہی پر ملاقات ختم ہو جاتی۔ انگریزوں کی کم گوئی اور الگ تھلگ پن سے میں واقف تھا اس لیے خود کو اس پر مسلط کرنے سے میں احتراز کرتا تھا۔ اس ضعیفی میں بھی اس کے استوار جسم کو دیکھ کر میں سوچتا تھا کہ اس عمر میں ہمارے وطن میں بوڑھے ٹوٹی لالٹین بن جاتے ہیں نہ کسی کو روشنی دے سکیں نہ خود کو سنبھالے رکھ پائیں، جب جب زبان کھولیں کسی نے کسی کی شکایت یا اپنی بیماری کا لمبا چوڑا بلیٹن سنانے بیٹھ جائیں۔ ہاں ان کے یہ ہیلتھ بلیٹن دن میں کئی کئی بار بڑی مستعدی سے شائع ہوتے ہیں اور بس!

نکلسن کبھی مجھے دو دو دن نظر نہ آتا لیکن ایک بار وہ مجھے مسلسل ایک ہفتے تک نظر نہیں آیا تو مجھے کچھ "پڑوسیانہ" سی فکر ہوئی پہلے تو میں نے سوچا وہ شاید اپنے لڑکے کے گھر پر مقیم گیا ہوگا۔۔۔۔ اس نے کئی بار مجھ سے اپنے کنبے کا تذکرہ بڑے پیار سے کیا تھا۔۔۔ اس کے دو لڑکے اور لڑکیاں تھیں لیکن یہ امید بھی کم تھی کہ وہ ان کے پاس گیا ہوگا۔ پڑوسی ہوتے ہوئے بھی میں نکلسن کو نہ صرف جاننے بلکہ محسوس بھی کرنے لگا تھا وہ ایک بہت ہی خوددار شخص۔۔۔۔ "کہ آشیاں کسی شاخ شجر پہ بار نہ ہو" قبیل کا انسان بیوی کی موت کے بعد وہ لندن میں تنہا رہنے لگا تھا، بوڑھوں کی دیکھ بھال کرنے والی ایسوسی ایشن کی طرف سے کچھ نوجوانوں نے اسے کمپنی بھی دینی چاہی مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کے لڑکے، لڑکیاں اس کے پاس آتے جاتے اور اس کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں اس لیے اسے کسی کی ہمدردی کی ضرورت بہت ہے۔ اس کے بچوں کی خود ہی مصروف زندگی تھی اس لیے اکثر وہ اس کے پاس رات ہی کو آتے تھے۔ اس کا پتہ اس کے گھر سے ابھرتے قہقہوں اور بات چیت کی آوازوں سے ہوتا تھا، اگلے دن وہ مجھ سے معذرت کرتا کہ اس کے گھر کے ہلچل نے مجھے ضرور ڈسٹرب کیا ہوگا! مجھے یہ دیکھ کر حیرت آمیز مسرت ہوتی کہ انگلستان کے اور ضعیف لوگوں کی طرح اسے تنہائی کا گلہ نہیں تھا کیوں کہ اس کے بچوں نے اسے فراموش نہیں کر دیا تھا۔ اس کا فخریہ اظہار کئی بار لوگوں کے سامنے کرتا کہ وہ کسی کھیت میں کھڑے بد نصیب کاٹھ کے پتلے کی مانند نہیں تھا جس کے آس پاس تنہائیاں چیل کوؤں کی طرح منڈلاتی ہوں وہ کئی بار اپنے پڑوسیوں کو وہ چھوٹے موٹے تحفے خاص طور پر بتاتا جو اس کے بچے اس کے لیے لایا کرتے تھے۔ شاید آس پاس کے اپار ٹمنٹس میں وہی ایک تھا جس کی ڈاک پابندی سے آیا کرتی تھی۔ وہ خط سب کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر بتاتا کہ اس کے بچے کس طرح اس کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ سب خوش مزاجی سے مسکرا کر اس کی خوش قسمتی کے کئی بار سنے ہوئے بیان کو پھر ایک بار سن لیتے۔۔۔۔ ان خطوں میں اصرار ہوتا کہ وہ اپنی اکیلی زندگی چھوڑ کر ان کے پاس جا رہے، وہ ہر طرح اس کی خدمت کرنے کو تیار تھے۔ اس کے بچوں میں مائیکل شاید اسے سب سے زیادہ چاہتا تھا دوسرے کے مقابلے میں وہ مائیکل کے خطوں کا زیادہ ذکر کرتا۔

ایک دن میں نے اپنا مقابلہ اس کے بچوں سے کیا، گھر سے میرے لیے خط بہت کم آتے اور جب بھی آتے ان میں شکایت رہتی کہ جو کچھ اماں باوا کو بھجواتا ہوں وہ ناکافی ہے، وہ اسی وجہ سے مجھ سے ناراض سے رہتے تھے ہیں۔ جانتا تھا کہ ابا ضعیف تھے اور اماں کی صحت بھی یوں

سی رہتی تھی ۔۔ میرا سر شرم سے جھک گیا، اگر میں نے خود ہی ان کی ضروریات کو محسوس کیا ہوتا تو ان کے مانگنے کی نوبت ہی کیوں آتی ۔ مجھ
انھیں شکایت کا موقع ہی کیوں ملا ہوتا، میں نے اپنی خود غرضی پر لعنت بھیجی ۔ میں چاہتا تھا کہ عائشہ جب بیاہ کے بعد میرے گھر آئے تو ایک
م وہ زندگی اس کی منتظر ہو، اماں اور ابا کو پیسہ بھجوانے کے بعد میں عائشہ کے لیے کچھ رقم پس انداز کرتا جا رہا تھا۔

میں نے نکلسن کی کال بیل بجائی، کچھ دیر توقف کے بعد دروازہ کھلا، وہ بہت کمزور نظر آیا۔

"آپ ہفتے بھر سے دکھائی نہیں دیے ۔" اس کی آنکھوں میں تشکر کا ایک سمندر تھا ۔ "آؤ اندر آجاؤ ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اندر
نے کو کہا "تمہارا بہت شکریہ لیکن میں تو بالکل ٹھیک ہوں ۔۔۔ ہاں چند دنوں کے لیے مائیکل کے پاس چلا گیا تھا۔ اس کے بچے کی سالگرہ تھی
ہاں کچھ زیادہ ہی پی لی تھی ۔"

"اوہ میں سمجھا، خدانخواستہ........"

"میں اور بیماری! انہیں بھئی مائیکل مجھے رات ہی لا کر چھوڑ گیا ہے ۔ تکان سی ہو گئی ہے ۔" وہ ہنسا ایک لاغر سی ہنسی، دھیرے دھیرے
کر اس نے کیبنیٹ سے وھسکی نکالی ۔ "یہ لیزا اور اس کے شوہر میرے لیے لائے تھے ۔ لیزا میری بیٹی ہے نا ۔"

"سوری میں پیتا نہیں ۔" میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آیا۔

اس نے مجھے دروازے پر روک دیا ۔ "تمہارے ماں باپ خوش نصیب ہیں کہ خدا نے انھیں تم جیسا لڑکا دیا ۔" اس کی آنکھیں کچھ بھی
ی سی لگیں ۔ بھلا بیماری کے اظہار میں کیا بے عزتی ہوتی جو وہ مجھ سے چھپانا چاہتا تھا۔

نکڑ کے پب گولڈن ایگ میں، میں کبھی کبھی چلا جایا کرتا تھا جہاں مدھم روشنی میں اٹھارویں صدی کا ماحول پیدا کیا گیا تھا، اندھیرے
، لکڑی کی دیواروں پر سجے کوٹ آف آرمس، بار گرل کی نشیلی نظریں، فضا میں بسی بیر کی مہک اور سگریٹ اور سگار کا دھواں ۔ نیچے تہہ
انے میں جاتی سیڑھیاں جہاں کا نٹرا سینٹیو کا مفت انتظام تھا، وہاں سوائے سب ہی "عمر خیام" آتے تھے ۔ حسین، تنگ کمر، شیریں دہن
مشوقوں کے ساتھ، ان سبھی سے میرے تعلقات دوستانہ تھے ۔

"کام شاستر کی سرزمین پر تم ایک کلنک ہو ۔" Bertle مجھے کہا کرتا اور اس کی گرل فرینڈ اور بھی زیادہ اس کے بغل میں دبک
تی ۔

"تم نے دودھ پینا کب سے چھوڑ دیا ۔" Benn میرے Drangeald پر پھبتی کستا، ان حسین اور کھلے عام عشق کا اظہار کرتے
ڑوں کے درمیان میں خود کو آندھی میں اڑتے تنہا پتے کی طرح محسوس کرتا جو نہ اپنے آغاز سے واقف ہو نہ اپنی منزل جانتا ہو۔

"مجھے بہت جلد فیصلہ کرنا ہوگا ۔" میں سوچتا، میں سورج کی طرح مشرق اور مغرب دونوں ہی کو اپنی باہنوں میں سمیٹ نہیں سکتا تھا
جھے کوئی ایک راہ اپنانی ہوگی ۔ کیا ہوا جو اماں اور ابا نے عائشہ کو قبول نہیں کیا! اس کی مغربیت پر نکتہ چینی کی! کبھی میرے دل میں باغیانہ
یالات ابھرتے اماں اور ابا کی ناشکر گزاری کی گرفت اپنے مستقبل کی کلائی پر کچھ زیادہ ہی آہنی لگتی لیکن میں خود کو فوراً ٹوکتا، مغرب کے اس
حول میں جہاں بچے کم عمری ہی میں اپنے ماں باپ سے تعلق توڑ لیتے ہیں وہاں نکلسن اور اس کے بچوں کی مثال تھی جنھوں نے حتیٰ کہ شادیاں
ب اپنے باپ کی انتخاب کردہ لڑکیوں سے کی تھی۔

اس ویک اینڈ میرا دماغ کچھ زیادہ ہی پریشان تھا۔ سب کچھ بھول کر میں سونا چاہتا تھا اور نیند تھی کہ مجھے جل دیے جا رہی تھی اور اس
سے زیادہ تھا نکلسن کے اپارٹمنٹ سے اٹھتا ہوا شور و غل، بات چیت اور قہقہے، میں نے طے کر لیا کسی دن ضرور جا کر اس کے کہنے سے کیوں کا

کہ وہ آنا چاہیں تو بے شک آئیں رات ہی میں مگر پڑوسیوں کی نیند تو برباد نہ کریں۔ دراصل چند دن پہلے میں نے نکلسن کو ڈاکٹر جانسن کلینک میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

"آگئی ہوگی ساری نسل مزاج پرسی کو۔" میں نے جھلا کر سوچا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن ان کی آوازیں ا بلند اور قہقہے لتنے بے لگام تھے کہ میں بستر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا، ڈریسنگ گاؤن پہن کر سلیپر گھسیٹتا ہوا میں تنتناتا اس کے دروازے پر اور گھنٹی بجائی ——— مگر کون سنتا؟ وہاں تو طوفان بد تمیزی برپا تھا۔ میں گھوم کر اس کے کورٹ یارڈ میں گیا اور دبیز پردوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ میرے علاوہ کچھ اور پڑوسی بھی نالاں اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ کوئی Response نہ پاکر اچانک Benn نے گھونسہ مار کر شیشہ توڑ دیا اور ہم سب اندر داخل ہوگئے۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ صرف نکلسن صوفے پر بیٹھا تھا، بے جان! اس کا سر پاس رکھی تپائی پر ٹکا ہوا تھا اور پھیلا ہوا بے جان ہاتھ تپائی پر رکھے Tape Recorder کے Volume Knob پر تھا۔

جب اس کی موت واقع ہوئی ہوگی اس وقت وہ کچھ لکھ رہا تھا۔

"ڈیر فادر، میں نے تمہارے لیے جو نیا رین کوٹ بھجوایا امید ہے تمہیں پسند........" Bertie نے ناامیدی سے سر ہلا دیا۔

"Old unfortunate rascal" برٹی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"ہمیں اس کے لڑکے اور لڑکیوں کو خبر کر دینی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"کون لڑکے لڑکیاں؟" ولیم نے ابرو چڑھا کر مجھ سے پوچھا۔ "اس کا کوئی نہیں تھا۔"

"اور مائیکل؟" کوئی چیز میرے حلق میں اٹکی۔

"مائیکل اس کا اکلوتا بچہ تھا وہ جب پانچ سال کا تھا تبھی کسی کار کے نیچے آکر مر گیا تھا۔"

اور اس رات جب میں آخر کار بستر پر گرا تو رات بھر میری آنکھوں میں بے جان سے سائے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے رہے جنھیں سہاروں کی تلاش تھی جو اپنی تنہائیوں سے ڈرے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کے پیچھے چھپ رہے تھے۔ جو اپنے انجام کو دیکھ کر لرز رہے تھے۔ سائے سایوں سے پناہ مانگ رہے تھے۔

اعلان بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند

(فارم : ۴) (رول نمبر : ۸)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر کا نام : رمن راج سکسینہ

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ادارۂ ادبیاتِ اردو "ایوان اردو"

نام و پتہ مالک : ادارۂ ادبیاتِ اردو "ایوان اردو" پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد 82

میں رمن راج سکسینہ تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

بتاریخ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء
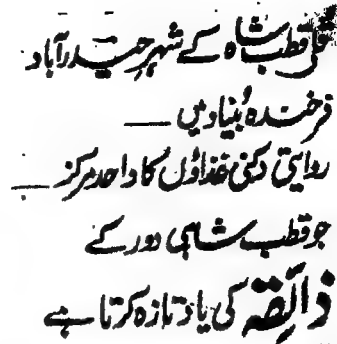
رمن راج سکسینہ

THIS BOOK IS COMPOSED BY
SHARP COMPUTERS
MEHBOOB BAZAAR, CHADER GHAT, HYD - 24

سن اجراء: ۱۹۳۸ء　　　　فون: 310469

ماہنامہ **سب رس** حیدرآباد

جلد: ۵۰	○	اپریل، مئی، جون ۱۹۹۵ء	○	شمارہ: ۴، ۵، ۶

اس شمارے کی قیمت : بیس روپے

فی پرچہ	:	۷ روپے	مشرق وسطیٰ اور امریکہ	:	۳۰ ڈالر
زرِ سالانہ	:	۷۵ روپے	پاکستان، برما، سری لنکا	:	۱۵ ڈالر
کتب خانوں سے	:	۱۰۰ روپے	انگلستان	:	۱۲ پونڈ

ناشر: ادارہ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۸۲

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے [illegible] پرنٹنگ پریس [illegible] میں طبع کروا کے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کتاب : مرزا غالب

نتالیا پری گارینا

ترجمہ : اسامہ فاروقی

باب ۔ ۸

چراغ دیر

آج صبح میں نے ایک بار پھر ہاتھی پر سوار ہو کر بنارس کی گشت لگا
یہ سیر مجھے بہت بھلی لگتی ہے۔ ایسے ایسے گوناگوں مناظر اور لوگوں
ایسے پورے پورے گروہ دیکھنے کو ملتے ہیں جن کی ظاہری شکل
پوشاک کرہ ارض کے اور باشندوں سے قطعاً کوئی مماثلت نہیں رکھ

سلتی کوف : "ہندوستان کے بارے میں خط

دلی میں غالب کی رہائش کرائے کے گھروں میں رہی۔ ساری عمر وہ اپنے لیے ذاتی مکان جانہ پائے۔ دہلی کے نقشے
ان کے مقامات رہائش کی نشان دہی کوچہ بلی ماراں، گلی قاسم جان، چاندنی چوک اور مسجد فتح پوری کے علاقوں سے ہوتی
اب ان گھروں کا کہیں نام و نشان نہیں رہا۔ بس ایک بچا ہے، سو وہ بھی ایسی سقیم حالت میں ہے کہ کاٹھ گودام کے کام
آرہا ہے۔ اس کی بہ جائے بستی نظام الدین میں غالب کی آخری آرام گاہ کے پاس اب غالب اکیڈمی کی شاندار عمارت رہ رو
دعوت نظارہ دیتی ہے۔ یہ ایک نجی ادارہ ہے، جسے "ہمدرد دواخانے" نے اپنے وسائل سے قائم کیا ہے۔ اکیڈمی کی عمارت
ایک کتب خانہ ہے، غالب میوزیم ہے اور جلسوں اور موسیقی کی محفلوں کے لیے ایک ہال ہے۔ آخری منزل پر خوش نویسی
تربیت گاہ ہے جہاں بالکل پرانے زمانے کی طرح، روشنائی اور سیاہی سے داغ دار اپنے اپنے درجوں میں فرش پر بیٹھے،
تختیاں یا کاغذ کے اوراق گھٹنوں پر دھرے، ہاتھوں میں سنبھالے یا پھر نیچی چوکیوں پر رکھے، شاگرد مختلف کاروباری
نمائشی یا آرائشی طرز ہائے تحریر کی مشق کرتے ہیں اور تحریر کی چھ بنیادی اقسام، خط ثلث، کوفی، رقاع، نسخ، نستعلیق، دیوانی اور
سیکھتے ہیں۔ خوش نویسی میں کمائی کے اچھے امکان ہیں اور ہندوستان میں اب تک اردو کے بیشتر ناشرین کمپوزنگ کی زد
سے بچنے کے لیے، خوش نویسوں کی خدمات سے استفادے کو ترجیح دیتے ہیں۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس کو ابھی تک فن کی روایتی اقسام میں سے ایک کی حیثیت حاصل ہے۔ پرانی دلی کے
سے گھروں کے دروازوں کی زینت اب تک، نہایت نفاست سے کندہ کیے ہوئے غالب کے وہ اشعار ہیں، جو انھوں نے
طور سے ان مکانوں کے مالکین کے لیے لکھے تھے۔

دلی میں غالب میوزیم دو ہیں، دوسرا میوزیم غالب سے منسوب ایک اور ادارے غالب انسٹی ٹیوٹ سے
یہ سرکاری انسٹی ٹیوٹ ہے (اس کی رسم افتتاح میں اندرا گاندھی شریک تھیں) یہ دو جدید طرز کی عمارتوں پر مشتمل

میوزیموں میں اس عہد کی مختلف [illegible] کے وقتوں ... اور مطبوعات، مرزا کی تصنیفات
تون اور اصل عبارتوں کی جو منظوم نظمیں، ان کی شبیہیں اور خود معروف تصویروں کی نقلیں، یادگاری جشنوں اور تقریبوں کے
ں پہلی گئی عکسی تصویریں، نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ دونوں میوزیموں کے ارباب حل و عقد نے، بہ ظاہر یہ وضاحت کی غرض سے، غالب کے سوانح حیات
عض حقائق کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے۔ ان میں سے ایک میوزیم میں ایک بڑے شیشے کے
ں میں غالب اور امراؤ بیگم کی شبیہیں پیش کی گئی ہیں۔ منظر اس سے قبل کے ایک باب میں مذکور، مسجد میں تبدیل
ھر والے لطیفے کی تصویر کشی کرتا ہے۔ امراؤ بیگم چارپائی پر بیٹھی ہیں اور گھونگھرالے بالوں والی چھوٹی سی داڑھی والے
ان کے سامنے جوتے اپنے ہاتھوں میں سنبھالے کھڑے ہیں، بہ ظاہر انھیں اپنے سر پر رکھنے کا ارادہ ہے۔ تاہم ممکن
ہ اس منظر کے خالق فن کار نے شاعر کی، کفر کی حدوں کو چھوتی ہوئی اس حرکت کو پوری طرح سے پیش کرنے سے
ب ہی کو مناسب سمجھا۔

دوسرے میوزیم میں اس معروف شبیہ کو 'جیتے جاگتے' روپ میں پیش کیا گیا ہے، جس میں غالب کو ایک چوکور
پ کے نیچے، دوزانو بیٹھے حقہ پیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پانی سے گزر کر ٹھنڈے ہو جانے والے دھوئیں کے کش سے، حقہ
والے کو، خاص طور سے گرمی میں، کتنی غیر معمولی طراوت محسوس ہوتی ہوگی، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس منظر کی پیش
کے لیے ایک منڈپ ایستادہ کیا گیا ہے، جس کے نیچے موم کے بنے ہوئے غالب بیٹھے ہیں اور پاس ہی اصل تصویر میں
نے کے طور سے، کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے شاعر کی نگاہ کو اپنے فن سے خیرہ کرتے ہوئے، یا تو مغل جان یا پھر ماہ
رد ہم چودھویں بیگم، بڑے ناز و ادا کے ساتھ بل کھاتی ہوئی رقص کناں ہیں۔

غالب نے ہمیشہ ازراہِ مزاح، مورتی پوجا کے قائل برہمنوں کی صحبت میں نشو و نما پانے والی اپنی بت پرستی کا
راف کیا ہے، گو کہ اس سے ان کی مراد محض بتانِ دل فریب و بے وفا کی پرستش ہوتی تھی۔ اور اس لیے میرے خیال میں
یں یہ جان کر ہنسی آتی کہ وہ وقت بھی آئے گا جب خود ان کو صریحاً مادی اشیا سے بنا ہوا موضوع پرستش بنا لیا جائے گا۔ نہ
ف ان کو، بلکہ خوراک کے تعلق سے ان کی پسند اور رغبت تک کو، کیوں کہ تصویر کو تکمیل کے درجے تک پہنچانے کے لیے
یوزیم میں کھانے کی چیزوں، ترکاریوں اور پھلوں اور خاص طور سے مختلف اقسام کے آموں کے مصنوعی نمونے بھی
مائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔

چاہے میوزیم کے ارباب حل و عقد کے ذہن میں یہ بات نہ بھی رہی ہو، عام طور سے، یہاں نمائش کے لیے رکھی
ی اشیا اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ ہمیں غالب کی شخصیت کا ادراک بہ حیثیتِ مجموعی کرنا پڑتا ہے، شخصیت کو طاقت بخشنے
الی خوبیوں کو بھی دیکھنا پڑتا ہے اور کمزوریوں، عادات و اطوار اور میلانِ طبع پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ یہ بات بہت انوکھی ہے،
یوں کہ اس سے، یوں کہنا چاہیے کہ متاخر عہد وسطیٰ کے ادب کے لیے مخصوص، شاعر کے رواجی پیکر خیالی میں خلل پڑتا ہے۔
غالب کے تعلق سے تاہم محض خونِ جگر کھا کر زندہ رہنے والے شاعر کا پیکر خیالی، اس شاعر کا پیکرِ خیالی جس کا جام یا تو ہمیشہ
خالی ہوتا یا جس میں اگر کچھ ہوتا تو بس شراب کی تلچھٹ یا زہر کی تلخی، ایک ایسے زندہ دل اور پرجوش شخص کے پیکرِ خیالی کے
ساتھ یک جا ہو جاتا ہے، جو شراب و کباب، چٹپٹے گوشت کے پکوان اور ان کے ساتھ ذائقے کو دوبالا کرنے کے لیے استعمال کی
جانے والی سبزی ترکاریوں اور خصوصاً بے مثال دال کا دل دادہ تھا اور جو دنیا کے آٹھویں عجوبے، یعنی آم سے سب سے بڑھ
رغبت کے لیے مشہور تھا۔

بیگم اور نانا غلام حسین خاں سے مل جاتی تھی اور انھیں یک گونہ آسودگی حاصل تھی۔ تاہم دہلی کی زندگی طرح طرح کے اخراجات کی متقاضی تھی اور جہاں غالب قرض میں پھنسے تھے۔

۱۸۲۵ء میں انگریز حسبِ معمول کے مطابق کسی نافرمان ہندوستانی ریاست کے خلاف اقدام کر رہے تھے اور غالب اپنے ماموں علی بخش کے ساتھ، اس مہم میں شریک احمد بخش خاں کے ہم رکاب تھے۔ جنرل کامبر میر کے لشکروں نے بھرت پور کا محاصرہ کر لیا اور ہمارے ان دونوں رئیس زادوں کی کسی طرح کی بھی مدد کے بغیر، جو میدانِ جنگ سے قدرے فاصلے پر خدم و حشم کے لیے ایستادہ خیموں میں نہایت اطمینان کے ساتھ وقت گزاری کرتے رہے، بالآخر شہر پر قبضہ کر لینے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے فرصت کے اوقات کا مشغلہ تھا بادہ نوشی اور کھلے دل کی بات چیت۔ جب فرصت سے طبیعت ایک حد تک اوب جاتی تو علی بخش خاں مرزا سے درخواست کرتے کہ وہ فارسی انشا میں مہارت حاصل کرنے میں ان کی مدد کریں: تخاطب کا صحیح طریقہ، القاب کا صحیح استعمال، خطوط کی عبارت کو اشعار کے برمحل حوالوں سے دل کش بنانے کے گر اور خط و کتابت کی مختلف اقسام کی مناسبت سے اسلوبِ بیان کے صحیح انتخاب کے رموزان کو سکھائیں۔ مرزا بہ رضا و رغبت یہ کام انجام دیتے۔ دوسری صلاحیتوں کے ساتھ استاد اور معلم کی خداداد قابلیت بھی ان کو ودیعت ہوئی تھی۔

بعد میں تعلیمی اغراض سے لکھی ہوئی یہ یادداشتیں اور مثالیں مرزا نے اپنی تالیف "پنج آہنگ" میں شامل کیں، جس کے قلمی نسخے کی ترتیب و تہذیب کا کام انھوں نے ۱۸۳۵ء کے قریب مکمل کیا۔

غالب کی نثر فارسی کے اس مجموعے کے معرضِ وجود میں آنے کے بارے میں علی بخش رنجور یوں رقم طراز ہیں "عنفوانِ شباب کے دن تھے، چہار اطراف سبزے گویا کہ سامانِ مسرت تھی، گل ہائے انبساط کھلے ہوئے تھے، دہانے دولت چوپٹ کھلے تھے اور ہمیں خلد آشیانی احمد بخش فخرالدولہ جیسے عظیم انسان کی سرپرستی حاصل تھی۔ کیا کیا مجھے اس سرکار سے مرحمت نہیں ہوا تھا، عنایت، محبت، عزت اور دولت، سبھی کچھ تو عطا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ زندگی کے شب و روز مسرت و انبساط رنگ رلیوں اور عیش و طرب میں گزر رہے تھے اور مجھے نہ کبھی فکرِ معاش ستاتی تھی اور نہ خوفِ مکافات۔

میرے برادرِ مکرم جناب اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب نے، جن کی دوستی میرے لیے باعثِ فیض ہے، جو نظم و نثر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور جن کا شمار اپنے عہد کے عظیم ترین انشا پردازوں میں ہے، چھوٹوں کے تئیں تلطف کی اپنی عادت کے مطابق، مجھے تعلیم دینی شروع کی۔ مجھ ناچیز اور اس شاعرِ بے مثال کے درمیان قرابت دوگونہ تھی، جس میں محبت احترام کا وہ جذبہ بھی شامل تھا، جو غازے کی طرح رخِ یگانگت کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ میرے ساتھ ان کا برتاؤ دوستانہ اور مشفقانہ تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ حصولِ علم و دانش میں میری رہ نمائی بھی کیا کرتے، چناں چہ میری درخواست پر انھوں نے چند صفحات پر اعزازی القاب اور شائستہ محاورے، موصولہ خطوط کے لیے اظہارِ تشکر اور جوابی خطوط کے نہ آنے پر اظہارِ شکایت کے فقرے رقم فرمانے اور میرے حوالے کیے۔ میں نے ان اوراق کی حرزِ جاں کی طرح حفاظت اور ان تحریروں کو اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں دستورالعمل بنایا۔"

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں بھرت پور کا محاصرہ انگریزوں کی فتح پر ختم ہوا اور غالب کی فوجی ملازمت اس واقعے تک محدود رہی، اس کی پھر کبھی تجدید نہیں ہوئی۔

۱۸۲۵ء میں وہ حاجی خواجہ فوت ہوا جو غلط فہمی کے نتیجے میں وظیفے میں غالب کا حصہ دار بن بیٹھا تھا۔ کسی وقت جب مرزا نے اپنے مالی امور میں دل چسپی لی اور پوچھ گچھ کی، تبھی تو یہ معلوم کر کے انھیں بڑی حیرت ہوئی [illegible] تکلیف پہنچی کہ ان کے چچا کے ورثا میں مرزا کے خاندان سے محض دور دراز کی قرابت رکھنے والا یہ ساٹھ سالہ [illegible] ملازم [illegible] سب

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ، وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

قسمت کے ظلم و ستم کے ان شکوے شکایتوں کے برعکس جو نوجوانی میں شاعر قلم بند کیا کرتا تھا اس غزل کی الم ناک فضا بالکل دوسری نوعیت کی ہے۔ دل کی گہرائیوں کو چھو لینے والے نوحے کے لیے مخصوص رقت انگیز آہنگ کے ساتھ غزل دل جلا کر جوانی کی گزری ہوئی مسرتوں اور محفلوں کی بے لگر فنا ہو جانیوں کے خیال سے مملو ہے۔ شمع خاموش وہ علامت ہے جو غالب کے بعد معاصر کی شاعری میں ایک مخصوص مفہوم کی حامل ہو جاتی ہے۔ فی الوقت اس علامت کا تعلق رات کی پر مسرت محفل نا و نوش کے بعد کے خمار صبح گاہی اور بے سوچے سمجھے زندگی پھونک دینے کے بعد عمر گذشتہ کی میزان لگانے یا بہ الفاظ دیگر اقدار حیات کی تخمین نو کے فکر و خیال سے ہے۔

غالب نے اپنے حق کے لیے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس اثنا میں سر چارلس مٹکاف کا تقرر دہلی میں رزیڈنٹ کے عہدے پر ہوا۔ احمد بخش نے غالب سے وعدہ کیا کہ وہ انھیں مٹکاف سے متعارف کرا دیں گے۔ غالب نے یہ کوشش کرنے کا فیصلہ کیا کہ نصراللہ بیگ کے تمام ورثا کو وظیفہ علاحدہ علاحدہ ملے۔ مٹکاف عین اسی وقت بھرت پور میں وظائف کے معاملات کی یکسوئی میں لگے ہوئے تھے اور احمد بخش نے غالب کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے پیچھے پیچھے وہاں روانہ ہو جائیں۔ بڑی مشکل سے اپنے قرض خواہوں سے پیچھا چھڑا کر غالب بھرت پور پہنچے۔ تاہم نواب تعارف کا کام مختلف بہانوں سے ٹالتے رہے۔ سر چارلس، احمد بخش کی جاگیر فیروزپور جھرکہ بھی گئے اور وہاں تین دن قیام کیا لیکن اس بار بھی نواب نے غالب کو ان سے متعارف کرانے کی کوئی سبیل نہ نکالی۔ اب مرزا بالآخر سمجھ گئے کہ نواب کو اس معاملے کے غالب کے حق میں تصفیے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ فوری کانپور روانہ ہوئے تاکہ مٹکاف کو، جو دہلی کے لیے روانہ ہو چکے تھے، راہ ہی میں جا لیں۔ کانپور میں غالب سخت بیمار پڑ گئے اور ان کا منصوبہ درہم برہم ہو گیا۔ غالب کلکتہ جانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ راستے میں لکھنؤ بھی پڑتا ہے اور غالب نے طے کیا کہ اس شہر کی بھی سیر کریں گے جو اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط سے ایک اہم ادبی مرکز کی حیثیت سے دلی کا حریف تھا۔ پہلے ہی سے لکھنؤ کے ارباب شعر و ادب کی دوسری نسل بھی میدان شعر میں اس شہر کی نام وری کا ڈنکا بجا رہی تھی۔ غالب کے پسندیدہ شاعر ناسخ کا تعلق بھی لکھنؤ کے دبستان شاعری سے تھا، وہی ناسخ جن کو غالب بعد میں مہر کے نام اپنے ایک خط میں "میرا دوست اور تمھارا استاد" قرار دیتے ہیں۔ معاملہ طے ہو گیا، پالکی میں سوار، اپنے خدمت گاروں کی معیت میں، غالب اس شہر کو روانہ ہوتے ہیں جس کی قصیدہ خوانی [illegible] میں اس وقت تک کافی تعداد [illegible] شعر کہہ چکے تھے۔

بیماری نے ابھی تک پیچھا نہیں چھوڑا تھا، لیکن مرزا چاہتے تھے کہ جلد از جلد لکھنؤ پہنچ جائیں۔ یہاں ان کا [illegible] سے [illegible] ہوا تھا، کیوں کہ [illegible] روایات کے حامل اس عظیم المرتبت [illegible] زیادہ کو کچھ سے [illegible] رکھنے والے اس شہر کے لیے غالب کی آمد [illegible] واقعہ تھی۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا
نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

غزل کا آغاز دنیا سے لاتعلقی اور "بے خودی" یعنی صوفیہ کے بیکر خیالی سے ہوتا ہے جن کے لیے اس دنیا اور باغ رضواں کی سبھی دل فریبیوں کی حیثیت "طاق نسیاں" کے اک مرجھائے ہوئے گلدستے سے زیادہ نہیں۔ طاق: اسلامی طرز تعمیر میں عمارت کے اندرونی حصے کا ایک جزو، کمروں میں عموماً مختلف اسباب خانہ داری طاقوں میں رکھے جاتے تھے، گلدستہ بھی وہیں رکھا جاتا تھا۔ آگے غزل میں غم محبت کا موضوع شروع ہوتا ہے۔

محبوب جفا شعار نے اپنے نشتر مژگاں کی کاوشوں سے عاشق کا دل چھلنی کر ڈالا، نتیجتاً خون جگر کا ہر قطرہ یوں لگتا ہے جیسے تسبیح مرجاں کا دانہ ہو۔

تاہم اس ستم گر کا قتل عاشق (یا شاید عاشق کے لیے اور بھی زیادہ مایوس کن، قتل عاشق سے اجتناب) کا عزم، عاشق کے اسی دل سوزی کے ساتھ اظہار عشق کے ارادے کو بدل نہیں سکتا، جس دل سوزی سے بانسری بانے اپنے خالق سے جدائی کی شکایت اور اس کے تئیں اظہار محبت کرتی ہے۔ اس کے لیے تو وزاری اور نالے بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہیں، وہ بانسری کی دل خراش تانوں کی یاد دلاتے ہیں، اور دانتوں میں لیا جانے والا تنکا ایک بانسری ہے۔ بانسری بانے کے موضوع سے ہمیشہ عارفانہ تلازمۂ خیال مربوط رہا ہے۔ "مثنوی جلال الدین رومی" کا آغاز ہی اس شعر سے ہوتا ہے:

بشنو از نے چون حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

اور "مثنوی" کو متصوفانہ تعلیمات کا لب لباب مانا جاتا ہے۔ اس طرح سے غالب کے اس شعر میں "مثنوی" کے پہلے شعر کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد کے شعر میں شاعر اسی معشوق حقیقی کے موضوع کو آگے بڑھاتا اور وسعت دیتا ہے، جس کی مژگاں پر لرزتے ہوئے ایک سرشک سے نہیں معلوم کتنے عشاق خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوئے ہوں گے۔ اگلے شعر میں مضمون عشق حقیقی کی بلند سطح سے گر جاتا ہے، شعر میں محبت نفسانی کے آہنگ بدلتے ہوئے مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر یہاں عشق ارضی کی واقعہ گوئی سے کام لیا گیا ہے۔

مراد وہ نرکل ہے جس سے بانسری بنائی جاتی ہے۔ دانتوں میں تنکا [illegible] کی طرف سے، رحم
کی درخواست کی روایتی علامت ہے۔

ہندوستان ہے۔ غالب کے مشہور تذکرہ نگار مالک رام کا خیال ہے کہ "چراغِ دیر" میں شاعر کی آپ بیتی کی جھلک واضح ہے ہمارے لیے اس رائے سے اتفاق نہ کرنا ممکن نہیں۔

مثنوی کا آغاز زندگی کے مصائب کے تعلق سے شاعر کے روایتی شکووں سے ہوتا ہے، تاہم انھیں اشعار میں کنایۃً غالب کو سفر پر مجبور کرنے والی وجہ کا تذکرہ بھی مل جاتا ہے۔

نفس با صور دمساز است امروز
خموشی محشرِ راز است امروز
رگِ سنگم شرارے می نویسم
کفِ خاکم غبارے می نویسم
پریشاں تر ز زلفم داستانے ست
بہ دعوی بر سرِ مویم زبانے ست
شکایت گونہ دارم ز احباب
کتانِ خویش می شویم بہ مہتاب

مرے سینے میں اک شورِ قیامت خیز ہے برپا
خموشی آج میری محرمِ اسرار ہے گویا
ہوں رگ پتھر کی، لکھتا ہوں شرر میں
ہوں خاک اور لکھوں خاک رہ گزر میں ★
پریشاں ہے مثالِ زلفِ برہم داستاں میری
دلوں کو چیر کر رکھ دے فغانِ خوں چکاں میری
بہت شکوہ مجھے احباب سے ہے
کتاں اپنی میں دھوؤں چاندنی سے ★

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس وقت تک غالب کی "پنشن" کی داستان اور ان کے مالی معاملات دونوں ہی زلفِ برہم کی طرح کافی الجھ چکے تھے۔ اور مرزا کے پاس ان سے جن کو وہ اپنے احباب میں شمار کرتے تھے ناراض ہونے کی کافی وجوہ تھیں۔ شاعر کا چوٹ کھایا ہوا حساس دل اس مہین کتان کی مانند ہے جسے سورج کی کرن، چاہے وہ باریک ہی کیوں نہ ہو، جلا دیتی ہے اور اس لیے اسے چاندنی میں دھوتے اور سکھاتے ہیں۔

شکایت کے موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے شاعر اسے جہان آباد دہلی کی ہجو ملیح کی شکل دے دیتا ہے۔ (جہان آباد وہ نام ہے جو مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے آگرے سے وہاں اپنا دارالسلطنت منتقل کرنے کے بعد اسے دیا تھا)۔

نفس ابریشمِ سازِ فغان ست
بیانِ نے تہیم در استخوان ست
ز دہلی تا بروں آوردہ بختم
بہ طوفانِ تغافل دادہ رختم
کسے از اہلِ وطن غم خوارِ من نیست
مرا در دہر پنداری وطن نیست
مگو داغِ فراقِ بوستاں سوخت
غمِ بے مہریِ این دوستاں سوخت

ہے ریشم سا نفس سازِ فغاں میں
مثالِ نے ہے تپ اس استخواں میں ★
نکالا مجھ کو جب دلی سے باہر میری قسمت نے
بنایا بے سروساماں مجھے سامانِ وحشت نے
نہیں کوئی وطن میں غم گسارِ جان و تن میرا
نہ ہو، اس دیر میں جیسے کہیں کوئی وطن میرا
فراقِ بوستاں کے ہیں ہزاروں داغ سینے پر
پھر اس پر دوستوں کی بے وفائی، تف ہے جینے پر

یہاں موضوع میں اچانک تبدیلی آتی ہے اور دہلی پر طعنہ زنی کی تلافی کے طور سے بنارس کی مدح سرائی کا بلند آہنگ اور شگفتہ موضوع ہمارے سامنے آتا ہے۔

جہان آباد گر نبود الم نیست
جہان آباد بادا جائے کم نیست
بہ خاطر دارم اینک گل زمینے
بہار آئیں سوادِ دل نشینے

جہاں آباد چھوٹا، خیر کوئی غم نہیں اس کا
رہے آباد یہ عالم، ٹھکانہ مل ہی جانے کا
یہیں نظروں کے آگے یہ جوارِ گل بہ داماں ہے
یہیں رہ جائیے، ہر سو بہاراں ہی بہاراں ہے

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشت خرم و فردوس معمور
بہ خوش پرکاری طرز وجودش
ز دہلی می رسد ہر دم درودش

کرے شرمندہ جنت کو بھی اپنے کیف رنگیں سے
بنارس کو خدا محفوظ رکھے چشم بد بیں سے
ادا ہے اس کی دلکش دل ربا ہے جان دلی کی
زباں پہ ورد ہے صلِ علیٰ، صلِ علیٰ کاشی

ہندوؤں کے مذہبی عقائد کے مطابق روح دنیا میں بار بار جنم لیتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک جنم کا برا چال چلن انسان کے کرم کو بگاڑ دیتا ہے اور نتیجۃً اگلے جنم میں وہ یا تو نیچ ذات کے ایک فرد کی شکل میں یا پھر کسی جانور کے روپ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اس روپ میں انسان کو جو بھی دکھ جھیلنے پڑتے ہیں ان کی حیثیت پچھلے برے اعمال کی سزا کی ہوتی ہے۔ زندگی کی حقیقت پر غور و فکر کرنے والوں کے لیے واضح ہے کہ بار بار پیدائش یا آواگون (تناسخ) کے اس سلسلے کو ختم کرنا ہی انسان کا نصب العین ہونا چاہیے۔ بلاشبہ اس مقصد کے حصول میں مدد رہبانیت، تپسیا اور ترک خواہش وغیرہ سے ملتی ہے، گو کہ یہ بھی سچ ہے کہ ایسے کارنامے انجام دینا رشیوں منیوں ہی کے بس کی بات ہے۔

تاہم سنسار کے چکر کو توڑنے اور روح کائنات (برہما) میں خود کو مدغم کر دینے کا ایک نسبتاً سیدھا سادہ طریقہ بھی ہے، اور وہ ہے تیرتھ یاترا کے دوران بنارس میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دینا۔ ہمارے تیرتھ یاتری غالب بنارس کی سب سے بڑی خوبی اس مقدس شہر کی اسی خوبی میں دیکھتے ہیں:

تناسخ مشرباں چوں لب کشایند
بہ کیش خویش کاشی را ستایند
کہ ہر کس کاندراں گلشن بہ میرد
دگر پیوند جسمانی نہ گیرد
چمن سرمایۂ امید گردد
بہ مردن زندۂ جاوید گردد

تناسخ پر عقیدہ رکھنے والے سب یہ کہتے ہیں
بنارس میں جو مر جاتے ہیں وہ بھی زندہ رہتے ہیں
یہ مانا، پھر سے وہ پیوند جسمانی نہیں پاتے
یہ مانا، چشم ظاہر بیں کے آگے وہ نہیں آتے
بنارس کا مگر اک سحر کہیے، شعبدہ کہیے
یہاں کی جاں فزا آب و ہوا کا معجزہ کہیے
کہ مرنے والے سب قالب بدل کر زندہ رہتے ہیں
مجسّم نور بن کر جاوداں پائندہ رہتے ہیں

دل کش مندروں کی رونق و شان، باغوں کی پھبن، بھانت بھانت کے خوش دلوں کا مجمع اور ان کی شوخ پوشاکیں، ہندوستان کے کونے کونے سے آنے والے تیرتھ یاتری ذہن پر ایسا تاثر چھوڑتے ہیں جس کو بھلانا ممکن نہیں۔ بہت سے اپنے پیش رووں اور بعد میں آنے والوں کی طرح غالب بھی بنارس کے حسن کے گرویدہ ہو گئے۔

زہے آسودگی بخش رواں ہا
کہ داغ چشم می شوید زجاں ہا
شگفتے نیست از آب و ہوائش
کہ تنہا جاں شود اندر فضائش
بیا اے غافل از کیفیت ناز
نگاہے بر پری زادانش انداز
ہمہ جاں ہائے بے تن کن تماشا
نہ دارد آب و خاک این جلوہ ہاہا

ادھر آؤ، ادھر، اے خانۂ غفلت کے مت والو!
ادھر دیکھو ذرا اس کے حسینوں پر نظر ڈالو
یہ کوہ قاف کی پریاں ہیں یا حوریں ہیں جنت کی
مجسم ہو گئی ہوں جیسے موجیں نور و نکہت کی
نہیں حائل ہے پردہ کوئی جسمانی کثافت کا
سراپا پیکرانِ نور ہیں اعجاز قدرت کا

بنارس سے متعلق ہر شے کو شاعرانہ روایات کو برقرار رکھنے والے قدیم ہندوستان کے روپ میں دیکھتا ہے۔ بہار گلاب کے پھولوں سے گندھے ہوئے برہمنوں کے جنیو (زنار) سے کی گئی ہے اور خود آسمان ایک ہندو کی پیشانی کی رف اور طرح طرح کے دوسرے رنگوں سے مکمل آشنا ہے:

درین دیرینه دیرستانِ نیرنگ
بهارش ایمن ست از گردشِ رنگ
به تسلیمِ هوائے آن چمن زار
ز موجِ گل بهاران بسته زنار
فلک را قشقه‌اش گر بر جبین نیست
پس این رنگینیِ موجِ شفق چیست

یہ کہنہ دیر، دیرستانِ عالم کا عجوبہ ہے
بدلتے موسموں سے ناشناسا اس کی دنیا ہے
بہار ایسی یہ رکھتا ہے چمن زار
کہ موجِ گل سے جو باندھے ہے زنار *
فلک یہ اپنی پیشانی پہ جو قشقہ لگاتا ہے
اسی کے گلشن و گل زار سے سرخی چراتا ہے

لیکن بنارس صرف ہندوؤں ہی کو عزیز نہیں ہے۔ آگے غالب کہتے ہیں کہ جیسے کعبہ مسلمانوں کے لیے مرکزِ جاذبہ کی ھتا ہے ویسے ہی بنارس میں سبھی ہندوستانیوں کے لیے ایک کشش ہے، چاہے وہ اللہ پر عقیدہ رکھتے ہوں یا حاب "آدی گرنتھ" پر، مہاتما بدھ کو مانتے ہوں، آتش پرست ہوں یا گھنٹیوں کی جھنکار پر عیسائیوں کے گرجا گھر میں تے ہوں۔

سوادش پائے تختِ بت پرستان
سراپایش زیارت گاهِ مستان
عبادت خانهٔ ناقوسیان ست
همانا کعبهٔ هندوستان ست

بنارس جانِ جاناں پائے تختِ بت پرستاں ہے
بنارس ارضِ خوباں ہے، زیارت گاہِ مستاں ہے
بنارس کو عبادت خانۂ ناقوسیاں کہیے
بنارس کو بجا ہے کعبۂ ہندوستاں کہیے

بنارس کی حسینائیں غالب کو بے چین کر دیتی ہیں۔ حالاں کہ وہ خود بتانِ دل فریب ہیں، لیکن اپنے مذہب کے مطابق ستش بھی کرتی ہیں۔ اور ایک برہمن کے لیے پتھر کے صنم کی پوجا کتنا مشکل کام ہو گا جب کہ اس کی ساری توجہ یہ م کھینچ لیتے ہیں!

بتانش را هیولائے شعلهٔ طور
سراپا نورِ ایزد چشمِ بد دور
ز تابِ جلوهٔ خویش آتش افروز
بتانِ بت پرست و برهمن سوز

صنم یاں کے بنے ہیں شعلہ ہائے طور سے گویا
سراپا عبارت ہیں خدا کے نور سے گویا
ہیں تابِ رخ سے اپنے آتش افروز
بتانِ بت پرست و برہمن سوز *

جنت جیسی جاں بخش آب و ہوا والا یہ دل فریب شہر اس عظیم دریائے گنگا کے کنارے آباد ہے، جس میں اشنان سے نہ صرف دلی مرادیں بر آتی ہیں بلکہ سب پاپ بھی دھل جاتے ہیں۔ آواگون کے لامتناہی چکر سے پاک صاف نکل کے لیے دیرینہ سال بوڑھے اپنے نحیف و ناتواں جسم کو اس ندی کے پانی میں غوطہ دیتے ہیں تو دل فریب دوشیزائیں ساڑیوں میں ملبوس پانی میں چھینٹے اڑاتی ہوئی اٹکھیلیاں کرتی ہیں اور تمام رعنائیوں کے ساتھ کنارے پر یوں کہ بھیگی ساڑی سے ڈھکے ہوئے ان کے متناسب بدن کی دل فریبی دوبالا ہو جاتی ہے۔

رسانیده از ادائے شست و شوئے
به هر موجه نوید آبروئے

پری پیکر بنارس کے جو گنگا میں نہاتے ہیں
وہ گویا آبرو ہر موجِ گنگا کی بڑھاتے ہیں

بہ مستی موج را فرمودہ آرام
ز نغزی آب را بخشیدہ اندام

عنایت وہ کریں موجوں کو آرام
جو بخشیں آب کو اپنے وہ اندام

او ر پانی کی اس ساری چھپ چھپ اور چمک دمک کے اوپر پورے کروفر کے ساتھ بنارس کے محلات اور مندروں کی عمل داری ہے۔

مگر گوئی بنارس شاہدے ہست
ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست
بہ گنگش عکس تا پرتو فگن شد
بنارس خود نظیر خویشتن شد

بنارس کو اگر ٹھیرائیے اک شاہد زیبا
وہ جس کے روبرو صبح و مسا گنگا آئینہ
پڑا گنگا میں اس کا عکس ایسا
نظیر اپنی بنارس آپ ٹھہرا

اس دل فریب گوشۂ عافیت میں کسی طرح یقین نہیں آتا کہ دنیا میں شر کا بھی وجود ہے، لیکن بدی متواتر اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہے، سب سے مقدم دیرینہ رشتوں کے ٹوٹنے اور سابقہ اقدار کی شکست و ریخت ہے۔

شبے پرسیدم از روشن بیانے
ز گردش ہائے گردوں راز دانے
ز ایماں ہا بہ جز نامے نہ ماندہ
بغیر از دانہ و دامے نہ ماندہ
پدرہا تشنۂ خون پسرہا
پسرہا دشمنِ جان پدرہا
برادر با برادر در ستیز است
وفاق از شش جہت رو در گریز است
بدیں بے پردگی ہائے علامت
چرا پیدا نہ می گردد قیامت

وحید عصر اک عالم سے اک دن میں نے پوچھا
یہ آخر ماجرا کیا ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا
جو پوچھو دین و ایماں کی تو بس اک نام باقی ہے
مئے الفت کہاں باقی ہے، خالی جام باقی ہے
ادھر ماں باپ ہیں اولاد سے برگشتہ و بدظن
ادھر یہ حال ہے اولاد بھی ماں باپ کی دشمن
لڑے مرتے ہیں بھائی بھائی آپس میں خدا سمجھے
محبت، پیار، یاری، دوستی، عنقا ہے دنیا سے
قیامت کے سبھی آثار پیدا ہیں مگر پھر بھی
بہت حیران ہوں آخر قیامت کیوں نہیں آتی

یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ غالب کے لیے قیامت کی یہ" علامات۔ تعلقات رشتہ داری کے فشار کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں : غالب کے سرپرست نواب احمد بخش، حالاں کہ بزرگی کو دیکھا جائے تو مرزا کے باپ کے برابر تھے، انھوں نے بھی اپنے فائدے کے لیے مالی امور کے تعلق سے جوڑ توڑ کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا، حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ مرزا اور ان کے اقربا کی خوش حالی کا انحصار اسی پر ہے۔ اسی طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ" بیٹوں۔ کی پیڑھی کو بھی اپنے "آبا۔ سے متصادم ہونے میں کوئی عار نہیں ہے۔ نواب احمد بخش کے بیٹوں کا تو پوچھنا ہی کیا؟ ان کے مفادات کا ٹکراؤ گویا کہ بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔ بے شک شعری تصاویر خیالی کا زندگی کے معینہ واقعات سے دو ٹوک موازنہ ضروری نہیں، لیکن اس کے باوجود فکر شاعرانہ کی روش کو بلاشبہ مخصوص محرکات ہی متعین کرتے ہیں۔

لیکن فی الوقت خود غالب کو ان " علامات۔ کی صحت پر پورا یقین نہیں ہے، اور چوں کہ مشکلات کے حسب منشا حل کی امید قائم ہے، تو روشن ضمیر دانائے راز کی توضیحات کو سن کر انھیں مسرت بھی ہوتی ہے اور ان کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہوتا ہے۔

سوئے کاشی بہ انداز اشارت
تبسم کرد و گفتا این عمارت

مری اس بات کو سن کر، تبسم زیر لب بولا
سوئے کاشی اشارہ کرکے وہ دانائے بے ہمتا

که خطا نیست صانع را گویا
که از هم ریزد این رنگین بنا را
بلند افتاده تمکین بنارس
بود بر اوجِ او اندیشه نارس

اسے دیکھو یہ شہر نورنکہت ، یہ حسیں وادی
نہیں منظور فطرت کو گوارا اس کی بربادی
کہاں ہے فرشِ گیتی پر بنارس شہر کا ثانی
تصورِ خانۂ مانی بھی اس کے آگے بے معنی
کمندِ فکر اپنی نارسائی پر ہے شرمندہ
بلند ، اوجِ ثریا سے بھی اس کا نقش تابندہ

یہاں پھر موضوع میں اچانک تبدیلی آتی ہے۔ گویا کہ یہ مان کر کہ بنیادی اقدار برقرار ہیں شاعر کو اس کے نجی معاملات یاد آتے ہیں اور اسے مایوسی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے :

الا اے غالبِ کار اوفتادہ
ز چشمِ یار و اغیار اوفتادہ
ز خویش و آشنا بیگانہ گشتہ
جنونِ گل کردہ و دیوانہ گشتہ
چہ جوئی جلوہ زیں رنگیں چمن ہا
بہشتِ خویش شو از خوں شدن ہا
چوں بوئے گل ز پیراہن بروں آی
بہ آزادی ز بندِ تن بروں آی
فرو ماندن بہ کاشی نارسا نیست
خدارا این چہ کفر ماجرا نیست

سن اے واماندۂ راہِ طلب اے غالبِ خستہ
خبر لے اپنی اے دامِ گل و گلشن میں پابستہ
ہوائے گل نے دیوانہ بنا کر رکھ دیا تجھ کو
جنونِ شوق نے وارفتۂ غفلت کیا تجھ کو
جسے تو ڈھونڈتا پھرتا ہے ان رنگیں بہاروں میں
وہ جنت ہے ترے خونِ جگر کے لالہ زاروں میں
مثالِ بوئے گل باہر نکل آ جلدِ گل سے
خودی کو اپنی کر آزاد قیدِ زلف و کاکل سے
قدم رک جائیں کاشی پر کمالِ نارسائی ہے
یہ کیا افتاد ہے کیسی یہ کفر ماجرائی ہے

وہ احباب کے تعلق سے اپنی رنجشیں اور اقربا کے تئیں اپنی شکایتیں بھلا دیتا ہے اور اب اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں ناحق اس نے بے یار و مددگار چھوڑ دیا اور ان سے بے اعتنائی کی۔

دریغا در وطن واماندۂ چند
بہ خونِ دیدہ زورق راندۂ چند
ہوس را پائے در دامن شکستہ
بہ امیدِ تو چشم از خویش بستہ
ہمہ در خاک و خوں الگندۂ تو
بہ حکمِ بے کسی پابندۂ تو

وطن میں کچھ ترے دل دادہ تجھ کو یاد کرتے ہیں
تری فرقت میں پیہم گریہ و فریاد کرتے ہیں
ہوس کے پاؤں توڑے ، ہیں وہ بیٹھے
تری امید میں خود کو بھلائے ★
کمالِ ضبط سے بے چارگی کا درد سہتے ہیں
شررِ افشاں ہیں دل کے داغ پر خاموش رہتے ہیں

اور اب یہ سمجھ لینے کا وقت آگیا ہے کہ اپنی اور اقربا کی مصیبتوں میں بڑا ہاتھ خود اسی کا ہے :

سر و سرمایہ غارت کردۂ تو
ز تو نالاں ولے در پردۂ تو
از آنانت تغافل خوش نما نیست
بہ داغِ شاں سوائے گل روا نیست

ترے ہاتھوں ہوئی برباد ان کی زندگی ساری
وہ تجھ پر جان دیتے ہیں، تجھے ہے ان سے بے زاری
بھلا لگتا نہیں ہے یہ تغافل
نہ دے داغوں کو ان کے موجۂ گل ★

اور بالآخر مثنوی اختتام پر پہنچتی ہے ، شاعر خود کو سنبھالتا ہے ، اب اسے پتہ چل گیا ہے کہ جن کو وہ عزیز رکھتا ہے

نہیں دوبارہ مسرت و شادمانی وہ کیسے بہم پہنچا سکتا ہے، اس لیے اب مثنوی کا آہنگ بھی بدلتا ہے، اس میں پھر سے جذبات کی وہی شدت نمودار ہوتی ہے، جس سے داستان کا آغاز ہوا تھا، دل سوزی اور شرر کا پیکرِ خیالی معرضِ وجود میں آتا ہے، اب شاعر نے نئے کارنامے سرانجام دینے کے لیے کمر کس لی ہے:

ترا اے جبلہ خبر کاریست درپیش
بیابانے وکہسارے ست درپیش
ترا زاندوہِ غمہاں بود باید
خرابِ کوہ و ہاموں بود باید
نفس تاخود فرو نشیند ازپانے
دلے از جادہ پیمائی میاسائے
شررآسا فنا آمادہ برخیز
بیفشاں دامن و آزادہ برخیز

تجھے درپیش ہے جو کام کچھ اس کی خبر بھی ہے
ترے رستے میں قاتل کر بلائے کوہ و در بھی ہے
تجھے اندوہ غموں بھی لگے ہات
خرابِ کوہ و ہاموں ہو تو ہے بات *
جہاں تک ساتھ یہ دم دے ترا چل
چلا چل، بس چلا چل، بس چلا چل *
شرر آسا، فنا آمادہ، مصروفِ سفر ہوجا
جگر سے خون ٹپکا، رازدانِ بحر و بر ہوجا

اس میں شک نہیں کہ ذہنی تاثرات کی بوقلمونی کے لطیف اظہار کی حامل یہ قابلِ قدر شعری تخلیق، شاعر کی قلبی کیفیات گویا کہ بس پر سکون زندگی جینے کے لیے بنے ہوئے اس دل فریب شہر کی دید سے شاعر کے دل میں اٹھنے والے جذبات کے پر مسرت طوفان، اپنے تعلق سے روا رکھی جانے والی ناانصافی کے کبھی پیچھا نہ چھوڑنے والے احساس، اور مستقبل میں درپیش طویل، مشکل اور تھکا دینے والے سفر کی فکر کی آئینہ دار ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس مثنوی کے اشعار میں وجود کی شان، میں کیسے روشن اور انسان دوستی کے جذبات سے بھرپور نغمے کی گونج سنائی دیتی ہے!

نوٹ:- مثنوی "چراغِ دیر" کے محولہ اشعار کا منظوم اردو ترجمہ جناب اختر حسن صاحب کا ہے، بہ جز ان متفرق اشعار کے جن پر ستارے کا نشان بنا دیا گیا ہے۔ ان اشعار کا منظوم اردو ترجمہ جناب مظفر مجاز صاحب نے میری درخواست پر کیا ہے۔ میں دونوں شعرائے کرام کا اور غالب کے خطوں کے ترجمے کے لیے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا شکر گزار ہوں، جن کی کتاب "اوراقِ معانی" سے میں نے استفادہ کیا ہے۔

مترجم

آثم راندیری

اردو کے چند ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات اوران کے آٹو گراف

[آثم راندیری کا اصل نام محمود میاں ہے۔ ۱۵/ اگست ۱۹۰۲ء کو راندیر ضلع سورت میں پیدا ہوئے۔ آثم راندیری گجراتی کے شاعر، ادیب اور صحافی ہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں راندیر سے ایک گجراتی ماہ نامہ "صادق" جاری کیا۔ بعد ازاں ۱۹۲۹ء میں بمبئی سے ایک گجراتی ماہ نامہ "لیلا" شائع کیا۔ ان کے کئی ادبی اور تنقیدی مضامین گجراتی رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ انھوں نے ۵۷۵ھ میں عرب سے راندیر آکر بس جانے والے نائت قبیلوں کی تاریخ "تاریخ نائت واذ مسجد" کے نام سے شائع کی۔ آثم راندیری ساری دنیا کا سفر کرچکے ہیں۔ کئی قومی اور سماجی اداروں سے وابستہ ہیں اور اپنا زیادہ تر وقت ان ہی کاموں میں صرف کرتے ہیں۔]

مجھے بچپن ہی سے شعروادب سے دلچسپی رہی ہے۔ میری مادری زبان گجراتی ہے۔ اس زبان میں شعر کہتا ہوں اور نثر میں بھی میرے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ مجھے اردو سے بھی بے حد لگاؤ ہے۔ اساتذہ سخن کا کلام اکثر میرے زیر مطالعہ رہا ہے۔ اپنی ملازمت اور کاروبار کے سلسلے میں ہندوستان کے سبھی بڑے شہروں کا سفر کرچکا ہوں۔ میں جس شہر میں بھی جاتا میری یہ کوشش ہوتی کہ اس مقام کے ادیبوں اور شاعروں سے نیاز حاصل کروں۔ اس مضمون میں میں نے اپنے ترپن سال کے ماضی کی راکھ سے کچھ چنگاریاں چن کر پیش کی ہیں۔ کسی زمانے میں یہ خاکسار آثم راندیری بمبئی کی VALCON TRADING CO.LTD. (SISTER COMPANY OF . SWEEDNA.) میں Travelling Agent کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ مجھے سال دو سال میں ہندوستان کے تمام بڑے شہروں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ اسی سلسلے میں ۱۹۴۰ء میں میرا حیدرآباد دکن جانا ہوا۔ اس وقت کے حیدرآباد کی رونق اور چہل پہل کچھ عجیب سی تھی۔ جہاں ہر کس و ناکس خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے نظر آتا تھا۔ کون مسلمان ہے کون ہندو ہے اس کی شناخت مشکل تھی۔ کہیں پڑھا تھا کہ اردو زبان کے شاعر سب سے پہلے دکن ہی میں پیدا ہوئے۔ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ بہمنی قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں کئی نامور شاعر اور ادیب اس سرزمین سے اٹھے۔ ان کے بعد ولی دکنی ثم گجراتی نے سارے ہندوستان میں اپنی شاعری کا ڈنکا بجادیا۔ انھوں نے ہمارے شہر سورت پر مثنوی لکھی تھی جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

عجب شہراں میں ہے پرنور یک شہر
بلا شک وہ ہے جگ میں مقصد دہر
اسے مشہور اس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت

اور ہاں سراج اورنگ آبادی صاحب کو بھی کیسے بھول سکتے ہیں جن کا یہ مصرع اس وقت زبان پر آگیا ہے۔ "جب نام سراج ملا ہم کو جلتے ہی رہیں گے کہیں نہ کہیں"۔ ان کے علاوہ اور بھی شعرا اور ادیبوں کی بدولت دکن میں اردو زبان پروان چڑھی۔ بعد میں دہلی اور لکھنؤ اردو زبان کے مرکز بنے۔

جن دنوں میں حیدر آباد گیا، حضور نظام عثمان علی خان کی سرپرستی کی بدولت ہندوستان کے کئی نامی گرامی شاعر، ادیب، دانش ور اور عالم و فاضل حضرات حیدر آباد میں مقیم تھے۔ اور اردو کو فروغ دے رہے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد، داغ دہلوی۔ امیر مینائی، جلیل مانک پوری، احسن مارہروی ایسے صاحب فن حیدر آباد کی ادبی محفلوں کو گرما رہے تھے جن کا ڈنکا سارے ہندوستان میں بج رہا تھا۔ اسی لیے تو حیدر آباد میں شاعروں اور ادیبوں کی قدر دانی کی باتیں سن کر استاد شاہ ظفر، حضرت ذوق دہلوی کو کہنا پڑا۔

گرچہ ہے ملکِ دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر ؟

حیدر آباد میں جب میں نے یہ سنا کہ جناب جلیل مانک پوری بھی یہاں مقیم ہیں تو ان سے نیاز حاصل کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ آپ کا کلام پڑھ چکا تھا اور سن بھی چکا تھا۔ جب آپ کے مکان پر پہنچا تو ایک لڑکے نے میرا استقبال کیا۔ میں نے حضرت جلیل سے ملنے کی آرزو ظاہر کی تو وہ کمرے میں گیا اور تھوڑی دیر میں ایک ضعیف العمر کو یعنی حضرت جلیل صاحب کو لے کر آیا۔ سلام و دعا کے بعد آپ نے مجھ سے دریافت کیا کہ " میاں کہاں سے تشریف لا رہے ہو ؟" میں نے عرض کی " حضرت بمبئی سے۔ لیکن ویسے میں قصبہ راندیر ضلع سورت گجرات کا رہنے والا ہوں اور آپ کا آٹو گراف لینے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے سوال کیا کیا گجرات میں اردو بولی جاتی ہے ؟ تب میں نے کہا۔ جی ہاں، وہاں بھی دینی مدارس اور اسکولوں میں اردو سکھائی جاتی ہے۔ تب آپ نے تعجب سے پوچھا کہ آپ مجھے کب سے جانتے ہیں ؟ میں نے کہا۔ آپ کا کلام لاہور کے رسالے " عالمگیر " میں پڑھتا ہوں اور ویسے بھی ہمارے یہاں شادی بیاہ کی محفلوں میں قوالوں اور طوائفوں سے آپ کی غزلیں سنی ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے ان کی غزلوں کے شعر اور مقطعے سنائے۔

مزا ہوتا جو مرا نالہ آتش بار ہو جاتا
کسی کا دل دکھانا پھر تمہیں دشوار ہو جاتا
جلیل اک بے وفا کی یاد ہر دم گدگداتی ہے
وگر نہ شعر کہنا ان دنوں دشوار ہو جاتا

پارسائی کا بہت کرتے تھے اظہار جلیل
جھومتے آج چلے آتے ہیں مے خانے سے

اشعار سن کر آپ مسکرائے۔ اپنے دو چار اشعار سنائے۔ بہت خوش ہوئے اور فرمایا اس وقت میرے ہاتھ میں رعشہ ہے کتاب رکھ جائیے طبیعت سنبھلنے پر لکھ رکھوں گا۔ کل آکر لے جانا۔ دوسرے دن مکان پر گیا۔ ان کے صاحبزادے نے آٹو گراف لاکر دی۔ کوئی شعر نہیں لکھا تھا۔ صرف دستخط تھے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ آپ کے فرزند علی احمد تھے جن کا کلام رسالوں میں علی احمد جلیلی کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے۔ جناب علی احمد کو شاید ہی یہ واقعہ یاد ہو۔ جلیل صاحب کے وہاں سے میں جناب ماہر القادری صاحب کے پاس گیا۔ ماہر صاحب اس وقت کسی دینی ادارے میں کام کر رہے تھے۔ ان کی نظمیں " دکن کی برسات۔ " وہ نکلی دھوپ سایہ جا رہا ہے۔ " اور " صبح بہاراں۔ " میں نے رسالہ ساقی میں پڑھی تھیں۔ اور ماہر صاحب سے متاثر تھا۔ خیر ان کا آٹو گراف لے کر جب واپس جانے لگا تب آپ نے بتایا کہ فانی بدایونی صاحب بھی ان دنوں حیدر آباد میں ہیں۔ ان سے بھی ضرور مل لیجیے۔ یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔ ان کی مشہور غزل ان دنوں بہت سے قوال اور لکھنؤ کے نیولے " میر۔ " گا کرتے تھے۔ راندیر میں کسی کے ہاں شادی میں ان کو لکھنؤ سے بلایا گیا تھا۔ تب میں نے ان سے یہ غزل سنی تھی

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

راندیر کا ایک یادگاری کل ہند مشاعرہ منعقدہ ۱۹۵۳ء

ھنی طرف سے : جناب ساغر نظامی ، بہزاد لکھنوی ، سنجر مدراسی ، واقف مرادآبادی
سرتاج رحمانی ، محمد رمضانی ، نظر سیہوری ، نخشب
جناب راجندر سنگھ بیدی اور دوسرے مشہور شعرا و ادیب ۔

ایستادہ : جناب طالب راندیری ، جناب سرتاج رحمانی ، حضرت جگر مرادآبادی
آثم راندیری اور ، جناب حامد راندیری

بیٹھے ہوئے : نظر سیہوری ، شکیل بدایونی ، اور سر تاج رحمانی
ایستادہ : صبا افغانی ، آثم راندیری ، حیدر دہلوی ، حامد راندیری ، اور کاتب دہلوی -

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

جب فانی صاحب کے مکان پر پہنچا، آپ ظہر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ سلام و دعا کے بعد میں نے اپنے آنے کا مقصد ظاہر کیا۔ آپ نے آٹو گراف بک میں ایک شعر لکھ کر دستخط کر دیے۔ تب میں ان سے عرض کیا کہ ایک گجراتی رسالہ بنام "لیلا۔ Leela" بمبئی سے شائع کرتا ہوں۔ آپ اپنی کوئی تصویر ہو تو عنایت فرمائیں۔ میں آپ کے مختصر حالات کے ساتھ اپنے رسالے میں شائع کروں گا۔ آپ نے ایک پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر عنایت فرمائی اور میں نے اپنے رسالے "لیلا" میں اسے مع حالات شائع کیا۔
فانی صاحب کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ شاید حیدرآباد یا کسی اور ریڈیو اسٹیشن سے ایک آل انڈیا مشاعرہ نشر ہو رہا تھا جسے میں بمبئی میں سن رہا تھا۔ فانی صاحب نے اپنی غزل پڑھنی شروع کی اور ابھی صرف مطلع پڑھا تھا کہ حضرت جگر مرادآبادی نے ان کے پاس سے غزل لے لی اور اس غزل کو اپنے مخصوص ترنم میں پڑھ کر سنایا۔ اس غزل کا مقطع یہ تھا:

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

اس وقت فانی صاحب حیدرآباد میں محکمہ تعلیم میں اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔ فانی صاحب سے ملنے کے بعد میں جناب علی اختر صاحب کے پاس گیا۔ ان سے آٹو گراف لیے۔ ان کے کہنے پر میں درویش منزل گیا حضرت امجد صاحب سے نیاز حاصل کی اور ان کا آٹو گراف لیا جس میں ایک رباعی تحریر کی تھی۔ اس کے بعد میرا جب دوبارہ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد جانا ہوا تو جناب محمد علی خاں خویشگی مہتمم دارالطبع جامعہ عثمانیہ اور بیگم خویشگی مدیر "بجولی" سے ملاقات کی اور ان کے آٹو گراف بھی حاصل کیے۔ اس وقت مجھے برابر یاد نہیں، غالباً عابد روڈ پر ایک عینک کی دکان تھی جہاں اکثر شام کے وقت شعرا جمع ہوتے تھے۔ اسی دکان پر میری جناب مخدوم محی الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ کچھ عرصے بعد بمبئی میں انھیں جوش ملیح آبادی اور دیگر شعرا کے ساتھ ایک مشاعرے میں سنا تھا۔ جوش مشاعرے کے صدر تھے۔ حیدرآباد کے تاثرات یہاں ختم ہوتے ہیں۔ اس دور کے شعرا کے بعد حیدرآباد میں ویسے تو بڑی تعداد میں کئی خوش گو شعرا، ادیب، پیدا ہوئے۔ مگر میں جن سے زیادہ متاثر ہوا ان میں جناب شاہد صدیقی، جناب خورشید احمد جامی، جناب شاذ تمکنت، جناب سلیمان اریب، جناب راشد آزر، پروفیسر مغنی تبسم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انھیں میں سے چند شعرا اور ادیب ہیں جو آندھرا پردیش میں اس وقت ہندی کی سخت آندھی میں شمع اردو کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔

۱۹۴۰ء میں حیدرآباد کے دوران سفر ہی میں میرا لکھنؤ بھی جانا ہوا تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہاں کے شعرا کے نام اور پتے حاصل کیے اور سب سے پہلے ابوکمال امید امیٹھوی صاحب سے ملا۔ تعارف کرانے کے بعد آٹو گراف لیا۔ گجرات کا باشندہ ہونے کے باعث اور اردو ادب سے اتنی دلچسپی رکھتے ہوئے دیکھ کر فرمایا چلیے میں اور بھی یہاں کے شعرا حضرات سے آپ کی ملاقات کرا دوں۔ یہ کہتے ہوئے مجھے جناب ناطق لکھنوی صاحب کے مکان پر لے گئے اور میرا تعارف کرایا۔ سن کر کہنے لگے کہ دیکھا جائے تو صحیح معنوں میں یہی لوگ اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنا آٹو گراف لکھ کر ایک کتاب مع دستخط عطا کی۔ وہ اردو زبان کی منظوم تاریخ تھی جو آپ نے لکھ کر چھپائی تھی۔ امید صاحب مجھے یہاں سے "نگار" کے دفتر لے گئے اور جناب نیاز فتح پوری صاحب سے ملاقات کرائی۔ ویسے نگار تو پڑھتا ہی تھا اور نیاز صاحب کی نظم و نثر سے کافی متاثر تھا۔ نیاز صاحب سے نیاز حاصل کر کے مسرت ہوئی۔ آپ نے بھی چند اشعار بطور آٹو گراف لکھ دیے۔ یہاں سے جناب امید صاحب کا شکریہ ادا کر کے ان کے مکان پر انھیں چھوڑ آیا۔ عمر رسیدہ ہستی تھی تاہم آپ نے میرے ساتھ ہر جگہ آنے کی زحمت فرمائی تھی۔ یہ تھا لکھنؤ کا کلچر، لکھنؤ کی تہذیب۔ بعد میں جناب صفی لکھنوی صاحب کے وہاں گیا جن کے بڑے بھائی ظریف لکھنوی مشہور مزاح نگار شاعر تھے۔ صفی صاحب کا مشہور مطلع اس وقت یاد آ رہا ہے:

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا !!

آپ کافی سن رسیدہ بزرگ تھے۔ وہی لکھنوی نفاست، طرزِ گفتگو اور لباس۔ بہت دیر تک مجھ سے باتیں کیں۔ جب جانے لگا تو کہا یہاں شعرا کے علاوہ اور تاریخی عمارتیں بھی ہیں۔ آپ یہاں کے امام باڑے دیکھے بغیر مت جانا۔ ان سے آٹو گراف لیا۔ اور شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے زمانے کی عمارتیں، رومی دروازہ، قیصر باغ، امام باڑہ اور نواب واجد علی شاہ کی یادگاریں دیکھیں۔ زبان پر یہ شعر آگیا:

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

لکھنؤ سے بمبئی واپس ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ جانا ہوا۔ سب سے پہلے جناب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ خادم سے اپنے آنے کا مقصد ظاہر کیا اور وہ مجھے مکان میں لے گیا۔ اثر صاحب صوفے پر بیٹھے تھے۔ سلام و دعا کے بعد معلوم ہوا کے آپ ڈپٹی کمشنر ہیں۔ آپ تپاک سے ملے۔ آٹو گراف دیا اور فرمایا کہ آج شب آپ ضرور تشریف لائیں۔ "نان لون ساتھ نوش فرمائیے۔ ("نان لون" شاید لکھنؤ کا محاورہ ہوگا) میں نے معذرت چاہی۔ اردو شعر و شاعری کی طرف میری رغبت دیکھتے ہوئے کہنے لگے کہ ابھی چند روز پہلے لکھنؤ کی ایک قابلِ ناز ہستی، شاعر اور مشہور ڈراما نگار (ڈرامہ نگار) احسن لکھنوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں نے عرض کی کہ میں نے ان کا ڈرامہ "چلتا پرزہ" ہی دیکھا تھا اور ان کا کلام بھی لاہور کے ماہوار رسالے "خیالستان" میں پڑھا ہے۔ اختر شیرانی اس رسالے کے مدیر تھے۔ ان کی غزل کا ایک مقطع جو "خیالستان" میں چھپی تھی سنایا:

اک وہ بھی زمانہ تھا جب اپنا قلم احسن
چلتا ہوا جادو تھا، بہتا ہوا دریا تھا

سن کے کہنے لگے بھئی آپ کے شعری ذوق کی داد دینی پڑے گی۔ پھر فرمایا یہاں ایک اور بھی سر پھرے شاعر تھے جو مرزا یاس یگانہ چنگیزی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ کافی عرصہ حیدرآباد دکن میں مقیم رہے۔ ڈاکٹر اقبال ایسے شاعر کی بھی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ حال ہی میں ان کی بھی وفات ہوگئی ہے۔ کہتے خوب تھے۔ مگر آخر میں ان کے دماغ میں کچھ فتور سا آگیا تھا۔ ملحد ہوگئے تھے جس کی وجہ سے یار لوگوں نے ان کی خوب پٹائی بھی کی تھی اور منہ کالا کر کے جوتیوں کا ہار پہنا کر گدھے پر بٹھا کر سارے شہر میں انھیں گشت کرایا۔ میں اثر صاحب کی باتیں خموشی سے سنتا رہا مگر دل کو بہت صدمہ ہوا۔ ان کا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوا۔ اثر صاحب کی باتوں سے معلوم ہوا کہ آپ بھی کچھ یگانہ سے بدظن تھے۔ ویسے یاس یگانہ کی غزلیں، رباعیات اور قطعات میں لاہور کے "عالمگیر" رسالے میں اکثر پڑھا کرتا تھا۔ اسی رسالے میں اعلیٰ حضرت نظام، مہاراجہ کشن پرشاد، اور حضرت جلیل مانک پوری کا کلام بڑی شان و شوکت سے سرخ و سبز رنگین روشنائی میں شائع ہوتا تھا۔ اسی رسالے میں یگانہ نے ایک مرتبہ اقبال کو "اک بال" لکھا تھا۔ اس وقت یگانہ کی ایک بہت ہی خوبصورت غزل کا مطلع یاد آرہا ہے:

جنھیں ذوقِ حضوری میں ترا دیدار حاصل تھا
الٰہی کون سی وہ صورتیں تھیں کونسا دل تھا ؟

الحمد اللہ میں ملحد نہیں۔ "ناستک" نہیں۔ پھر بھی اثر صاحب سے جدا ہو کر راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ مرزا یگانہ کے اعتقاد کا معاملہ تو صرف ان کے اور اللہ میاں کے درمیان کا تھا۔ لوگوں کو کیا حق تھا جو اس طرح کسی انسان کو سزا دے کر اس کی بے حرمتی کریں۔

اثر صاحب نے کتاب میں شعر لکھ کر آٹو گراف کے ساتھ اپنا مجموعۂ کلام "بہاراں" عنایت فرمایا۔ وہاں سے جناب مجاز

ماحب سے ملنے گیا۔ حسن اتفاق سے مکان پر پہنچا ہی تھا کہ آپ دروازے سے باہر نکلے۔ تانگے والے نے کہا۔ لیجیے مجاز رہے ہیں۔ سن کر غالب کے مصرع میں تصرف کر کے میں نے کہا کہ "میں جانتا تھا کہ وہ نکلے۔ جیسا معاملہ ہوا۔ سلام ، بعد میں نے آنے کا منشا ظاہر کیا تو کہنے لگے۔ اس وقت میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔ آپ بھی میرے ساتھ ں نے کہا تانگہ حاضر ہے۔ وہ مجھے کافی ہاؤس لے گئے۔ جہاں چند نوجوان ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو سے معلوم ج رات ہونے والے مشاعرے کے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں۔ کافی کے دور کے بعد ان کا آٹو گراف لیا اور جانے لگا اگر فرصت ہو تو مشاعرے میں تشریف لانا۔ ان سے رخصت ہو کر جناب آل احمد سرور صاحب کے گھر گیا۔ تعارف کے اف بک دی۔ آپ نے کتاب میں شعر لکھ کر دستخط کیے اور فرمایا آج رات کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے مشاعرہ نشر لا ہے اور جگر صاحب بھی تشریف لائیں گے۔ آپ ضرور آیئے گا۔ یہ کہہ کر مجھے ایڈمیشن کارڈ دیا۔ مشاعرے کے بعد . صاحب سے ملا۔ مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ چوں کہ کچھ عرصہ پہلے ہی میں انھیں جناب حیدر دہلوی، نظر سیوہاروی، یونی اور سرتاج رحمانی کے ہم راہ بمبئی سے اپنے ساتھ راندیر مشاعرے میں لے گیا تھا۔ پوچھا! یہاں کیسے؟ کہاں ، ہو وغیرہ۔ مختصر باتیں ہوئیں اور میں واپس امین آباد پارک ہوٹل آگیا۔ مشاعرے میں جگر صاحب نے وہ غزل سنائی طلع ہے:

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن.

آپ نے راندیر کے مشاعرے میں پہلی بار پڑھی تھی اور جناب مجاز صاحب نے اپنی یہ غزل سنائی:

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
مجاز اک بادہ کش تو ہے یقیناً
مگر سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے

لکھنؤ کے شعرا کا تذکرہ ختم ہوتا ہے لیکن ایک اور لکھنوی مشہور و معروف شاعر سے بھی مجھے بمبئی میں ۳۰/ دسمبر ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ تھے جناب آرزو لکھنوی۔ آرزو صاحب کا بمبئی میں بھنڈی بازار کے ایک کتب فروش ۔ اکثر شام کے وقت بیٹھنا ہوتا تھا۔ جہاں کبھی کبھار خاکسار آثم بھی ان کی صحبت میں کچھ حاصل کرنے کی غرض سے تھا۔ شاعری کے علاوہ آرزو صاحب کے ڈراموں نے بھی ہندستان گیر شہرت حاصل کی تھی۔ آرزو صاحب کے گیتوں ں دنیا میں ہل چل مچادی تھی۔ آپ کے چھوٹے سا مجموعہ کلام "سریلی بنسری" کی دھن نے خالص اردو کے پرستاروں کو یا تھا۔ کلکتہ کے بعد آپ بمبئی میں کافی عرصے تک مقیم رہے۔ آپ نے ۱۶/ اپریل ۱۹۵۱ء میں بمقام کراچی انتقال
کھنؤ کے دوران سفر میں نے ایک خاص بات دیکھی کہ وہاں کے شرفا اور صاحب قلم حضرات کی تہذیب اور اخلاق کی ر، وہاں کے تانگہ (یکہ) والوں کو بھی ہر کسی سے "حضور" کہہ کر مخاطب ہوتے دیکھا۔ "حضور کہاں تشریف لے جاؤ گے؟ ں ہوٹل میں قیام فرماؤ گے؟" وغیرہ۔ یہ پچاس سال پہلے کی باتیں ہیں۔ خدا جانے اب وہاں کا کیا حال ہے۔
دوسرے روز جناب اکبر الہ آبادی کے صاحبزادے جناب عشرت حسین صاحب سے ملاقات کے لیے گیا۔ تعارف کے نے انھیں بتایا کہ میں نے ایک مضمون ان کے والد صاحب کے متعلق بمبئی کے "ہیگھڈی موج" گجراتی رسالے میں تھا۔ سن کر خوش ہوئے اور آٹو گراف لکھ کر دیا۔ یہ عشرت حسین صاحب وہی صاحب ہیں جن کے بارے میں ان کے ے اکبر الہ آبادی نے لکھا ہے:

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے ۔ کھا کے لندن کے ہوا عہد وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی ۔ کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے
موم کی پتلیوں پہ کچھ ایسی طبیعت پگھلی ۔ چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

عشرت صاحب سے رخصت لے کر جناب فراق گورکھپوری کے مکان پر پہنچا۔ اس زمانے میں آپ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ اس وقت فراق صاحب اپنی اردو غزلوں کے ہندی ایڈیشن کے پروف دیکھ رہے تھے۔ آپ کا کلام بھی اردو کے نامی گرامی رسالوں میں شائع ہوتا تھا اور بندہ انھیں پڑھا کرتا تھا۔ اس وقت یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اس زمانے میں ہمارے راندیر قصبے کے دو ادارے انجمن اسلام اور محفل اسلام کے کتب خانوں میں مندرجہ ذیل اردو رسالے اور اخبارات آتے تھے۔ اس سے پتہ چلے گا کہ اس وقت راندیر، سورت اور گجرات میں اردو زبان کتنی وسعت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ لاہور سے نیرنگ خیال، مخزن، نقوش، عالمگیر، جہانگیر، شباب اردو، اردو، چندن، خیالستان، اخبار "زمیندار"۔ دہلی اور دوسرے شہروں سے نگار، دین دنیا، شاعر، ساقی، اودھ پنچ، صوفی، آج کل، بیسویں صدی وغیرہ، اخبار مدینہ، خلافت ان کے علاوہ اور بھی ہوں گے۔ خیر ۔۔۔ فراق صاحب کی غزلیں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔ آپ نے بھی شعر اور آٹو گراف لکھ دیے اور میں شکریہ ادا کر کے ان سے جانے کی اجازت چاہی۔

۱۹۴۰ء میں بھوپال جانا ہوا تھا۔ اس زمانے میں ملا رموزی کی گلابی اردو صحافت نگاروں میں مشہور تھی۔ آپ سے ملا اور آٹو گراف لے کر شکریہ ادا کیا۔ وہاں سے کانپور گیا۔ وہاں حضرت حسرت موہانی صاحب سے نیاز حاصل کیے۔

۱۹۴۱ء میں میرا دہلی، آگرہ اور لاہور بھی جانا ہوا تھا۔ دہلی میں اس وقت فصیح الملک نواب داغ دہلوی کے جانشینوں میں آپ کے داماد نواب سائل دہلوی، سید وحید الدین احمد بیخود، پنڈت دتاتریا کیفی وغیرہ حیات تھے۔ سب سے پہلے میں پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی صاحب کے دولت خانے پر گیا۔ کیفی صاحب بابائے اردو مولانا عبدالحق کے خاص ساتھی اور انجمن ترقی اردو کے نائب صدر تھے۔ چھوٹا سا قد۔ گورا رنگ، نفیس کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا تعارفی کارڈ بھیجا۔ آپ نے خود آ کر میرا استقبال کیا اور اردو ادب سے میرا لگاؤ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ آٹو گراف دیا اور فرمایا آج رات کو مشاعرہ ہے۔ حفیظ جالندھری صاحب بھی تشریف لانے والے ہیں۔ آپ ایسا کیجیے شام، بجے آپ غریب خانے پر آجائیے ساتھ میں "ڈنر" لے کر مشاعرہ میں جائیں گے۔ اندھے کو کیا چاہیے؟ دو آنکھیں۔ یہ سن کر میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ حفیظ جالندھری ایسے شاعر سے شرف نیاز حاصل کرنے کے ساتھ ان کی زبان سے ان کا کلام بھی سننے کو ملے گا۔ میں حفیظ صاحب کی غزلیں رسالوں میں پڑھ چکا تھا اور ان کی وہ نظم جو انھوں نے سر عبدالقادر بار ایٹ لا کے ہمراہ لندن جا کر وہاں ہندوستانی طلبہ کی محفل میں پڑھی تھی "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے"۔ میں بھی کبھی کبھار دوست احباب کی محفلوں میں سنایا کرتا تھا۔ میں نے پنڈت جی کی دعوت بلا تکلف قبول کر لی۔ خوش ہوئے اور فرمایا اب میں آپ کو حضرت داغ دہلوی صاحب کے داماد نواب سائل صاحب سے بھی ملوا دوں۔ ہم دونوں تانگے میں سائل صاحب کے دولت خانے پر گئے۔ بہت ہی نورانی چہرہ، اس پر سفید ریش، فرشتہ صورت ایک بزرگ چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ پاؤں پر پلاسٹر لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا آپ گھوڑے کی سواری کرتے ہوئے گر گئے تھے۔ کیفی صاحب نے میرا تعارف کرایا اور آنے کا مقصد بتایا تو فرمانے لگے۔ بھئی اب تو ہم چراغ سحری ہیں چلو اچھا ہوا آپ آگئے اور مل لیا۔ بعد میں کیفی صاحب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ پنڈت جی آپ ہی میری طرف سے اشعار لکھ کر دستخط کر دیجیے۔ چناں چہ آپ نے جو اشعار سنائے وہ پنڈت جی نے لکھ کر مجھے دیے۔ سائل صاحب سے ملاقات کا منظر اس وقت میری نظروں میں گھوم رہا ہے اس کے کچھ عرصہ بعد میں نے سائل صاحب کو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے غزل نشر کرتے سنا تھا۔ اب بھی میرے کانوں میں ان کا ترنم گونج رہا ہے۔ اس غزل کا ایک شعر اور مقطع درج ہے۔

یہ مسجد ہے وہ میخانہ ، تعجب اس پہ ہوتا ہے
جناب شیخ کے نقش قدم ، یوں بھی ہے اور یوں بھی
مجھے نواب بھی کہتے ہیں ، شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانے میں ترا سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

ل صاحب کے گھر سے کیفی صاحب مجھے دہلی کی ایک اور بزرگ ہستی کے پاس لے گئے وہ تھے پنڈت امرناتھ ساحر۔
نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ مختصر تعارف کے بعد آپ نے بھی اشعار لکھ کر آٹو گراف دیے۔ میں
سے رخصت ہوا اور دوبارہ ۷ بجے ان کے دولت خانے پر گیا۔ ساتھ میں ڈنر لیا۔ وہی دہلی کی خاص خاص لذیذ کھانے کی
پر چنی گئی تھیں۔ وقت مقررہ پر ہم دونوں جامعہ ملیہ پہنچے۔ ہال لوگوں سے بھر گیا تھا۔ صدر مشاعرہ کیفی صاحب تھے
نٹے تک مشاعرہ گرم رہا۔ حفیظ صاحب نے ایک دو غزلیں سنائیں۔ آپ بھی ترنم ہی سے پڑھتے تھے۔ "اپنے وطن میں
ہے پیارے۔" کی بھی فرمائش ہوئی تھی۔ کسی نے شاہنامہ اسلام کے کچھ بند سنانے کی۔ خواہش کی مگر انھیں اور کسی جگہ
رہ میں جانا تھا اس لیے معذرت کرلی۔ مشاعرے کے اختتام پر طلبہ نے انھیں آٹو گراف دینے کے لیے گھیر لیا۔ میں
۔ بک دی تو صرف حفیظ لکھ دیا۔ میں نے کہا کوئی شعر بھی لکھ دیجیے۔ تو فرمایا۔ آپ ہی میرا کوئی شعر لکھ دیں۔ مشاعرے
یفی صاحب کا شکریہ ادا کر کے ان سے رخصت ہوا۔

سی سفر کے دوران میرا لاہور بھی جانا ہوا۔ وہاں اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی بیسویں صدی کے دفتر پہنچا۔ مدیر رسالہ
تر گرامی سے ملا۔ بیسویں صدی بھی میں پڑھا کرتا تھا۔ مختصر تعارف کے بعد ان سے جناب احسان دانش کے مکان کا
کر کے ان سے ملاقات کی۔ آپ کے متعلق میں نے جو سنا تھا ویسے ہی پایا۔ وہ حقیقی معنوں میں شاعر مزدور ہی نظر
ب چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک طرف کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک دری زمین پر بچھی ہوئی تھی اور ایک تکیہ دھرا تھا۔ آپ
شعر لکھ کر آٹو گراف دیے۔ میں نے ان سے جناب اختر شیرانی کا پتہ دریافت کیا تو کہنے لگے۔ اختر صاحب اس وقت لاہور
ں ہیں۔ اپنے وطن ٹونک گئے ہوئے ہیں۔ میں اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو آپ نے مجھے اپنا مجموعہ کلام "آتش
عنایت فرمایا۔

لاہور میں صرف دو ہی دن کا پروگرام ہونے کی بنا پر وہاں کے دیگر نامی گرامی شاعروں اور ادیبوں سے نیاز حاصل نہ کر پایا
ال تو اس سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ مگر ان کے بعد مجھ کو جن سے خاص ملنے کی تمنا تھی وہ تھے حفیظ
ں اور مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر "زمیندار"۔ اس زمانے میں زمیندار اور لاہور کے ایک آریہ سماج روزنامے کی آپس میں
پ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ دونوں اخبار اشعار ہی میں سوال جواب کیا کرتے تھے۔ مولانا کی ایک نظم کے شعر کا ایک
ہے دانت کی سل پر دے رگڑا۔ اب تک میرے ذہن میں ہے۔ لاہور سے فوراً مجھے دہلی اور آگرہ جانا پڑا۔

ہلی میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے جانشینوں میں جناب سید وحید الدین احمد بیخود صاحب کی خدمت میں حاضر
کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ سماعت بھی کم ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے حاضر ہونے کا
یا تو آپ نے فرمایا۔ دیکھیے اس وقت کچھ لکھ نہیں سکتا۔ میں اپنے اشعار لکھاتا ہوں آپ لکھ لیں۔ اور میں نے آپ کے
ہوئے اشعار اپنی آٹو گراف بک میں لکھے۔ بعد میں آپ نے قلم کو اپنے دائیں پاؤں کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان رکھ
ں کوشش کے ساتھ اشعار کے نیچے دستخط کر دیے۔ اس وقت آپ سفید ململ کا کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر لال ترکی

ٹوپی تھی اور تہبند باندھے ہوئے تھے۔ آپ نے مجھے اپنا دیوان "گفتار بیخود" عنایت فرمایا۔ یاد ش بخیر آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ آپ نے کوئن وکٹوریہ Queen Victoria کو اردو کا ٹیوشن دیا تھا اور خط بھی مجھے دکھایا۔ لفافے پر کوئین کے نام کی مہر تھی۔ پتے پر صرف اتنا ہی لکھا تھا۔ "منشی بیخود۔ انڈیا۔ اور وہ خط انھیں برابر مل گیا تھا۔ اس ملاقات کے تھوڑے عرصے بعد میں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ان کا کلام انھیں کی زبانی سنا۔ اس غزل کا ایک مصرع یاد آرہا ہے:

ستم کی کہانی ہے اے بندہ پرور نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سن سکو گے

جب میرا آگرے جانا ہوا تو جناب سیماب اکبر آبادی صاحب سے ملاقات کی۔ آپ اس وقت "شاعر" رسالے کے لیے کچھ مضمون لکھ رہے تھے۔ ویسے انھیں بمبئی کے مشاعرے میں سن چکا تھا۔ مختصر تعارف کے بعد آپ نے بھی اشعار لکھ کر آٹو گراف دیے۔ آپ کے کئی مجموعۂ کلام شائع ہو چکے تھے۔ ہندوستان کے صف اول کے شعرا میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے عالم شخص تھے۔ "شاعر" کی معرفت آپ نے اردو ادب کی خاص خدمت کی۔ اس وقت ان کی غزل کا ایک مطلع یاد آرہا ہے:

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

جب بھی آگرے کا نام آتا ہے۔ تاج محل کے بعد مجھے نظیر اکبر آبادی اور سیماب اکبر آبادی یاد آجاتے ہیں۔ سیماب بڑے خود دار شخص تھے۔ ان کے متعلق سنا تھا کہ بمبئی کے کسی مشاعرے میں انھیں مدعو کیا گیا تھا۔ جب آپ بمبئی سنٹرل اسٹیشن پہنچے اور دیکھا کوئی انھیں لینے نہیں آیا ہے، واپس آگرہ لوٹ گئے تھے۔ علامہ اقبال کی وفات پر آپ نے لکھا تھا کہ "میرا ایک ہم سخن اور ہم پلہ شاعر دنیا سے اٹھ گیا۔"

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ۱۹۴۰ء میں ہندوستان کا دورہ شروع کیا تھا جو تقریباً ۱۹۵۲ء تک جاری رہا۔ اس طویل عرصے میں مندرجہ بالا شہروں کے علاوہ الہ آباد، کانپور، بھوپال، دہلی، آگرہ، ناگپور، وغیرہ شہروں میں بھی جانا ہوتا تھا اور اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی شام کو وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی خدمت میں پہنچ جاتا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں جب پہلی بار الہ آباد گیا تب ہمارے ایک گاہک، اسرار کریمی پریس کے حاجی صاحب سے معلوم ہوا کہ جناب نوح ناروی صاحب کسی عزیز کے ہاں شادی میں الہ آباد تشریف لائے ہیں۔ میں نے ان سے پتہ حاصل کیا اور شام کو جا کر ملاقات کی۔ اپنا تعارف کرایا۔ بمبئی کے مشاعرے کا بھی ذکر کیا۔ غالباً ۱۹۳۳ء کا سال تھا۔ بمبئی میں ٹاؤن ہال میں ایک بہت ہی شاندار اور یادگار مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں خاص طور پر حضرت داغ دہلوی ہی کے شاگرد مدعو کیے گئے تھے۔ مثلاً مولانا احسن مارہروی، سیماب اکبر آبادی، نوح ناروی، ناطق گلاؤٹھی وغیرہ۔ یہ جانشین داغ اپنے شاگردوں کے ساتھ آئے تھے۔ مولانا احسن مارہروی کو مشاعرے کا صدر بنایا گیا تھا۔ طرحی مشاعرہ تھا۔ دو مصرعۂ طرح دیے گئے تھے۔ (۱) "دیوانہ مری رائے میں دیوانہ نہیں ہے۔" (۲) مرا دل توڑتے ہو میرے دل کا آسرا ہو کر۔ طرحی غزلوں کے بعد غیر طرحی دور شروع ہوا۔ شاگرد سیماب، ساغر نظامی نے نظم اور شاگرد نوح ناروی، بسمل الہ آبادی نے اپنی غزل سے مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔ ساغر نے "بھکارن" نظم اپنے خاص ترنم سے سنائی تھی اور بسمل نے ایک لمبی بحر کی غزل اپنے خاص انداز اور ترنم سے سنائی تھی۔ اس غزل کا مقطع مجھے اب بھی یاد ہے:

ہے نوح نسبت بسمل کی طوفانِ سخن سے ڈر کیسا؟
ہر بزم میں غزلیں پڑھتے ہیں، ہر بحر میں غزلیں کہتے ہیں

میری درخواست پر حضرت نوح ناروی نے کمال شفقت سے اپنے آٹو گراف دیے۔

۱۹۵۶ء میں جب میرا دوسری بار الہ آباد جانا ہوا تب میں نے فراق گورکھپوری اور بسمل الہ آبادی سے ملاقات کی۔ اسٹیشن سے شہر میں جاتے وقت ایک مکان پر نظر پڑی تھی۔ بسمل الہ آبادی کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اسی روز اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی میں سب سے پہلے جناب عشرت حسین اکبر الہ آبادی کے ہاں اور بعد میں جناب فراق گورکھپوری کے پاس گیا۔

دوسرے روز بسمل صاحب سے ملا۔ آپ یہاں کی میونسپل آفس میں ملازم تھے۔ اور وہاں سے گھر آرہے تھے۔ سلام علیک کے بعد تعارف کے دوران بمبئی کے مشاعرے کا بھی ذکر کیا۔ خوش ہوئے آٹو گراف لکھ کر کہنے لگے۔ چلیے میں آپ کو یہاں کے تاریخی باغ کی سیر کراؤں۔ اس وقت بسمل صاحب نے کہا کہ یہاں کے امرود ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ اور اکبر آبادی کا یہ شعر سنایا:

ہیں الہ آباد میں سامان کیا بہبود کے
کیا دھرا ہے یہاں بجز اکبر کے اور امرود کے

۴۳۔۲۔۱۷ کو بمبئی میں ایک بہت ہی اعلیٰ پیمانے پر آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ جس میں ملک کے نامور شعرا مدعو کیے گئے تھے۔ ان میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، اختر شیرانی، ماہر القادری، پنڈت آنند نرائن ملا اور بیکل اتساہی خاص کشش کے باعث تھے۔ اخباروں میں اس کا خصوصیت کے ساتھ اعلان کیا گیا تھا۔ تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ جوش، جگر، اختر اور ماہر القادری مدینہ ہوٹل (کرافٹ مارکٹ) میں ٹھہرے ہوئے ہیں جو میرے مکان سارنگ اسٹریٹ سے قریب ہی تھی۔ میں ہوٹل پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا ایک بڑے کمرے میں جوش، جگر، اختر اور ماہر بیٹھے ہوئے تھے۔ میز پر کباب اور منے ارغوانی کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ ماہر صاحب کے سوا تینوں حضرات کے ہاتھوں میں گلاس تھے۔ ماہر صاحب نے مجھے پہچان لیا اور کہا تشریف لائیے۔ اور مختصر میرا تعارف کرایا اور آٹو گراف بھی لکھوا دیے۔ آپ نے کتاب کے ورق پلٹ کر فانی بدایونی صاحب کا آٹو گراف دیکھا تو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر چوم لیا اور آنکھوں سے لگالیا۔ دیگر حضرات بھی دیکھتے رہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ماہر صاحب کے دل میں فانی صاحب کی کتنی وقعت اور قدر و قیمت ہے اور آپ ان سے کتنی عقیدت رکھتے ہیں۔ ماہر صاحب نے میرے اور اپنے لیے چائے منگائی۔ اس دوران ان سب کی باتیں سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی۔ رات کو دھوبی تلاؤ رنگ بھون میں مشاعرہ تھا۔ تمام میدان سامعین سے بھر گیا تھا۔ اسٹیج پر ملک کے نامی گرامی شعرا تشریف فرما تھے۔ صدر مشاعرہ پنڈت آنند نرائن ملا تھے۔ میں وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ ماہر صاحب مجھے اسٹیج پر لے گئے۔ شعرا کی صف کے پیچھے مجھے بٹھادیا۔ یکے بعد دیگر شاعر آتے گئے اور سامعین سے داد حاصل کرتے گئے۔ جگر اور بیکل اتساہی ساری محفل پر چھا گئے تھے۔ جوش صاحب اپنے ہوش میں نہ ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل سے دو چار رباعیاں پڑھ سکے۔ جگر کی کیف آور ترنم ریز غزلوں اور بیکل کی نظموں نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔ رات کے ڈھائی بجے مشاعرہ ختم ہوا تھا۔ ایسا مشاعرہ بمبئی میں پھر کبھی دیکھنا اور سننا نصیب نہیں ہوا۔ ویسے مشاعرے تو اب بھی ہر جگہ ہوتے ہی رہتے ہیں مگر اب نہ اس معیار کے شعرا ہیں اور نہ اب ویسی فضا ہے۔

۱۹۵۲-۵۳ء میں خاکسار کی کوشش سے راندیر میں خانقاہ رفاعیہ کے میدان میں دو یادگار مشاعرے ہوئے تھے۔ جن میں اس زمانے کے نامی گرامی مشہور شعرا میں سے حضرت جگر مرادآبادی، بہزاد لکھنوی، ساغر نظامی، سرتاج رحمانی، شعری بھوپالی، نظر سیوہاروی، شبیل بدایونی، صبا افغانی، حیدر دہلوی، محتسب، کنور مہندر سنگھ بیدی مدعو کیے گئے تھے۔ راندیر کے سوا گجرات بھر میں مشاعرے کبھی ہوتے نہیں۔ راندیر کے مشاعروں میں حضرت جگر مرادآبادی نے

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

سنائی۔ اس غزل کے علاوہ اور بھی ایک غزل عنایت فرمائی تھی۔ بہزاد صاحب نے: "منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے۔" اپنے خاص ترنم میں سنائی۔ ساغر نظامی نے ایک غزل ترنم میں اور ایک نظم کے چند بند سنائے تھے۔ شبیل کی غزل کا مطلع تھا:

ہنگامۂ غم سے تنگ آکر اظہارِ مسرت کر بیٹھے

مشہور تھی اپنی زندہ دلی، دانستہ شرارت کر بیٹھے

صبا افغانی کی غزل کا مطلع تھا:

راز ہے بہت گہرا، بات اک ذرا سی ہے
وہ ہیں سامنے پھر بھی چشم شوق پیاسی ہے

اور شعری بھوپالی نے یہ غزل سنائی:

الٰہی جستجو نے دل کا یہ انجام ہوجائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہوجائے

اور اس شعر پر سامعین تو خیر، شعرا نے بھی خوب داد دی تھی:

ابھی تو دل میں اک ہلکی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے، کل اس کا محبت نام ہوجائے

اس مشاعرے کے نقیب جناب ناچیز راندیری صاحب اور صدر حضرت مولانا سید ظہور الحسن فنانونکی صاحب تھے جن کی بدولت راندیر میں برسوں شعر و شاعری کی گرم بازاری رہی۔ آپ کے انتقال کے بعد راندیر میں شعر و ادب کی فضا معدوم ہوگئی۔ اردو شاعری ہماری روزمرہ زندگی میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ شادی و غم کا کوئی بھی موضوع ہو اردو شاعری کو اظہار کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی شیرینی اور حلاوت سے دوست، دشمن سبھی فیض پاتے ہیں۔ اب مشاعرے خواص کے دربار سے نکل کے عوام کی محفلوں میں آگئے ہیں۔ مشاعروں میں شعرا کا انتخاب ترنم اور اداکاری کے مدنظر اور مشاعروں میں شعرا کے دوش بدوش شاعرات کی شرکت۔۔۔

آٹوگراف:۔

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

فراق گورکھپوری
۲۵ ستمبر ۱۹۰۱ء

اس مست قوالی نے ہر جیب
[illegible] شراب خانہ

[illegible]
27/5/[illegible]

[illegible] میں سروجنی نائیڈو [illegible] کر رہی تھیں۔ ایک بجے قریب بیچ کانگریس کے ممبر
[illegible] قریب پہنچ گئے۔ ان کے علاوہ [illegible] سات ہزار کے قریب لوگ شریک تھے جن کے داخلے کا ٹکٹ ایک روپے
[illegible] تھا۔ لوگ تمام درجہ بدرجہ سب کے سب [illegible] پر جو ترتیب سے بچھائی گئی تھیں۔ [illegible] آلۂ مکبر الصوت
نصب تھے۔ [illegible] کے لٹ چک رہی تھیں۔ صدر جلسہ مولانا آزاد کے آتے ہی کارروائی کا آغاز ہوا۔ سب
[illegible] کے بعد اسٹیج پر میکروفون کے سامنے کھڑے "بندے ماترم" کے چند بند پڑھے۔ اور مولانا آزاد نے اپنے مخصوص ان
میں صدارتی تقریر کی اور کہا کہ "ایک عرصے کے بعد ہم بھائی بہنیں یہاں برطانوی سامراج کی راجدھانی دلی میں بابو سبھاش کے زمانۂ صدار
میں اکٹھے ہوئے ہیں تاکہ بعض اہم معاملات ہماری بیٹھکوں میں طے پا جائیں۔ اب میں کارروائی شروع کرتا ہوں اور سب سے پہلے مجھے ڈ
کھرے کے معاملات آپ لوگوں کے سامنے لانے ہیں۔ وہ تمام واقعات پارلیمنٹری بورڈ کے اراکین آپ کو بتائیں گے۔ آپ بیٹھے سنتے رہیں ا
غور کریں کہ ڈاکٹر کھرے کے ساتھ جو سلوک ہم نے کیا ہے وہ کہاں تک حق بجانب تھا۔" پھر اس کے بعد کانگریس کے مختلف سربر آو
لوگوں نے کھرے کی مخالفت اور اس کی غلط روش پر جو تنقید و تبصرے شروع کیے اور برا بھلا کہنا شروع کیا تو سارا پنڈال گونج گیا اور سر گ
بھاشے کی خوب نمائش ہوئی۔ بعد میں فیڈریشن پر بحث ہوئی اور سبھوں نے کہا کہ یہ ہندوستان میں نافذ نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوا کہ یہ ظالم
مکار برطانیہ فیڈریشن ہم پر خواہی نخواہی لادنا چاہے تو ہمیں ستیہ گرہ، سول نافرمانی کی پرامن اور ثابت قدم جنگ کے لیے ہمیشہ کے لیے
رہنا چاہیے۔ اس وقت جب کہ ہر شخص مخالفت کر رہا تھا اور پورے جوش سے کر رہا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس اب برطانوی حکومت کے
کو یہ لگل ہی جائیں گے۔ دوسرے دن کے اجلاس میں ڈاکٹر کھرے کے معاملے پر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے مزید روشنی ڈالی۔ اس کے بعد
فیڈریشن پر بحث ہوئی۔ مسٹر بھولا بھائی دیسائی کو مطعون کیا۔ انھوں نے بھی اپنی برات میں ایک مدلل تقریر کی اور پھر راج گوپال اچاریہ
مدراس پر اور ستیامورتی نے دیسی ریاستوں کے جبر و تشدد پر بحث کی اور کہا کہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج پہلی مرتبہ کانگریس کی بیٹھ
میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حیدرآباد کا ذکر آیا ہے۔ لیکن آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس ریاست میں لوگوں کو سیاسی آزادی ا
نہیں ہے۔ برطانیہ کا بھوت اب بھی اسے خوفناک دکھائی دے رہا ہے اور اس کے خوف سے رات دن ہر وقت لرزتی رہتی ہے۔ اس کو
چاہیے کہ اب وکٹن اور اروِن کا سا زمانہ نہیں رہا۔ اب برطانوی شہنشاہیت کی گرفت ڈھیلی ہو رہی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہاں اپنی ر
کو سیاسی آزادی نہ بخشے۔ اس لیے حکومت حیدرآباد، کشمیر، ٹراونکور میں ہم کو دخل دے کر یہ ثابت کرنا چاہیے کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس
برطانوی حکومت سے زیادہ ان معاملات میں دخل دینے کی حق دار ہے۔ اس موضوع پر کملا دیوی چٹوپادھیائے بھی اپنی میٹھی زبان، شیر
انداز اور پر زور لہجے میں دیسی ریاستوں کے جبر و تشدد پر ایک گھنٹے تک تقریر کرتی رہیں اور اس کے بعد ریزولیوشنوں اور ترمیموں پر دو
شماری کر کے بارہ بجے رات کو جلسہ ختم ہو گیا۔

تیسرے دن کا جلسہ نہایت اہم تھا۔ اور بڑا ہی پر زور تھا۔ اس جلسے کے شروع ہونے تک بابو سبھاش بوس کلکتے سے دلی وارد ہو
اور جلسے کی صدارت سنبھالی۔ عوام نے جو اس وقت جلسے میں تھے ان کو دیکھ کر نعرے لگائے اور بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ پھر جلسے
کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے اردو ہندی جھگڑے پر ہنگامہ آرائی شروع ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس
بارے میں بدنام ہو رہی ہے۔ آج کے جلسے میں اسے اپنی زبان کے بارے میں اپنی پالیسی واضح کر دینی چاہیے۔ کانگریس کے دشمن اس چیز
فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہندوستان میں ایک پھوٹ ڈالی جا رہی ہے۔ اور دو تین مقرروں نے بھی یہی کہا۔ اس کے بعد مولانا آزاد اٹھے اور کہ
زبان کے بارے میں آج تیرہ برس سے کانگریس اپنے طرز عمل اور پالیسی کا برابر اظہار کرتی رہی ہے اگر اس پر بھی لوگوں کو شک و شبہ
میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کانگریس نہ تو اردو کی طرف داری کرتی ہے اور نہ ہندی کی بلکہ یہ اس زبان کو اپنی زبان سمجھتی ہے جو یوپی،
اور لاہور میں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ اگر ہندی ہے تو کانگریس کی زبان ہندی ہے اور اگر اردو زبان ہے تو یہی کانگریس
زبان ہے اگر آپ اس زبان کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ اسی جگہ بیٹھے رہیں جہاں آج تین دن سے بیٹھے رہے ہیں [illegible] راجندر پرشاد
سردار ولبھ بھائی پٹیل کی تقریریں سنی ہیں۔ یہی کانگریس کی زبان کا نمونہ ہے۔" پھر اس کے بعد مسلم لیگ کا قصہ شروع ہوا۔ مفتی احمد

نے کانگریس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے مسلم لیگ کے صدر جناح سے گفتگو کرنے کے بجائے کانگریس کے وفادار مسلمانوں اور مسلم کانگریسی ممبروں
کی عام مسلمانوں میں ذلت و تضحیک کی۔ اور یہ رد عمل بھی پیدا ہو نا چاہیے کہ آخر وہ کانگریس کبھی بھی مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں سے [illegible] کرنے کی
گفتگو کر کے اپنی پوزیشن کمزور اور دوسروں کی منصوبہ بندی کرے۔ اور جب سے کانگریس نے جناح سے بات چیت کی ہے مسلم لیگ اپنے کو
طاقتور تصور کرتی ہے اور مسلمانوں کو کانگریس پر نکتہ چینی کرنے کا بہترین موقع دے دیا ہے۔ اس پر مولانا آزاد نے جذبات پر جوش اور پر
اثر انداز میں اپنی تقریر، منشی احمد دین کی مخالفت میں شروع کی اور کہا کہ "منشی احمد دین نے جو تجویز آپ کے سامنے ابھی ابھی پیش کی ہے
اور دوسرے ایک نے اس کی تائید بھی کی ہے افسوس ہے کہ میں اس تجویز پر مبارکباد نہیں دے سکتا۔ کانگریس نے لیگ سے بات چیت کر کے
کچھ کھویا نہیں بلکہ پایا ہے۔ ہم جس زمین پر کھڑے ہیں وہ مضبوط ہے اور ہمارے جو اصول و آئین ہیں ان سے ہم بال برابر بھی نہیں ہٹے۔ ہم
کو اپنے مسلم بھائیوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے اور باہمی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا چاہیے۔ یہ مجھ کو
معلوم ہے کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے موقع پر گاندھی جی نے جناح کے آگے سادہ کاغذ اپنے دستخط کر کے ڈال دیا تھا تاکہ وہ جو کچھ
حقوق چاہتے ہیں اس پر لکھ دیں وہ انھیں اپنی طاقت سے کانگریس کی اعلیٰ کمان سے منوا لیں گے۔ مسٹر جناح نے ۱۴ نکات لکھ دیے۔ گاندھی جی
نے کہا اب ایک شرط اور ہے کہ جب میں مکمل آزادی کا مطالبہ کروں گا تو آپ میرا ساتھ دیں گے؟ اس پر مسٹر جناح نے انکار کر دیا جس سے ہم
سبھوں کو سخت قلق ہوا لیکن اب بھی ہم اپنے تکمیل مقصد کے لیے ان سے سمجھوتہ کریں گے ان کے گھر پر ایک نہیں سو مرتبہ جائیں گے اس
سے ہماری بڑائی اور طاقت میں رتی برابر کا فرق نہیں آئے گا۔ پس آپ سے میں درخواست کرتا ہوں کہ منشی احمد دین کی تجویز کو پاس ہونے
نہ دیں۔" اس کے بعد مولانا کی تائید میں ولبھ بھائی پٹیل نے آدھے گھنٹے تک تقریر کی۔ اس کے بعد دوسروں نے بھی کہا۔ بہرحال منشی احمد دین
کی تجویز گر گئی۔ اس روز جلسہ کوئی رات کے دو بجے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ میری آرزو جی بھر کے نکل گئی اور خوب سماں دیکھا۔ مقررین
میں دت مزم دار، پروفیسر رنگا، کملا چٹوپادھیائے، احمد دین، ڈاکٹر اشرف، مولانا حفظ الرحمن، مولانا آزاد، بھولا بھائی ڈیسائی، [illegible]
راجندر پرشاد، غضب کے بولنے والے ہیں۔ راج گوپال چاری اور ستیا مورتی اور بھولا بھائی ڈیسائی کی انگریزی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مولانا
آزاد کانگریس کے لیڈروں میں خوب پوجے جاتے ہیں۔ ہر کوئی بڑے ادب و احترام سے انھیں دیکھتا اور بڑا اثر رکھتے ہیں جس تجویز، جس
ترمیم کو چاہیں دو منٹ کی تقریر میں گرا دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ کانگریس کا یہ دنگل خوب اچھی طرح دیکھنے میں آیا۔

(۱۹۳۸ء میں لکھے ہوئے خط کا اقتباس)

(۱۱) محمد پکتھال خیریت آباد میں رہتے تھے۔ ان کا قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی زبان میں بہت معروف ہے۔ مسجد خیریت آباد نماز کے لیے
آتے تھے۔ وہیں محمد پکتھال سے ملاقات ہوئی۔ میں طالب علم تھا اس حیثیت سے میرا تعارف ہوا۔ میں ان کے بنگلے پر بھی جانے لگا۔ جب میں
جاتا تو وہ پوچھتے، کچھ چاہیے؟ میں خاموش کھڑا رہتا۔ وہ سمجھ جاتے اور اوپر بنگلے پر جا کر مٹھی میں رقم (سکے) لا کر دیتے۔ ہر مہینے یہ سلسلہ چلتا رہا۔
مٹھی میں جتنے بھی سکے آ جاتے مجھے دے دیتے۔ اوپر بنگلے پر کھڑی ان کی انگریز بیوی دیکھتی رہتیں۔ ان کے کوئی اولاد نہیں۔ کوئی رشتہ دار
مسلم نہیں تھا۔ ان کے احسان کا بدلہ تو میں چکا نہیں سکتا لیکن ان کے انتقال کے بعد سے ہر سال بقر عید میں ان کے نام سے قربانی پابندی سے
ضرور دیتا ہوں۔ کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ کبھی اپنے نام سے قربانی نہ دے سکا تو ان کے نام سے قربانی ضرور دیتا ہوں۔ محمد مارماڈیوک پکتھال
انگلستان میں ۷/ اپریل ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹/ مئی ۱۹۳۶ء لندن میں وفات پائی۔ ان کے ایصال ثواب کے لیے مسجد خیریت آباد میں
بعد نماز عصر ختم قرآن ہوا۔ مہاراجہ کشن پرشاد، نواب نظامت جنگ اور دوسرے عہدہ دار، امرا شریک ہوئے۔ مہاراجہ بہادر تا ختم قرآن
مسجد میں تشریف فرما رہے۔ حیدرآباد میں وہ بیک وقت چار عہدوں پر فائز رہے۔ صاحب زادہ نواب معظم جاہ کے اتالیق بھی تھے اور ناظم
اطلاعات حیدرآباد بھی۔ پرنسپل چادر گھاٹ ہائی اسکول کے علاوہ حیدرآباد سول سروس ہاؤس کے مہتمم اور نگران بھی تھے۔ پکتھال مرحوم کی
سوانح عمری "اینی فری منٹل" کی مؤلفہ میرے پاس ہے۔ جب یہ شائع ہوئی تھی تو ماہ نامہ [illegible] انڈیا میں اس پر تبصرہ پڑھ کر حیدرآباد، بک ڈپو سے
اسے منگوایا [illegible] طرف سے خیال
ہٹ گیا [illegible]

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

شمس العلماء عزیز جنگ بہادر ولا کی قدر افزائی

سالار جنگ اول کی مدار المہامی کے زمانے (۱۸۵۳ء - ۱۸۸۳ء) میں بیرون ریاست سے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی جن باکمال شخصیتوں کو سابق ریاست حیدرآباد میں خدمات انجام دینے کے لیے دعوت دی گئی تھی ان میں یو۔پی، دہلی اور شمالی ہند کے دیگر علاقوں سے آنے والی شخصیتوں کی تعداد بلاشبہ بہت زیادہ تھی لیکن جنوبی ہند سے بھی کئی ممتاز شخصیتوں کو حیدرآباد آنے کی ترغیب دی گئی تھی چنانچہ مدراس اور جنوبی ہند کے دیگر علاقوں سے بھی کئی ہنرمند اور صاحبان علم و فضل حیدرآباد آئے اور ان کے خاندان اس ریاست میں آباد ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کو سنگم کہا جانے لگا اور حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب تشکیل پائی۔ مدراس سے ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد آنے والوں میں عزیز جنگ بہادر کے والد مولوی نظام الدین احمد بھی شامل تھے۔ عزیز جنگ بہادر کا خاندان حیدرآباد کے نامی گرامی خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس خاندان کے نمائندہ سربرآوردہ اصحاب میں دین یار جنگ بہادر، رکن الدین احمد اور ڈاکٹر حسن الدین احمد، آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ) شامل ہیں۔

عزیز جنگ بہادر (احمد عبدالعزیز) ۲۸ / ستمبر کو نیلور (صوبہ مدراس) میں پیدا ہوئے۔ ان کا مدراس کے ایک معزز اور ممتاز علمی نائطہ گھرانے سے تعلق تھا۔ جب ان کی عمر نو سال تھی تو وہ اپنے والد کے ساتھ جنھیں سالار جنگ اول مدارالمہام نے طلب کیا تھا حیدرآباد آئے۔ عزیز جنگ کا ابتدائی تقرر عدالت دیوانی خورد میں ایک معمولی خدمت پر ہوا لیکن محنت، دلچسپی اور دیانت داری سے کام کرنے کے باعث وہ ترقیاں پاتے رہے اور اول تعلقدار ضلع میدک کی خدمت سے وظیفے پر علاحدہ ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے پائے گاہ نواب سر وقار الامرا میں معتمد، صدر محکمہ، صدر تعلقدار اور میر مجلس علاقہ ممدوح کے عہدوں پر سات سال تک خدمات انجام دیں۔ وہ دو سال مجلس وضع قوانین اور پندرہ سال مجلس بلدیہ کے رکن رہے۔ نیز وہ ایک سال نائب میر مجلس کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ یوں تو انھوں نے ملازمت کے دوران ہی تالیف و تصنیف کے کام کا آغاز کر دیا تھا مگر ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد انھوں نے اپنا سارا وقت اور توانائیاں تالیف و تصنیف کی نذر کر دیں۔ وہ شاعر، ادیب، محقق اور مورخ تھے۔ انھوں نے جتنے مختلف النوع موضوعات پر علمی، ادبی اور تحقیقی کام کیا ہے اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ انھوں نے اپنے پیچھے علمی، ادبی، اور تحقیقی کام کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہی نہیں بلکہ ایک علمی خزانہ تھے۔ فارسی شاعری اور اردو شاعری کے کلیات عزیز بہادر جنگ ولا کے تخلیقی کارنامے ہیں۔ ان کی مرتب کردہ فارسی لغت آصف اللغات (۷ جلدیں) ان کا ایک نہایت علمی اور تحقیقی کام ہے۔ ان کی مرتب کردہ احکام و قوانین مالگزاری کی کئی جلدیں، احکام صلیات کی کئی جلدیں، خزینہ لیناس و حساب، مصطلحات دکن، سیاق دکن، تقسیم اندوختہ اور ایسی ہی کئی دیگر تالیفات عہد و حال کے دکن اور سابق ریاست حیدرآباد کے نظم و نسق کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے آج بے حد سود مند اور مددگار ہیں۔ علمی

وہ تحقیقی کارناموں کے صلے اور قدردانی میں انھیں حکومت ہند کی جانب سے شمس العلما اور حکومت ریاست حیدرآباد کی جانب سے عزیز جنگ بہادر کے خطابات دیے گئے تھے۔

عزیز جنگ ولا کو آصف اللغات کی ہر جلد پر سابق حکومت ریاست حیدرآباد کی جانب سے پانچ سو روپے بطور انعام منظور کیے بعد ازاں اس رقم میں دو سو اسی روپے کا اضافہ کیا گیا۔ اسی طرح آصف اللغات کی ہر جلد پر ابتدائی تاریخ منظوری سے سات سو اسی روپے بطور انعام دیے گئے۔ عزیز جنگ بہادر کو ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ان کی گراں قدر علمی تصانیف کی قدردانی میں ماہانہ سو پچاس روپے (۲۵۰) ماہانہ الاؤنس مقرر کیا گیا تھا اس کے علاوہ ان کے ایک فرزند کے نام پچاس روپے تعلیمی وظیفہ جاری تھا اسی ان کے چھوٹے فرزند رکن الدین احمد کے نام اکیس سالہ عمر تک جاری کرنے کے احکام بھی صادر کیے گئے تھے۔ عزیز جنگ بہادر کی قدردانی سے متعلق سرکاری کارروائیاں مسلوں (Files) کی شکل میں آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ریکارڈ ذخائر میں موجود ہیں۔ ان مسلوں کے مطالعے اور تجزیے کے بعد ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

آصف اللغات کی جلد اول شائع ہونے پر عزیز جنگ بہادر نے اس کا ایک نسخہ داخل کرتے ہوئے حکومت ریاست حیدرآباد اپنی درخواست میں لکھا کہ ان کی اس جدید تالیف "آصف اللغات" کی جلد اول کے لیے گورنر جنرل ہند نے ان کے نام پانچ سو روپے انعام منظور کیا۔ اس کے علاوہ عزیز جنگ بہادر کو یہ اطلاع بھی دی گئی کہ حکومت ہند اگر مطمئن ہو جائے کہ کام استقلال کے ساتھ ہو ایسی صورت میں آئندہ شائع ہونے والی ہر جلد کے لیے پانچ سو روپے کا عطیہ دیا جائے گا اور اگر عزیز جنگ بہادر آئندہ کسی وجہ سے اس کو مدون نہ کر سکیں تو حکومت مذکور کو کسی وقت بھی عطیہ موقوف کرنے کا اختیار ہوگا نیز عزیز جنگ بہادر کو ہر جلد کی پچاس کاپیاں دا ہوں گی۔ عزیز جنگ بہادر نے حکومت ہند سے مذکورہ بالا عطیے کی منظوری کا تذکرہ کرتے ہوئے استدعا کی کہ ان کے ذاتی و آبائی حقوق سے آصف اللغات کی جو جلد تیار ہو جاتی ہے اس تالیف کے صلے میں ان کو حکومت حیدرآباد کی جانب سے ایک خاص انعام دیا جائے حکومت اس انعام کے عوض میں ان کی طرف سے چند نسخے قبول کرے۔ انھوں نے یہ بھی تحریر کیا کہ وہ آصف اللغات کو اٹھائیس (۲۸ میں مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اکبر حیدری، معتمد فینانس نے عزیز جنگ بہادر کی درخواست پر رائے دی کہ حکومت کی جانب سے عزیز جنگ بہادر کو ایک تنخواہ چالیس روپے ماہانہ دینا مناسب ہے بشرطیکہ اس کے معاوضے میں وہ ہر شائع شدہ جلد کی پچیس (۲۵) کاپیاں داخل کریں اور ہر کم ایک جلد شائع ہوا کرے۔ کیاسن واکر، معین المہام فینانس نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا کہ چوں کہ حکومت ہند نے فی جلد پانچ عطیہ دینے کا وعدہ کیا ہے لہٰذا اس حکومت کی تقلید میں حکومت حیدرآباد بھی پانچ سو روپے کا انعام ہر جلد کے صلے میں ان ہی شرائط منظور کر سکتی ہے مگر ان شرائط میں ایک ترمیم کی جائے کہ حکومت حیدرآباد کے لیے پچاس جلدوں کی بجائے پچیس جلدیں داخل کر

مہاراجہ کشن پرشاد مدار المہام نے معین المہام فینانس کی رائے سے اتفاق کیا اور اپنے معروضے مورخہ ۱۲/ رجب ۱۳۲۴ھ جولائی ۱۹۰۶ء میں عزیز جنگ بہادر کی درخواست کا خلاصہ اور ان کی درخواست پر معتمد معین المہام فینانس اور اپنی رائے لکھ کر آ سلاطین نواب میر محبوب علی خان کے ملاحظے کے لیے پیش کیا۔ آصف سادس نے مدار المہام اور معین المہام فینانس کی تجویز سے اتفاق

ے میں جو فرمان مورخہ ۱۵/ شعبان ۱۳۳۱ھ م ۲۰/ اگست ۱۹۱۳ء کو جاری ہوا اس کا متن درج ذیل ہے:
"آپ کی اور جسٹس واکر کی رائے معروضہ ۲۲ / رجب ۱۳۳۱ھ کے مطابق عزیز جنگ بہادر کو آصف اللغات کی تصنیف کے لیے فی جلد
سو روپے انعام انھیں شروط سے دیا جائے جن شروط سے گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کو انعام دینے کی خواہش ظاہر کی ہے مگر انعام کے
ضے میں ہر جلد کی ۵۰ کاپی کے عوض ۱۵۰ کاپی ان سے لینا کافی ہوگا۔"
مذکورہ بالا احکام کی تعمیل میں آصف اللغات کی ہر جلد کے شائع ہونے پر عزیز جنگ بہادر کو حکومت حیدرآباد کی جانب سے پانچ پانچ
روپے ادا کیے جارہے تھے کہ عزیز جنگ بہادر نے ایک اور درخواست پیش کی جس میں انھوں نے لکھا کہ لغت کی ہر جلد کے ۵۰۰ نسخے طبع
رہے ہیں۔ طباعت کے حقیقی مصارف ایک ہزار چار سو ساٹھ روپے ہیں اور جو امداد ہر دو حکومتوں سے مل رہی ہے اس کی مجموعی رقم
ہزار ایک سو اسی روپے ہے جو مصارف سے دو سو اسی روپے کم ہے۔ یہ رقم وہ اپنی جیب سے ادا کر رہے ہیں۔ لغت کی فروخت سے بھی
کے نقصان کی پابجائی ممکن نہیں ہے کیوں کہ ۵۰۰ مطبوعہ نسخوں کے منجملہ ۲۵۳ نسخے حکومت اور کتب خانوں کو بطور ہدیہ دیے جاتے ہیں
باقیہ ۲۷ نسخے بھی علم دوست حضرات کی نذر کر دیے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی استدعا ہے کہ ان کی محنت اور لغت کے محاسن کو پیش نظر
رکھتے ہوئے تاریخ محبوب السلاطین کے مصنف مولوی عبد الجبار خاں کی طرح جنھیں کتاب مذکور کی ہر جلد کی طباعت کے لیے جو دو ہزار روپے
دیے جاتے ہیں انھیں بھی دیے جائیں۔
عزیز جنگ بہادر کی اس درخواست پر معین المہام فینانس نے لکھا کہ مولوی عبد الجبار خاں کو تاریخ دکن کے صلے میں فی جلد دو ہزار
روپے کی جو امداد دی جاتی ہے اس کی صورت علاحدہ ہے۔ وہ تاریخ کی ایک کتاب تصنیف کر رہے ہیں جو اس ریاست کے لیے مفید ہے۔ اس
کے علاوہ جز معاش ہونے کی وجہ سے ان کے لیے اس کتاب کا اپنی ذات سے طبع کرانا ممکن نہ تھا۔ عزیز جنگ بہادر کی بات مختلف ہے۔ ان
کے پاس ذاتی پریس ہے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں اور یہ کتابیں بڑے پیمانے پر عوام میں اچھی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں
اس لیے معین المہام فینانس نے رائے دی کہ عزیز جنگ بہادر کو جو انعام دیا جاتا ہے اس میں دو سو اسی روپے فی جلد اضافہ کیا جائے تو کافی ہے
کیوں کہ اس سے حقیقی اخراجات کا تکملہ ہو جاتا ہے۔ اب تک جتنی جلدیں شائع ہوگئی ہیں ان کے تکملے کے لیے بھی فی جلد اتنی ہی رقم دی جائے
سالار جنگ سوم مدار المہام نے عرض داشت مورخہ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ م ۱۱/ نومبر ۱۹۱۲ء میں مذکورہ بالا تفصیلات درج کرتے ہوئے لکھا کہ انھیں
معین المہام فینانس کی رائے سے اتفاق ہے اور یہ عرض داشت آصف سابع کے ملاحظے کے لیے پیش کی جس پر آصف سابع کا حسب ذیل فرمان
مورخہ ۸/ صفر ۱۳۳۱ھ م ۱۶/ جنوری ۱۹۱۳ء کو صادر ہوا۔
"عزیز جنگ بہادر کو کتاب آصف اللغات کی تصنیف کے لیے فی جلد انعام رقمی پانچ سو روپیہ جو دیا گیا اور آئندہ دیا جائے گا اس میں
تمھاری و معین المہام فینانس کی رائے معروضہ یکم ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ کے مطابق دو سو اسی روپے فی جلد اضافہ کیا جائے۔"
جب عزیز جنگ بہادر سرکاری خدمت اور پائیگاہ کی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد مالی مشکلات سے دوچار ہوئے تو انھوں نے
ایک خاص وظیفے اور مالی امداد کی اجرائی کے لیے ایک درخواست پیش کی۔ اس درخواست میں انھوں نے اپنی ۱۴ قانونی تالیفات کے علاوہ دیگر
فنون جیسے سیاق، عمل، طیور، تاریخ اور ملازمت میں اپنی تالیفات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ انھیں حکومت حیدرآباد سے چار سو روپے

(۲۰۰) ماہانہ اور علاقہ پائیگاہ نے ایک سو پچاس روپے (۱۵۰) وظیفہ ان کی ۳۴ سالہ ملازمت کے صلے میں ملتا ہے۔ ان کی ۳۴ سالہ ملازمت سال ملازمت کے مماثل ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں صبح کے ۹ بجے سے رات کے ۱۰ بجے تک کام کیا اور نہایت اور عیڑھے کام انجام دیے۔

اپنی مالی مشکلات کے سلسلے میں انھوں نے لکھا کہ ملازمت کی جائز آمدنی اور ان کی قانونی تالیفات سے حاصل ہونے والے منافع سے اپنے لیے ایک مکان ہی مہیا کر سکے ہیں۔ اب ان کی عمر ۷۰ سال ہو چکی ہے لیکن آرام اور سکون کے ساتھ زندگی گزارنے ان کے اور ان کے خاندان کے پاس آمدنی میں اضافہ کا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ اپنی مشکلات کا اظہار کرنے کے بعد انھوں نے استدعا کی کہ ان کی علمی خدمات صلے میں جس کا سلسلہ ان کی حیات تک ہے کوئی خاص وظیفہ منظور کیا جائے اور ان کے افراد خاندان کے لیے بھی اعانت کی کوئی صورت جائے جو ان پر واجب ہے۔

عزیز جنگ بہادر نے اپنی درخواست کے ساتھ عماد الملک بہادر اور معین المہام امور مذہبی و صدر الصدور (مولوی محمد انو خاں صاحب) کے سرٹیفکیٹ منسلک کیے تھے۔ عماد الملک بہادر نے اپنے سرٹیفکیٹ میں سرکاری ملازمت کے زمانے میں عزیز جنگ بہ دیانت، امانت، بے غرضی اور محنت کا اچھے الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کی علمی تالیفات سے ملک کو فائدہ پہنچا ہے مگر عماد نے اس امر پر اظہار افسوس کیا تھا کہ عزیز جنگ بہادر فکر اہل و عیال سے مستغنی نہیں ہیں جب کہ کم دیانت دار عہدہ دار آخر عمر میں پانے کے بعد مستغنی ہوا کرتا ہے۔ معین المہام امور مذہبی نے لکھا کہ ان کی قومی خدمات اور علمی مشاغل سے حیدرآباد کے عوام کو بے پہنچا ہے اس لیے ان کی خدمات کی قدر کی جانی چاہیے۔ معین المہام عدالت و طبابت (نواب فخر الملک بہادر) نے عزیز جنگ بہادر کی در پر پرزور الفاظ میں سفارش کرتے ہوئے لکھا کہ جن مالی مشکلات کا عزیز جنگ نے اظہار کیا ہے اس پر انھیں یقین ہے کیوں کہ عز اپنے زمانۂ ملازمت میں متدین عہدیدار رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ آج اپنی مشکلات کے اظہار پر مجبور ہوئے ہیں۔ نواب فخر الملک نے تجویز پیش کی کہ عزیز جنگ بہادر کو تاحیات چار سو ماہوار اور ان کے ایک فرزند کو بائیس سالہ عمر تک پچاس روپے اسکالر شپ لڑکیوں کی شادی کے لیے پندرہ ہزار روپے عطا ہونے چاہئیں۔ آر۔ گلنسی، معین المہام فینانس نے عزیز جنگ بہادر کی مالی امداد میں اپنی رائے تحریر کی کہ جہاں تک عزیز جنگ بہادر کی سرکاری خدمات کا تعلق ہے اس کے صلے میں وہ وظیفہ پا رہے ہیں جس کی نسبت جاتا ہے کہ وہ ایک متدین عہدہ دار کا وظیفہ ہے۔ ایسے وظیفہ یاب کو کوئی اور مزید مالی امداد محض اس وجہ سے نہیں دی جا سکتی کہ زمانۂ ملازمت میں متدین رہا ہے۔ عزیز جنگ بہادر کو لغت کی تالیف کے سلسلے میں متعدد بار مالی امداد حکومت حیدرآباد اور گورنمنٹ انڈیا سے مل رہی ہے۔ ان کو قانونی تالیفات سے بھی بہت کچھ آمدنی ہے۔ اس سلسلے میں جو تحریکات پیش ہوئی ہیں وہ بہت مسرفانہ ہے کسی خاص مالی امداد کی سفارش کرنا دشوار ہے۔ اگر آصف سابع کا منشا ہے کہ ان کی کچھ نہ کچھ امداد کی جائے تو ان کے تاریخی کام کی قدر طور پر انھیں ماہانہ دو سو روپے کا الاؤنس عطا فرمایا جائے۔ عزیز جنگ بہادر کی درخواست کا خلاصہ اور منذکرۂ بالا سفارشات کو ایک داشت مورخہ ۸/ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ م ۱۳/ فروری ۱۹۱۶ء میں درج کر کے اسے آصف سابع کے ملاحظہ اور احکام کے لیے پیش کیا گیا۔

آصف سابع نے عرض داشت میں درج کردہ سفارشات کا بغور جائزہ لینے کے بعد عزیز جنگ بہادر کو امداد جاری کرنے کے

درمیانی صورت نکالی اور جس روز عرض داشت پیش کی گئی تھی اسی روز آصف سابع کا حسب ذیل فرمان صادر ہوا۔

"عزیز جنگ بہادر کے نام تا حیات خاص طور سے دو سو پچاس روپے ماہانہ کا الاؤنس محرم ۱۳۳۴ھ سے جاری کیا جائے اور ان کی تصانیف کثیرہ کی قدر دانی کے طور پر یہ بھی مزید رعایت ہو جائیں مناسب سمجھتا ہوں کہ عزیز جنگ بہادر کے ایک فرزند کے نام جو وظیفہ تعلیمی ۵۰ روپے ماہانہ کا جاری ہے اس کی مدت ختم ہونے کے بعد ان کے چھوٹے فرزند رکن الدین احمد کے نام ۲۱ سالہ عمر تک جاری کر دیا جائے۔"

مندرجہ بالا کارروائیوں کے خلاصے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اہم علمی و تحقیقی تالیف کی تکمیل اور ایک اعلیٰ پایہ کی علمی شخصیت کی قدر افزائی میں سابق ریاست حیدرآباد کا رویہ کتنا مثبت، معقول اور مستحسن تھا۔

ماخذ

اس مضمون کی تیاری میں آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹیٹوٹ کی حسب ذیل مسلوں (files) سے استفادہ کیا گیا۔

1- Intalment No. 78, List NO., 368

مقدمہ:- تقرر محرر برائے نواب عزیز جنگ بہادر بصلہ تالیف کتاب

2- Instalment No. 80, List No. 3, Serial No. 306

مقدمہ:- درخواست شمس العلماء عزیز جنگ بہادر برائے عطائے وظیفہ بطور خاص

—o—

محمد عبدالقیوم

چار مینار کی چالیس ۴۰ نشانیاں

حیدرآباد میں فن تعمیر کی یادگاروں میں سب سے زیادہ شہرت چار مینار کو ہی ہے۔ یہ سربفلک عمارت محمد قلی قطب شاہ نے ۱۵۹۱ء میں تعمیر کروائی۔ یہ وسط شہر میں چار مرتفع میناروں کی خوش وضع عمارت ہے۔ اس کی تاریخ "یا حافظ" کے اعداد سے نکلتی ہے۔ اس کی بنیاد سے چار سمتوں کو چار شاہراہیں جاتی ہیں۔ بنیادی کرسی پر چار کمانیں بنائی گئی ہیں جن کا رخ جنوب شمال مشرق اور مغرب کی طرف ہے۔ ان کمانوں کے چاروں گوشوں سے یہ نہایت عظیم الشان چار مینار بلند ہوتے ہیں۔ ہندوستان بھر میں اس وضع کی یہ پہلی عمارت تھی۔ تمام عمارت پر بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ اور گل کاری کی ہوئی ہے۔ حیدرآباد کی مشہور عمارت دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کیے بغیر نہیں رہتی۔

ذیل میں ہم چار مینار کی چالیس نشانیاں یا خوبیاں پہلی بار پیش کر رہے ہیں جو چار کے ہندسے سے تقسیم کی جا سکتی ہیں

۱) چار مینار کے چار مینار ساٹھ گز (۶۰) بلند ہیں۔
۲) چار مینار کی چاروں کمانوں کی بلندی آٹھ (۸) گز اور چوڑائی بارہ (۱۲) گز ہے۔
۳) چار مینار کے ہر مینار کو چار (۴) حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔
۴) چار مینار پر شہر حیدرآباد کی چار شاہراہیں آکر ملتی ہیں۔
۵) چار مینار کے ہر مینار میں چار گیلریاں (مینار گردشیں) بنائی گئی ہیں۔

پہلی اور دوسری دوہری گیلری میں کمانوں کی تعداد۔	۲۰ عدد
تیسری گیلری میں کمانوں کی تعداد۔	۱۲ عدد
چوتھی گیلری میں کمانوں کی تعداد۔	۱۲ عدد
	۴۴ عدد

ہر مینار کی گردشوں میں محرابوں کی تعداد چوالیس ہے اور چاروں میناروں میں ۱۷۶ مینار گردشیں ہیں۔

۶) چار مینار کی بلند کمانوں میں ہر دو طرف چار چار چھوٹی محرابیں یا کمانیں بنائی گئی ہیں اس طرح ان کی کل تعداد بتیس (۳۲) ہے
۷) چار مینار کی بلند کمانوں کے اندرونی حصے میں بھی چار چار چھوٹی محرابیں یا کمانیں بنائی گئی ہیں۔
۸) چار مینار کی کمانوں اور میناروں کے درمیان نچلی منزل میں ایک مربع نما حوض بنوایا گیا تھا۔ اس کا اندرونی حصہ ہشت پہلو تعمیر کیا گیا تھا۔ (یہ حصہ اب بند کر دیا گیا ہے)
۹) چار مینار کے ہشت پہلو حوض کا احاطہ سولہ (۱۶) گز تھا۔
۱۰) چار مینار کا سطحی نقشہ مربع نما ہے۔ اور کل رقبہ آٹھ سو چالیس (۸۴۰) مربع گز ہے۔
۱۱) چار مینار کے ہر مینار سے دوسرے مینار کا درمیانی فاصلہ اٹھائیس (۲۸) گز ہے۔
۱۲) چار مینار کی کمانوں اور میناروں کے درمیان میں مربع کا ہر پہلو بارہ (۱۲) گز ہے۔ اس طرح کل رقبہ ایک سو چوالیس (۱۴۴) مربع گز ہوتا ہے۔
۱۳) چار مینار کے چاروں گوشوں میں کمانوں کی بناوٹ کے لیے ہر گوشہ میں اڑتالیس (۴۸) مربع گز رقبہ مختص کیا گیا ہے۔

۱۳) چار مینار میں اوپر جانے کے لیے چاروں میناروں کے اندرونی حصے میں زینے بنائے گئے ہیں۔

۱۴) ہر مینار میں منزلوں تک پہنچنے کے لیے چار چار کمانیں بنائی گئی ہیں۔ لیکن اب ان کمانوں میں جالیاں لگا دی گئی ہیں۔ اس لیے آج صرف ایک ہی راستہ زیر استعمال ہے۔

۱۶) چار مینار کی بلند کمانوں تک کے بیرونی سمت کا فاصلہ اٹھائیس (۲۸) گز ہے۔

۱۷) چار مینار کے ہر مینار کے بیرونی سمت کا فاصلہ بتیس (۳۲) گز ہے۔

۱۸) چار مینار کی پہلی منزل میں اندرونی سمت (سابقہ حوض کے اوپر) چھت کو سہارا دینے والی کمانوں میں آٹھ (۸) عدد علموں کے پنجے بنائے گئے ہیں۔ جن میں طغرے (اللہ یا محمد یا علی) چونے میں کندہ کیے گئے ہیں۔ اور پنجوں میں کل سولہ (۱۶) عدد شیر دہاں بنائے گئے ہیں۔

۱۹) آٹھ (۸) علم کے پنجوں کے اوپری حصے میں سولہ (۱۶) کمانیں بنائی گئی ہیں۔

۲۰) سولہ (۱۶) کمانوں پر چھت کے عین وسط میں ایک خوبصورت پھول بنایا گیا ہے۔ اس پھول میں سولہ (۱۶) کلیاں بنائی گئی ہیں۔

۲۱) سولہ (۱۶) کلیوں والے پھول کے اطراف ایک خوبصورت حلقہ بنایا گیا ہے۔ اس میں بارہ (۱۲) عدد چھوٹے دائرہ نما پھول بنائے گئے ہیں۔

۲۲) چار مینار کی چاروں بلند کمانوں کی بیرونی سمت قطب شاہی طرز تعمیر میں چار (۴) کنول کی کلیاں بنائی گئی ہیں اور چاروں کمانوں کے آٹھ (۸) تمغوں میں بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔

۲۳) چار مینار کی دوسری منزل کے چھجے کی بیرونی سمت میں ہر جانب بیس (۲۰) چھوٹی کمانوں سے سجایا گیا ہے۔ اس طرح کل اسی (۸۰) کمانیں بنائی گئی ہیں۔

۲۴) چار مینار کی دوسری منزل کی درمیانی کمان یعنی چوتھی کمان میں گھڑیاں لگائی گئی ہیں۔ جن کی کل تعداد چار (۴) ہے۔

۲۵) چار مینار کی دوسری منزل میں ان کمانوں کے اوپر چھجے کی بیرونی سمت میں ہر طرف بیس (۲۰) عدد خوبصورت (برا کنس) بنائے گئے ہیں۔

۲۶) چار مینار کی پہلی اور دوسری منزل میں ہر سمت جملہ سولہ (۱۶) چھوٹی اور بڑی کمانیں بنائی گئی ہیں۔

۲۷) تیسری منزل کے بیرونی سمت کے نچلے حصے میں سولہ (۱۶) کمانیں بنائی گئی ہیں۔ اور ان میں خوبصورت جالیاں لگائی گئی ہیں۔

۲۸) تیسری منزل کی بیرونی سمت (شمالی اور جنوبی) کے سب سے آخری حصے میں سولہ (۱۶) عدد مربع نما جاذب نظر جالیاں لگائی گئی ہیں۔

۲۹) دوسری منزل کے اندرونی حصے میں مدرسے کے چار (۴) خاص حصے مربع بنائے گئے ہیں۔ مربع کے ہر ضلع کا طول (۴) گز ہے۔

۳۰) دوسری منزل کی چھت سولہ (۱۶) پہلو والی بنائی گئی ہے۔

۳۱) چار مینار کی تیسری منزل میں مسجد واقع ہے۔ اس کے اندرونی حصے کی ایک صف میں بیس (۲۰) اشخاص نماز ادا کر سکتے ہیں۔

۳۲) اس مسجد کے کل چار مینار ہیں جن پر کلس ہیں۔

۳۳) مسجد کے مشرقی سمت کی منبر کی دیوار میں مزید چار (۴) چھوٹے مینار بنائے گئے ہیں۔

۳۴) مسجد کے جنوبی میناروں کی بلندی کی دیوار میں چار (۴) محراب بنائے گئے ہیں۔

۳۵) چار مینار کے اوپر جانے کے لیے پہلی منزل سے میناروں کے اندر سے چونسٹھ (۶۴) عدد سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اس حصے پر پہنچتے ہیں جو چاروں میناروں کی درمیانی چھت ہے اور اسی پر مسجد واقع ہے۔

۳۶) چار مینار کی مسجد (تیسری منزل) سے میناروں کی آخری بلندی پر پہنچنے کے لیے مزید چھہتر (۷۶) عدد سیڑھیاں بنائی ہیں۔

۳۷) چار مینار کے ہر مینار میں کل ایک سو چالیس (۱۴۰) سیڑھیاں ہیں اس طرح چاروں میناروں میں بنائی گئی کل پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) سیڑھیاں ہیں۔

۳۸) چار مینار کی تیسری منزل پر مسجد میں داخلے کے لیے مشرقی سمت میں ایک باب الداخلہ بنایا گیا ہے۔ باب الداخلہ ایک خوبصورت ہشت پہلو مینار بنایا گیا ہے جس میں آٹھ (۸) کمانیں بنائی گئی ہیں۔ اس مینار کی چھت پر سولہ (۱۶) مخروطی حصوں سے ایک مخروطی گنبد بنایا گیا ہے اور اس پر کلس لگایا گیا ہے۔

۳۹) چار مینار کے ہر مینار کے آخری حصے میں آٹھ (۸) کمانیں بنائی گئی ہیں۔ اس بلند ترین مقام سے ہم سارے حیدرآباد نظارہ کر سکتے ہیں۔

۴۰) چار مینار کے سب سے آخری حصے میں ہر مینار پر ایک خوبصورت سڈول گنبد ہے۔ اس طرح چاروں میناروں میں چ گنبد ہیں اور ان پر چار (۴) عدد طلائی کلس ہیں۔

○ ○ ○ ○

آلِ احمد سرور

○

وقت کی بات ہے یا خوبیِ قسمت یارو
دیوزادوں پہ ہے بونوں کی حکومت یارو

ہر حقیقت میں بڑے پیچ ہوا کرتے ہیں
تم لیے پھرتے ہو اک سادہ حقیقت یارو

لوگ لمحے کی مسرت کے لیے جیتے ہیں
کیا ہوئی وقت کے عرفان کی دولت یارو

خواب دیکھو تو سہی، خواب دکھاؤ تو سہی
خواب بن جاتے ہیں اک روز حقیقت یارو

دل پہ جو برف جمی ہے وہ پگھلتی ہی نہیں
چھیڑو اس خسروِ خوباں کی حکایت یارو

ہے روایت سے بغاوت بھی ضروری شاید
ہر بغاوت ہے نئی ایک روایت یارو

صرف لینا جنھیں آتا ہے ہوس کے ہیں غلام
اور دینے کا ہے اک نام محبت یارو

کیفی اعظمی

○

کہیں سے لوٹ کے ہم لڑکھڑائے ہیں کیا کیا
ستارے زیرِ قدم رات آئے ہیں کیا کیا

نشیبِ ہستی سے افسوس ہم ابھر نہ سکے
فرازِ دار سے پیغام آئے ہیں کیا کیا

جب اس نے ہار کے خنجر زمیں پہ پھینک دیا
تمام زخمِ جگر مسکرائے ہیں کیا کیا

چھٹا جہاں سے اس آواز کا گھنا بادل
وہیں سے دھوپ نے تلوے جلائے ہیں کیا کیا

کہیں اندھیرے سے مانوس ہو نہ جائے ادب
چراغ تیز ہوا نے بجھائے ہیں کیا کیا

○○○

اقبال متین

○

ہم میں ہی ایسی خاصی ہے کچھ ۔ اک اک کرکے ہر گھر چھوٹا
یا ہم بیچ کے آدھاری ہیں ۔ یا جیون کا پل پل جھوٹا

سب اچھے ہیں ۔ ہم نے سب کو آنکھوں میں ۔ دل میں رکھا
ایک ہوا کا جھونکا آیا آنکھیں بھیگیں ۔ دل بھی ٹوٹا

ہنستے بولتے اٹھ جانے کا دکھ تھا ۔ چاہنے والوں کو
اپنا بھی تھا طور طریقہ ۔ آنسو بن کر بگیا لوٹا

سوکھی سوکھی اس دھرتی پر کتنے ارماں بولیتے ہو
یاد رکھو بھی ۔ غم ہی لے گا ۔ پھوٹے گا جب بوٹا بوٹا

چلتے چلتے تھک کر گولی خشک زباں کے نیچے رکھنا
یہ تو نہیں جینے کا سلیقہ کون رکے گا گردم ٹوٹا

جس دریا کے تٹ پر بیٹھا کوئی موجیں گنتا تھا
آج سنا ۔ واں ڈوب مرا وہ ۔ بھیڑ کے تھی ۔۔ چشمہ پھوٹا

ایک پرندہ شاخ سے چمٹا ۔ مرا ہوا ہے ۔ گرا نہیں
یہ بھی شاید ریت ہے کوئی ۔ شاخ ہری ہے ۔ پر نہ پھوٹا

صاحب جی ۔ اقبال متین ۔ کتنے رستے ناپو گے
دیکھو جی اب بیٹھ رہو بھی ۔ یہ چھوٹا کہ وہ چھوٹا

اکبر حیدرآبادی

★

کہرے سے سوادِ ہجر کے پھر پیغام وصال آگیا ہے
میں اپنی ہی دھن میں مبتک تھا، یہ کس کا خیال آگیا ہے

ویران سی ہو کے رہ گئی ہے سرشار زمیں سماعتوں کی
ہونٹوں کی حدود سے گزر کر آنکھوں میں سوال آگیا ہے

از بس کہ نگاہ میں ہماری تشکیک و یقیں کے مسئلے ہیں
فرعون کے دیدنے سے پہلے موسیٰ کا خیال آگیا ہے

مہروسہ و نجم ہی نہیں ہیں مسحور طلسم چشم جاناں
ان آنکھوں کا اشتیاق لے کر صحرا سے غزال آگیا ہے

پگھلے ہوئے نور کی حرارت حل ہو گئی منجمد رگوں میں
جب نغمہ سرا ہوا ہے سورج، مہتاب کو حال آگیا ہے

پہلو میں عروسِ شب کے ہوگا اب اس کے جمال کا تعین
ہے موج میں صبح کا ستارہ سورج کو زوال آگیا ہے

خوش ہوں کہ ہوئے ہیں تار سارے ژولیدہ رفاقت و جنوں کے
امید اعادہ وفا کیا جب دل میں ملال آگیا ہے

ہیں اپنے ہی دام میں مسخر افسردہ نصیب لوگ اکبر
فن میرا لہو میں جذب ہو کر تا حد کمال آگیا ہے

★

دل بیدار تھا، ہر منظر کے جال سے [illegible] کر
پاؤں تلے جب رات کو روندا، سورج سر پ

باہر تھا تنہائی کا ساحل، خاموشی کی ر
اندر لیکن شور مچاتا سورج سمندر

بجنے لگی تھی سناٹے میں یادوں کی ر
شام ہوئی تو گھبرا کر میں گھر سے باہر

اک پلڑے میں رکھی تھی خوش بو، اک پلڑے میں ر
میزانِ احساس میں ان کا تول برابر

ذرّے اور زمرّد کی پہچان تھی جن کو
یوں بے رنگ ہوئیں وہ آنکھیں، ہیرا پتھر

۸/ مارچ

(بین الاقوامی یومِ خواتین)

تم سوامی رام بنے میرے
تم مجنوں قیس بنے میرے
کبھی کھیل لیا، کبھی چھوڑ دیا
کبھی پچکارا، کبھی دھتکارا
کبھی پہنا، مسلا، پھینک دیا
کبھی پچھواڑے میں داب دیا
کبھی ہاتھ پہ مہندی رکھلا کر
میرے چہرے پہ ہلدی مل دی
کبھی بیگم عام بنوا کر
مری ذات کٹھوٹی گم کر دی
تم سوامی مجنوں یاد کرو
جب صحرا صحرا دوڑایا
میری لاٹھی سے چشمے پھوٹے
جب عیب لگا کر دھتکارا
مری کوکھ جہنم بن رکھی
جب ویشیا کہہ کے پلٹے تھے
مرا بستر عمر تمہاری تھی
تم سوامی مجنوں پل بھر کے
دنیا کے تماشے میں تم نے

مجھے جانے ذرا سی عزت دی
دنیا کے ترازو میں تم نے
مجھے ہیرے موتی قیمت دی
اس کھیل سرائے سے باہر
تم رشتوں کے ٹکسالوں میں
مجھے کھوٹا کہہ کے الگ کرو
تم شہوت کی دیواروں میں
مجھے عزت کہہ کے دفن کرو
مجھے چوکھٹ، تہمت پہنا دو
مجھے مالک داسی رچا دو
یہ کھیل سرائے بہت ہوا
وہ جل مرنا، چولہے پھٹنا
یہ آگ تماشا بہت چلا
یہ قیس قبا بے رنگ ہوئی
اس کھیل سرائے سے نکلو
تم میرے جیسے انساں ہو
مرے دوست بنو، مرے دوست بنو!

اکبر حیدرآبادی

سوالِ بے جواب

ہرے بھرے درخت پوچھتے ہیں بادِ گرم سے
خزاں کی زرد رو کتاب میں بتا
ہمارا نام کس ورق پہ درج ہے؟

ابھی ہمارے ٹہنیں بکھراں کی نرم چھاؤں میں
طیورِ خوش نوا کے گیت
ناتمام ہیں!
ابھی شگوفے نکہتوں سے ہمکلام ہیں
ابھی کٹورے اوس کے بھرے نہیں
ابھی ہماری تشنگی بجھی نہیں!

رواں دواں ابھی تو سیلِ جود والتفات ہے
ابھی تو جشنِ رنگ و بو کی رات ہے!
ہمیں خبر نہیں ـــــ بتا
یہ رقص و رنگ و نغمہ اور کتنے دن کی بات ہے؟

ہرے بھرے درخت
برگ و بار، شاخسار سب
سوالیہ نشان اُدھر
مگر اِدھر ـــــــ
لبِ ہوائے گرم پر
لگی ہے مہرِ خامشی!!

ناممکن

اک گمبھیر سا شہر بسا ہے میرے اندر
اور اس شہر کے سینے میں
آوازوں کا شور سنائی دیتا ہے
چہروں کا بازار دکھائی دیتا ہے!

خزاں رسیدہ ایک شجر کی ڈالی پر
کوئل بیٹھی روتی ہے
ہجر زدہ اشکوں کے ہار پروتی ہے
میری رگِ گردن کے قریب
ہلکی ہلکی سی اک جنبش ہوتی ہے

کیا میں آنکھیں موند لوں اپنی؟
کیا میں اپنے کانوں میں سیسہ بھر لوں؟
کیا وہ شہر جو میرے اندر بسا ہوا ہے
چہرے اپنے کھو دے گا؟
کیا اس شہر سے آنے والی آوازیں رک جائیں
ناممکن ہے
ـــــ ناممکن!!

صفیہ اریب

نظمیں

○

ر کے پردے
د و تو شاید
وش ہو سکوں گی
میں
ایک نیا گلدان
میز پر آجائے
تو.... شاید
رات بھر
سو سکوں گی
میں
دل
بہت تھک چلا ہے
کوئی
چھوٹی سی خواہش

چند لمحوں کے لیے
کچھ دے سکے
تو شاید....
جی سکوں.... میں!

○

غم کی
نئی رت
سلام ہے
تیرے نام ...!
چند آنسو
ہیں
پچھلی رتوں کے
ڈھلک جائیں
تو
قبول کرلے ...!

محمد قلی قطب شاہ

نتوان کرد خوب شکلِ خودش　　　حسن افروز چہرہ ایام
نذرِ تاریکیِ ابد گشتند　　　شہریارانِ آفتاب مقام
گرد تغیرِ روزگار رسید　　　بر فلک بوس و زرفشاں اہرام
قرن ہا گشت و محوِ خاک شدند　　　سبز بختانِ گلشنِ اقوام
کس نہ داند کسے کجا خفتند　　　ساکنانِ قصورِ سنگ رخام
لوحِ تربت ترا بیا موزد　　　حالِ زارِ شہانِ ذی اکرام
برسرِ ارضِ بے نشان گشتند　　　فاتحانِ فلک رسا اقدام
رہ گذارِ جہان! کجا ہستند؟　　　شہسوارانِ مرکبِ ایام
لیک در قلبِ دہر زندہ بود　　　شاعرِ خوش کلام و صاحبِ جام
بعد مدت غبارِ قبرت گشت　　　سرمہ دیدہ خواص و عوام
این سعادت ترا مبارک باد　　　اے محمد قلیِ خوش انجام

بہ سخن بردہ ای امان ورنہ
ذکرِ سلطان و بر زبانِ عوام!

○ ○ ○

آپ کو یقین نہ آئے یا د آئے مگر یہ واقعہ ہے کہ جب کبھی میں نے کافی کے بارے میں استصواب رائے عامہ کیا ہمیشہ اسی قسم کا ہوا۔ شائقین میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استصواب رائے عامہ کرنا بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نیک مرد کی عمر اور خوب صورت عورت کی آمدنی دریافت کرنا خطرے سے خالی ہے۔ زندگی میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو واقعی کافی سے بیزار تھا لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابل التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔

ایک صاحب اپنی پسند کے جواز میں صرف یہ کہہ کر چپ ہو گئے کہ

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافی لگی ہوئی

میں نے وضاحت چاہی تو کہنے لگے "دراصل یہ عادت کی بات ہے۔ یہ کم بخت کافی بھی رواجی چنے اور ذومنی ایک دفعہ منہ لگنے کے بعد چھڑانے نہیں چھوٹتی۔ کیوں نا؟" اس مقام پر مجھے اپنی معذوری کا اعتراف کرنا پڑا کہ بچپن میری صحت خراب اور صحبت اچھی رہی۔ اسی لیے ان دونوں خوب صورت بلاؤں سے محفوظ رہا۔

بعض احباب تو اس سوال سے چراغ پا ہو کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ وہ جھوٹے الزام لگا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جھوٹے الزام کو سمجھ دار آدمی نہایت اعتماد سے ہنس کر ٹال دیتا ہے مگر سچے الزام سے تن بدن آگ لگ جاتی ہے۔ اس ضمن میں جو متضاد باتیں سننا پڑتی ہیں، ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ایک کرم فرما نے میری بیزاری کو محرومی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا۔

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

ان کی خدمت میں حلفیہ عرض کیا کہ دراصل بیسیوں گیلن کافی پینے کے بعد ہی یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی دوسرے صاحب نے ذرا کھل کر پوچھا کہ کہیں کافی سے چڑنے کی اصل وجہ معدے کے وہ داغ (ULCERS) تو نہیں جن دو سال سے لیے پھر رہا ہوں اور جو کافی کی تیزابیت سے جل اٹھتے ہیں۔

اور اس کے بعد وہ مجھے نہایت تشخیص ناک نظروں سے گھورنے لگے۔

استصواب رائے عامہ کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب مجھے اپنے تاثرات پیش کرنے کی اجازت دیجیے۔ میرا ایمان قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان غور و فکر کی عادت ڈالے۔ یا محض عادت ہی ڈال لے تو ہر میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر حقے ہی کو لیجیے۔ معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ حقہ پینے سے پاس نہیں پھٹکتے بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ اگر تمباکو خراب ہو تو تفکرات ہی پر کیا موقوف ہے کوئی بھی پاس نہیں اب دیگر ملکی اشیاء خورد و نوش پر نظر ڈالیے۔ مرچیں کھانے کا ایک آسانی سے سمجھ میں آنے والا فائدہ یہ ہے کہ ان سے مشرقی کھانوں کا اصل رنگ اور مزا دب جاتا ہے۔ خمیرہ گاؤزبان اس لیے کھاتے ہیں کہ بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ جوشاندہ اس لیے گوارا ہے کہ اس سے نہ صرف ایک ملکی صنعت کو فروغ ہوتا ہے بلکہ نفس کو مارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شلغم اس لیے زہر مار کرتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے لیکن جدید طبی ریسر ثابت کر دیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اہل ذوق کے نزدیک یہی اس کی خوبی ہے۔

معلوم نہیں کافی کیوں، کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی۔ لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو علم نہیں تھا۔ اگر انھیں ذرا بھی علم ہوتا تو جراحت کی طرح یہ بھی یونانی طب کا جزو غالب ہوتی۔ اس قیاس کو اس مزید تقویت ہوتی ہے کہ قصبوں میں کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عطائیوں نے "اللہ کافی شافی" کہہ کر موخرالذکر کا سفوف اپنے نسخوں میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ زمانہ قدیم میں اس قسم کی جڑی بو

ستعمال مداوت اور حفظ ماتقدم کے لیے مخصوص تھا۔ چوں کہ آج کل ان دونوں باتوں کو معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ اس لیے اسے
رف اظہار خلوص باہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سنا ہے کہ چائے کے بڑے خوب صورت باغ ہوتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں
میں پیدا ہوتی تو ایشیائی ممالک میں اتنی افراط سے نہیں ملتی بلکہ غلے کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔ میری معلومات
امہ محدود ہیں مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اگتی ہوگی کیوں کہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں ہے جو اللہ
عالی اپنے نیک بندوں پر آسمان سے براہ راست نازل کرتا ہے تاہم میری چشم تخیل کو کسی طور یہ باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی
پیداوار ہو سکتی ہے اور اگر کسی ملک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی تو اللہ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اگتا ہوگا؟ ایسے
ارباب ذوق کی کمی نہیں جنھیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھیے تو مجھے اپنا
ملک اس لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

میں مشروبات کا "پارکھ" نہیں ہوں۔ لہٰذا مشروب کے اچھے یا برے ہونے کا اندازہ ان اثرات سے لگاتا ہوں جو
نے پینے کے بعد رونما ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے میں نے کافی کو شراب سے بدرجہا بدتر پایا۔ میں نے دیکھا ہے کہ شراب
پی کر سنجیدہ حضرات بے حد غیر سنجیدہ گفتگو کرنے لگتے ہیں جو بہت جاندار ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے کافی پی کر غیر سنجیدہ لوگ
انتہائی سنجیدہ گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے سنجیدگی سے چڑ نہیں بلکہ عشق ہے۔ اسی لیے میں سنجیدہ آدمی کی مسخرگی
برداشت کر لیتا ہوں، مگر مسخرے کی سنجیدگی کا روادار نہیں۔ شراب کے نشے میں لوگ بلاوجہ جھوٹ نہیں بولتے۔ کافی پی کر
لوگ بلاوجہ سچ نہیں بولتے۔ شراب پی کر آدمی اپنا غم اوروں کو دیتا ہے مگر کافی پینے والے اوروں کے فرضی غم اپنا لیتے ہیں۔
مدہوش ہونے کے بعد مے خوار ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دیتے ہیں۔ کافی پی کر حلیف بھی حریف بن جاتے
ہیں۔

یہاں مجھے کافی سے اپنی بیزاری کا مخلصانہ اظہار مقصود ہے لیکن اگر کسی صاحب کو یہ سطور شراب کا اشتہار معلوم
ہوں تو اسے زبان و بیان کا عجز تصور فرمائیں۔ کافی کے طرفدار اکثر یہ کہتے ہیں کہ یہ بے نشے کی پیالی ہے، بالفرض محال یہ
گزارش احوال واقعی یا دعویٰ درست ہے تو مجھے ان سے دلی ہمدردی ہے مگر اتنے کم داموں میں آخر وہ اور کیا چاہتے ہیں؟

کافی ہاؤس کی شام کا کیا کہنا! فضا میں ہر طرف ذہنی کہر چھایا ہوا ہے۔ شور و شغب کا یہ عالم کہ آواز سنائی نہیں دیتی اور
بار بار دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میں نے کیا کہا۔ ہر میز پر تشنگان علم کافی پی رہے ہیں اور غروب آفتاب سے غرارے تک
عوام اور آم کے خواص پر "انقلاب زندہ باد" والے لہجے میں بحث کر رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے کافی اپنا رنگ دکھاتی ہے اور
تمام بنی نوع انسان کو ایک برادری سمجھنے والے تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کی ولدیت کے بارے میں اپنے شکوک کا
سلیس اردو میں اظہار کرنے لگتے ہیں جس سے بیروں کو کلیتہً اتفاق ہوتا ہے۔ لوگ رو ٹھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن یہ
سوچ کر پھر بیٹھ جاتے ہیں کہ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک اینگلو انڈین نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا
ہے۔ میں اس واقعے سے سولہ آنے متفق ہوں۔ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی
غلط نہیں معلوم ہوتا کہ کافی پینے سے بدن میں چستی آتی ہے جبھی تو لوگ دوڑ دوڑ کر کافی ہاؤس جاتے ہیں اور گھنٹوں وہیں بیٹھے
رہتے ہیں۔

بہت دیر تک وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ کافی نہایت مفرح ہے اور دماغ کو روشن کرتی ہے اس کے

صحبت میں انھوں نے اطلاع دی کہ " آج کل کا واقعہ ہے۔ میں دفتر سے گھر لوٹا تو نڈھال ہو چکا تھا۔ بیگم بڑی مزاج داں ہیں۔ فوراً کافی کا TEA POT لا کر سامنے رکھ دیا۔

میں ذرا چکرایا۔ پھر کیا ہوا؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں نے دودھ دان میں سے کریم ڈالا۔" انھوں نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "شکر دان میں سے کیا نکلا؟"

فرمایا۔ "شکر نکلی اور کیا! تھی کہ موزے نکلتے؟"

مجھے غصہ تو بہت آیا مگر کافی کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

عمدہ کافی بنانا بھی کیمیاگری سے کم نہیں۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق یہی سننے میں آیا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ ہر ایک کافی باورچی اور خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ، حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا ہے۔ مشرقی آفریقہ کے اس انگریز افسر کا نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے جس کی مزے دار کافی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پرتکلف دعوت کی۔ جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظر حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب پوچھی۔

حبشی نے جواب دیا کہ " بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں۔ پھر اس میں کافی ملا کر دم کرتا ہوں۔"

"لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو۔ بہت مہین چھنی ہوتی ہے۔"

"حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی ریشمی موزے استعمال کرتے ہو؟" آقا نے غضبناک ہو کر پوچھا۔

خانساماں سہم گیا۔ "نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔"

سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کافی کی تندی اور تلخی سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بچپن ہی سے یونانی دواؤں کا عادی رہا ہوں اور قوت برداشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کڑوی سے کڑوی

گولیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا!

لیکن کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو معتدل قوام بنتا ہے وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میری انتہا پسند طبیعت اس میٹھے زہر کی تاب نہیں لا سکتی۔ لیکن وقت یہ آن پڑتی ہے کہ میں میزبان کے اصرار کو عداوت اور وہ میرے انکار کو تکلف پر محمول کرتے ہیں۔ لہٰذا جب وہ میرے کپ میں شکر ڈالتے وقت اخلاقاً پوچھتے ہیں۔

"ایک چمچہ یا دو۔۔۔؟"

تو مجبوراً یہی گزارش کرتا ہوں کہ میرے لیے شکر دان میں کافی کے دو چمچے ڈال دیجیے۔

صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خورد و نوش کا تعلق ہے میں تہذیب حاضر کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کے بجائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ پہلی نظر میں جو محبت ہو جاتی ہے اس میں بالعموم نیت کا فتور کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ بد ذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لیے بڑا مارنا پڑتا ہے۔ مگر میں اس سلسلے میں ہر سن کی [illegible] و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں۔ چاہے ٹھیک اس میں یہی کا [illegible] یا گرمی جیسی قائل نہ ہوں۔ علاوہ بریں، میں ہر کافی پینے والے کو جنتی سمجھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو لوگ عمر بھر ہنسی خوشی یہ عذاب جھیلتے رہے ان پر دوزخ اور جہنم حرام ہیں۔

کافی امریکہ کا قومی مشروب ہے۔ میں اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا کہ امریکہ [illegible] سے پھیلایا کافی کا؟

زدہ ہے [illegible] یہ حقیقت اصل ہے کہ مجھے کوئی سہو ہوا ہے تو یہ سمجھیے کہ خمار خاطر چائے کی وجہ سے مقبول ہوئی
نے "غبار خاطر" کے پانچویں ایک صاحب نے مجھے [illegible] کر سکے تھے یہ دلیل پیش کی کہ امریکہ میں تو کافی اس قدر
ہے کہ جیل میں بھی پلائی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ جب خود قیدی اس پر احتجاج نہیں کرتے تو ہمیں کیا پڑی کہ وکالت
ں۔ پاکستانی جیلوں میں بھی قیدیوں کو مشاغل کے لیے کی غرض سے [illegible] جاتی ہے۔ کافی کے سریع الاثر ہونے میں
کلام ہے۔ میرا خیال ہے کہ دم نزع حلق میں پانی چوانے کے بجائے کافی کے دو چار قطرے ٹپکا دیے جائیں تو مریض کا
آسانی سے نکل جائے گا۔ لہٰذا مجھے تو اس تجویز پر بھی اعتراض نہ ہو گا کہ گنہگاروں کی فاتحہ کافی پر دلائی جائے۔

یہ درست ہے کہ کھانے کے معاملے میں [illegible] رائج ہوئے ہیں اور غذاؤں کے بے دریغ انتخاب نے
ہیں خاصا تہ سوا کیا ہے لیکن جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے ہم نے ان کے متعلق کوئی بری خبر نہیں سنی۔ ان کی رچی
ئی حس شامہ کی داد دیجیے کہ نہ مغل حکمرانوں کا جبر و تشدد انہیں پنیر کھانے پر مجبور کر سکا اور نہ امریکہ انہیں کافی پینے پر
دہ کر سکا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان کی نفاست نے سخت قحط کے زمانے میں بھی افیم اور کسی نرم کو پنیر اور کافی پر ترجیح دی۔

ہمارا منشا امریکی یا مغلی عادات پر نکتہ چینی نہیں ہے۔ ہر آزاد قوم کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنے معدہ اور معدے کے
تھ جیسا سلوک کرنا چاہے بے روک ٹوک کرے۔ اس کے علاوہ، جب دوسری قومیں ہماری ز ساول، نہاری اور فالودے
مذاق نہیں اڑاتیں تو ہم دخل در "ماکولات" کرنے والے کون؟ بات دراصل یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں پیاس بجھانے
، لیے پانی کے علاوہ ہر رقیق شے استعمال ہوتی ہے۔ سنا ہے جرمنی میں، جہاں قومی مشروب بیر ہے، ڈاکٹر بدرجہ مجبوری
ت ہی تندرست و توانا افراد کو خالص پانی پینے کی اجازت دیتے ہیں لیکن جن کو آب نوشی کا چسکا لگ جاتا ہے وہ راتوں کو چھپ
پ کر پانی پیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ پیرس کے کیفوں میں رنگین مزاج فنکار، بورژوا طبقے کو چڑانے کی غرض سے کھلم کھلا
پیا کرتے تھے۔

مشرقی و مغربی مشروبات کا موازنہ کرنے سے پہلے یہ بنیادی اصول ذہن نشین کر لینا از بس ضروری ہے کہ ہمارے
ان پینے کی چیزوں میں کھانے کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اپنے قدیم مشروبات مثلاً یخنی، سویاں، ستو اور فالودے پر ؟
لیے تو یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ستو اور فالودے کو خالصتاً لغوی معنوں میں نہ آپ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں بلکہ دنیا میں
کوئی ایسی شے ہے جسے آپ بامحاورہ اردو میں بیک وقت کھاپی سکتے ہیں تو یہی ستو اور فالودہ ہے جو مخصوص غذا اور ٹھنڈے
ربت کے درمیان ایک ناقابل بیان سمجھوتہ ہے لیکن آج کل ان مشروبات کا استعمال خاص خاص تقریبوں پر ہی کیا جاتا ہے
ں کا سبب یہ ہے کہ اب ہم نے عداوت نکالنے کا ایک اور مہذب طریقہ اختیار کر لیا ہے۔

آپ کے ذہن میں خدانخواستہ یہ شبہ پیدا ہو گیا ہو کہ راقم السطور کافی کے مقابلے میں چائے کا طرفدار ہے تو مضمون
م کرنے سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کافی سے اس لیے بیزار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز
ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

کاشی ناتھ سنگھ

ترجمہ: حیدر جعفری سید

بھولا بابو کو ملازمت سے آئے ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ ایک واقعہ ہو گیا۔

وہ کمرے میں لیٹے اخبار بینی کر رہے تھے ایک شام کھڑکی سے کوئی کرن آئی اور ان کے گنجے سر پر پڑ رہی جیسے وہ کسی ننھے بچے کی ہتیلی ہو گرم اور گداز۔ بھولا بابو لیٹے سے بیٹھ گئے دیکھا سورج پہاڑی کے پیچھے کہیں چلا گیا ہے اور وہ کرن ان کے سر پر جوں کی توں رکھی ہے

وہ اٹھے۔ انھوں نے سامنے کی دیوار پر ہاتھ رکھا۔ کچھ لمحے وہ لالی وہاں بھی ٹھیری تھی۔ ہتیلی ذرا گرم لگی ہاتھ وہاں سے ہٹا دیا اور اپنے گالو پر رکھا۔ اپنے گال کی جلد ہتیلی سے کوئی انچ بھر اندر پڑتی تھی انھیں دکھ ہوا۔

باہر ہری گھاس لال ہے، چار دیواری لال ہے -------- وہ تیز قدموں سے آگے بڑھے اور چار دیواری تک گئے پھر رک گئے۔ جہاں سے سورج نظر آ رہا تھا۔ پہاڑیوں سے کچھ اوپر بادلوں کے کہیں آس پاس تاڑ اور پھولوں کے بیچ میں انھوں نے خود پر نگاہ ڈالی ----- مارکین کا سفید کرتہ گلابی ہو اٹھا تھا وہ مسکرائے -----

"دیکھو، دنیا میں کیا کیا چیزیں ہیں کتنی اچھی اچھی چیزیں!"

پھر انھوں نے چار دیواری کے باہر نگاہ دوڑائی۔ ادھر ادھر دور نظر آنے والی ہریجن بستیوں پر دیکھا۔ جھونپڑیاں بن ہوئی ہیں، سنالو کی جھونپڑی لمبی ہو کر منڈر چھو رہی ہے۔ منڈر کے پاس ایک گائے کھڑی ہے اور پونچھ جھٹکا رہی ہے۔ انھوں نے گائے کو غور سے دیکھا ------ وہ لال ہے یا سفید ہی ہے وہ فیصلہ نہ کر سکے۔ "واہ کیا مذاق ہے" وہ مسکرا اٹھے۔

اچانک بھولا بابو کا دھیان سورج پر گیا سورج کا گولا چھوٹا بڑا ہو رہا تھا کانپ رہا تھا۔

"بچی کی ماں" وہ چلائے۔

کوئی جواب نہ آیا۔

"بچی کی ماں" وہ پھر چلائے۔

"کیا ہوا؟" آنچل سے ہاتھ پونچھتی بچی کی ماں نکلی۔

"ارے ادھر تو آؤ۔"

بچی کی ماں دوڑیں جا کر بھولا بابو کے پہلو میں کھڑی ہو گئیں۔

"سامنے ادھر دیکھو۔"

وہ سڑک پر دیکھنے لگیں۔

"سڑک نہیں ادھر دور تاڑ کے پیچھے۔"

وہ اچک کر دیکھنے لگیں پھر بھولا بابو کی جانب مڑیں اور خوش ہو گئیں۔

"کس قدر حسین؟" بھولا بابو شادماں فرحاں ہو گئے۔

"ہاں بہت حسین!" بچی کی ماں بولیں۔

"کیا بہت حسین؟" بھولا بابو دائیں جانب گھومے۔

"ادھر سے لدی خچروں کی قطار اور ان کے پیچھے چلتے توری۔"

بھولا بابو کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"عورت کی ذات خچر اور گدھے کے علاوہ دیکھ ہی کیا سکتی ہو؟"

"تو کیا دیکھنے کے لیے کہہ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں جاکر ہلدی لاؤ اور آٹا گوندھو۔"

"نہیں! ذرا مجھے بھی دکھائیے نا!" انھوں نے اصرار کیا۔

"کیا دکھاؤں خاک؟" اتنی دیر سے پریشان کیا، پھر دکھانے کے لیے ہوں؟"

"تو کیا ہے؟" بٹی کی ماں نے زور دیا۔

تاڑوں کے بیچ میں دیکھو دھندلی دھندلی پہاڑیوں میں۔"

"ہیں"

"لال سورج ہے؟"

"ہاں!"

گولائی پر چلتے بھورے بادلوں کی لکیریں ہیں؟"

"ہاں ہیں"

"تو دیکھو، اسے اچھی طرح دیکھو"

"اسے کیا دیکھنا؟ آپ آج دیکھتے ہیں میں زندگی بھر سے دیکھ رہی ہوں؟"

"ہاں"

"اچھا، بہت اچھا کر رہی ہو، اب ایک کام کرو کہ چلو چولہا پھونکو

بٹی کی ماں کھڑی رہی بھولا بابو کو دیکھتی رہی۔

"میں کہتا ہوں------جاؤ" بھولا بابو چیخ اٹھے۔ بٹی کی ماں سہم کر چلی گئی۔

بھولا بابو دیکھتے رہے------ سورج، بادل، بادلوں پر ابھرتے رنگ، رنگوں پر کھنچی دھاریاں، پہاڑیوں کے سامنے والے حصے کا دھندلا پن، دھندلے پن کے بالکل اوپر------چوٹی پر سرخ گیرے کا بنا ہوا، وہ زندگی بھر تار بابو رہے------انھوں نے سوچا۔ پہاڑیوں کے اس ضلع ہی میں رہے------ان سے کوئی گاؤں نہیں چھوٹا، قصبہ نہیں چھوٹا، شہر نہیں چھوٹا لیکن یہ سورج! اب تک کہاں تھا؟ یہ شام آخر کدھر تھی؟------آج وہ کیا دیکھ

رہے ہیں؟

انھوں نے اپنے پیچھے کسی بچے کے کھنکھنے کی آواز سنی!

"کون؟ نیلو!"

نیلو کودتا ہوا آیا۔

"اور سب کہاں ہیں؟"

"کھیل رہے ہیں!"

"کہاں؟"

نیلو نے مکان کے پیچھے والے میدان کی جانب اشارہ کیا۔

"اچھا جاؤ دوڑو تو۔ سب کو بلا لاؤ۔"

نیلو دوڑ گیا۔

بھولا بابو سورج کو دیکھتے رہے کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے کبھی اچک کر کبھی جھک کر۔ انھوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں انھیں لگا کہ گولے کا اوپری سرا جس کے ایک کنارے پر پتلی لکیر ہے ڈوب رہا ہے سورج کی کرنیں اب ادھر نہیں ہیں نہ میدانوں میں نہ ہرے کھیتوں میں، نہ جھونپڑیوں پر۔ وہ بادلوں کے پیچھے سے اوپر آکاش کی جانب جا رہی ہیں روشنی کی کئی دھاراؤں میں، کئی رنگوں میں۔

"نیلو" وہ پیچھے مڑ کر چلائے۔

کوئی نظر نہیں آیا۔

"سب کے سب کہاں غائب ہو گئے؟" وہ بڑبڑائے۔

"ارے او، کون جا رہا ہے؟"

سامنے والی سڑک سے ایک اونٹ جا رہا تھا اس پر گندی قمیص پہنے ایک آدمی بیٹھا تھا وہ بے فکری سے بیڑی پی رہا تھا۔

"ہم تم ہی سے کہہ رہے ہیں؟"

اس نے سر گھما کر ادھر دیکھا۔

"ذرا سامنے تاڑوں کے بیچ میں تو دیکھو وہاں کیا ہے؟"

اونٹ والا ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"سالے" بھولے بابو کے منہ سے نکلا۔

"ہاں دیکھا تھا۔"

بھولا بابو تھوڑی دیر تک ضلع دار صاحب کو پھٹی آنکھوں سے تکتے رہے انھیں خاموش دیکھ کر بولے۔ "آج کا سورج ایسا سرخ۔۔۔ ایسا خوب صورت کہ آپ سے کیا کہوں؟ ساری دھرتی سرخ ہو گئی تھی ضلع دار صاحب؟ آپ نے دیکھا تھا یا؟"

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا روز ہو رہا ہے موسم ہی اس طرح کا ہے۔" ضلع دار صاحب نے کہا۔

"نہیں صاحب روز کیسے ہوتا ہے؟" بھولا بابو متعجب ہوئے۔

"خیر" ضلع دار صاحب نے بے پروائی سے کہا" بات کیا ہے؟ وہ!"

بھولا بابو چپ ہو رہے ان کے جوش کو کچھ دھچکا لگا انھوں نے سر ہلایا اور چل پڑے۔

"آخر بات کیا ہے!" ضلع دار صاحب نے پوچھا۔

"اب آپ کو کیا بتائیں صاحب۔" انھوں نے آہستہ سے کہا۔

وہ سیدھے بازار میں نکلے بازار کا وہ حصہ کھلا پڑا ہے۔ سڑک پر دشتی ہے لوگ ہیں۔۔۔۔ شناسا، اجنبی لیکن بھولا بابو اپنی راہ چلے جا رہے ہیں۔ انھوں نے سورج کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہا جب کہ بہتوں سے کہنا تھا، وہ دکھی تھے۔ مغموم اس بات کے لیے تھے کہ وہ ضلع دار کے یہاں مجبوراً چلے گئے۔ لوگ ضلع دار کو بہت ذہین اور ہوشیار سمجھتے تھے وہ بھی ماننے لگے تھے لیکن آج اس کی قلعی کھل گئی۔ اگر انھوں نے سورج نہ دیکھا ہوتا تو ایک بات تھی لیکن انھوں نے دیکھا ہے اور مزے میں دیکھا ہے۔

پھر بھی بھولا بابو اس پر از سر نو سوچنے کے لیے مجبور تھے اور سوچا بھی۔۔۔۔ "یہ ایسی بات نہیں جسے سب سمجھ لیں" اس خیال سے انھیں اور اذیت ہونے لگی۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ مطمئن ہونے لگے۔۔۔۔ حالاں کہ ضلع دار صاحب زیادہ پڑھے لکھے ہیں لیکن پڑھائی سے کیا ہوتا ہے حقیقت میں دیکھا جائے تو پڑھائی اور سمجھ۔۔۔۔ دو چیزیں ہیں۔۔۔ اور خاص طور پر ایسی باتوں کے لیے عمر اور تجربہ چاہیے۔"

بھولا بابو مادھو والی گلی میں مڑنے کو ہوئے۔ دیکھا مادھو ہاتھ میں بالٹی لیے دوسری گلی سے نکل رہے ہیں۔ وہاں کچھ اندھیرا تھا۔

"مادھو" انھوں نے پکارا۔

"بابو میں ہوں سوہن۔"

"اچھا تم ہو خیر کوئی بات نہیں" انھوں نے سوہن کو بلایا۔

"تمھارے صاحب تو دوپہر سے ہی باہر ہیں۔" سوہن نے بتایا۔

"کہاں گئے؟"

کسی گاؤں میں، کوئی موقع دیکھنے!"

"اچھا دوپہر سے ہی غائب ہیں؟"

"ہاں"

"تو پھر انھوں نے سورج کہاں دیکھا ہوگا۔" بھولا بابو نے سوچا پھر انھوں نے سوہن کی عمر اور تجربے کو غور سے دیکھا۔

"تم شام کو کیا کرتے ہو؟" انھوں نے پوچھا۔

"چمن جاتا ہوں کھلی ملتا ہوں، سانی سانتا ہوں، دودھ دوہتا ہوں اور۔۔۔۔۔"

"سورج دیکھتے ہو یا نہیں؟"

"سورج؟" سوہن نے حیرت سے پوچھا۔

"تم نے آج سورج دیکھا تھا؟"

"کون سورج؟ سورجا تیلی؟"

"نہیں کولھو، بیوقوف!" بھولا بابو ناراض ہو گئے۔ سوہن ہنسنے لگا۔ "بابو میں گنوار آدمی کیا جانوں کس کو پوچھتے ہیں؟"

"میں آسمان کے سورج کی بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں بابو دیکھا تھا۔"

"تمھیں کچھ خاص لگا تھا۔"

"مطلب؟" سوہن نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"کچھ گول گول، کچھ لال لال" بھولا بابو نے سوہن کی مدد کی۔

"تو؟"

"تو تمھارا سر اور گھنس پالو" انھوں نے غصے سے کہا۔

وہ واپس چل دیے۔ اس بار بھولا بابو کی رہی سہی امید نے دم توڑ دیا "آخر لوگ کیا ہوتے جارہے ہیں؟" وہ جھلا اٹھے۔

گھر پہنچ کر انھوں نے پھاٹک کھولا اندر گئے۔ چھڑی رکھی اور بستر پر گر پڑے "ہائے! دنیا کتنی بدل گئی ہے" انھوں نے بار بار سوچا، سوچا کل شام ہوگی وہ سب ہی لوگوں کو بلائیں گے سورج دکھائیں گے اور سمجھائیں گے کہ دنیا میں چولھا، منصوبے، بکری، اونٹ اور دودھ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ سورج بھی ہے پہاڑیوں کے اوپر ہوتا ہے تاڑوں کے بیچ میں آتا ہے پھر کانپتا ہے اور پھر وہ لمحہ بھی آتا ہے جب وہ پہاڑوں کے پیچھے جاتا ہے اور ڈوبنے سے پہلے ایک ملائم کرن تمھارے گنجے سر پر چھوڑ جاتا ہے۔

اچانک انھیں یاد آیا وہ اپنا ہاتھ سر پر لے گئے ٹٹولا وہ حصہ بالکل ٹھنڈا تھا انھیں دکھ ہونے لگا۔۔۔۔۔ "لیکن کتنے لوگ ہیں جو کل بھی اسے سمجھ سکیں گے؟" وہ بے چین ہونے لگے۔

بھولا بابو کو کسی کے اندر آنے کی آہٹ ملی۔ دیکھا میز پر کھانے کی تھالی ہے اور چارپائی کے ایک کنارے بٹی کی ماں بیٹھی ہے۔

"شام کو کہاں چلے گئے تھے؟"

"کہیں نہیں" بھولا بابو نے بے دلی سے جواب دیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

بھولا بابو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بٹی کی ماں نے چادر کے اندر ہاتھ ڈالا اور پھر ماتھا چھوا۔

"ٹھیک تو ہے" وہ تھوڑی دیر چپ رہیں اب تک بٹی، نیلو، اور دوسرے بچے بھی آگئے تھے۔

"اچھا اٹھیے کھا لیجیے۔"

"آج میں نہیں کھاؤں گا۔"

"کیوں؟" بٹی کی ماں چونکی۔

بھولا بابو کافی دیر تک خاموش پڑے رہے اداس اور افسردہ۔

پھر مضبوط لہجے میں بولے۔ "دیکھو سمجھنے کو یہ بیوی ہے یہ بیٹا ہے یہ بیٹی ہے یہ مکان ہے، یہ جائداد ہے، یہ دوست ہیں، یہ رشتے دار ہیں لیکن سچ پوچھو تو کوئی کسی کا نہیں۔"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟" بٹی کی ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"جب میرا دکھ کوئی نہیں سمجھ سکتا تو کیسی بیوی اور کیسا بیٹا؟"

بٹی کی ماں سسکنے لگیں۔

"میرا کوئی نہیں ہے" بھولا بابو کی آواز بھرا گئی۔

"نہیں، نہیں یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

بٹی کی ماں رونے لگیں انھیں دیکھ کر بچے بھی سسکنے لگے۔

"لیکن اس میں رونے کی کیا ضرورت ہے؟ تم سب جاؤ، کھاؤ، پیو، بس میں نہیں کھاؤں گا۔"

بھولا بابو نے بھیگی آواز میں کہا اور دوسری کروٹ لیٹ رہے۔

"بٹی کی ماں آخر کیوں؟ یہ سب کیوں؟" انھوں نے بٹی کی ماں کو جھنجھوڑا۔

بٹی کی ماں اور زور سے رونے لگیں بھولا بابو ان کو دیکھتے رہے اور اچانک پھوٹ کر رونے لگے۔

رونے والوں میں سب سے اونچی اور دکھی آواز بھولا بابو کی تھی

وقار خلیل

یومِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب

(رپورٹ)

و کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور شہر حیدرآباد، فرخندہ بنیاد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ، معانی (۱۵۶۵ء - ۱۶۱۱ء) کی یاد میں ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ۱۹۵۶ء (قیام آندھرا پردیش) سے سالانہ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ دکنیات کے ماہر اور دانشور پروفیسر سید محی الدین قادری زور کی فکر، نظر اور شعور کا یہ جشن دکنی ادب، تہذیب اور تاریخ کا وہ منظر نامہ بن گیا ہے۔ آج کے بدلے ہوئے جمہوری حالات میں بھی ہزاروں حیدرآبادیوں ہی نہیں تلگو، اردو، ہندی، کنڑی اور مراہٹی زبانیں بولنے والوں کا ن حاصل ہے اتحاد، یگانگت اور یک جہتی کی روشن علامت کے طور پر یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کے جشن بالشان انعقاد کے سلسلے بمقام "ایوان اردو" (پنجہ گٹہ روڈ) ۲۶ / فبروری ۹۵ء کو تیاری کمیٹی کا مشاورتی اجلاس پروفیسر جعفر نظام (صدر ادارہ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ادب، شعر، تہذیب، تاریخ، صحافت اور ثقافت کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے ۵۰ اصحاب نے اس مشاورتی اجلاس میں شرکت کر اپنے زرین مشوروں اور تجاویز سے نوازا۔

معتمد ادارہ، عمومی ادبیات اردو پروفیسر مغنی تبسم نے مشاورتی اجلاس کی تجاویز کی روشنی میں یوم قلی قطب شاہ تقاریب کی چار روزہ تفصیلات کو قطعیت دیتے ہوئے بتایا کہ یہ تقاریب وسیع، متنوع اور رنگارنگ انداز میں ۸ / اپریل سے منائی جائیں گی۔

یوم قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں بصراحت ذیل ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔

افتتاحی اجلاس پروفیسر مغنی تبسم، جناب محمد اسلم فرشوری، جناب سید صفی الدین قادری۔

دو سیمینار جناب محمد منظور احمد (کنوینر) پروفیسر یوسف سرمست، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر سید سراج الدین، جناب راشد آزر، ڈاکٹر احمد اللہ خاں، پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ، جناب موہن پرشاد اور جناب محسن علی۔ (اراکین)

استقبالیہ کمیٹی جناب پرمانند سنگھی، جناب موہن لال نگم، جناب ولی قادری، صدر ادارہ، معتمد ادارہ

مشاعرہ کمیٹی جناب مصحف اقبال توصیفی (کنوینر)، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر صادق نقوی، وقار خلیل، جناب صلاح الدین نیر اور جناب سوز عابدی (اراکین)

دو سیمینار ڈاکٹر ... مہری (کنوینر)

جشن جوبلی پروگرام کمیٹی جناب اسلم فرشوری (کنوینر)، محترمہ رفیعہ منظور الامین، جناب نظام جیلانی، جناب عنایت اللہ، جناب یوسف شریف، محترمہ جمیلہ نشاط، محترمہ فاطمہ عالم علی خاں، پروفیسر اشرف رفیع

مشاعرہ بمقام گولکنڈہ ڈاکٹر صادق نقوی (کنوینر)

پاٹ لک لنچ جناب سوز عابدی (کنوینر)

سوونیر کمیٹی جناب زاہد علی خاں ایڈیٹر سیاست (کنوینر)

نشر و اشاعت کمیٹی جناب جہاں دار افسر (کنوینر) محترمہ جمیلہ نشاط، جناب مظہر حسین (اراکین)

۴/ اپریل ۹۵ء کو پریس کلب حیدر آباد میں منعقدہ پریس کانفرنس میں پروفیسر جعفر نظام، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر موہن لال نگر نے یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کی افادیت اور ادارہ ادبیات اردو کی علمی و ادبی خدمات سے تلگو، اردو، انگریزی اخبارات کے نمائندوں کو واقف کرایا اور بتایا کہ ۱۹۳۱ء میں دکنیات کے نامور محقق ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے ہم عصر رفقائے کار کے تعاون سے ادارہ ادبیات اردو قائم کیا جس کے گراں قدر علمی و ادبی ذخیرے میں نایاب مخطوطات اور اہم مطبوعات کے ساتھ ساتھ ادب، آرٹ اور کلچر، حیدر آبادی میوزیم بھی ہے۔ اس کے علاوہ ادارے کا ترجمان ماہ نامہ سب رس ۱۹۳۸ء سے باقاعدہ شائع ہوتا ہے۔ اردو کے امتحانات بھی لیے جاتے ہیں جنھیں عثمانیہ یونیورسٹی نے تسلیم کیا ہے۔ ترقی اردو بیورو حکومت ہند کے تعاون سے مرکز خوشنویسی کا قیام بھی عمل میں آیا ہے اور اس مرکز سے سینکڑوں طلبہ و طالبات نے خوشنویسی کورس کی تکمیل کی ہے۔ ادارہ ادبیات اردو نے تین سو سے زائد کتابیں بھی شائع کی ہیں جن میں ادب، تاریخ، شاعری، ادب اطفال، دکنیات، تذکرے پر کتابیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ، یوم زور اور مختلف علمی و ادبی اجلاس منعقد ہوا کرتے ہیں۔ ریاستی حکومت کی طرف سے برائے نام پانچ ہزار کی سالانہ گرانٹ ملتی رہی ہے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے لیے ریاستی حکومت کی طرف سے کوئی رقمی اعانت نہیں ملتی۔ یہ عوامی فیسٹول عوام اور اردو دوستوں کے تعاون سے منایا جاتا ہے۔ ان تقاریب کے اہتمام کا بنیادی مقصد قومی اور لسانی یکجہتی کی بازیافت ہے۔ پریس کانفرنس کے موقع پر شریک معتمد ادارہ جناب سید صفی الدین قادری اور نشر و اشاعت کمیٹی کے کنوینر جناب جہاں دار افسر بھی موجود تھے۔ دوسرے دن تلگو، اردو اور انگریزی اخبارات میں رپورٹ شائع ہوئی۔

۳۶ ویں یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا افتتاحی اجلاس ۸/ اپریل ۱۹۹۵ء کو بمقام باغ فیض آثار، گنبد ان قطب شاہی، ۵ بجے شام منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس سے قبل صبح ساڑھے دس بجے گنبد محمد قلی قطب شاہ میں مجلس سالانہ کا آغاز قاری مصطفیٰ صاحب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جناب کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کا مرثیہ سنایا اور پھر ڈاکٹر صادق نقوی صاحب نے ذکر مصائب اہل بیت کیا اور آغا عباسی صاحب نے نوحہ پیش کیا۔ مزار محمد قلی پر چادر گل نذر کی گئی اور فاتحہ خوانی ہوئی۔

اسی روز دوپہر گنبد محمد قلی قطب شاہ کے چبوترے پر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی طرف سے افتتاحی ظہرانے (پاٹ لک) دستر خوان بچھا اور گنبد ابراہیم قلی قطب شاہ کے دامن میں خواتین اہل قلم نے ظہرانہ تناول کیا اور پھر موسم بہار میں خوش گوار تبدیلی کے ساتھ ۳۰-

گنبدان قطب شاہی میں یوم قلی قطب شاہ۔ شہ نشین پر گورنر جناب کرشن کانت، سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی و صدر ادارہ ادبیات اردو پروفیسر جعفر نظام، سابق صدر نشین اقلیتی کمیشن
جناب عبدالکریم خان، جناب محبوب حسین جگر، جناب خلیل الرحمن سابق ایم پی اور پروفیسر مغنی تبسم
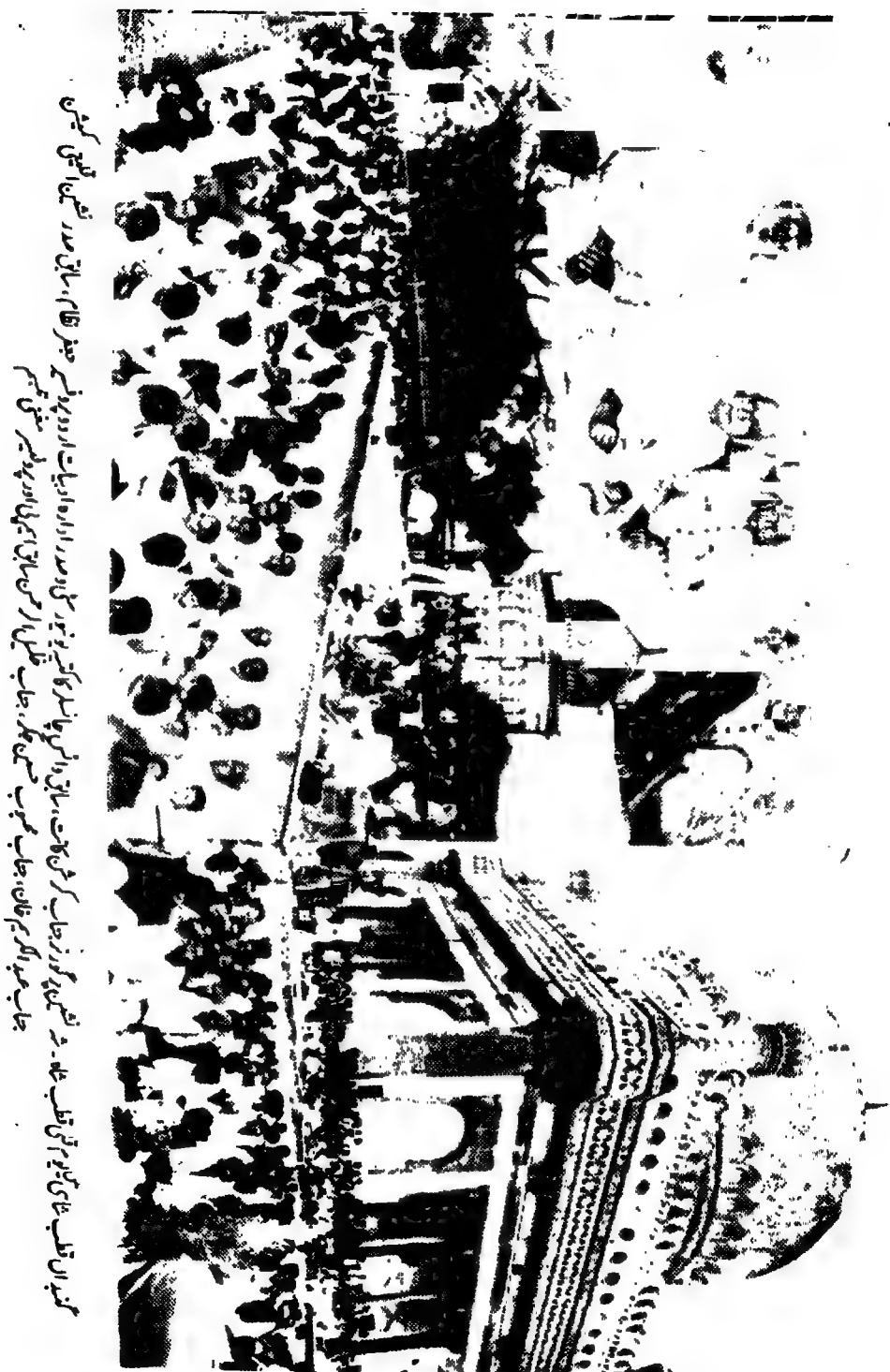
۲/اپریل ۱۹۹۵ء کو صبح گیارہ بجے یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں ایک پریس کانفرنس پریس کلب میں منعقد کی گئی۔ڈا
ے۔ال نگم صحیفہ نگاروں سے خطاب کر رہے ہیں۔تصویر میں: پروفیسر جعفر نظام، پروفیسر مغنی تبسم جناب جہاں دار افسر صاحب،
جناب صفی الدین قادری صاحب۔

۹/اپریل ۱۹۹۵ء کو ایوان اردو میں "قطب شاہی دور میں شعر و ادب اور فنون لطیفہ کا فروغ" کے موضوع میں جناب ظہیر الدین بابو
خاں ریاستی وزیر کی صدارت میں سیمنار منعقد کیا گیا۔پروفیسر پر مود شنڈے خطاب کر رہے ہیں۔شہ نشین پر: پروفیسر جعفر نظام محمد
منظور احمد صاحب، محبوب حسین جگر صاحب، عزت مآب جناب بابو خاں صاحب، پروفیسر ہیمندر راج سکسینہ اور پروفیسر مغنی تبسم

پریس کانفرنس میں مدعو صحیفہ نگار حضرات

اردو سیمینار ۔ سامعین کا ایک منظر

سلطانہ شرف الدین صاحبہ ، پروفیسر رفیعہ سلطانہ ، ڈاکٹر زیب حیدر ، پروفیسر اشرف رفیع ، مصطفیٰ شروانی صاحب ، عبدالمحمود صاحب ، ادیب و شاعر اور دیگر اصحاب ۔

بتاریخ ۱۶/اپریل ۹۵ء ایوان اردو میں قطب شاہی عہد میں تلگو ادب اور دکنی کلچر کے موضوع پر ایک سمینار تلگو میں منعقد کیا گیا۔ پروفیسر مغنی تبسم خیر مقدم کر رہے ہیں۔ شہ نشین پر تلگو آرٹسٹ چلا بھوانی شنکر، پروفیسر جعفر نظام، ڈاکٹر پی۔ سی۔ ریڈی اور تلگو ادیب پائی سرسوتی دیکھے جاسکتے ہیں۔
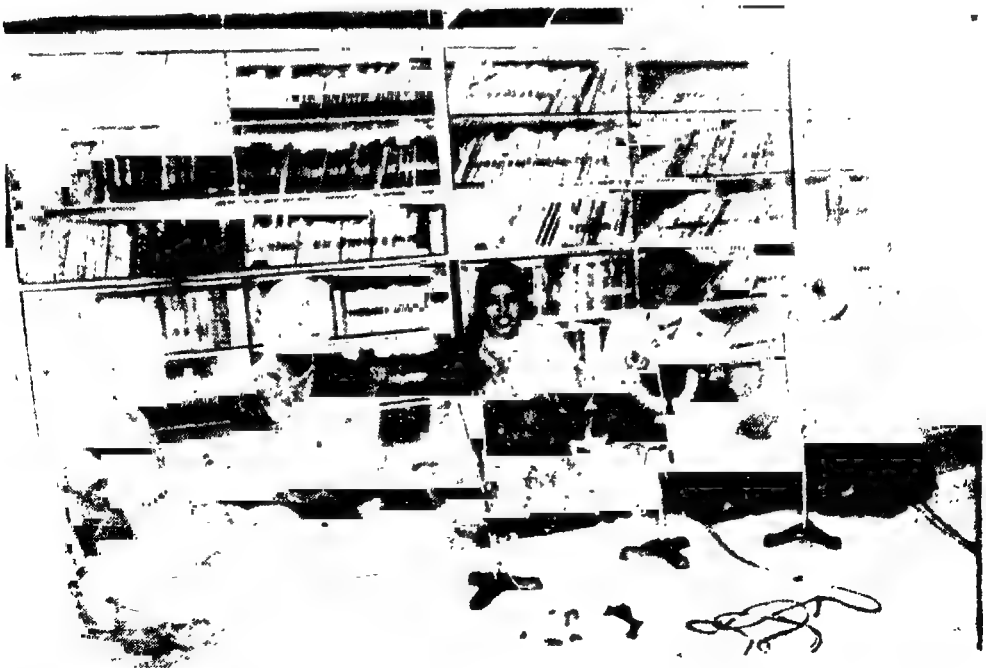
۲۳/ اپریل ۱۹۹۵ء کو ۲ بجے شام اردو گھر مغل پورہ میں شعبہ۔ خواتین ادارہ۔ ادبیات اردو کی جانب سے یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں ایک تہذیبی پروگرام پیش کیا گیا۔طالبات ڈھولک کے گیت پیش کر رہی ہیں۔

۳ بجے اردو کے بلند پایہ صاحب دیوان شاعر اور بانیٔ شہر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے گنبد کے ایک حصے میں سالانہ عوامی مشاعرہ شروع ہوا۔ جناب وقار اسدی (اسٹالگو) نے صدارت کی۔ اس مشاعرے میں یاسمین راشد، افضل تسلیم، ممتاز عابدی، حمید آصف، گلی میر، فریدالدین صادق، ڈاکٹر حسن، حامد محمود، ممتاز دانش، رحمت کوثر، ضیاء عرفان، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، سرور عابدی، سلطانہ شرف الدین، خواجہ ضمیر، عتیق موسوی، محمد منظور احمد، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، واصل صدیقی، ڈاکٹر صادق نقوی، ساغر حیدرآبادی، حمایت سلطانہ، سوز عابدی، راحت عزمی، وقار خلیل، موہن لال نگم، داؤد نصیب اور ڈاکٹر غیاث صدیقی نے کلام سنایا۔ جناب شوز عابدی نے ڈاکٹر صادق نقوی کنوینر مشاعرہ کے تعاون سے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

جناب کرشن کانت گورنر آندھرا پردیش کی تشریف آوری پر صدر ادارہ، معتمد ادارہ اور معزز اصحاب نے ان کا خیر مقدم کیا اور گنبد محمد قلی کے مقابل تیار کردہ خوبصورت شہ نشین کی طرف رہنمائی کی۔ ہزاروں خواتین و حضرات نے تالیوں کی گونج میں گورنر صاحب کو خوش آمدید کہا۔

وندے ماترم سے افتتاحی اجلاس کا آغاز ہوا پھر فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کاروں نے محمد قلی کی مناجات "مرا شہر لوگاں سوں معمور کر" سنائی۔

پروفیسر جعفر نظام صدر ادارہ ادبیات اردو نے خیر مقدمی کلمات کہے اور جناب گورنر صاحب کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ "عصر حاضر میں قومی اتحاد کے رمز شناس اور مشترکہ تہذیب کے علم بردار جناب کرشن کانت نے ہم سب حیدرآبادیوں کا دل جیت لیا ہے۔ یوم محمد قلی سے آپ کی دلچسپی اور حیدرآبادی تہذیب و تمدن سے رفاقت کا جذبہ ہم سب کے لیے قابل تقلید ہے۔"

پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ ادبیات اردو نے سالانہ رپورٹ پیش کی اور ادارے کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تفصیلی طور پر ذکر کیا اور کہا کہ "یوم محمد قلی قطب شاہ ادارے کی ہمہ جہتی سرگرمیوں کا ایک حصہ ہے۔ اردو ہشمول دکنی ادب و کلچر کا تحفظ اس ادارے کا بنیادی مشن ہے۔ پروفیسر تبسم نے ادارے کے اہم کتب خانہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مرکزی حکومت نے کتب خانے کے تحفظ کے لیے خطیر گرانٹ منظور کی ہے اور ریاستی اردو اکیڈیمی نے بھی اپنی اعانت سے کتب خانے کی ترقی اور دیگر امور کی انجام دہی میں عملی تعاون دیا ہے۔"

نامور ترقی پسند رہنما ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے قطب شاہی تہذیب و تمدن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ "قطب شاہی دور میں تہذیب و ادب کے ساتھ ساتھ تجارت کو کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔ قطب شاہوں کی رواداری کا فیضان ہے کہ ان کے دربار میں دکنی کے ساتھ تلگو شاعر بھی اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے۔ یہ تقریب قدیم تہذیبی ورثے کی بازیافت کہلاتی ہے اس لیے آج اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔"

جناب کرشن کانت گورنر آندھرا پردیش نے تالیوں کی گونج میں "سو وشیر" کی رسم اجرا انجام دی اور پہلی کاپی جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست کو نذر کی۔

عالی جناب گورنر صاحب نے افتتاحی خطاب میں شہریوں سے گنگا جمنی تہذیب کے اس شہر کو پاک و صاف رکھنے کی اپیل کی اور کہا کہ اس شہر کو جس کی بنیاد محمد قلی قطب شاہ نے رکھی تھی اور اسے اپنی شریک حیات "حیدر محل" کے نام سے موسوم کیا تھا صاف ستھرا رکھنا اور اس عہد کی تہذیبی روایات کو نئی نسلوں سے روشناس کرانا ہم سب کا فرض بن جاتا ہے۔" گورنر صاحب نے کہا کہ "قطب شاہوں نے اس شہر

کو بسایا اور آصف جاہیوں نے اس کو سنوارنے اور وسعت دینے میں گراں قدر رول ادا کیا ہے۔ " سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے گورنر صاحب نے کہا کہ " ۵ سال قبل جب وہ گورنر کی حیثیت سے یہاں آئے تو جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے پہلی بار اس تقریب میں مدعو کیا تھا۔ مجھے حیدرآباد اور اپنے وطن امرتسر میں ایک طرح کی رفاقت اور یگانگت کا ماحول ملا۔ دکن کی سرزمین پر کئی بادشاہ گزرے لیکن محمد قلی قطب شاہ کی یاد آج بھی باقی ہے۔ " گورنر صاحب نے کہا کہ ملک میں دو ہی جگہیں ایسی ہیں جہاں بادشاہوں نے اپنی محبوباؤں کی یادگاریں قائم کیں، جن میں تاج محل اور حیدرآباد شامل ہے۔ محمد قلی کا پیالہ، شراب کا نہیں محبت کا پیالہ تھا۔ اس نے جس روایت اور تہذیب کو فروغ دیا اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے افتتاحی اجلاس میں انیل بکار گروپ کی طرف سے " قلی قطب شاہ اور بھاگ متی " ڈانس بیلے پیش کیا گیا جسے ہزاروں باذوق اصحاب و خواتین نے مسرت اور انہماک سے دیکھا۔ فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کاروں رکن الدین، خان اطہر، وقار الدین، گائتری راؤ نے محمد قلی اور حیدرآبادی شعرا کا کلام پیش کیا۔ اقبال حسین خاں بندہ نوازی اور ان کے ہم نواؤں نے قوالی پیش کی۔ محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے گنبدان قطب شاہی کو فلڈ لائٹ کے ذریعے بقعہ نور بنایا گیا تھا اور میوزیمس اور حتہ خانوں کو عوام کے لیے کھول دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں جناب محمد عبدالقیوم مددگار ناظم محکمہ آثار قدیمہ کے تعاون کو یاد رکھا جائے گا۔ جناب سید صفی الدین قادری شریک معتمد ادارہ کے شکریے پر یوم محمد قلی قطب کا افتتاحی اجلاس اختتام کو پہنچا۔

سیمینار یوم محمد قلی قطب شاہ

یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں ۹/ اپریل ۱۹۹۵ء کو ۱۰ بجے صبح " ایوان اردو " میں سیمنار بعنوان " قطب شاہی دور میں شعر و ادب اور فنون لطیفہ کا فروغ " کا اہتمام کیا گیا۔ جناب بشیر الدین بابو خاں ریاستی وزیر اقلیتی امور، وقف بورڈ اور اردو اکیڈیمی نے صدارت کی۔ اس سیمنار میں ممتاز مورخوں اور دانشوروں نے مقالے پیش کیے۔ جناب محبوب حسین جگر جوائینٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست اور پروفیسر مہندر راج سکسینہ نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔

پروفیسر جعفر نظام صدر ادارہ نے خیر مقدمی خطاب کیا، موصوف نے جناب محبوب حسین جگر کو حیدرآباد کی ادبی، تہذیبی اور تعلیمی سطح پر شجر سایہ دار قرار دیا اور ادارے کی ترقی میں مرحوم عابد علی خاں اور جگر صاحب کی مخلصانہ مساعی کا ذکر کیا۔ پروفیسر جعفر نظام نے پروفیسر سکسینہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی مقناطیسی شخصیت اور علمیت کو حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کا مظہر قرار دیا اور ادارے سے دیرینہ رفاقت کا ذکر کیا۔ پروفیسر نظام نے ریاستی وزیر جناب بشیر الدین بابو خاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ خاں صاحب عہد حاضر میں اردو اور اقلیتوں کے ہمدرد ہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم، معتمد عمومی ادارہ نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ادارے کی تشکیل جدید کے منصوبوں کو عملی شکل دی جارہی ہے اور اس کے میوزیم کو حیدرآباد میوزیم سے موسوم کیا جاکر سیاحوں کے لیے قابل دید بنایا جائے گا۔ ادارے کے اردو امتحانات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر تبسم نے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے تعاون کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم اردو والوں نے سرکار کی سرپرستی کے بغیر بھی اردو خواندگی کی مہم آگے بڑھایا ہے۔ گزشتہ سال ادارے کے ابتدائی امتحانات میں تقریباً ۱۵ ہزار طلبہ و طالبات نے شرکت کی اور کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے صدر سیمنار جناب بشیر الدین بابو خاں کی اردو دوستی کو خراج تحسین پیش

تے ہوئے کہا کہ خاں صاحب کی شخصی کوششوں سے ریاستی حکومت نے ادارے کے کتب خانہ کے لیے خطیر گرانٹ منظور کی۔

سمینار کا کلیدی اور افتتاحی مقالہ بزرگ معلم پروفیسر ہمندر راج سکسینہ نے پیش کیا اور کہا کہ قطب شاہی سلطنت نے ہند، ایرانی ر کے ساتھ ساتھ آندھرا اور تلنگانہ کی تہذیب کو اپنا کر ایک عالمگیر مثال قائم کی۔ قطب شاہی عہد کی گنبدوں اور مسجدوں میں مقدس کنول پتیاں اور نقش و نگار ہندوستانی تہذیب کا مظہر ہیں۔ قطب شاہی افواج کے دو سپہ سالاروں رستم راؤ اور رگھوتم راؤ کی وفاداری بھی تاریخ ہم باب رہا ہے۔ پروفیسر سکسینہ نے عہد عثمانی تک تہذیبی اتحاد اور میل ملاپ کی مثالیں دیتے ہوئے ڈاکٹر زور کو خراج عقیدت پیش کیا ر کہا کہ آج سے ستر سال پہلے بنسی راجہ کی ڈیوڑھی کے کائستھ پاٹ شالہ میں ڈاکٹر گھوند راج سکسینہ الہام اور ڈاکٹر زور نے انجمن شمع اردو م کی تھی اور یہی "انجمن آج ادارہ ادبیات اردو کی صورت میں روشن ہے۔"

جناب محبوب حسین جگر نے کہا کہ "آندھرا پردیش کے قیام کے بعد توقع بندھی تھی کہ ریاست میں تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی پرستی اور ترقی ہوگی مگر متعدد نمائندگیوں کے باوجود بھی ریاست میں اردو کا موقف ہنوز نااستوار ہے۔"

صدر جلسہ جناب بشیر الدین بابو خاں نے کہا کہ ڈاکٹر زور نے دکن میں اردو کی بڑی خدمت کی ہے، وہ دور حاضر میں دکنی کلچر کے یرکار کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے صدر سمینار جناب بشیر الدین بابو خاں نے کہا کہ "قطب شاہی مران حقیقی معنوں میں سیکولر حکمران رہے ہیں، ان کے زمانے میں حکومت نے "فرمان ہندوی" کے نام سے تلگو اور دکنی میں احکام جاری یے تھے۔ موصوف نے کہا کہ آندھرا پردیش کی سابقہ حکومتوں نے اردو کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ سازشانہ رویے کو پایا، صرف وعدے کیے حق نہیں دیا۔ ہماری حکومت اور میری دلی خواہش ہے کہ ریاست میں اردو کے فروغ اور ترقی کے سلسلے میں ریاستی دو اکیڈیمی سے ہٹ کر ادارہ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو، ادبی ٹرسٹ اور دیگر اداروں کے اراکین کا ایک اجلاس طلب کیا جا کر ریاست ں اردو کے دیرینہ اور نا تمام مسائل کا حل ڈھونڈ نکالا جائے کیوں کہ تلگو دیشم سرکار سننے کی طرف مائل ہے اور حکومت کی جیب سے اردو ل کو بہت کچھ مل سکتا ہے۔ جناب بابو خاں نے اردو گرائمر اسکول پروگراموں کے سلسلے میں عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ اور ادارہ بیات اردو کے اقدامات کی تحسین کی۔ انھوں نے کہا کہ "ہم چاہتے ہیں کہ شہر کے بکھرے ہوئے محلوں میں اردو کے تعلیمی پراجکٹ کو سعت دی جائے اور ہم اسی سال سے اس اسکیم کا آغاز کر رہے ہیں۔

اس سمینار کے پہلے مقرر پروفیسر پرمود شنڈے نے قطب شاہی فن تعمیر پر عالمانہ مقالہ پیش کیا اور کہا کہ قطب شاہی عہد کے تعمیری رثے کو بچائے رکھنا ضروری ہے۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی نے محمد قلی کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس کی عری زندگی کے کرب اور طرب کی آئینہ داری کرتی ہے۔ محمد قلی کی شاعری میں اس کی انسان دوستی اور وسیع المشربی کا واضح طور پر اظہار ملتا ہے۔

پروفیسر سیدہ جعفر سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کہا کہ قطب شاہوں نے تلنگانہ میں پاکیزہ تمدن کی بنیاد رکھی تھی، ہویں صدی میں گولکنڈہ صنعتی اعتبار سے عالم گیر شہرت کا حامل رہا ہے اور یہ علاقہ ہیروں کا شہر کہلاتا تھا۔ ڈاکٹر احمد اللہ خاں ڈائرکٹر دائرۃ

الشریف نے قطب شاہی نظام عدل پر مقالہ پیش کیا اور کہا کہ قطب شاہوں نے غیر مسلم رعایا پر شریعت اسلامی کے نفاذ کی کبھی کوشش نہیں کی اور ان کے مسائل کی یکسوئی کے لیے پنڈتوں کا تقرر کیا تھا۔ ڈاکٹر احمد اللہ خاں نے قطب شاہی "داد محل" کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس محل کے جھروکے میں خود بادشاہ وقت عوام کے مسائل اور شکایات کو سن کر بروقت فیصلے دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صادق نقوی پروفیسر شعبہ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی نے "شاہان قطب شاہیہ اور غیر مسلم رعایا" کے زیر عنوان پر مغز مقالہ سنایا اور کہا کہ قطب شاہی نظم و نسق میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مکمل آزادی حاصل تھی۔ جناب محمد ۱۱۱ار احمد منظور کنوینر سیمینار نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

سیمینار کا دوسرا اجلاس ایوان اردو میں ظہرانے کے بعد ۲ بجے دن پروفیسر سید سراج الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر جعفر نظام صدر ادارہ اور پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ بزرگ ادیب اور ترقی پسند دانشور رہنما ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور کہا کہ قطب شاہی دور میں فن تعمیر، شعر و ادب اور فنون لطیفہ کا فروغ محض اس لیے ہوا کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ریاست میں استحکام تھا۔ ڈاکٹر گوڑ نے مشورہ دیا کہ دکنی ڈرامے اور موسیقی پر بھی کام ہونا باقی ہے۔

پروفیسر سید سراج الدین نے صدارتی خطاب میں کہا کہ "انصاف" کے بغیر حکمرانی کامیاب نہیں ہو سکتی، قطب شاہوں کا استحکام اس لیے تھا کہ وہ انصاف پر مبنی طرز حکومت کے قائل تھے۔ پروفیسر سید سراج نے کہا کہ بھاگ متی اور محمد قلی کی حکایت خلوص و وفا کو صدیوں سے عوام نے تسلیم کیا ہے تو اسے یکسر تسلیم کر لینا چاہیے اور متنازعہ مسئلہ نہیں بنانا چاہیے اور تاریخی آثار کی صیانت کی طرف اولین توجہ دینا بھی قدیم ورثے کی شناخت کے لیے ضروری ہے۔

پروفیسر ایم۔ اے شریف نے کہا کہ قطب شاہی تہذیب کا مکمل جائزہ اسی وقت لیا جا سکتا ہے جب کہ گولکنڈہ، احمد نگر، بیجاپور اور بیدر کی تہذیبوں پر بھی ہماری نظر ہو۔ انھوں نے اس بات پر اظہار تعجب کیا کہ قطب شاہی عہد کی شاعری پر تو بہت کچھ کام ہوا مگر آرکیٹکچر اور پینٹنگس پر ابھی بہت کچھ کام ہونا باقی ہے۔

رائے موہن پرشاد نے اپنے مضمون میں بتایا کہ محمد قلی قطب شاہ کی گنبد سے لے کر قطب شاہی دور کی عمارت پر کنول کا پھول نمایاں نظر آتا ہے، جس سے قطب شاہوں کی وسیع المشربی کا ثبوت ملتا ہے۔ ڈاکٹر راوحا کرشن شرما نے کہا کہ محمد قلی اپنے عہد کے پڑوسی راجاؤں سے خوش گوار مراسم رکھتا تھا، چناں چہ تلگو شعرا نے کھلے دل سے اس کے قصیدے لکھے۔ ڈاکٹر شرما نے تجویز پیش کی کہ قدیم عمارتوں پر ریسرچ کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تعاون و امداد سے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ جناب محمد صابر علی (سالار جنگ میوزیم) نے فن خطاطی کی اہمیت اور افادیت کو اپنے مقالے کے ذریعے واضح کیا۔ ڈاکٹر زینب حیدر۔ جناب محمد عبدالقیوم مددگار ناظم محکمہ آثار قدیمہ اور محترمہ نجمہ السحر نے بھی سیمینار کی دوسری نشست میں اپنے مقالے پیش کیے۔ جناب محمد منظور احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔

مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہ

۹/ اپریل ۹۰ء کو سات (۷) بجے شام "ایوان اردو" میں محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا مشاعرہ ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب صدر ریاستی

جذبی پروگرام میں سامعین کا ایک منظر۔ سامعین میں پروفیسر جعفر نظام، جناب تراب الحسن، جناب منوہر راج سکسینہ، ڈاکٹر مصطفیٰ علی کاظمی، ڈاکٹر بیگ احساس کے علاوہ دیگر ادیب و شاعر

ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد لٹریری فورم اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام ۹ / مئی ۹۵ء کو پاکستانی شاعرہ کشور ناہید کے اعزاز میں ایک جلسہ پریس کلب میں منعقد کیا گیا۔ پروفیسر شیو کے۔ کمار نے صدارت کی۔ تصویر میں: پروفیسر مغنی تبسم مخاطب کر رہے ہیں مسند نشین پر کشور ناہید، جیلانی بانو، مظفر مجاز اور حسن فرخ

جلسے کے آغاز سے قبل سامعین کا ایک منظر۔
کشور ناہید، جیلانی بانو، پروفیسر حبیب ضیاء، قمر جمالی، پروفیسر یوسف کمال، پروفیسر شیو کے۔ کمار، ریاست علی تاج، پروفیسر جعفر نظام، مصحف اقبال توصیفی اور دیگر ادیب و شاعر

انجمن ترقی اردو کی صد سالہ تقریب میں قرأت ہوا۔ ڈاکٹر مجتبیٰ نے تمہیدی تقریر کی اور مشاعرہ کی نظامت کے لیے جناب مصحف اقبال توصیفی کو
دعوت دی۔ اس مشاعرے میں قدیم اور جدید طرز سخن کے (۳۰) شعرا نے کلام سنا کر داد پائی۔ جناب ولی قادری، شیخ [illegible] نظامی اور
جناب خلیل الرحمٰن [illegible] نے بحیثیت مہمانان خصوصی شرکت کی۔ اس مشاعرے میں سعید شہیدی، ڈاکٹر علی احمد جلیلی، پروفیسر
مغنی تبسم، رشید آذر، پرنس لعل علی خاں ثاقب، ولی قادری، حامد بن شبیر، ڈاکٹر عقیل، علی الدین نوید، جہاں دار افسر، اثر غوری، محمد منظور
احمد منظور، ڈاکٹر محمد علی اثر، صلاح الدین نیر، ریاست علی تاج، ستار صدیقی، سلطانہ شرف الدین، ڈاکٹر صبیحہ نسرین، عطا شہیدی، فیض الحسن
خیال، راز عابدی، رؤف شاداب، عزیز بھارتی، غضنفر علی باقری، جوہر ہاشمی، اختر زاہدی، مومن خان شوق، ڈاکٹر سید حسن، افضل تسلیم، نیہپال
سنگھ ورما، رحیم اختر، شفیع اقبال، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، قمر الدین صابری، صادق نوید، حمید آصف، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، رحمت کوثر، سوز
عابدی، مظہر مہدی، نصرت محی الدین اور ناظم مشاعرہ مصحف اقبال توصیفی نے کلام سنا کر داد پائی۔

تلگو اجلاس
قطب شاہی دور میں تلگو ادب اور دکنی کلچر

۱۶ / اپریل ۹۵ء کو ۱۱ بجے دن "ایوان اردو" میں تلگو اجلاس منعقد ہوا۔ سرکردہ تلگو ادیبوں اور صحافیوں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر پی۔
ایس ریڈی نے اجلاس کی صدارت کی۔ پروفیسر جعفر نظام صدر ادارہ نے خیر مقدمی کلمات کہے اور مقررین کا خیر مقدم کیا۔ پروفیسر نظام نے
کہا کہ "ہماری ریاست محمد قلی کے عہد سے آج تک لسانی اتحاد کی مظہر رہی ہے۔" انھوں نے تلگو، اردو قلم کاروں کو ایک دوسرے کے قریب
آنے کا مشورہ دیا۔

مسٹر ڈی مرلی دھر نے گولکنڈہ اور ریاست حیدرآباد کی تاریخ کا تقابلی جائزہ لیتے قطب شاہوں کی طرز حکمرانی کو [illegible] سیکولرزم کا
نام دیا۔

تلگو شاعرہ اور قلم اسٹوری رائٹر مسز لیلاوتی سرسوتی نے عہد ابراہیم قطب شاہ کی مذہبی یک جہتی اور لسانی ہم آہنگی کے تناظر میں کہا کہ
"تلگو عوام ابراہیم قلی کو "ملک ابراما" کہتے تھے۔ اور ان کی رام جیسی پرستش کرتے تھے۔ مسز بھوانی شنکر نے جو کئی تلگو فلموں کے آرٹسٹ
رہے ہیں، مہمان خصوصی کے طور پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جس زبان کے شعر و ادب میں زندگی کی ترجمانی و اعلیٰ اقدار شامل ہوں وہ زبان
کبھی مر نہیں سکتی۔ محمد قلی سے لے کر اقبال اور تلگو شاعر ستارے تک جس طرح شعر و ادب کا ارتقا ہوا ہے وہ لازوال ادبی ورثہ ہے۔ انھوں
نے اردو اور تلگو والوں سے اپیل کی کہ وہ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کو عوام تک پہنچانے میں حصہ لیں۔

ڈاکٹر پی۔ ایس ریڈی نے صدارتی تقریر میں کہا کہ محمد قلی تین زبانوں کا شاعر تھا۔ دکنی، فارسی، اور تلگو میں اس نے شعر کہے جو
ہمارے شعری ادب کا لازوال ورثہ ہے۔ ڈاکٹر ریڈی نے تجویز پیش کی کہ محمد قلی کے عہد اور فن پر ڈاکٹر [illegible] کیا جانا چاہیے۔
پروفیسر مغنی تبسم [illegible] کے شکریے پر یہ محمد قلی قطب شاہ سلسلہ کا تلگو اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

تہذیبی پروگرام

اتوار ۲۳ / اپریل کو ۴ بجے شام بمقام "اردو گھر" مغل پورہ میں یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب سلسلے میں آخری تہذیبی پروگرام ڈھولک کے گیت، دکنی گیت، براکتھا اور بیلے کا بہ تعاون سرور ڈنڈا میموریل سوسائٹی باذوق خواتین و حضرات کی موجودگی میں منعقد ہوا۔ محترمہ انیس حسن الدین نے صدارت کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ قطب شاہوں اور آصف جاہوں نے حیدرآباد فرخندہ بنیاد کو جن اعلیٰ وارفع اقدار اور تہذیب سے آراستہ کیا ہے اور زندگی کی مبارک اور صالح اقدار کی جس طرح آبیاری کی ہے، اس تناظر میں آج کے اچھے اور سچے شہریوں کا فرض ہے کہ وہ اس تہذیب اور ان اقدار کو مزید تابناک بنائیں۔ مہمان خصوصی محترمہ لکشمی دیوی راج نے ادارہ ادبیات اردو سرگرمیوں اور اس کے بانی معتمد ڈاکٹر زور کے علاوہ کارکنان ادارہ کی خدمات کو سراہتے ہوئے اس یادگار اور بے حد مقبول تہذیبی شام کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔ جناب منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے بھی مخاطب کیا اور کہا کہ حیدرآباد کو دنیا بھر میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ شہر ایک خاتون کے نام سے منسوب ہے۔

اس تہذیبی پروگرام میں پرنسس عیسن ایجوکیشنل سنٹر اور نامپلی ہائی اسکول (گاندھی بھون) کی طالبات اور طلبہ نے رنگارنگ کلچرل پروگرام ڈھولک کے گیت، بتکما پیش کیا۔ اعجاز مصباح الدین نے سرور ڈنڈا کا دکنی کلام سنا کر داد حاصل کی اور پھر انھوں نے ایم کے حسینی کے اشتراک سے براکتھا کا مقبول عام آئٹم پیش کیا۔ نامپلی ہائی اسکول کے طلبہ نے تلگو کا مقبول آئٹم بتکما کا مظاہرہ کیا۔ جناب اسلم فرشوری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ تہذیبی پروگرام کی کنوینرس محترمہ فاطمہ عالم علی صاحبہ اور پروفیسر اشرف رفیع نے انتظامات کی نگرانی کی آخر میں تمام فن کاروں کو ادارہ سیاست کی طرف سے کتابوں کی صورت میں تحفے دیے گئے اور ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے خوب صورت میمنٹو صدر ادارہ پروفیسر جعفر نظام نے پیش کیا۔ جناب سید تراب الحسن آئی۔ اے۔ ایس ریٹائرڈ کے ہاتھوں فن کاروں نے تالیوں کی گونج میں تحفے قبول کیے۔ جناب سید لطیف الدین معتمد سرور ڈنڈا میموریل سوسائٹی نے شکریہ ادا کیا۔

○ ○ ○

نقد و نظر

[تبصرے کے لیے دو کتابیں بھیجی جائیں۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

نام کتاب: ذروں سے ستاروں تک (شاعری) مصنف: اکبر حیدرآبادی سائز: ۸/ اڑہائی

صفحات: ۱۶۷ قیمت: ۵ پونڈ ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، لال کنواں، دہلی

اردو کے معروف شاعر اکبر حیدرآبادی کا یہ تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو شعری مجموعے ------------ اور نئو کی آگ شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں ۱۳۲ غزلیں، ۱۸ نظمیں اور چند رباعیات شامل ہیں۔ ان میں سے بیش تر تخلیقات برصغیر اور انگلستان کے جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔

اکبر حیدرآبادی نے جب شعر گوئی کا آغاز کیا ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ وہ اس تحریک سے وابستہ تھے اور آج بھی ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کبھی نعرہ بازی کا شکار نہیں ہوئی۔ اسی طرح روایت پسندی سے بھی انھوں نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ ابتدا ہی سے انھوں نے غزل کو اپنا خاص فن ٹھہرایا اور اس صنف سخن میں ایک انفرادی رنگ پیدا کیا۔ ان کی شاعری میں مسلسل ارتقا ہو رہا ہے۔ چناں چہ اس مجموعے کی تخلیقات میں عصری حسیت کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایسے شاعر کا کلام ہے جو بیسویں صدی کی ساتویں آٹھویں دہائیوں میں سیاسی، اقتصادی، اخلاقی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں، سائنسی انکشافات اور ٹکنالوجیکل ترقی اور اس کے اثرات سے باخبر نہیں بلکہ اپنے فکری اور جذباتی ردعمل کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔

اکبر حیدرآبادی اگرچہ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں اور ان کا شعری سرمایہ زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے لیکن وہ نظم کے بھی اچھے شاعر ہیں۔ اس مجموعے میں شامل نظمیں بالخصوص "سوال بے جواب"، "ناممکن"، "کتنا وقت گذر جانے پر"، "خوف کا زینہ" جدید دور کے ایک اچھے نظم نگار شاعر کی حیثیت سے انھیں روشناس کراتی ہیں۔ ان سے یہ خواہش بے جا نہ ہوگی کہ وہ آئندہ اس صنف پر زیادہ توجہ دیں۔ اردو میں نظمیہ شاعری مسلسل روبہ انحطاط ہے اور اس کو سنبھالا دینے کی شدید ضرورت ہے۔

(مغنی تبسم)

نام کتاب: جلیں آتش کدے (شاعری)   مصنف: منظور الامین   سائز: ۸/۱ ڈیمائی   صفحات: ۳۰۰

قیمت: ۶۰ روپے   ملنے کا پتہ: مصنف - بی [illegible] اپارٹمنٹ - روڈ نمبر ۲، بنجارہ ہلز - حیدرآباد۔

منظور الامین کی نظموں کا مجموعہ "جلیں آتش کدے" اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نظموں کے اس مجموعے میں کچھ ایسی
...ہیں جو کلی طور پر غالباً اس سے قبل کبھی پیش نہیں کی گئیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب نہ صرف بے مثال ہے بلکہ ادبی
...قوں میں نئی راہ شروع کرنے والی بھی۔

شاعری کی ایک خوبی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جو کچھ شاعر پر گزرے وہ ان تجربات اور احساسات کو من و عن اپنے اشعار میں ڈھال
ے۔ نفسیات اور انسانی جبلت کا خاصہ ہے کہ جو کچھ ہم تجربہ کرتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں یا جو ہمارے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں، دل
ہتا ہے دوسرے بھی اس تجربے میں شامل ہوں اور دوسروں کو بھی ہمارے مشاہدات، احساسات، اور جذبات کا پوری طرح اندازہ ہو جائے
یر نظر مجموعہ شاعر کے تجربات، مشاہدات اور احساسات کا وہ ذخیرہ ہے جو انھیں کشمیر کے طویل قیام کے دوران حاصل ہوا۔ وہاں برف ہی
ف دیکھ کر شاعر کے دل میں جو خیالات پیدا ہوئے ہیں ان کی عکاسی ان نظموں اور غزلوں میں ملتی ہے۔ برف کے نہ صرف حسین مناظر اور
ش نما ماحول سے شاعر متاثر ہوا ہے۔ بلکہ برف کے جان لیوا طوفانوں اور دل آزاریوں سے بھی دوچار ہوا ہے اور یہی سب کچھ شاعر نے
ین کے پیش نظر کر دیا ہے۔

امین صاحب کا انداز شعر گوئی منفرد ہے۔ وہ خود اپنی طرز کے مالک ہیں۔ کسی کی چھاپ ان پر نہیں لگائی جا سکتی۔ کلام میں اثر اور زور
یاں ہے اشعار میں بڑی روانی ہے اور بے ساختگی ہے۔ شاعر نے تمام تر نظموں، غزلیات اور رباعیات کا موضوع برف کو ہی بنایا ہے۔
رف کو دیکھ کر خود بقول شاعر:

دیکھ کر برف کی ایسی جادو گری   قلب شاعر میں آشفتگی جاگ اٹھی

ہماری ادبی تصانیف میں غالباً یہ بھی پہلی مثال ہے جب کہ نظموں کا مجموعہ صرف ایک ہی موضوع پر ہو۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

برف کے کوہ، برف کی دیوار   برف کے گھر ہیں، برف کے اشجار
برف کھلیان، برف ہی انبار   گرم رکھنے کو برف ہی کے شرار
گلشنوں میں نہ رنگ و بو کا نکھار   زیست بوجھل، گھٹن، گراں، دشوار
سرد و جامد ہے برف کی آواز

شاعر نے برف سے متعلق سائنسی توجیہ پیش کی ہے۔ برف کیوں گرتی ہے؟ کیسے گرتی ہے؟ کس طرح یہ جڑی جڑی [illegible] شکلیں اختیار
کر لیتی ہے؟ گلیشیر اور آئس برگ کیا ہیں؟ کس طرح بنتے ہیں؟ اور اس قسم کے کئی سوالات کا جواب اس حرف [illegible] میں [illegible] دوسری نوعیت
[illegible] ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ برف کہاں کہاں پائی جاتی ہے؟ کون سے [illegible] برف [illegible] برف کے ذرا [illegible]
[illegible] آسکتے ہو [illegible] برف کے اثرات کم کر کے اور کر [illegible]

زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔ ذیرہ آور اور شناخت کو مفاہیم کی سطح پر قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ ہر دو صورت میں کہیں کہیں الفاظ کی ہیئت نے مفاہیم کو آوارہ کر دیا ہے۔

"قدیر زماں" کے پاس متضاد خیالات سے معنی پیدا کرنے کا فن موجود ہے۔ اس کی مثال ان کی کہانی "بے مثال" ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"کبھی کبھی بچے واقعات بھی بڑے دل چسپ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ کبھی جھوٹی اور من گھڑت باتیں بھی بڑی دل چسپ ہوتی ہیں۔ لیکن تم دونوں بھی اس واقعے کو سن چکے ہو۔ تو اس کو دہرانے سے کیا حاصل؟۔۔۔۔۔۔ باتیں دہرانے سے اور بھی سچی ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی ان میں، ہماری دل چسپی بڑھ جاتی ہے۔"

"پاڑا" میں ثابت کیا گیا ہے کہ انسان ہو یا جانور راضی بہ رضا ہو تو سب کا چہیتا ہے۔ اس افسانے میں یہ بات کبھی اختتام پر سامنے آتی ہے کہ جانور کی مرضی کے بغیر اس کی خصی کر دی جاتی ہے جبکہ انسان ہر غلط کام اپنی مرضی سے کرتا ہے۔

"رات کا سفر" داستانوی انداز میں تحریر کردہ جنس کا افسانہ ہے۔ "آوازیں" فلسفیانہ سوچ کی زین ہے۔ "امن کی بستی" ملک کی آزادی اور تقسیم کا المیہ ہے۔ "دودھ کے دانت" میں تخیل سے معقول اور مناسب استفادہ کیا گیا ہے۔ "جہاں گزراں" مفاہیم کی سطح پر قبول کی جا سکتی ہے۔ "کچھوے کی واپسی" میں تخلیقی صلاحیت سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ قدیر زماں نے "کچھوے کی واپسی" لکھا نہیں ہے افسانے نے اپنے آپ کو لکھوا لیا ہے۔ "بڑی چڑی" ایک زندہ کہانی ہے اور زندہ مسائل کو لے کر لکھی گئی ہے۔ اس کہانی میں "مٹی کا ڈھیلا" کہیں زندگی، کہیں دکھ اور کہیں HIAERARCHY کی علامت بنتا ہے۔

قدیر زماں کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ جملے دیر تک ذہن میں گونجتے ہیں:

"۔۔۔۔ تمھیں کسی اور سے رجوع ہونے کی ضرورت صرف اس وقت ہوگی جب تم خود کشی کرنا چاہو گے۔ ویسے یہ بات اٹل ہے کہ تم اس تجربے کا فائدہ نہ اٹھا سکو گے۔" (فریاد)

"۔۔۔۔ ہم لوگ تعداد میں بہت زیادہ ہیں اس لیے ہمارے اختلافات بھی زیادہ ہیں۔" (الاؤ)

"اب آپ کسی ایسی دکان پر چلیے جس کی ترازو میں ڈنڈی نہیں ہے۔" (شناخت)

"جسے بھولنے کی عادت ہو اسے بالکل نہیں بولنا چاہیے۔" (بے مثال)

"کوئی ملے یا نہ ملے، رات دیر گئے گھر جا کر پھر ایک نئے خواب کی امید میں بستر پر جا لیٹتا۔" (بڑی چڑی)

"گہری نیند سو کر اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ نیم خوابی ہی میں اس نے سارے خواب دیکھے تھے۔" (بڑی چڑی)

"تم اس طرح میری طرف نہ دیکھو۔ میری بدنامی ہوگی اور تمھارا ایکا پن بھی آشکار ہوگا۔" (رات کا سفر)

"۔۔۔۔ وقفہ بھی کتنا طویل ہوتا ہے کہ ڈھیر سارے کام کر لو اور کلاس میں آ کر بیٹھو تو گھنٹی بجتی ہی نہیں ہے۔ لیکن ایک کلاس سے دوسری کلاس، ایک سال سے دوسرا سال کوئی وقفہ نہ تھا۔" (جہاں گزراں)

"وقت کھڑا ہی رہا۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ لیکن میرے یہ سارے بال سفید ہو گئے۔" (جہاں گزراں)

[illegible] نقوش حیات [illegible] ریاست علی تاج

سالِ اشاعت: ۱۹۹۰ء [illegible] صفحات: ۱۴۴ مجلد قیمت: ۸۰ روپے

ناشر: مصنف 2 / 23-1-278 جعفری گلی، کوٹلہ عالی جاہ، حیدرآباد - 500023

آج جب میں ریاست علی تاج کے "نقوش حیات" تلاش کرنے نکل پڑا ہوں تو یہ معلوم ہوا کہ ان کے نقوش، آج کے محاورے کسی سیٹیلائٹ (Satellite) کے Foot Prints سے کم نہیں، جس کا نظام نشریات دور دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ سیٹیلائٹ کی طرح تاج کے موضوعات کا احاطہ دور دور تک نمایاں ہے۔ جن امور حیات کو انھوں نے شعر کا موضوع بنایا ہے ان میں بڑا تنوع ہے۔ موضوعات میں فضائی آلودگی بھی ہے، خراب و خستہ سڑکیں، جھونپڑیوں کی زندگی بھی ملتی ہے، رنجشیں، جھگڑے، تنافر اور تلخیاں بھی ہیں، عید تہوار بھی --- اور ان تہواروں سے جڑے ہوئے نسلی اور مذہبی فسادات بھی ---- چاند کا سفر بھی ہے اور اسکائی لیب بھی۔ اس طرح کے اشعار مطرح نو الجھن کہ ماحدت پسند اقتادہ ازم" کی تفسیر دکھائی دیتے ہیں۔

تاج نے شاعری کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ ہاں ذریعہ اظہار ضرور بنایا ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کو پڑھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ زبان پر انھیں مکمل دسترس حاصل ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے اس لیے ان کی سوچ کا کینوس بہت وسیع ہے۔ انھوں نے لفظوں سے جو حسیاتی پیکر تراشے ہیں، انھیں آپ تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں:-

ریشم کا گستاخ - دوپٹہ
راز بدن کے کھول رہا ہے

یا پھر یہ شعر:

گھنا جنگل، حسیں برگِ درختاں
شفق گوں شام کتنی دل کشا ہے

تاج کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے، ان کے دل نے جو بھی محسوس کیا ہے، وہ ان احساسات اور تاثرات کو آسانی سے لفظوں کا روپ دے دیتے ہیں، لیکن یہ پیرہن چوڑی دار پائجامہ نہیں کہ جس کے اندر جاؤ تو آسانی سے باہر نہ نکل سکو۔ ان کے یہاں نہ تو تعقید لفظی ہے اور نہ تعقید معنوی۔ ان کے یہاں عام ابہام "ترسیل کا المیہ" بھی نہیں ملتا بلکہ "از دل خیزد، بر دل ریزد" والی کیفیت ہے۔ ان کے الفاظ میں ہے۔ الفاظ جو دو روحوں کے درمیان مادے (Matter) کا پل ہیں۔

ریاست علی تاج ایک اچھے شاعر، ایک اچھے فن کار، ایک اچھے تخلیق کار ہیں۔ برسوں تک وہ تعلیم و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے ہیں اور اسی کے سیاق و سباق میں بحیثیت معلم، وہ موٹر کے Spark - Plug کی طرح ہیں جو کار کو Ignition دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ طالبان علم کے دلوں میں علم و فن کی سچی لگن پیدا کرتے رہے ہیں۔ علم کے ساتھ ساتھ آئے دن ان کے مشاہدات اور تجربات زندگی نے ان میں وہ نظر پیدا کی ہے جو دور بین بھی ہے اور گہری بھی۔ چناں چہ تاج حقیقت کی دہلیز تک آکر ٹھہر نہیں جاتے بلکہ اس کی تہہ کو بھی پا جاتے ہیں اور پھر اپنے شعر کے ذریعے، تنگ نظری، بکم عصری، اوہام اور تعصبات کا پردہ چاک کر دیتے ہیں۔

ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں عید، تہوار جب بھی آتے ہیں لوگ شہروں سے بھاگ جاتے ہیں کیوں کہ "شہر میں

یں کمال و ہنر یوں ہی نہیں آجاتا۔

میرا خیال ہے کہ دور افتادگی، کم آمیزی اور ضروریات سے زیادہ عجز و انکسار نے، انھیں نقصان پہنچایا ہے لیکن واقعتہ، تاج کی اہل ایسی پذیرائی کرنی چاہیے کہ ان کا مقام واقعی ان کے نام کے مطابق ہی ہو۔

(منظور الامین)

نام کتاب : اردو مثنوی مطالعہ اور تدریس مصنف : ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

سنہ اشاعت : ۱۹۹۲ ، سائز : ۱/۸ ڈیمائی صفحات : ۲۱۲

قیمت : سو روپے ناشر : مصنف ڈی ۷ / سی ۱ موتی باغ ۱ نئی دہلی - 110021

قدیم اردو ادب پر مصنفہ کی تحقیقی و تنقیدی نظر بطور خاص رہی ہے۔ ان کی پہلی تحقیقی کاوش "ریاست میسور میں مثنوی کا ارتقا" پر ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی گئی تھی۔ بعد ازاں ان کی ادبی اور لسانی تلاش و جستجو کا سفر مختلف ابعاد میں جاری ہے۔ ان کا اصل میدان اردوئے قدیم اور دکن ہے اور اس میں بھی تخصیص، صنف مثنوی کو حاصل رہی ہے۔ علاوہ ازیں، لسانیات، قواعد زبان اور مثنوی ان وب موضوعات تحقیق ہیں۔ پیش نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

یوں تو مثنوی پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور انتخابات شائع کیے جا چکے ہیں لیکن کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے طلبہ کی ضروریات اور ان کے مسائل کے پیش نظر لکھی جانے والی اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں مثنوی کا ابتدائی تاریخ اور ی تدریس کے اصول سے بات شروع کر کے بلا امتیاز زماں و مکاں ہندوستان کے مشہور و معروف بلکہ مستند مثنوی نگاروں کے انتخاب بش کیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں فاضل مصنفہ نے نمونہ کلام پیش کرنے سے پہلے متعلقہ شاعروں کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں سے بھی طلبہ کو راہ طور پر روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں حضرت شاہ برہان الدین جانم سے لے کر میر حسن اور دیاشنکر نسیم لکھنوی تک مثنوی نگاروں کی کل بائیس عدد مثنویاں شامل کی گئی ہیں۔

پیش نظر کتاب میں اردو کی اب تک کی نو دریافت اور مسلم الثبوت مثنویوں کو اس نقطہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ علموں کو سردست ایسا مواد مل سکے جس سے اردو مثنوی کی واقعی اہمیت کا اندازہ ہو اور ایک ساتھ مطالعے کا موقع بھی ملے۔ اس کے لیے نہ نے مثنوی کی علاقہ اور مختلف ادوار پر مبنی مروجہ تقسیم سے قصداً انحراف کیا ہے اور انھیں ایک دھاگے میں تاریخ وار پرونے کی ما کی ہے۔ اس اعتبار سے اس میں دکن کے مذکورہ بالا شاعر کے علاوہ عبدل بیجاپوری، احمد گجراتی، صنعتی بیجاپوری، رستمی بیجاپوری، ابن گولکنڈوی، ملا نصرتی بیجاپوری، روشن علی سیار نگ پوری اور سراج اورنگ آبادی کی مثنویاں شامل ہیں۔ اسی طرح شمالی ہند کے سودا اور علاوہ اسمٰعیل امروہی کی مثنویاں بھی منتخب کی گئی ہیں۔

کتاب کے اولین حصے میں اردو مثنوی کی ابتدا سے بحث کی گئی ہے نیز قدیم مثنویوں کے سماجیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً

قدیم مثنویوں کے موضوعات اور ان کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے۔

لیکن اس کتاب کا حاصل مطالعہ مضمون "تدریس مثنوی" ہے جس میں بعض قابل قدر اصول مدلل طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ اس سے طلبہ کو مثنوی کے قصے کا ماخذ، قدیم مثنویوں میں تاریخ تصنیف کی نشان دہی، تحریر مثنوی کی مدت، اور قدیم مثنویوں میں مثنوی کے نام کی صراحت وغیرہ کی تفہیم میں مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ مثنویوں میں شامل غزل، رباعی، اور قصیدے وغیرہ کی بحروں کی شناخت کو سہل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

"اپنی بات" کے تحت مصنف نے اس کتاب کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کے بعد، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ سے کتاب کی اشاعت کے لیے ملی جزوی مالی امداد کا بہت خوش اسلوبی سے اعلان اور شکریہ ادا کیا ہے۔

عمدہ کاغذ، نفیس طباعت، مضبوط جز بندی، پادبونڈ اور دیدہ زیب سرورق کتاب کے حسن باطن کے ساتھ ساتھ خارجی حسن میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ آخر میں بقول مصنف، "مجھے امید ہے کہ قارئین کو یہ نئے ڈھنگ کی کوشش پسند آئے گی۔"

(پرویز شہریار)

نام کتاب: بت خانہ خلیل (شاعری) مُصنف: حافظ خلیل حسن خاں خلیل مانک پوری

مرتب: ڈاکٹر علی احمد جلیلی ملنے کا پتہ: مرتب۔ ۱/۳۴۷۔۱۔۲۲، جلیل منزل سلطان پورہ۔ حیدرآباد۔ ۲۴

سائز: ۸/اڈیمائی صفحات: ۲۴۰ غیر مجلد قیمت: ساٹھ روپے

ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے نہایت جاں فشانی سے مثنوی مذکور کا جو ہندی کی شہرہ آفاق تصنیف "پدماوت" کا منظوم ترجمہ ہے، ملک محمد جائسی کی اس نظم کا دیگر اردو تراجم سے موازنہ کرکے خلیل کی مثنوی کے معیار کا تعین کیا ہے۔ کتابیات کے عنوان سے اٹھارہ کتابوں کی تفصیل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے کس محنت شاقہ سے دیگر مثنویوں کو سامنے رکھ کر ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔ نیز کتاب کے مصنف حضرت خلیل حسن خاں خلیل اور حضرت فصاحت جنگ جلیل مانک پوری کی اس دعا کو مستجاب کیا ہے کہ "فسانہ ہو ہر سو کہانی مری۔"

پدماوت کے مصنف ملک محمد جائسی سولھویں صدی عیسوی کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔ ۱۴۹۳ء ملک جنگ وہ ایک غریب کسان خاندان میں پیدا ہوئے۔ زندگی بھر فقراء و مساکین کی صحبت اختیار رکھی۔ حسن صورت سے گو علاقہ نہ تھا لیکن حسن سیرت کے گل بوٹوں نیز شعر و سخن کی اعلیٰ صلاحیتوں نے ان کی زندگی کو ایک معیار عطا کیا تھا۔ ملک محمد جائسی نے یوں تو متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن "پدماوت" نے انھیں دنیائے ادب میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ بقول علی احمد جلیلی، ہندی والوں نے بہ اعتبار زبان، معانی، ترتیب و تسلسل، سیرت نگاری اور اسلوب نگارش پدماوت کو ہندی ادب کا ایک جگمگاتا ہیرا کہا ہے۔ اردو والے مثنویوں کے زمرے میں اس کی جس قدر تعریف کی

اس مثنوی کا آغاز حسب روایت حمد و نعت سے ہوتا ہے اس کے بعد والی ریاست بلرام پور سر مہاراجہ [illegible] پرساد سنگھ بہادر کی مدح ہے جن کی سرپرستی میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے۔ پھر آغاز داستان کے عنوان سے مثنوی شروع ہوجاتی ہے۔ اس مثنوی میں پچیس (۲۵) ذیلی عنوانات ہیں جن کے تحت داستان رواں دواں ہے۔ اس کتاب میں اصل مثنوی ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے (۱۳۲) صفحات پر مشتمل دلچسپ اور پر مغز مقدمہ لکھا ہے۔ (۲۲۴۳) اشعار میں ملک محمد جائسی کی پدماوت کے اس منظوم ترجمہ کو مکمل کیا گیا ہے۔ عنوان کتاب پر "خلیلی مثنوی" لکھا ہے۔ یہ خلیل حسن کی خلیلی مثنوی ہونے کی وضاحت ہے۔ بعض اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مترجم شاعر اپنے پیش رو متقدمین شعرا کے کلام سے بخوبی واقف تھے۔ نمونۂ کلام:

کرشموں نے بھی کچھ نہ ٹوکا رے — نہ غمزوں نے بھی ہائے روکا رے
یہ پازیب پاؤں پڑتی ذرا — کمر کی دھمک تو پکڑتی ذرا
یہ منھ دیکھتی آرسی کیوں رہی — یہ منھ باندھے چمپا کلی کیوں رہی
نہ چوڑی نے بھی ہاتھ پکڑا ذرا — نہ زنجیر نے پاؤں جکڑا ذرا
چل اب یاں سے جگنی سرک دور ہو — نہ سینے پہ میرے چمک دور ہو
گلا چھوڑ دے اے لڑی تو بھی اب — نہ رہ ناک میں نتھ پڑی تو بھی اب
کلائی مری چھوڑ کنگن ذرا — سرک میرے بازو سے جوشن ذرا

خواصیں کنیزیں طرح دار سب — شراب جوانی سے سرشار سب
کوئی گل بدن ماہ پارا کوئی — کوئی چاند اس میں ستارا کوئی
ہر انداز میں سینکڑوں ناز تھے — ہر اک ناز میں لاکھوں انداز تھے
مسی کی دھڑی سب جمائے ہوئے — دوالی کا کاجل لگائے ہوئے
سراپا ادا شوخ طناز سب — ستم کوش ، سرمایہ ناز سب
شگفتہ تھا چہرہ ، ابلتا تھا رنگ — ٹپکتا تھا جوبن ، اچھلتا تھا رنگ

بت خانہ خلیل اگرچہ ایک خیالی داستان کا منظوم ترجمہ ہے لیکن جس حسن و خوبی کے ساتھ لکھی گئی ہے اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کی لطافت سے شعر و سخن کے چاہنے والے محظوظ ہوں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ساری مثنوی مرصع شعر گوئی کی مکمل صلاحیتوں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

مثنوی کے آخر میں خاتمہ کے عنوان سے خلیل مرحوم نے آٹھ شعر کہے ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس مثنوی کی ترقیم سے محض دل کا بہلانا ہے ورنہ نمود، صلہ و ستائش، تکبیر و تعبیر کے دعوے سے یہ مبری ہے۔ مقدمہ کے آخر میں راقم کا قطعہ تاریخ درج ہے۔

(ڈاکٹر سید عباس متقی)

○ ○ ○ ○ ○ ○ ○

نام کتاب : رقصِ تنہائی (مجموعہ کلام)　　مصنف : علی اصغر

سائز : ۱/۸ ڈیمائی　　صفحات : ۱۴۸　　قیمت : پچاس (۵۰) روپے

ناشر : مکتبہ شعروحکمت ، ۲ / ۶۔۳۔۶۵۷ سوماجی گوڑہ ، حیدرآباد ۔۵۰۰۰۸۲

حیدرآباد کے نئے اور پرانے شاعروں کے کلام کے مجموعوں کا ایک سیلاب آئے دن میرے پاس آتا رہتا ہے۔ یہ ایک قابل فہم بات ہے کیوں کہ جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے، اردو شاعری میری پہلی محبوبہ ہے۔ ابھی چند روز قبل حیدرآباد کے ایک نوجوان شاعر علی اصغر نے اپنا شعری مجموعہ "رقص تنہائی" میرے ہاں بھجوایا۔ یہ شاعر انگریزی کے لکچرر ہیں، جس کے باعث شاید نظم نگاری کے ان کے تناظر میں وسعت پیدا ہوئی ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دانستہ یا شعوری طور پر کسی مغربی شاعر، برطانوی، امریکی یا یورپی سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے غائر مطالعے کے بعد سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اردو زبان کے استعمال اور اس کی موضوعاتی وسعت میں علی اصغر اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ وہ اردو زبان کو اس کی ساری نزاکتوں کے ساتھ بڑے اعتماد سے برتتے ہیں۔ اردو اور ہندی کی ہلکی آمیزش ان کے کلام میں بھلی لگتی ہے اور عام بول چال کی زبان میں اظہار کا میلان ان کی شاعری کو دل پذیر بناتا ہے۔ اس ضمن میں مثال کے طور پر ان کی نظمیں "بھوکا پریوار"، "جنت"، "میرے ابا" اور "نیلام گھر" پیش کی جاسکتی ہیں۔ بیش تر ہم عصر اردو شاعروں کے برعکس علی اصغر جذباتیت کی رو میں بہہ جانے سے احتراز کرتے ہیں کیوں کہ وہ بنیادی طور پر زندگی کی تاریک حقیقتوں کے انکشاف سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ امر باعث حیرت نہیں کہ وہ روزمرہ زندگی کے تجربات سے اپنے استعارے اور تشبیہات اخذ کرتے ہیں اور پھر ان میں گہری فکر کا عنصر شامل کردیتے ہیں۔ اس مجموعے کی نظموں میں سے ایک نظم جو مجھے بے حد پسند آئی وہ "ٹپکتی چھتری کے نیچے" ہے۔ اس نظم میں چھتری کے استعارے کی توسیع بڑی تازہ کاری سے کی گئی ہے، جس کے ذریعے ادراک کے بے جوڑ عناصر اور بیان کی دل کشی کو فن کاری کے ساتھ یک جا کیا گیا ہے جوتوں کے دانت دکھنے لگے ہیں ------ جیب میں شاید ہوا ہوگی / ابھی سائیں سائیں کرتی ادھر سے گذری تھی --- ایک بھولی بسری یاد / دل کے تنور پر ہاتھ تاپ رہی ہے / میں نے چھتری نالے میں پھینک دی ہے ---- چھتری، جو آسمان کی طرح برس رہی تھی ----

علی اصغر کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت، جزئیات نگاری ہے جو ان کے فن کو اعتبار بخشتی ہے۔

میں کچھ کہنے کی کوشش میں
دیواروں پر ٹنگے ہوئے منظر دیکھوں گا
وہ کھڑکی سے باہر کی دنیا میں جیسے کھو جائے گی
ٹیلی فون سہارا دے گا
اور ہم اپنی ٹھنڈی چائے کو
تنہا چھوڑ کے اٹھ جائیں گے

(ادھوری ملاقات)

اس کتاب کے گوناگوں محاسن کو دیکھتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جلد ہی معاصر اردو شاعری میں اس نوجوان شاعر کی فن کارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا جائے گا۔

(پروفیسر شیو کے۔ کمار)

نام کتاب : عصری ہندوستانی کہانیاں (حصہ اول) صفحات : ۱۵۴ قیمت : ۷۵ روپے
نام کتاب : عصری ہندوستانی کہانیاں (حصہ دوم) صفحات : ۲۲۰ قیمت : ۱۰۰ روپے
ناشر: ساہتیہ اکادمی۔ نئی دہلی

ساہتیہ اکادمی مختلف ہندوستانی زبانوں کے ادب کی باہمی ترسیل اور قومی یک جہتی کے تناظر میں تراجم کو خاص اہمیت دیتی ہے۔
ی، تراجم کی تربیت کے مقصد سے ایسے ورک شاپ بھی منعقد کرتی ہے جس میں مترجمین کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔
ی نے اردو زبان کے ادبی تراجم سے متعلق ایک ورک شاپ یکم ڈسمبر ۱۹۸۹ء سے ۱۵/ ڈسمبر ۱۹۸۹ء تک منعقد کیا۔ جناب بلراج کومل
ورک شاپ کے ڈائرکٹر تھے۔ پروفیسر حنیف کیفی اور جناب جے رتن نے بحیثیت ماہر معاونین اس ورک شاپ میں شرکت کی ان کے
ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے دس مترجمین ڈاکٹر ضیاالرحمن، محترمہ رضیہ سلطانہ، ڈاکٹر ایم۔ اسد الدین، ڈاکٹر سہیل احمد
تی، جناب محمد حامد علی خاں، جناب ماہر منصور، ڈاکٹر احسن نشاط، محترمہ مہر افشاں فاروقی، جناب عدیل مہدی اور ڈاکٹر اعجاز افضل نے
لیا۔ عصری ہندوستانی کہانیاں اکادمی کی جانب سے شائع شدہ مختلف کہانیوں کے اردو تراجم پر مشتمل ہے۔ عصری ہندوستانی کہانیاں دو
ں میں شائع کی گئی ہیں۔ یہ تراجم انگریزی سے کیے گئے ہیں اس لیے ترتیب میں بھی انگریزی حروف تہجی سے کام لیا گیا۔ سب سے پہلے
اور سب سے آخر میں اردو ہے۔ آسامی، بنگالی، انگریزی، گجراتی، ہندی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، مراٹھی، اڑیا، پنجابی، سندھی، تمل، تیلگو اور
کہانیوں کے مصنفین علی الترتیب لکشمی ناتھ بزبوروا، پربھات کمار مکھوپادھیائے، بھوانی بھٹاچاریہ، دھوم کیتو، پریم چند، ماستی
یش آئنگار، اختر محی الدین، پوین کنم وارکے، روپ کھتک، کالندی چرن پانی گرہی، کرتار سنگھ دگل، امرلال ہنگورانی، سی راج گوپال
یہ، پی پدم راجو اور عصمت چغتائی ہیں۔ حصہ اول میں ہر زبان کی ایک کہانی شامل کی گئی ہے۔ لیکن حصہ دوم میں یہ توازن باقی نہیں
گیا اس میں بعض زبانوں کی دو دو کہانیاں شامل ہیں اور بعض زبانوں کی صرف ایک۔ ایسا کیوں کیا گیا اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔
، کشمیری، کنڑ، مراٹھی، اڑیہ، سندھی، تمل، تیلگو اور اردو کی ایک ایک کہانی جب کہ انگریزی، گجراتی، ملیالم اور پنجابی کی دو دو کہانیاں
ں کی گئی ہیں۔ ہندی کی تین کہانیاں ہیں۔ سارے مصنفین معروف ہیں اور ان کی یہ کہانیاں انگریزی میں ترجمہ کی جاچکی ہیں۔

ہم عصر کہانیاں کتنے عرصے پر محیط ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ کیوں کہ پریم چند اور وکیوم محمد بشیر ہم عصر نہیں ہوسکتے۔ وکیوم محمد بشیر،
ت چغتائی، ملک راج آنند اور دوسرے افسانہ نگاروں کا تعلق پریم چند کی بعد والی نسل سے ہے۔ کہانیوں کے ساتھ سنہ بھی نہیں دیا گیا
۔ بیدی اور عصمت کی کہانیاں پانچویں دہائی کی لکھی ہوئی ہیں جب کہ پریم چند کا انتقال چوتھی دہائی میں ہوگیا تھا۔ یہ ساری کہانیاں ہم عصر
ملتی ہے لیکن اب جو کہانی لکھی جارہی ہے اس کی نمائندگی کوئی کہانی نہیں کرتی۔ ان کہانیوں سے مختلف زبانوں کی کہانیوں کی سمت و رفتار
ازہ نہیں ہوتا اس کے باوجود ان دو جلدوں میں ہندوستان کی ۱۴ زبانوں کی نمائندہ کہانیاں اکٹھا کی گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں علاقائی بو
بھی نہیں ہے۔ بیش تر کہانیوں کا پس منظر علاقائی نہیں ہے۔ بنگالی کہانی اور مراٹھی کہانی کا پس منظر لندن کی زندگی ہے۔ اڑیا کہانی کا پس
انگریزوں کے دور کا ہے۔ ایک حیرت انگیز بات یہ بھی لگی کہ گجراتی کہانی، ملیالم کہانی، سندھی کہانی اور گجراتی کہانی (حصہ دوم) کے
ی کردار مسلمان ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک کا حصہ ہیں اور وہ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں اور کلچر کا ایک

حصہ میں۔ آسامی، اڑیا، پنجابی، سندھی اور تیلگو کہانیوں میں علاقائی رنگ کی کوشش ملتی ہے۔ پدما راجو کی تیلگو کہانی "کشتی کے مسافر" ایک عمدہ کہانی ہے۔

دوسری جلد میں "کمو ما سکہ" (آسامی) بنگالی کہانی "تارنی ملاح" (تارا شنکر بنرجی) "بڑا شہر" (بنگالی کہانی: پریندر مترا) اپنی علاقائی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انگریزی اور اردو کا کوئی علاقہ ہی نہیں ہے اس لیے ان کہانیوں میں علاقائی رنگ تلاش کرنا فضول ہے۔ عصمت اور راجندر سنگھ بیدی کی اردو میں یو۔پی اور پنجابی کے اثرات تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

دو جلدوں میں شامل کہانیوں میں صرف اردو کی کہانی "لاجونتی" فسادات کے موضوع پر ہے۔ دوسری زبانوں کی کہانیوں میں یہ موضوع نہیں ملتا۔

یہ ساری کہانیاں انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ کہانیوں کا راست ترجمہ نہیں ہے اس لیے ساری کہانیوں کی زبان ایک جیسی لگتی ہے۔ زبانوں کا مخصوص رنگ تلاش کرنا اور محاورے و روزمرہ کا لطف حاصل کرنا ممکن نہیں۔

جلد اول میں ۱۵ کہانیاں ہیں۔ اس کی ضخامت ۱۵۲ صفحات اور قیمت ۵۰ روپے ہے۔ جلد دوم میں ۲۲ کہانیاں ہیں اور اس کی ضخامت ۲۲۰ صفحات اور قیمت سو روپے (۱۰۰) ہے۔ ٹائٹل کثیر رنگی ہے اور بہت خوب صورت ہے۔ ساہتیہ اکادمی کی یہ قابل قدر پیشکش ہے۔ اکادمی نے جس مقصد سے یہ کتابیں شائع کی ہیں وہ بڑی حد تک پورا ہوتا ہے۔ اکادمی کتابوں کی نکاسی کا بھی منظم اور منصوبہ بند طریقہ اختیار کرے تو یہ کتابیں ادب دوستوں تک بہ آسانی پہنچ سکتی ہیں۔

(ڈاکٹر بیگ احساس)

نام کتاب : بے کار کی باتیں (مزاحیہ مضامین) مصنف : میر فاروق علی
سائز : ۱/۸ ڈیمائی صفحات : ۱۱۱ مجلد ، آفسیٹ طباعت
ناشر : مکتبہ شعر و حکمت ۲ / ۱۵۹-۳-۹ ، سوماجی گوڑہ ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲

میر فاروق علی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "بیکار کی باتیں" اس گھٹن زدہ ماحول اور بے روح، بے مہک اور تناؤ سے بھرپور اس دنیا میں ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہے۔ ہم زندگی کی فرسودہ اور پامال روایتوں اور روزمرہ کے کاموں میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ ہمارے لطیف احساسات و جذبات کند ہوتے جارہے ہیں اور ہم فطری طور پر قہقہہ لگانے کی صلاحیت سے تیزی سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔

بنیادی طور پر حس مزاح کے دو پہلو ہیں: ایک وہ ہے جو انسانوں کی غلطیوں اور کمزوریوں پر اظہار غم خواری کرتا ہے اور دوسرا کوتاہیوں اور کمزوریوں کا ہلکے سے ٹھوکے سے احساس دلاتے ہوئے اصلاح حال اور سدھار کی ترغیب دیتا ہے۔ اس تعلق سے شیکسپیئر کسی بھی مزاح نگار کے لیے ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہو سکتا ہے۔ ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ مزاح نگار کسی کے رویے اور طور طریق کی کمزوریوں پر طنز کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑائے۔ ایسا تیکھا اور تیز و تند مزاح بعض اوقات مردم بیزار جذبے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ سوفٹ، پوپ، ڈرائیڈن

والمیر اس قسم کا مزاح لکھنے والوں میں نمایاں ہیں۔ [illegible] مزاحیوں اور بے ہودہ گوئی کا پردہ فاش
نے کا ایک شائستہ، نفیس اور مہذب طریقہ ہے۔ یہ جذبہ مزاح کا لطیف اظہار بھی ہے اور طنز کا موثر ہتھیار بھی۔ ایسے مزاح کی
ذمت، مروجہ معنوں سے الگ اور متضاد ہوتی ہے۔

شیکسپیر کا یہ قول ان مزاحیوں پر ایک کھلا تبصرہ ہے جو رنگ میں بھنگ ڈالنے کے عادی ہوتے ہیں اور جن سے انتہائی غیر لچک دار اور
یانہ رجحان کی بو آتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھارے نیک اور پرہیزگار بن جانے سے دنیا سے شراب کباب اور عیش و نشاط ختم ہی ہو جائے گا۔"

ایک اور جگہ کہتا ہے:

"میں اس بات کو پسند کروں گا کہ کوئی بے وقوف مجھے مسرت سے ہم کنار کرے بہ نسبت اس کے کہ کوئی عقل مند مجھے رنجیدہ کرے۔"

الہ آبادی نے بھی بات اک اور انداز میں کہی ہے:

بار خاطر ہو تو واعظ کا بھی ارشاد برا
دل کو بھا جائے تو اکبر کی خرافات اچھی

س انداز پر غور کیجیے جس میں اکبر نے بعض "مہذب" لوگوں کی تہذیب کی ہجو کی ہے:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے ہسپتال جاکر

اس سلسلے میں اردو کے عظیم ادیب رتن ناتھ سرشار کے ظرافت آمیز اور قہقہہ بردوش مزاح کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جو انھوں
، "خوجی" کے لافانی کردار کی تخلیق کر کے پیش کیا ہے۔ "خوجی" ایک ڈھائی فٹا کردار ہے جو اپنے مخالفین کے خلاف جو اسے خواجہ بدیع
ماں کے بجائے خوجی کہہ کر پکارنے کے بچکے سے اشتعال کا ارتکاب کرتے ہیں، اپنی سات فٹی قرولی گھماتا ہے۔

یہ امر باعث امتنان ہے کہ فاروقی علی مزاح کی اس روایت سے وابستہ ہیں اور حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں جہاں مزاح نگاری کا ایک
ے سے بڑا دور دورہ ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے تو ایک سرکاری عہدے دار ہیں لیکن وہ صاحب نظر ہیں اور بڑی دور رس نظر رکھتے ہیں۔
کے مزاح میں طنز کی چاشنی ہے جو قارئین کو اپنے درون میں جھانکنے اور اپنا محاسبہ کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر چھپی ہوئی
الجھنوں، خود پسندیوں اور خود نمائیوں کو بھی دیکھیں۔

اس مجموعے کا جو بہترین مضمون ہے اس میں انھوں نے ایک نام نہاد اعلیٰ ادارے کے سادہ لوح ماں باپ سے ان کے کم عقل
ڈن کے داخلے کے لیے زیادہ سے زیادہ عطائے وصول کرنے کا انداز اپنایا ہے۔ اس کے منتظم اور چوری چھپے کے کاروبار پر بڑے فن
راور انداز میں طنز کیا گیا ہے۔ معقول ماں باپ میں جو تیکھی کھڑ اور جنون ہوتا ہے کہ ان کے ممی اور کم عقل بچوں کو میڈیکل اور انجینئرنگ
دن میں کسی بھی طریقے سے چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز داخلہ مل جائے، اس کا شکار ہو کر بیچارے انتظامیہ کی چال بازیوں میں پھنس
تے ہیں جو ایک چالاک شکاری بگلے کی طرح انھیں نگلنے تیار رہتا ہے۔ اس جنون کے پیچھے جو محرکات کار فرما ہیں ان میں ایک تو یہ ہے کہ

شادی کے بازار میں دولہے کی قیمت بڑھ جائے یا اپنی جھوٹی انا کی تسکین کے لیے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ بھجوایا جائے ۔ خواہ وہ وہاں جاکر کسی ہوٹل میں بیرے ہی کیوں نہ بن جائیں یا کسی پٹرول پمپ پر کام ہی کیوں نہ کرنے لگیں ۔ جہاں سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو سیٹس بیچی جاتی ہیں اور مسابقتی امتحان سے پہلے ہی "اڈوانس بکنگ" کرلی جاتی ہے ۔ نشست مل جانے کے بعد بے وقوف بنائے گئے والدین انتظامیہ کا ہزاروں بار شکریہ ادا کرتے ہوئے اطمینان کی سانس لیتے ہیں ۔ اس مضمون کی آخری سطریں طنزیہ اظہار کی بہترین مثال ہیں جن کے لطیف پیرایہ ، اظہار کے پوشیدہ معنوں میں بڑی شدت کارفرما ہے اور ادارے کے جارحیہ واقعات اور عزائم پر ایک چبھتا ہوا طنز۔

مصنف نے ایک اور مضمون میں جو کسی حد تک شخصی خاکہ ہے اپنے ممدوح کی علمی اور صحافتی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی سخت جدوجہد کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور لطیف مزاحیہ انداز اختیار کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح ساتھ ہی ساتھ اس نے اس عمارت کی پہلی منزل سے تیسری منزل تک رسائی حاصل کرلی۔

سابق وزیراعظم سلطنت حیدرآباد سر اکبر حیدری کا "حسن خدمت" کے تعلق سے یہ استفسار کہ "حسن" اور "خدمت" میں کیا رشتہ ہے ؟ ہم میں ایک لطیف احساس پیدا کرتا ہے ۔ کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ایک وظیفہ یاب عہدے دار کے کارنامہ ، ملازمت میں نہ تو "حسن" ہوتا ہے نہ "خدمت" ۔ فاروق علی کوئی عام ور شخصیت نہیں ہیں لیکن ان کے مزاح کی ایک شعاع ہماری زندگی کی بے کیفی اور بے لطفی کو کم کرسکے گی ۔ ہم اس پرآشوب سیارے (زمین) پر اپنی غیر یقینی زندگی کے دوران ایسی جتنی بھی شعاعیں اور کرنیں اکٹھا کرسکیں وہ بہت ہی غنیمت ہوگا ۔ کیوں کہ مزاح ہم میں مصائب و آفات کا سامنا کرنے کی قوت بخشتا ہے اور پھر سے ابھرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے ۔ اس موقع پر مہاتما گاندھی کی ایک بات یاد آتی ہے کہ:

"اگر مجھ میں حس مزاح نہ ہوتی تو میں کبھی کا خودکشی کرچکا ہوتا ۔"

فاروق علی کا یہ پہلا مجموعہ ، مضامین خوش گوار وقت گزارنے کا بہت ہی مسرت آگیں ذریعہ ہے ۔ ان سے اور اعلیٰ مضامین کی توقع کی جاسکتی ہے جن کے ہم منتظر ہیں ۔ کوئی بھی شخص بڑی خوبی سے ان کی "بیکار کی باتیں" کے لیے "کام کی باتوں" کا خیال چھوڑ دے گا تاکہ زندگی کچھ کم ناخوش گوار اور زیادہ قابل برداشت بن سکے ۔ یہ ہماری روزمرہ زندگی میں ترش روئی کم کرسکے گی۔

اس مزاحیہ کتاب میں فاروق علی کی منکسرانہ کوشش اس بات کی مستحق ہے کہ عوام کے تمام طبقات کی جانب سے ان کی ہمت افزائی اور سرپرستی کی جائے ۔ فاروق علی کے ساتھ میری نیک تمنائیں وابستہ ہیں۔

(پروفیسر ست نارائن سنگھ)

سنِ اجراء: ۱۹۳۸ء　　بہ یادگار سید محی الدین قادری زور　　فون: 310469 ۔

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۵۰　○　جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۵ء　○　شمارہ: ۷، ۸، ۹

اس شمارے کی قیمت : بیس روپے

فی پرچہ	:	۷ روپے	مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ	:	۳۰ ڈالر
زرِ سالانہ	:	۷۵ روپے	پاکستان، برما، سری لنکا	:	۱۵ ڈالر
کتب خانوں سے	:	۱۰۰ روپے	انگلستان	:	۱۲ پونڈ

ناشر: ادارہ ادبیاتِ اردو پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۴۸۲

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے انتخاب پریس عابد روڈ میں طبع کروا کے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

پہلی بات

ترقی پسند تحریک نے اس صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں ایک اہم تاریخی رول ادا کیا تھا۔ پھر وہ زوال کا شکار ہو گئی۔ ترقی پسند تحریک کی بعض اپنی خامیاں تھیں جن سے ادب کو کچھ نقصان بھی پہنچا۔ ان خامیوں کا اعتراف آج خود ترقی پسند ادیب اور نقاد بھی کرتے ہیں۔ ان باتوں کو دوہرانے کی اب چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک پر اعتراضات بجا طور پر کیے گئے لیکن اس تحریک کے ایک اہم مثبت پہلو کو ہمیشہ نظرانداز کیا گیا۔ اور وہ پہلو ہے دانش وری کا۔ اس تحریک نے ہندوستان کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کا عالمی تناظر میں جائزہ لیا اور نہ صرف ادیبوں، شاعروں بلکہ عام قارئین کی ذہنی تربیت کی اور ان کے فکر و احساس پر گہرا اثر ڈالا۔ ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت نے بھی دانش وری کی روایت قائم کی تھی۔ اس نے آج کے عہد میں سائنس اور ٹکنالوجی کی بے مہار ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال، انسانی رشتوں اور اقدار کی شکست و ریخت، اجنبیت، فرد کی تنہائی اور کربِ ذات جیسے مسائل پر توجہ دی۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جدیدیت چند کلیشوں کی اسیر ہو کر رہ گئی۔ اب اردو میں دانش وری کی روایت تقریباً منقطع ہو گئی ہے۔

آج ساری دنیا میں جمہوری قبا پہن کر دیو استبداد رقص کر رہا ہے ہر طرف دہشت اور درندگی کا راج ہے۔ علاقہ واریت، فرقہ پرستی اور احیا پسندی عروج پر پہنچ گئی ہے۔ رجعت پسند طاقتیں بے لگام ہو چکی ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ فرقہ پرست رجعت پسند جماعتیں عوام کے جذبات سے کھیل رہی ہیں اور ان کے ذہنوں کو اس قدر مسموم کر دیا گیا ہے کہ اب لوگ کسی معقول بات سننے کے بھی روادار نہیں رہے، دوسری طرف سیکولر سیاسی جماعتیں مصلحت اندیشی میں گرفتار ہیں۔ ان کی آواز کمزور پڑ گئی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ بوسنیا کے عوام پر ناقابلِ قیاس مظالم ڈھائے جاتے ہیں تو اسلامی تنظیمیں احتجاج کرتی ہیں۔ دعائیہ اجتماع منعقد کیے جاتے ہیں اور نام نہاد سیکولر تنظیمیں اور سیاسی جماعتیں (بہ استثنائے چند) چپ سادھی بیٹھی ہیں۔ گویا یہ مسئلہ صرف مسلمانوں کا ہے، عام عالم انسانیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان حالات میں دانش وروں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اور نگاہیں ترقی پسند تحریک کی طرف اٹھتی ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن ماضی کی غلطیوں کا اعادہ کیے بغیر بہ احسن الوجوہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں سے مطالبہ کرنا کہ وہ ان وقتی مسائل پر لازماً قلم اٹھائیں، درست نہیں ہے۔ ادیب کو یہ آزادی ہے کہ جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے ضبطِ تحریر میں لائے۔ ادیب کی وابستگی یقیناً اس کے اپنے فن سے ہونی چاہیے۔ وہ کسی دی ہوئی پالیسی اور پروگرام کا تابع نہیں ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر بھی توجہ دے۔ ادیب اخباروں میں کالم نویسی کرتے ہیں تو کیا وہ اپنی صحافتی صلاحیتوں کو کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ سماجی مسائل کو موضوع بنانا اور ان موضوعات پر ادبی شہ پارے تخلیق کرنا یہ کام ایک اعلیٰ درجے کا فن کار ہی انجام دے سکتا ہے پریم چند، غلام عباس، بیدی، کرشن چندر اور منٹو کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں شاعری میں اقبال، ن۔ م۔ راشد، فیض، مخدوم، سردار جعفری، مجروح، کیفی اعظمی، ناصر کاظمی، اخترالایمان ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں بھی کئی ادیب اور شاعر اس راہ پر گام زن ہیں۔

ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ماضی کی طرح انفرادی طور پر ادیبوں شاعروں کے محاسبے سے گریز کرے۔ اس کا اصل کام ایک ذہنی فضا پیدا کرنا ہے جو ادیبوں شاعروں اور فن کاروں کے لاشعور کو تحریک دے اور جب ان کی تخلیقات کی قدر و قیمت کے تعین کا سوال آئے تو ادبی اور فنی معیارات کو اولیت دے۔

مغنی تبسم

کتاب: مرزا غالب

مصنفہ: ڈاکٹر نتالیا پری گارِنا

مترجم: اُسامہ فاروقی

باب ۹

بادِ مخالف

مجھے قسمت نے جہلا نے رشک کینہ وروں کا ٹھٹھا اڑانے اور نادانوں پر خوش طبعی سے لعنت بھیجنے کا حق دیا ہے۔ (پوشکن)

لیکن آگے کلکتہ تھا۔ غالب بنارس سے باندا مولوی محمد علی خاں کو لکھتے ہیں: "آج کہ جمعہ کا دن اور ایک جماعت کے قول کے مطابق ماہِ رواں کی نو تاریخ ہے اور ایک دوسرے گروہ کے حساب سے دس، میں رختِ سفر باندھ رہا ہوں۔ اگر رات خیریت سے گزر گئی اور میرا وجودِ موہوم اپنی عدمیت اصلی کی طرف رجوع نہیں کرتا، تو کل کہ شنبہ کا دن ہے، بنارس سے روانہ ہوجاؤں گا۔ مخفی نہ رہے کہ ناخدایان خداناشناس نے، بنارس میں، کشتی کے سلسلے میں بد معاملگی کی۔ میں جس کے پاس بھی گیا اس نے کلکتے تک سو روپیہ کرایہ طلب کیا اور پٹنہ تک بیس روپے سے زیادہ مانگا۔ اب یہی نظر آتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر اس بقعۂ صرا تک راہ طے کروں گا، لیکن کشتی کی خواہش ابھی میرے دل سے نہیں نکلی، پٹنہ جاکر پھر جستجو کروں گا۔" (ترجمہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

بالآخر کلکتے کا دشوار گزار راستہ طے ہوا۔ غالب وہاں ۲۱/ فروری ۱۸۲۸ء کو پہنچے اور کلکتے سے غالب پھر انھیں مکتوب الیہ کو اپنے سفر کے آخری مرحلے کی سرگذشت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں: "غرض کہ بخت کی یاوری اور انفاسِ قدسی کی برکت سے، گردباد کی طرح دوشِ ہوا پر پرواز کرتے اور خار خارِ راہ سے فریاد کناں گزرتے ہوئے، جیسے کوئی دمِ تیغ کو اپنی رہ گزر بنائے، کبھی جاڑوں کی ٹھنڈی ہواؤں میں راتوں کو ٹھٹھرتے اور زمانے کے گوناگوں ستم سہتے ہوئے بہ روز سہ شنبہ چہارم ماہِ شعبان کو میں وارد کلکتہ ہوا۔ میں ان ایزدی بخشائشوں پر ناز کرتا ہوں کہ اس اجنبی شہر پہنچ کر مجھے ایک ایسا گھر مل گیا جس میں ہر طرح کا آرام و آسائش ہے۔ بیرونی حصّے میں آزادوں کے فراغِ خاطر جیسی فضا اور اندرونی حصّے میں دنیا طلبوں کے دہانے جیسا بیت الخلا۔ اسی کے ساتھ صحنِ خانہ کے ایک گوشے میں میٹھے پانی کا کنواں اور سقف و بام کی سمت اہلِ تنعم کے مزاج کے مطابق ایک آرام گاہ۔ یہ مکان کسی خاص جستجو اور زحمتِ گفتگو کے بغیر دس روپے ماہانہ کرائے پر مل گیا اور اسے مسافر کی تکیہ گاہ اور منزلِ راحت قرار پایا۔ دو روز میں نے آرام کیا کہ سفر کی تکان دور ہوجائے۔" (ترجمہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

غالب نے شملہ بازار میں گھر کرائے پر لیا تھا۔ حالات کا جائزہ لینے میں، رسمی ملاقاتوں میں اور ضروری سفارشیں بہم پہنچانے میں کچھ وقت لگا اور دو ماہ بعد، اپریل کے اواخر میں، مرزا نے اپنے کاغذات کو گورنر جنرل ہندوستان کی کونسل میں پیش کرنے کی کوشش شروع کی۔ یہاں پتہ چلا کہ اس طرح کے کاغذات پر ضروری کارروائی دہلی میں انگریزوں کے رزیڈنٹ کے ذریعے کلکتہ پہنچنے پر ہی کی جا سکتی ہے۔ غالب نے ایک خط کے ذریعے اپنے دوست لالہ ہیرا لال کو دہلی میں اپنا

وکیل مقرر کیا۔ مرزا نے کچھ سفارشی خطوط بھی حاصل کیے جو ان کی طرف سے لالہ ہیرالال نے رزیڈنٹ دہلی سرایڈورڈ کول بروک تک پہنچائے۔ خط کتابت کے ذریعے معاملے کو سلجھانے میں کم و بیش ایک سال لگ گیا۔ مرزا کو اطلاع ملی کی ۲۴/ فروری ۱۸۲۹ء کو ایڈورڈ کول بروک نے رپورٹ ان کے حق میں کلکتہ بھیج دی ہے اور لگتا تھا کہ ان کے مقدمے کی پیش رفت میں ساری رکاوٹیں اب دور ہو گئی ہیں۔

غالب کو اپنے دعوے کی صحت پر پورا اعتماد تھا اور بہت پر امید تھے کہ ان کے ساتھ انصاف ہو گا۔ کلکتے کا ماحول ان کو پسند آیا۔ غالب پھر باندا اپنے دوست کے نام لکھتے ہیں: "قبلہ گاہ خدا پرستاں و پشت پناہ بے چارگاں! اللہ تعالیٰ کے انصاف و عنایات بھی تعجب انگیز ہیں، کلکتے کی آب و ہوا میرے لیے بہت ساز گار نکلی۔ وطن کے مقابلے میں یہاں میں اپنے کو بہت آزاد محسوس کرتا ہوں۔ رباعی:

غالب ہر پردہ نوائے دارد	ہر پردۂ ساز میں ہے ایک نوا
ہر گوشہ از دہر فضائے دارد	ہر گوشۂ دہر کی ہے ایک فضا
ہرچند بپوست از دماغم یک سر	خشکی مرے دماغ سے نے اڑی یک سر
بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد	بنگال کی واللہ! عجب آب و ہوا

(ترجمہ: مضطر مجاز)

غالبؔ کونسل کے ڈپٹی سکریٹری سائمن فریزر سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ فریزر کے لوہارو خاندان سے پرانے مراسم تھے اور چناں چہ بہ وقت ملاقات دونوں طرف سے دلی مسرت کا اظہار بھی ہوا، عطر اور پان سے ایک دوسرے کی تواضع بھی کی گئی۔ فریزر نے غالب کا تعارف کونسل کے فارسی شعبے کے سکریٹری اندروا سٹرلنگ سے کرایا۔ اس نے غالب سے ترجمان کی مدد کے بغیر گفتگو کی اور ان کی بہت عمدگی سے پذیرائی کی۔ جواباً مرزا نے اس کی ستائش میں ۵۵ ابیات کا ایک قصیدہ لکھا جس میں بہ قول خود "آخر کے چند اشعار میں اپنے معاملات کا ذکر کیا ہے۔ قصیدے کو بڑی عنایت سے شرفِ قبولیت بخشا گیا، تاہم اس جان پہچان سے غالب جو امیدیں باندھے ہوئے تھے وہ غلط فہمی کی بنیاد پر قائم تھیں: غالب کو یہ مغالطہ تھا کہ اسٹرلنگ کچھ نہیں تو گورنر جنرل کے نائب کی خدمت پر تو ضرور فائز ہے۔

کلکتہ ہندوستان میں انگریزوں کی فتوحات کی بیرونی چوکی تھا۔ اس کے حلیے میں نوآبادیاتی طرزِ تعمیر کی عمارتوں سے نمایاں تبدیلی آچکی تھی اور طرح طرح کی یادگاریں، باغیچے اور پارک اس کی زینت بڑھاتے تھے۔ ہر شے میں کاروباری مزاج سرایت کیے ہوئے تھا۔ کلکتے میں گیس کی روشنی تک کا انتظام تھا۔ مختصر یہ کہ دہلی کے مقابلے میں، جس میں ایک جاگیردارانہ قلم رو کے دارالحکومت کی خصوصیات ابھی تک برقرار تھیں، کلکتہ اپنی بہتیری جدتوں سے سب کو متاثر کرتا تھا۔ یہاں روشن خیالی کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی، فارسی اور بنگالی میں اخبار شائع ہوتے تھے۔ بیس سال بعد غالب مثنوی "تقریظ آئین اکبری" میں، کلکتے میں جو کچھ ان کے مشاہدے میں آیا اس کے تاثرات بیان کرتے ہیں اور انگریزوں کے ان کارہائے نمایاں کا ذکر کرتے ہیں جو علم و فن کی ترقی کا نمایاں ثبوت ہے۔ (اس مثنوی کے بارے میں قدرے تفصیل سے گفتگو آگے آئے گی)۔

صاحبانِ انگلستان را نگر	اہلِ انگلستان کو تو دیکھیے
شیوہ و اندازِ اینہاں را نگر	شیوہ و انداز ان کے بوجھیے
تاچہ آئین ہا پدید آوردہ اند	کیسے یہ آئین لے کر آئے ہیں
آنچہ ہرگز کس نہ دید آوردہ اند	جو نہ دیکھا آج تک دکھلائے ہیں
زین ہنرمندان ہنر بیشی گرفت	ان ہنرمندوں نے چمکایا ہنر

داد و دانش را بہم پیوستہ اند
ہند را صد گونہ آئین بستہ اند
آتشے کز سنگ بیرون آورند
این ہنرمندان زخس چون آورند
تاچہ افسون خواندہ اند اینان برآب
دود کشتی را ہمی راند در آب
گہہ دخان کشتی بہ جیحون می برد
گہہ دخان گردون بہ ہامون می برد
غلتک گردون بگرداند دخان
نرہ گاؤ و اسپ را ماند دمان
از دخان زورق بہ رفتار آمدہ
باد و موج این ہر دو بے کار آمدہ
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند
حرف چون طائر بہ پرواز آورند
ہیں نمی بینی کہ این دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد گروہ
می زنند آتش بہ باد اندر ہمی
می درخشد باد چون اخگر ہمی
رو بہ لندن کاندران رخشندہ باغ
شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
کاروبارِ مردم ہشیار بین
در ہر آئین صد نو آئین کار بین

داد و دانش کو ملایا، دیکھ تو!
نت نئے آئیں دیے ہیں ہند کو
آگ پیدا ہوتی ہے جو سنگ سے
کس طرح وہ خس سے لے کر آگئے
پڑھ کے کیا پھونکا انھوں نے آب پر
ہیں دخانی کشتیاں مستِ سفر
بھاپ سے کشتی کو جیحوں میں چلائیں
اور کبھی پہیوں کو صحرا میں گھمائیں
بھاپ کی قوت سے پہیہ گھوم جائے
طاقت اسپ و گاؤ نر کی مات کھائے
بھاپ سے کشتی میں رفتار آگئی
رہ گئے منہ تکتے باد و موج بھی!
ساز میں بے زخمہ وہ نغمے جگائیں
طائروں کی طرح حرفوں کو اڑائیں
ہاں! یہ مردانِ خردمند ایسے ہیں
پل دو پل میں حرف میلوں بھیج دیں
آگ یوں دکھلاتے ہیں وہ باد کو
مثل اخگر بس! چمک اٹھتی ہے وہ
دیکھ جاکر لندنِ رخشندہ باغ
ہے وہ سارا شہر روشن بے چراغ
ہوش مندوں کے ہیں ایسے کاروبار
ہیں ہر اک آئین میں آئیں ہزار!

(ترجمہ: مضطر مجاز)

تاثرات کی ندرت اور یہاں محسوس ہونے والی ذہنی تسکین اور "بیڑیوں" سے آزادی کے احساس کی بہ دولت کلکتہ غالب کے لیے واقعی بہشت سے کم نہیں تھا۔ ایک قطعے میں وہ کلکتے کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

اس وسیع حلقہ واقفیت میں جو اس شہر میں غالب نے اپنے لیے بنالیا تھا ان کی زندگی کے لیے خاص اہمیت مولوی سراج الدین احمد سے دوستی کو حاصل ہے، جو ایک ممتاز سماجی کارکن اور اردو و فارسی زبان و ادب کے شائقین کے ایک ادبی حلقے کے سربراہ تھے۔ سراج الدین احمد بنگال کے روشن خیال حلقوں سے بھی ربط ضبط رکھتے تھے اور غالب نے اپنے قیام کلکتہ کے دوران انھیں کی مدد سے فارسی زبان میں شائع ہونے والے مقامی اخبار "آئینۂ سکندری" میں اپنا کلام چھپوایا۔ اس میں شک نہیں کہ کلکتے میں غالب کی آمد شعر و شاعری کے شائقین کے لیے ایک بہت اہم واقعے کی حیثیت رکھتی تھی۔ مرزا پُر تکلف فارسی اسلوب میں ان ادبی محفلوں میں اپنی کامیابی کا ذکر یوں کرتے ہیں: "احباب محفل منعقد کرتے اور مجھے کلام سنانے کی دعوت دیتے ہوئے شمع اصرار روشن کرتے۔ میں حیرت سے دم بخود رہ جاتا اور شرم سے آنکھیں نیچی کیے بیٹھا رہتا۔"

اسی زمانے میں غالب نے سرگرمی سے فارسی میں طبع آزمائی شروع کی۔ مالک رام کا خیال ہے کہ "گلِ رعنا" میں مشمولہ کلام کا بیشتر حصہ (مجموعے میں شامل ۴۵۵ اشعار میں سے ۳۶۵) انھوں نے کلکتے ہی میں لکھا۔

مولوی سراج الدین نے غالب کو کلکتے کے ان مشہور مشاعروں میں بھی مدعو کیا جو "ہر انگریزی مہینے میں ایک بار" (یعنی عیسوی تقویم کے حساب سے) مدرسۂ عالیہ میں منعقد کیے جاتے تھے۔ مشاعروں میں اردو میں لکھنے والے اور فارسی گو شعرا شریک ہوتے اور اپنا کلام سناتے۔ غالب ایسے متعدد مشاعروں میں شریک ہوئے۔ تاہم، خوش دلانہ کیفیتِ مزاج کے باوجود، مشاعروں میں مرزا کا رویہ آزادانہ بلکہ جارحانہ بھی رہتا تھا اور جیسا کہ عرشی، دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں "وہ ہر طرف سے موردِ عتاب و رشک ہوگئے"۔ انھیں میں سے ایک مشاعرے کے لیے انھوں نے اپنی مندرجۂ ذیل مشہور فارسی غزل لکھی:

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم
ایمان بہ غیب تفرقہ ہا رفت از ضمیر
زاسما گزشتہ ایم و مسمّیٰ نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ معنیِ لفظِ امید نیست
فرہنگِ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم
آئندہ و گزشتہ تمنا و حسرت ست
یک کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم
آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغ بانیِ صحرا نوشتہ ایم
غالب الف بمان علمِ وحدت خود ست
ہر لاچہ برفزد دگر آلا نوشتہ ایم

اس طرح کچھ حقیقتِ اشیا لکھا کیے
آفاق کو مرادفِ عنقا لکھا کیے
ایماں بہ غیب نے تو مٹائے ہیں تفرقے
اسما کو چھوڑ چھاڑ، مسمّیٰ لکھا کیے
لفظِ امید کے کہیں معنی نہ مل سکے
فرہنگِ نامہ ہائے تمنا لکھا کیے
آئندہ و گزشتہ ہے حسرت و آرزو
اک لفظ "کاشکے" کو بہ صد جا لکھا کیے
ہر نوکِ خار دل کے لہو میں ڈبوئی ہے
قانونِ باغ بانی صحرا لکھا کیے
غالب الف ہے اپنا تو وحدت کا خود علم
"لا" کیا ہے کیا ہوا ہے جب "الّا" لکھا کیے
(ترجمہ: مضطر مجاز)

ٹھیک سے علم نہیں کہ جو ادبی معرکہ برپا ہوا تھا وہ اس غزل یا پھر غالب کی کسی دوسری فارسی غزل کے سلسلے میں تھا۔ غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں کے طرفہ واقعات میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ اس شہر کے نکتہ رس اور سخن ور افراد نے اس خاک سار کے ورود سے پہلے ہی ایک انجمن بنا رکھی ہے۔ ہر ماہ انگریزی شمسی کے پہلے یک شنبہ یہ اہلِ قلم اور مدرسہ کمپنی بہادر کے ادبا اور اہلِ علم یہاں جمع ہوتے اور ہندی و فارسی غزلیں پڑھتے ہیں۔ اچانک ایک بلند پایہ شخص جو ہرات سے "بہ عہدہ سفارت" یہاں وارد ہوئے، میرے اشعار کو سن کر بڑی بلند آہنگی کے ساتھ انھوں نے میری ستائش کی اور اس قلم رو کے نادرہ گویوں کے کلام پر زیرِ لب مسکراتے رہے۔ چوں کہ طبیعتیں بالذات خود نمائی پر فریفتہ ہوتی ہیں اس لیے انھوں نے میرے کلام پر اس داد و تحسین کو سن کر حسد کو کام فرمایا۔ اس انجمن کے سربرآوردہ افراد اور اس بزمِ سخن کے فرزانوں کی طرف سے میرے دو شعروں پر ناروا اعتراضات وارد کیے گئے اور اب انھیں شہرت دی جا رہی ہے اور میں نے جواب دہی کے لیے زبان نہیں کھولی، لیکن یہاں کے دانش وروں سے وہ اپنے لایعنی اعتراضات کا جواب باصواب پا رہے ہیں۔ مخدومی نواب علی اکبر خاں طباطبائی اور محترمی مولوی محمد حسن میرے انھیں کرم فرماؤں میں سے ہیں۔۔(ترجمہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

اسی (یا کسی دوسرے) مشاعرے میں غالب کی غزل کے اشعار پر اعتراض کیے گئے اور اس سلسلے میں معترضین نے بہ طور سند قتیل کے اشعار کا حوالہ دیا، جن کی کلکتے میں بڑی عزت تھی اور جن کو بہت سے شرکاء مشاعرہ اپنا استاد مانتے تھے۔ قتیل (متوفی ۱۸۱۷ء) اپنی اصل کے اعتبار سے کھتری ذات سے تعلق رکھنے والے ہندو تھے، جنھوں نے مذہبِ اسلام اختیار کر لیا تھا۔ وہ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ غالب، جنھوں نے سخن گوئی کی ابتدا سے ہی یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اہلِ ہند کی فارسی کو مستند نہیں مانا جا سکتا، قتیل کے اشعار کا بہ طور سند حوالہ دیے جانے پر نہایت برہم ہوئے۔ انھوں نے اپنا یہ خیال خاصے تیکھے انداز میں وہیں ظاہر بھی کر دیا۔

اس مباحثے کی آوازِ بازگشت اس مشہور قطعے میں بھی سنائی دیتی ہے جو غالب نے کلکتے میں لکھا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ شعر جس میں قتیل کی طرف اشارہ ہے "گلِ رعنا" میں شامل نہیں ہے، تاہم کلیاتِ غالب فارسی کے دیباچے میں قطعے کو اس کی مکمل شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ قطعہ روایتِ مدحِ ذات سے تعلق رکھنے والی صنفِ سخن، تعلّی کا ایک نمونہ ہے، جس میں شاعر گویا کہ اپنے شعری کارہائے نمایاں کا امکانی نقادوں کی خردہ گیریوں سے بچاؤ کرتا ہے اور شعر و ادب کے تعلق سے اپنی پسند اور ناپسند ظاہر کرتا ہے۔

غالب کے اس قطعے میں ہمارے سامنے نئے زمانے کا انسان ابھرتا ہے، ایک ایسی شخصیت ابھرتی ہے جس کا ذہنی رویہ، سابقہ ادبی روایت کے تعلق سے بہ حیثیت مجموعی، بہت واضح ہے۔ سب سے مقدم یہ انسان آزادیِ رائے اور آزادیِ عقیدہ کے اپنے حق پر اصرار کرتا ہے اور اس کے اس نظریے کی بنیاد ہے سچی شاعری کے علم بردار کی بصیرت اور صداقت پر اعتماد:

نہ چنانم کہ بر عقیدۂ خویش | میں نہیں وہ عقیدہ جو اپنا
از فسونِ کسے ہراس کنم | ہو کے زیرِ اثر بدل ڈالوں

یہاں فارسی عبارت میں لفظ "فسوں" بہ معنی "جادو" یا "فریب" استعمال ہوا ہے، جس میں شاعری کے "سحر" کی طرف اشارہ بھی مضمر ہے۔ روایت ہے کہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ نے زمانۂ ماقبلِ اسلام کے شاعروں اور کاہنوں کی مذمت کی ہے اس لیے کہ ان کی شاعری کا اثر جادو اور سحر کا مرہونِ منت ہوتا تھا۔ تاہم "سحرِ حلال" نام کی بھی ایک چیز ہے اور یہ ہے سچی شاعری۔

نہ توانم کہ از نصیحت و وعظ | کھول کر وعظ و پند کا دفتر
عالمی را خدا شناس کنم | اک جہاں کو خداشناس کروں

یہاں ہمیں مذہب کے تعلق سے رواداری کے ثمر سنائی دیتے ہیں اور شاعری میں وعظ و تلقین سے پرہیز کی ضرورت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ شاعر کے اس حکیمانہ قول میں مذہب کی طرف رجحان رکھنے والے احباب سے درپردہ مباحثے کا احساس بھی ہوتا ہے، جن میں سے ایک، جیسا کہ قارئین کو یاد ہوگا، وہ فضلِ حق بھی تھے، جو غالب سے مذہبی مسائل کی تشریح پر مصر تھے۔

نہ کہ اخبار پاستانے را
دیو افسانہا قیاس کنم

اور بزرگوں کی ساری باتوں کو
محض افسانہ و فسوں جانوں

اس شعر میں مذکور غالب کا موقف قدیم اقوام کی رزمیہ داستانوں کے تعلق سے ان کے تاریخی نقطۂ نظر کی شہادت دیتا ہے۔ بعد میں سلسلۂ تیموریہ کی سرگزشت کے بارے میں اپنی تصنیف "مہرِ نیم روز" پر کام کرتے ہوئے وہ رزمیہ داستانوں سے متواتر ویسے ہی استفادہ کرتے ہیں جیسے تاریخی ماخذ سے۔

اور اب بالآخر وہ شاعری میں جدت کی ضرورت پر اپنے عقیدے کا اظہار کرتے ہیں۔

نہ کہ زاثار ہر چہ مشہور ست
اثری تازہ اقتباس کنم

اور مشہور عام باتوں کا
لوں اثر اور اختیار کروں

یہاں شاعر روایتی شاعری میں جائز سمجھے جانے والے، دوسروں کے خیالات کو طرح طرح سے "مستعار" لینے کے طریقے پر، پیش رووں کے خیالات، موضوعات اور تصاویرِ خیالی سے استفادے پر اور مختصر یہ کہ ان تمام خصوصیات پر کڑی تنقید کرتا ہے جو عہدِ وسطیٰ کی شاعری کا امتیازی وصف سمجھی جاتی تھیں۔

نہ کہ از بہر حلّہ ہائے بہشت
ترک آرائشِ لباس کنم
نہ کہ در عالمِ فراخ روی
عار از ژندۂ پلاس کنم

یا بہشتی لباس کی دھن میں
ترک اپنا یہاں لباس کروں
اور یا، اس فراخ عالم میں
اپنی گدڑی سے شرم و عار کروں

انسانی شخصیت اور اس کے روحانی تجربے کی قدر و قیمت پر یقین، رسوم و رواج سے آزادی کی ضمانت ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ان تمام رجحانات کے خلاف ایک چیلنج، جو انسان کے مقام، سکھی اور خوش حال زندگی پر اس کے حق اور ایسی زندگی کی طرف لے جانے والے اس کے اپنے چنے ہوئے راستے کے بارے میں اس کے نظریات سے میل نہیں کھاتے۔

بر مدارا اگر مدار کنم
کاخِ الفت قوی اساس کنم
لیک ناید زمن کہ در گفتار
مدحت لالہ سور داس کنم

میں وفاداری کو گر اپناؤں
کاخِ الفت قوی اساس کروں
کیوں میں لفاظی اپنی دکھلانے
مدحت لالہ سور داس کروں

غالب کی طبیعت میں دوستی کی حد درجہ پاس داری اور احباب کے لیے حتی الامکان سب کچھ کر گزرنے کی مستقل خواہش اور ساتھ ہی ساتھ ادبی نظریات کے تعلق سے غیر مصالحت پسندی اور ادبی تخلیقات پر تنقیدی نظر ڈالتے وقت رو رعایت سے اجتناب کا ایک عجیب و غریب امتزاج ملتا تھا۔ حالاں کہ غالب کے بیش تر پیش رووں اور معاصرین کے لیے شعری روایت کے پرستش کی حد تک احترام کو کم و بیش مذہب کا درجہ حاصل تھا، انھوں نے پیش رووں کی تخلیقات کو مکمل اور ہر طرح کے عیوب سے پاک نمونوں کی حیثیت سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اپنے ادبی مخالفین کی تنقید میں، قدیم عہد کے شعرا کے زمانے سے چلی آرہی، دشمنوں کے تعلق سے "ہجویہ" اصنافِ سخن کی تقلید کرتے ہوئے، غالب اکثر کافی تیکھا

طنزیہ انداز اختیار کر لیتے تھے۔ اپنے شاگرد ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق نہیں پیدا ہوتے تھے؟"

اور انھیں مکتوب الیہ کے نام ۲۷/اگست ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "سنو میاں، میرے ہم وطن، یعنی ہندی لوگ جو وادیِ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ کھاکس الو عبدالواسع ہانسوی لفظ "نامراد" کو غلط لکھتا ہے، اور یہ الو کا پٹھا قتیل "صفوت کدہ" و "شفق کدہ" کو اور "ہمہ عالم" اور "ہمہ جا" غلط کہتا ہے۔"

اوپر کے شعر میں لالہ سورداس کے پردے میں غالب کا اشارہ انھیں قتیل کی طرف ہے جن کی ثناخوانی سے انھیں اس وقت بھی انکار تھا جب وہ کلکتے میں ان کے مداحوں کے مہمان تھے۔

اس طرح سے اس مخصوص ادبی مناقشے میں غالب کی غیر مصالحت پسندی کے پیچھے نقد و نظر کے میدان میں ان کی بڑی اصول پسندی کارفرما تھی۔ اس کے باوجود وہ نہیں چاہتے تھے کہ ادبی امور میں ان کے خیالات کو کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش سمجھا جانے یا ان لوگوں کی شخصی توہین کی کوشش قرار دیا جانے جو ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اور چناں چہ غالب معذرت نامے کے طور سے مثنوی "باد مخالف" لکھتے ہیں۔ مثنوی کا مقصد اپنے کلکتے کے احباب اور سرپرستوں پر یہ واضح کرنا تھا کہ وہاں برپا ہونے والے ادبی معرکے کا باعث سیدھی سادی غلط فہمی تھی، اس میں ان کے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس ادبی تخلیق میں صورتِ حال کی طرف بہت سے دل چسپ اشارے اور کنائے ملتے ہیں، ادب کے تعلق سے تنقیدی نظریوں کا اظہار کیا گیا ہے۔

مثنوی کا آغاز کلکتے کی مہمان نوازی کی مدح سرائی اور ہفت اقلیم سے سفارتی اغراض سے وہاں اکٹھا ہونے والے مہمانوں، نیز کلکتے کے "پہلوی" یعنی فارسی اور "ریختہ" یعنی اردو، دونوں زبانوں میں سخن سرائی کرنے والے شاعروں کی ثناخوانی سے ہوتا ہے۔

آگے غالب اپنی حالتِ زار کا نقشہ کھینچتے ہیں، خود کو ناخواندہ مہمان کا نام دیتے ہیں اور مہمان نوازی کا شکریہ بجا لاتے ہیں، اور پھر اپنی غریب الوطنی اور احباب سے جدائی کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے اشعار کو غلطیوں سے پاک سمجھنے کے باوجود معافی کے خواستگار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کو اس بات پر شرم کا احساس ہے کہ اپنے رویّے سے انھوں نے اس علاقے کے ایسے گراں مایہ سخن پروروں، اور فن کے قدر دانوں کو آزردہ کر دیا ہے۔ چناں چہ ان کو بس ایک ہی چارہ کار دکھائی دیتا ہے اور وہ یہ کہ اپنی شکست کے اعتراف میں اپنا سر نیچے جھکا دیں۔ لیکن چوں کہ انھوں نے اپنے طرزِ عمل کی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے تو عفو و درگزر کے مستحق بھی ہیں، خاص طور پر اس لیے کہ ان کے اشعار میں تنقید کی سزاوار کوئی بات نہیں ہے۔

وہ بیدل کی مدح کرتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کو قتیل کے مقابلے میں پیش کرنے سے خود کو روک نہیں سکتے۔

گرچہ بیدل زاہلِ ایران نیست
لیک ہمچوں قتیل نادان نیست
نہ غلط گفتہ است در خود گفت
راست گویم در آشکار و نہفت

گو نہیں بیدل اہلِ ایراں سے
پر نہیں وہ قتیل سا ناداں
کیا غلط اس نے یہ کہا، جو کہا
راست گو ہوں میں آشکار و نہاں
(ترجمہ: مضطر مجاز)

پھر غالب دوبارہ کلکتے کے شاعروں کی تعریف و توصیف کرتے ہیں، پر تپاک استقبال کے لیے شکریہ ادا کرتے ہیں، ان کے کلام کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ آگے وہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا حزیں، اسیری، طالب، عرفی، نظیری اور خصوصاً ظہوری کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے احترام میں اپنا سر خم کرتے ہیں۔

ان تمام شعرا کا تعلق ابتدائی مغلیہ عہد سے ہے اور شاعروں کی اس فہرست سے غالب کے عہدِ جوانی کے میلانِ طبع میں تبدیلی کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر کئی بار قتیل کا منفی سیاق و سباق میں ذکر کرنے کے بعد وہ اپنا مطلب حرف بہ حرف سمجھاتے ہیں:

واقف ایسے سخن وروں سے ہو جو	آں کہ طے کردہ این مواقف را
کیا وہ سمجھے قتیل و واقف کو	چہ شناسد قتیل و واقف را

اور مثنوی کا خاتمہ عفو و در گزر کی التجاؤں اور اظہارِ تشکر کے ایک سنہرے طومار پر ہوتا ہے۔

یہ قابلِ قدر ادبی دستاویز کئی اعتبار سے دل چسپ ہے۔ لیکن مثنوی کو لکھتے وقت غالب کے پیشِ نظر جو مقصد تھا، اس کے حصول میں شاید ہی ان کو کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ کلکتے کے اس ادبی معرکے کی آواز بازگشت ایک طویل عرصے تک غالب کے خطوط اور گفتگو میں سنائی دیتی ہے اور بعض محققین کی رائے ہے کہ غالب نے اپنے مجموعۂ نثرِ فارسی "پنج آہنگ" کو یہ نام قتیل کی تصنیف "چہار شربت" کے جواب میں دیا تھا۔ قتیل کے شاگردوں کی کوشش یہ رہتی تھی کہ اپنے استاد کی مذکورہ بالا تصنیف سے مثالیں پیش کر کے غالب کو غلط ثابت کریں۔ غالب کا خیال یہ تھا کہ فارسی زبان میں مہارت تامہ کے حصول میں قارئین کی مدد کے لیے نمونے کے طور سے کام آنے والی ایک ایسی کتاب تصنیف کی جانے جس کے عنوان ہی میں قتیل کی تصنیف پر فوقیت کا دعویٰ مضمر ہو، کیوں کہ "پانچ" کا عدد "چار" کے عدد پر بہرحال فوقیت رکھتا ہے۔ یہ کافی بعد کی، یعنی ۱۸۳۵ء کی بات ہے۔

کلکتے میں غالب کے تعلقات اور ادبی مشاغل پر روشنی ڈالنے والے واقعات میں سے ایک، چکنی ڈلی والا واقعہ ہے۔ اس کا ذکر حالی کی "یادگارِ غالب" میں بھی ملتا ہے اور غالب کے ایک خط میں بھی۔ اس کا خلاصہ یوں ہے: مولوی کرم حسین بلگرامی کلکتے میں اودھ کے سفیر تھے۔ لکھنؤ کے سبھی باشندوں کی طرح وہ بھی ادب کے شائقین میں سے تھے۔ ممکن ہے کہ غالب ان سے مولوی سراج الدین احمد کے ذریعے متعارف ہوئے ہوں۔ ایک بار یہ سب کسی ایسی ادبی مجلس میں موجود تھے جہاں فیضی کے کلام کی خوبیوں پر تبادلہ خیال ہو رہا تھا۔ معلوم ہے کہ فیضی بدیہہ گوئی میں مہارت تامہ رکھتا تھا جس کی مثال بادشاہ اکبر کی شان میں لکھا ہوا اس کا وہ مشہور فی البدیہہ قصیدہ ہے، جس کا ذکر تاریخِ ادب میں صنعتِ تشبیہہ کے عمدہ استعمال کے مثالی نمونے کے طور سے ملتا ہے۔ غالب نے ذکر کیا کہ بدیہہ گوئی پر تھوڑی بہت قدرت تو انھیں بھی حاصل ہے۔ اس وقت مولوی کرم حسین ایک چکنی ڈلی اپنے منہ میں ڈالنے ہی والے تھے۔ انھوں نے چکنی ڈلی ہتھیلی میں رکھ کر ہاتھ مرزا کی طرف بڑھا دیا اور کہا "لیجیے، موضوع حاضر ہے، تشبیہہ میں کچھ ارشاد ہو!"۔ غالب اپنے مکتوب میں اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ڈلی واقعی بہت صاف اور چکنی تھی، اور میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے دس ایک اشعار (فی الواقعہ تیرہ۔ مصنفہ کتاب) کا ایک قطعہ موزوں کر کے پڑھ دیا۔ اشعار میں نے مولوی کرم حسین کے حوالے کیے اور انھوں نے ان کی قیمت اس چکنی ڈلی سے چکائی۔"

حالی مزید لکھتے ہیں کہ ان اشعار میں غالب نے اکیس تشبیہات استعمال کی ہیں۔ کرم حسین کے نام سے ہم "گلِ رعنا" کے قلمی نسخے کے واقعے کے ذریعے بھی واقف ہیں۔ یہ بیش بہا مخطوطہ حیدرآباد میں انھیں کے ورثا کے کتب خانے میں دریافت ہوا تھا۔ مالک رام اور دوسرے محققین نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ قلمی نسخہ انھیں کی فرمائش پر ترتیب دیا گیا تھا۔

کلکتے میں دیکھتے دیکھتے ہی کافی وقت گزر گیا۔ فروری ۱۸۲۹ء میں دہلی سے سر ایڈورڈ کول بروک کے پاس سے مناسب رپورٹ مرزا کے حق میں روانہ کی گئی۔ موصوف ۱۸۲۷ء سے وہاں رزیڈنٹ کی خدمت پر مامور تھے یا یوں سمجھنا چاہیے دہلی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ تاہم ۱۸۲۹ء کا موسم بہار بھی گزر گیا اور اس اصل معاملے میں کامیابی کی کوئی شکل نہیں دکھائی دی جس کی خاطر غالب نے کلکتے کا یہ تھکا دینے والا سفر اختیار کیا تھا، یعنی ان کے پنشن کے قضیے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی اور اس میں فیصلہ کن اہمیت ان واقعات کی تھی جو اس عرصے میں دہلی میں پیش آئے۔ اب کلکتے سے قطع نظر کرتے ہیں اور فی الحال غالب کو ہندوستان میں انگریزوں کی راج دھانی کلکتے ہی میں وہاں کے بادۂ ناب اور گھنگور گھٹاؤں جیسے بہکاووں اور دل فریبیوں سے نبٹنے کے لیے چھوڑتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سات سمندر پار کے کہرآلود جزیرۂ برطانیہ سے وارد ہونے والی ان سیم تن ماہ پاروں کی دل فریبیوں سے نبٹنے کے لیے بھی، جو یورپ کے لیے مخصوص، پابندیوں سے آزاد اپنے طور طریقوں سے، عورتوں کی پردہ نشینی کے عادی کسی بھی صاحب ایمان کے تخیل کو متاثر کرنے کی اہل تھیں۔ یہاں سے دہلی منتقل ہوتے ہیں، جہاں اس وقت کول بروک کا وہ معاملہ شروع ہوتا ہے، جس کا راست تعلق ہماری داستان سے ہے۔ دہلی میں ہماری ملاقات گرگِ باراں دیدہ کول بروک سے ہوگی جو سینتالیس سال سے پہرے کے کتے کی طرح کمپنی بہادر کے مفادات کی نگرانی پر مامور تھا اور دل و جان سے اس کی خدمت بجالا رہا تھا۔ لیکن اب اس کی ساری دوڑ دھوپ نقطہ اختتام کو پہنچنے والی تھی۔ مناسب ہوگا کہ اس معاملے کو سمجھنے کے لیے ہم اسپیر کی مدد لیں، جو دہلی کے اس عہد کا مورخ ہے جب مغلیہ سلطنت کا سورج بس ڈوبنے ہی والا تھا اور جس کی تحقیق کا موضوع دہلی کے انتظامیہ کے اسی عہد کی کارگزاریاں ہیں۔

اسپیر کے بیان کے مطابق جب دہلی رزیڈنسی میں کول بروک نے اپنے عہدے کا جائزہ لیا تو وہاں اس کو کافی تجربہ کار اور لائق مددگار ملے۔ "ان میں سے ایک کمپنی کی ملازمت دیوانی کا ہیم جُو ولیم فریزر بھی تھا جس سے بہت جلد کول بروک کے نہایت گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے۔ اس کے علاوہ یہاں ہونہار بس لاپ اور تجربہ کار کیونڈش بھی تھے۔ سر طامس منکاف، یعنی سر چارلس منکاف کے چھوٹے بھائی بھی تھے (سر چارلس دہلی کے سابق بے تاج بادشاہ تھے۔ مصنفہ کتاب)۔ اور پھر یہاں جواں سال ہنری ایلیٹ تھا جس نے مستشرقیات میں اپنی علمیت کی بنیاد ڈالنے کا کام بس ابھی ابھی شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے کم عمر چارلس ٹرے ولیان تھا، جو یہاں ابھی ابھی وارد ہوا تھا اور جس نے کچھ ہی عرصہ قبل کلکتے کے کالج میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ اسے سب کے پسندیدہ شعبۂ امور مملکت میں عہدہ ذاتی صلاحیتوں کی بنیاد پر ملا تھا، جہاں سر چارلس منکاف نے اس کا تقرر ایک ایسے شخص کی حیثیت سے کیا تھا جو ان کے خیال میں جدید مثالی "سیاست داں" کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ وہ جتنا سنجیدہ تھا اتنا ہی تیز طرار نوجوان بھی تھا، جس کی سرشت میں ایک انگریز پادری کی سنجیدگی اور فلسفۂ افادیت اجتماعی پر حال ہی میں ایمان لانے والوں کا جوش و خروش اکٹھا ہو گئے تھے۔ اس میں ایک مسیحی مجاہد اور اصلاح پسند کی خصوصیات یک جا ہوگئی تھیں۔ غالباً اسے منکاف کے چلے جانے سے مایوسی ہوئی لیکن جلد ہی اس نے ہریانے میں شیر کے شکار اور فرانسیسی ماہر نباتیات ژاکی مان سے بات چیت کے ذریعے اپنی اشک شوئی کر لی۔۔ یہی وہ شخص ہے جس کے روپ میں کول بروک کی، کمپنی کے نوکر شاہی انتظامیہ میں نئے رجحانات سے مٹ بھیڑ ہوئی۔

ٹرے ولیان کے پاس، جس کی ملازمت کا آغاز ۱۸۲۷ء میں ہوا، ہندوستان کے نوآبادیاتی موقف سے زیادہ سے زیادہ جلب منفعت اور ملک کا نظم و نسق چلانے کے بہتر طریقوں کے بارے میں نوبہ نو خیالات کی کوئی کمی نہیں تھی۔ چناں چہ اس نے اپنے حاکم بالادست کے نوآبادیاتی امرانہ طور طریقوں کی مذمت میں دیر نہیں کی جن کی حدیں، اس کے خیال میں، نہ صرف رشوت ستانی بلکہ سیاسی کوتاہ اندیشی سے بھی ملتی تھیں۔ اسی نے ان بدعنوانیوں کا پردہ فاش کیا، جن کی بنا پر کول بروک کا وہ "معاملہ" سب کے سامنے آیا اور جس کی سارے سرکاری ہندوستان میں اتنی تشہیر ہوئی۔ جیسا کہ اسپیر لکھتا ہے

ایک عرصۂ دراز تک اس شرم ناک معاملے کے برسرِ عام ذکر سے لوگوں کو بڑے جتن سے باز رکھا جاتا تھا۔

رزیڈنٹ کی حرکتوں کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد ٹرے ولیان جس طرح سے پیش آیا وہ اگلی پیڑھیوں کے ان نمائندوں کے رویے سے بالکل جداگانہ تھا، کمپنی میں جن کی ملازمت کا آغاز کم و بیش پندرہ سال کی عمر میں ہوتا تھا اور جو نتیجۃً ایسا سمجھتے تھے کہ یہ دستور تو ہمیشہ کے لیے بندھ گیا ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ٹرے ولیان کے پاس اپنے اصول اور اپنے آدرش تھے۔ جن سے رزیڈنٹ کی روش کسی طرح سے میل نہیں کھاتی تھی۔

کمپنی کے نمائندوں اور مقامی افراد کے ربط باہمی کی صورت میں ایک دستور کی پابندی کی جاتی تھی جس کے مطابق درخواست گزار کے لیے لازمی تھا کہ وہ قیمتی تحفے پیش کرے اور وصول کنندہ کا فرض تھا کہ یہ سب نذرانے کمپنی کے حساب میں جمع کرے کیوں کہ ان کا کمپنی کی ملکیت میں شمار ہوتا تھا۔ تاہم کمپنی کو تاجروں، کاری گروں، دیسی ریاستوں کے فرماں رواؤں اور دیگر اہلِ غرض افراد کی طرف سے پیش کیے جانے والے مال و متاع کا ایک قابلِ لحاظ حصہ ان تحفوں کے گودام یا توشہ خانے کے نہاں خانوں میں محفوظ رہنے کی بجائے باہر ہی رہ جاتا تھا۔ مثال کے طور سے ٹرے ولیان نے دیکھا کہ پانچ پانچ سو روپے کی بیش بہا کشمیری شالیں، بجائے اس کے کہ توشہ خانے میں اپنی مقررہ جگہ پر رہیں، لیڈی کول بروک کے شانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں (ملحوظِ خاطر رہے کہ پانچ سو روپیوں کو اس زمانے کے لیے ایک خطیر رقم سمجھنا چاہیے، غالب کی سالانہ پنشن ساڑھے سات سو روپے تھی)۔ دراصل اس طرح کے "تحفوں" اور نذرانوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر ان پر متصرف ہونے کے عادی یہ انگریز "نواب" اپنے لیے جو کچھ روا رکھتے تھے اس کے مقابلے میں ان شالوں کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔ مسلسل دو سال تک اپنی ذمہ داری پر تحقیقات سرانجام دیتے ہوئے نوجوان عہدہ دار نے اتنے ثبوت فراہم کر لیے جن کی بنیاد پر اس نوآبادیاتی گرگِ باراں دیدہ پر رشوت ستانی، غبن اور غداری کا الزام عائد کیا جا سکے۔

بادی النظر میں طرفین کی طاقت میں کافی فرق تھا۔ ایک طرف وہ گھاگ سیاست داں تھا، جس کی نہ صرف انگریزی رزیڈنسی میں جڑیں بہت گہری تھیں، بلکہ جس کے "دیسیوں" کی ایک بہت بڑی تعداد سے گہرے تعلقات تھے اور جس کو حکومتِ برطانیہ اور مغل دربار، دونوں کی طرف سے متعدد لمبے چوڑے خطابات سے نوازا جا چکا تھا۔

دوسری طرف ایک دھن کا پکا جنونی نوجوان تھا جو نہ صرف شکار کی بو پا جانے والے سگِ تازی کی اعلیٰ درجے کی قوتِ شامہ، فلسفۂ افادیت اجتماعی، عام بہبودی وغیرہ وغیرہ کے آدرشوں سے لیس تھا بلکہ جس کو نئی ساخت کے ملازمت پیشہ بیوپاری کی جان لیوا گرفت پر بھی قدرت حاصل تھی۔ جون ۱۸۲۹ء میں اس نے باضابطہ طور پر حکام کو مطلع کر دیا کہ کول بروک سے رشوت ستانی کا جرم سرزد ہوا ہے۔ کول بروک کو عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اب دہلی میں کول بروک اور ٹرے ولیان کے طرف داروں کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ کول بروک نے ہر طرف سے زور لگا دیا، لیڈی کول بروک نے اپنے پانسے پھینکے۔ کول بروک کا فریزر پر اپنے اثر کو کام میں لانا فیصلہ کن قدم ثابت ہوا۔ اس اثنا میں فریزر کا تقرر بہ حیثیت رزیڈنٹ کول بروک کی جگہ پر ہوا تھا۔ فریزر کو اپنے دوست سے ہمدردی تھی لیکن کول بروک کو اسے اس بارے میں مطلع کرنے کی فرصت نہ ملی کہ اسی مرحلے میں جس کے ذریعے خود اس کی سبک دوشی کے احکام صادر ہوئے تھے، راجہ بختاور سنگھ پر مزید مقدمہ نہ چلانے کی ہدایات بھی دی گئی تھیں۔ چناں چہ فریزر نے مقدمہ جاری رکھا اور حیرت زدہ ہی رہا کہ کس خطا کی پاداش میں اسے کلکتے سے ہدایات کی عدم تعمیل کے نام پر تنبیہہ کی گئی۔ فریزر کی شرافت نے اس سے ایسے کام کروائے جن سے اس کی وفاداری بھی ظاہر ہوتی ہے اور کوتاہ اندیشی بھی۔ اس نے ہدایت دی کہ شہر دہلی اور اس کے مضافات پر سر ایڈورڈ کول بروک کو بہ حیثیت رزیڈنٹ جو بھی مالی اور عدالتی اعلیٰ اختیارات حاصل تھے وہ برقرار رہیں گے۔ مزید برآں فریزر نے یہ بھی ہدایت دی کہ کول بروک کا وہ اعزاز و اکرام بھی برقرار رہے گا جس کا وہ بحیثیت رزیڈنٹ مستحق تھا۔ اس طرح سے کول بروک کو صرف اپنے سیاسی اختیارات سے ہاتھ دھونا پڑا اور قدرتی بات ہے کہ اپنے غیر دانش مندانہ فیصلوں سے فریزر نے

ترے ولیان کے روپ میں اپنا ایک دشمن پیدا کرلیا لیکن کول بروک اور اس کے طرف داروں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اسے ترے ولیان سے عہدہ برا ہونے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اسے قطعی طور سے معزول اور برطرف کیا گیا اور مجرم قرار دیا گیا۔ جتنے عرصے تک یہ تحقیقات چلتی رہیں تقریباً اتنا ہی وقت غالب کے کاغذات اور شاعر کے حقوق وراثت کی بحالی کے بارے میں کول بروک کی رپورٹ کو اپنا سفر طے کرنے میں لگا۔ نتیجۃً جب دفتری چھان بین کے تمام مراحل طے ہو گئے اور رپورٹ پر عمل کا وقت آیا تو وہ بے اثر قرار پائی۔

اب نئے رزیڈنٹ ہاکنس سے داد طلب کی گئی، لیکن وہاں سے پہنچنے والی اطلاعات غالب کے لیے بالکل غیر تسلّی بخش تھیں۔ ترے ولیان کے دوسرے احباب کی طرح ہاکنس کی بھی نواب شمس الدّین سے گہری دوستی تھی اور ہمارے قصّے میں یہ نواب اب ایک منفی کردار کی شکل میں ابھرتے ہیں۔ لیکن فی الوقت انگریزوں کے تعلق سے وہ اپنا پارٹ اسی مکھوٹے کو پہن کر ادا کرتے ہیں جو ان کے باپ نواب احمد بخش کو بھی پسند تھا، اور وہ تھا سلج علاقہ فیروزپور کے امیر رئیس کا روپ، جو انگریزوں کا وفادار بھی تھا اور باتوں سے دل موہ لینا بھی جانتا تھا، جس کے برتاؤ میں شائستگی تھی اور جو متواضع اور مہمان نواز تھا۔ اف، یہ مشرقی مہمان نوازی!

یہاں ترے ولیان کے ماہر نباتیات دوست ژاک ماں کے خط کا حوالہ دیے بغیر نہیں رہا جاتا جس میں اس نے اس نوجوان نواب سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے " فیروزپور سے دو فرسخ کے فاصلے پر جب میں گھوڑے سے پیدل آرہا تھا اور صبح ایسی ہی دل فریب تھی جیسی ہمارے ملک میں اپریل کے مہینے میں پو پھٹنے کے وقت ہوتی ہے، مجھے گھڑسواروں کا ایک گروہ دکھائی دیا جس کا سرگروہ ایک خوش وضع نوجوان تھا۔ اسے میں نے پہچان لیا، وہ اس علاقے کا نواب تھا۔ میرے قریب آنے کی غرض سے وہ اپنے گھوڑے سے کود کر اترا۔ ہم لوگ بڑے نمائشی انداز میں ملے، معانقہ کیا اور ایشیائی خوش خلقی کی بعض اور نشانیوں کا مظاہرہ کرنے کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ نواب مجھے اپنے ہم راہ ایک خوش نما محل میں لے آئے، جہاں سے اب میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ جب میں باغ کے دروازے سے گزر رہا تھا تو پاس کے قلعے سے مجھے توپوں کی سلامی دی گئی۔ جب ہم ہال میں داخل ہوئے ناشتہ اس تمام نفاست اور خوب صورتی کے ساتھ یوروپی ڈھنگ سے میز پر لگایا جا چکا تھا، جس کا آپ تصوّر کر سکتے ہیں۔ چوں کہ آج کل رمضان ہے، میرے میزبان جو مسلمان ہیں، میرے شریک طعام تو نہیں ہو سکے، لیکن انھوں نے میری خاطر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔۔۔۔

تاہم جب بھی سوتیلے بھائیوں اور غالب کے خاندان کو ان کے حصے کی رقم کی ادائیگی کا معاملہ درپیش ہوتا تو یہ خوش وضع نوجوان ایک ایک پیسے کو، چاہے وہ اپنا ہو یا غیر کا، دانتوں میں پکڑنے والے انتہائی حریص اور ہوشیار بیوپاری کا روپ دھار لیتا۔

کسی وقت شمس الدّین سے ملاقات کے موقع پر غالب نے ان سے لیک کا وہ شقہ دکھانے کی خواہش کی تھی جس کی رو سے ان کو اور ان کے افراد خاندان کو دس ہزار روپے سالانہ پنشن کی ادائیگی کی قرارداد کو پانچ ہزار روپے سالانہ میں تبدیل کیا گیا تھا۔ انھوں نے وہ دستاویز دکھائی، لیکن غالب کو شک ہوا کہ یہ شقہ جعلی اور ناقابل اعتبار ہے۔ اس شقہ پر سرکاری مہر کا کہیں نام و نشان نہیں تھا، اس کا دلّی کے ان دفاتر میں کہیں اندراج تک نہیں تھا جن کے ذریعے اس نوعیت کی مالی دستاویزات کا اجرا ہونا چاہیے تھا اور جہاں ان دستاویزات کی نقلیں محفوظ رہتی تھیں۔ کلکتے کے ان دفاتر میں بھی جہاں قانوناً اس طرح کی دستاویزات محفوظ رکھی جاتی تھیں، اس شقے کا کہیں پتہ نشان نہیں تھا۔

غالب نے پنشن کے سلسلے میں اپنے مطالبات کو باضابطہ پانچ نکات کی شکل میں اس طرح پیش کیا۔

۱) پہلی قرارداد کے مطابق حالاں کہ مجھے اور میرے افراد خاندان کو پنشن سالانہ دس ہزار روپے کے حساب سے ملنی چاہیے تھی لیکن واقعتہً کم دی جا رہی ہے، آئندہ پوری رقم دی جائے۔

۲) اب تک نواب شمس الدین سے جس مقررہ رقم سے جس قدر کم ملی ہے نواب سے اس کا بقایا دلایا جائے۔
۳) میری (یعنی غالب کی) شخصی پنشن کا تعین کیا جائے اور اس کی ادائیگی دوسرے ورثا سے علاحدہ ہو۔
۴) مجھے پنشن دہلی کے کلکٹر کے ذریعے ادا کی جائے نہ کہ نواب شمس الدین کے ذریعے۔
۵) غالب کو ان کی عالی خاندانی اور مرتبے کے مدِ نظر اعزازی خطابات سے نوازا جائے۔

اپنے تمام کاغذات، جن کو وہ "رپورٹ" کا نام دیتے تھے، مرزا نے گورنر جنرل کلکتہ بہ اجلاس کونسل کے ملاحظ میں پیش کر دیے۔ اس دوسرے شعبے کے اندراجات کی توضیح کے لیے جس میں پنشن کی رقم گھٹا دی گئی تھی لیک کے ا، وقت کے اراکین عملہ کی شہادت درکار تھی۔ لیک کے سابق سکریٹری جان میلکم اب بمبئی میں تھے۔ اس سلسلے میں ان سے دریافت کیا گیا اور غالب کے مقدمے کا فیصلہ اب اس پر موقوف تھا کہ وہاں سے کیا جواب آتا ہے۔

۱۸۲۹ء کے اواخر میں مرزا پر یہ بالکل واضح ہو گیا کہ کلکتے میں انھیں اور کچھ ملنے ملانے والا نہیں ہے۔ غالب کے قطعے "ساقی نامہ" میں محرمِ اسرار ساقی اور شاعر کے درمیان پہلے تو گفتگو مختلف نظریہ ہائے حیات، مذہبی مسائل اور تلاش حق کے بارے میں ہوتی ہے اور پھر اخلاقی مسائل پر۔ شاعر اسے سفر پر مجبور کرنے والے جور و جفاءِ اہلِ وطن کا، دہلی، بنارس اور عظیم آباد کا اور بالآخر کلکتے کا ذکر کرتا ہے:

حال کلکتہ باز جستم ، گفت	ذکرِ کلکتہ جو کیا تو کہا
باید اقلیم ہفتمش گفتن	اس کو اقلیم ساتویں کہنا
گفتم آدم بہم رسد دروے	پوچھا لوگ آتے ہیں کہاں سے یہاں ؟
گفت از ہر دیار و از ہر فن	کہا ہر اک دیار و فن سے میاں !
گفتم این جا چہ شغل سود دہد ؟	پوچھا : ہے شغل کیا یہاں اچھا ؟
گفت از ہر کہ ہست ترسیدن	کہا ہر ایک بات سے ڈرنا !
گفتم این جا چہ کار باید کرد ؟	پوچھا : کیا کام ہے یہاں بہتر ؟
گفت قطعِ نظر ز شعر و سخن	کہا شعر و سخن سے قطعِ نظر
گفتم این ماہ پیکران چہ کس اند ؟	پوچھا : ہیں کون سب یہ مہ پیکر
گفت خوبانِ کشور لندن	کہا لندن کے ہیں یہ سب دل بر
گفتم ایمان مگر دلے دارند ؟	پوچھا : سینے میں ان کے دل ہے کیا ؟
گفت دارند لیکن از آہن	کہا : ہے لیک ہے وہ لوہے کا !
گفتم از بہر داد آمدہ ام	کہا : انصاف کا ہوں طالب میں
گفت بگریز و سر بہ سنگ مزن	کہا پتھر سے سر نہ اپنا پھوڑ
گفتم اکنون مرا چہ باید ؟ گفت	پوچھا : کیا کام ہے مجھے زیبا
آستین بر دو عالم افشاندن	کہا عالم پہ آستین نچوڑ

(ترجمہ: مضطر مجاز)

غالب کا کلکتوی رزمیہ اختتام کو پہنچا۔ وہ اس شہر سے رخصت ہو رہے تھے جس نے ان کے دل کو موہ لیا تھا، نئے احباب سے رخصت ہو رہے تھے جن کے ساتھ انھوں نے پھر ساری عمر دوستی نباہی، جو ان کی شاعرانہ بصیرت کے قدرداں تھے، اس امر کی پروا کیے بغیر کہ ان کے پاس کوئی شاندار خطاب تھا یا نہیں اور جو ضابطہ آداب و رسوم کی پروا

بغیر ان سے پوری تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آنے اور اس جدائی کا غم تصنع سے پاک اور پرخلوص تھا۔

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا
ساماں بادشاہی وصل بتاں نہ پوچھ
ہر داغ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرض فضائے سینہ دردِ امتحاں نہ پوچھ
ناچار بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواری رہ و ستم ہم رہاں نہ پوچھ
کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ ہاں
دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

***

نوٹ

(۱) ہمیں بہت خوشی ہے کہ اس بار ہم اس منفرد کتاب کی لائق مصنفہ کے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" کے سابقے کا اضافہ کر رہے ہیں۔ موصوفہ کو حال ہی میں یعنی ماہ مئی ۱۹۹۵ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی ہے۔ آپ کے تحقیقی مقالے کا موضوع "سبکِ ہندی اور فارسی ادبیات میں اس کا مقام۔ شعریات کے مسائل" تھا۔ ہم اس موقع پر ان کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ ان کا خاور شناسی، بہ الفاظ دیگر مفاہمت بین الاقوام، کا مبارک سفر تادیر جاری رہے" اور اس سفر میں وہ نئی منزلیں کامیابی کے ساتھ طے کرتی رہیں۔

(۲) خوشی کی بات ہے کہ ہمارے شہر کے خوش گو شاعر جناب مضطر مجاز نے، جو اس سے قبل "جاوید نامہ" اقبال کا کامیاب ترجمہ کر چکے ہیں، اب اس کتاب میں مولہ غالب کے اشعار کا منظوم ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ امید ہے کہ ان کے ترجمے قارئین کو پسند آئیں گے اور اس کتاب کے اردو روپ کو خوب سے خوب تر بنانے میں معاون ہوں گے۔

(ادارہ)

پروفیسر گیان چند

بہ یادِ حیدرآباد

حیدرآباد، بہشت نژاد، فرخندہ بنیاد، جنّو سواد، فسحت آباد، نعمت خداداد زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا...... میں نے
خطاتِ ارض میں خدمت گزاری کی ہے: بھوپال، جموں، الہ آباد اور حیدرآباد۔ ابتدا بھوپال، انتہا حیدرآباد دونوں سابق والیانِ ریاست
مملکتیں۔ آخری آشیاں بندی لکھنو میں کی ہے جو بہ صورتِ ظاہر زندگی کا آخری پڑاؤ ہونا چاہیے۔ میرے ہر مستقر میں کچھ نہ کچھ خوبیاں تھیں
جو دل کشی، دل فریبی، دل بری، دل ربائی اور دل داری بلدہ حیدرآباد میں تھی وہ اور کہیں نہ ملی۔ اب اسی کی دلچسپ یادیں دل آویزی
دل دوزی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ اپنی اس دل باختگی کو تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔

میرا سب سے طویل قیام بھوپال میں رہا ہے۔ سوچا تھا کہ زندگی وہیں کٹ جائے گی، ایک مکان بھی تعمیر کر لیا۔ وہاں کے کالج
صرف بی۔ اے تک کا شعبہ تھا۔ میں نے وہاں مدھیہ پردیش کا پہلا پوسٹ گریجویٹ شعبہ قائم کیا۔ مدھیہ پردیش کی کسی یونیورسٹی میں تا
یونیورسٹی کی سطح کا شعبہ اردو نہیں۔ اس ریاست کے کالجوں کے زیادہ تر ایم۔ اے اردو کے شعبے حمیدیہ کالج (وکرم یونیورسٹی) ہی
تحریک یافتہ ہیں۔ لیکن میری ہمت اور ہوس کہنے لگی:

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے کالج کی   کچھ اور چاہیے وسعت مرے عمل کے لیے

یونیورسٹی میں جانے کا جو ہَو کا تھا اس نے بھوپال سے جموں پہنچا دیا۔ جہاں میں نے ایک نیا شعبہ، اردو تشکیل دیا۔ اہلِ بھوپال
طرح اہلِ جموں نے بھی میری بہت آؤ بھگت کی، بہت وقار دیا لیکن وہاں رہ کر معلوم ہوا کہ آئینی قیود کے سبب میں جموں میں ہمیشہ سے
بیگانہ ہی رہوں گا۔ اس ریاست کا شہری نہیں بن سکتا، مکان نہیں بنا سکتا، ووٹ نہیں دے سکتا، ہمیشہ کسی مالکِ مکان کے تحت کرائے
ہی رہوں گا۔ ۱۱ برس کے قیامِ جموں میں سات مکان بدلے، بستر بدوش ہی رہا۔ جہاں ہمیشہ بیرونی بن کر رہنا ہو، وہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے
میں اپنا بنایا ہوا شعبہ چھوڑ کر الہ آباد یونیورسٹی میں پہنچ گیا۔

آزادی سے پہلے میں چھ سال الہ آباد یونیورسٹی کا طالب علم رہ چکا ہوں۔ اردو ادب کے بارے میں جو کچھ اتھلی چھچھلی نظر بہم پہنچا
ہوں وہ اسی درس گاہ کا فیضان ہے۔ اسی کے شعبے میں پروفیسر و صدر بن کر آنا بڑا اکتساب و اعزاز تھا۔ یوپی کا متوطن ہوں۔ سوچا کہ
یونیورسٹی میں آگیا ہوں، اب یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا لیکن بندہ کچھ سوچتا ہے، تقدیر اس پر خندہ کرتی ہے۔ مشیت کو الہ آباد میں
طویل قیام منظور نہ تھا۔ کیوں؟ میں الہ آباد سے اپنے اخراج اور حیدرآباد میں ورود کی کہانی قدرے تفصیل سے افشا کرتا ہوں۔

دو معمولی باتوں پر میں اربابِ الہ آباد یونیورسٹی سے روٹھ گیا۔ انھوں نے مجھے وہ سینیرٹی نہیں دی جو قواعد کی رو سے مجھے ملنا چاہ
تھی۔ یونیورسٹی نے مجھے جس تنخواہ پر مقرر کیا، حکومتِ یوپی نے اس کی منظوری نہیں دی، اس سے ایک سیڑھی نیچے رکھا۔ اس پر میں
برداشتہ ہو گیا اور وہاں سے بھی کھسکنے کا قصد کر لیا۔

مجھے دو یونیورسٹیوں میں، تقرر سے پہلے، یہ اتفاق ہوا ہے کہ ان کے شہر میں سیاحت یا کسی کام کے لیے گیا۔ اس وقت سان گمان
نہ تھا کہ میں یہاں ملازم ہو کر آ جاؤں گا لیکن ایک ہی سال میں وہاں انٹرویو کے بغیر مامور ہو گیا۔ ۱۹۶۳ء میں گھومنے کے لیے سری نگر گیا۔ میں

جودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنوں کشمیر یونیورسٹی نے مجھے وہاں ریڈر اردو کی سلیکشن کمیٹی میں بہ طور ماہر کے بٹھالیا۔ کرنا کرتار کا ایسا
اکہ میں اگلے ہی سال جنوں یونیورسٹی میں شامل ہوگیا۔ ۱۹۷۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں پی ایچ۔ ڈی کا ایک زبانی امتحان لینے حیدرآباد گیا۔
رالقادر سروری صاحب کے بارے میں مقالہ تھا۔ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا۔ اس وقت وہاں کی مجوزہ مرکزی
نیورسٹی کے بارے میں بہت دھندلا سا تصور تھا۔ میں نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ سے کہا کہ سنا ہے وہاں ڈاکٹر سیدہ جعفر مقرر ہونے والی ہیں۔
ہوں نے جواب دیا کہ یہ اس وقت کی بات تھی جب نورالحسن وزیر تعلیم تھے، اب اس کا امکان نہیں۔

بات آئی گئی ہوئی۔ مجھے حیدرآباد یونیورسٹی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس سفر کے بعد ایک بار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے ملاقات ہوئی تو
نوں نے بتایا کہ مرکزی حیدرآباد یونیورسٹی میں سلیکشن کمیٹی ہوئی تھی جس میں وہ اور ڈاکٹر محمد حسن بطور ماہر کے بلائے گئے تھے۔ کسی
یدوار کو موزوں نہ سمجھا گیا۔ وائس چانسلر سردار گوربخش سنگھ نے نارنگ صاحب سے کہا کہ اگر وہ آنا چاہیں تو انھیں گریڈ کی سب سے اونچی
ؤاہ دی جا سکتی ہے۔

میرے ذہن میں نارنگ صاحب کی بات ہی تھی۔ جب حکومت یو۔ پی نے الہ آباد یونیورسٹی میں مجھے وہ تنخواہ نہیں دی جس کی
زیکیو ٹیو کونسل نے سفارش کی تھی تو میں نے جھنجھلاہٹ میں طے کیا کہ اب یہاں سے بھی کوچ کر جانا چاہیے۔ ۱۹۷۸ء کی گرمیوں کی چھٹیوں
ں بجنور گیا تھا، وہاں سے حیدرآباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے نام ایک مفصل چٹھی لکھی کہ سنا ہے آپ کو یونیورسٹی کے لیے اردو کے
وفیسر کی ضرورت ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آسکتا ہوں۔ لفافہ ڈاک خانے میں رجسٹری کرا کے آیا تو ہندوستان ٹائمز دہلی ایڈیشن گھر پر آچکا تھا
یکھا تو اس میں حیدرآباد کے اردو پروفیسر کی جگہ کا اشتہار موجود تھا۔ اسے پڑھ کر میں سٹپٹایا۔

چند ماہ بعد الہ آباد یونیورسٹی سے میری خفگی جاتی رہی۔ ہوا یوں کہ اگست ۱۹۷۸ء میں وہاں کے وائس چانسلر ڈاکٹر ہجیلا نے مجھے وہاں
کے پرو وائس چانسلر بننے کی پیشکش کی۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ دوسرے کئی پروفیسر اس عہدے کے خواہاں ہیں۔ وائس چانسلر نے کہا
۔ جو خواہاں ہیں وہ اس کے شایاں نہیں۔ میرے انکار کے باوجود انھوں نے ایک ہفتے کے بعد ڈین اسٹوڈینٹ ویلفیر کو میرے گھر بھیجا جنھوں
نے مجھے اس منصب کو قبول کرنے کے لیے بہت پھسلانا چاہا۔ میں نے قطعی انکار کر دیا لیکن اس کے بعد الہ آباد چھوڑ کر حیدرآباد جانے کا ارادہ
رک کر دیا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر نارنگ سے برابر مراسلت یا فون پر تبادلہ خیالات ہوا کیا میں نے انھیں بتادیا کہ میں نے اس طرح حیدرآباد
کے وائس چانسلر کو چٹھی لکھی تھی لیکن اب جانے کا ارادہ نہیں۔ نومبر ۷۸ء میں نارنگ صاحب کا فون آیا کہ دسمبر میں حیدرآباد میں سلیکشن
کمیٹی ہونے والی ہے۔ آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ ادھر میں یو۔ پی اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کا رکن تھا۔
پہلی یا دوسری دسمبر ۷۸ء کو لکھنؤ میں عاملہ کا جلسہ ہونے کو تھا۔ میں نہیں گیا، اپنی جگہ ڈاکٹر محمد عقیل رضوی کو بھیج دیا۔ ڈاکٹر محمد حسن اکادمی
کے وائس چیرمین تھے۔ میں نے ڈاکٹر عقیل کے ذریعے محمد حسن کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ حیدرآباد کی سلیکشن کمیٹی میں بلائے گئے ہوں تو ان سے
کہہ دینا کہ میں حیدرآباد جانے کو راضی نہیں۔

سلیکشن کمیٹی سے پہلے مجھے انٹرویو کے لیے مدعو کیا گیا۔ میں اس پر بھڑک اٹھا۔ میں نے اس مراسلے کو پھینک دیا، نہ کوئی جواب دیا، نہ
گیا۔ سلیکشن کمیٹی ہوئی۔ نارنگ اور محمد حسن ماہرین تھے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر ماہرین نے کہا کہ غالباً میں نہ آؤں گا۔ اس کے باوجود مجھے
منتخب کیا گیا، دوسرے نمبر پر ترویچی کے ڈاکٹر رضی الدین احمد کا نام رکھا گیا۔ کچھ دنوں بعد دسمبر ۱۹۷۸ء ہی میں میرے نام کا تقرر نامہ آگیا جس
میں لکھا تھا کہ مجھے ۲۲۵۰ روپیے کی تنخواہ پر مقرر کیا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ معذرت لکھ کر بھیج دوں۔ ڈاکٹر نارنگ سے رابطہ رہا۔ انھوں نے
روکا کہ میں انکار نہ کروں، طرح طرح کی وضاحتیں طلب کر کے ٹال مٹول کرتا رہا ہوں۔ میں نے ایک مہینے تک یونیورسٹی کو کوئی جواب

نہیں دیا۔ وہاں سے رجسٹرار کے خطوط آیا کیے کہ اپنی منظوری بھیج دیجیے۔ میں نے ٹالنے کی خاطر انھیں مکان دینے کے لیے لکھا۔ انھیں دنوں اپنے مہربان میر عابد علی خاں سے مراسلت ہوئی۔ وہ جنرل کمیٹی میں میرے ساتھی رہ چکے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ مجھے ضرور آنا چاہیے "اگر آپ نہ آئے تو آپ کا تو کوئی نقصان نہ ہوگا، یونیورسٹی کا نقصان ضرور ہوگا۔" پروفیسر سرور نے بھی لکھا کہ مجھے ضرور جانا چاہیے۔ اسی دوران میں فروری ۸۹ء میں بنارس یونیورسٹی میں پروفیسر اردو کی سلیکشن کمیٹی ہوئی جس میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر خورشید الاسلام اور من کمتر کو بطور ماہر بلایا گیا۔ خورشید الاسلام نے مجھے گھیرا اور کہا کہ اگر آپ نہیں جائیں گے تو اردو کو نقصان پہنچانے کے مجرم کہلائیں گے۔ ضرور جائیے اگر حیدرآباد پسند نہ آئے تو دو تین مہینے بعد کسی حیلے سے چھوڑ کر الہ آباد واپس آجائیے۔ ان کے اصرار کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب کی رائے تھی کہ مجھے الہ آباد نہیں چھوڑنا چاہیے لیکن میں جانتا تھا کہ سب ان کا مشورہ رضی الدین صدیقی کے مفاد کے پیشِ نظر ہے۔

میرے خاندانی بھائی مشیر اور بہی خواہ پی۔ سی۔ جین الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر معاشیات کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ مجھے جانا چاہیے۔ مجھے الہ آباد یونیورسٹی میں مقرر کرنے والے وائس چانسلر رام سہائے تھے۔ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد ان سے خاصا جلنا جلنا رہا۔ انھوں نے بھی کہا کہ اب الہ آباد یونیورسٹی میں کیا رکھا ہے، مجھے حیدرآباد کا تقرر قبول کر لینا چاہیے۔ کئی اہلِ اردو نے کہا کہ تمھیں نئے شعبے کھولنے کا تجربہ ہے، اگر تم نہیں گئے اور دوسرے صاحب آگئے تو یونیورسٹی کے مفاد میں نہ ہوگا۔ میں نے جملہ بہی خواہوں کے امر میں سرِ تسلیم خم کیا، الہ آباد یونیورسٹی سے ایک سال کی چھٹی لی اور حیدرآباد یونیورسٹی کو لکھ دیا کہ میں آرہا ہوں۔ ایسا شاید ہی ہوا ہو کہ کوئی الہ آباد یونیورسٹی کی پروفیسری چھوڑ کر کسی دوسری یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر گیا ہو۔

میں ۲۶/ مارچ ۷۹ء کو حیدرآباد یونیورسٹی میں پہنچا۔ اہلیہ کے ساتھ گیا تھا، یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں مقیم ہوا۔ ابھی میری آزمائش ختم نہیں ہوئی۔ میری اہلیہ یوپی چھوڑ کر حیدرآباد جانے کو تیار نہ تھیں۔ ایک دن حیدرآباد کے گیسٹ ہاؤس میں، بہت فیل مچایا، واقعی روئیں کہ یہاں سے واپس الہ آباد چلو۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ آنے کے فوراً بعد لوٹ گیا تو نکو کہلاؤں گا۔ اب آئے ہیں تو یہاں ایک سال رہ کر دیکھیں، اگر تمھیں پسند نہ آیا تو الہ آباد یونیورسٹی کی چھٹی ختم ہونے پر وہاں واپس چلے جائیں گے۔ جون کے آخر میں، میں اور اہلیہ اسبابِ خانہ داری کے ساتھ حیدرآباد پہنچ گئے۔ یہ ہے میرے ورودِ حیدرآباد کی غیر دلچسپ، ذاتی داستان۔

لیکن اس مصرِ دل نواز سے میری یاد اللہ ۱۹۷۹ء سے تقریباً ۲۲ سال پیش تر سے ہے۔ ۱۹۵۶ء میں مدھیہ پردیش بننے کے بعد وکرم یونیورسٹی اجین قائم ہوئی۔ حمیدیہ کالج بھوپال، نہ صرف اس یونیورسٹی میں، بلکہ پورے مدھیہ پردیش میں ایم۔ اے اردو کے شعبے والی واحد درس گاہ تھی جس کی وجہ سے ریاست کے اردو اساتذہ میں میں تنہا (کالج) پروفیسر کے منصب کا معلم تھا۔ مجھ ہی کو وکرم یونیورسٹی اجین میں اردو کمیٹیوں کا سربراہ مقرر کیا جاتا تھا۔ میں پروفیسرس کالونی بھوپال میں سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا۔ ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ کسی کی معیت میں پروفیسر عبدالقادر سروری میرے غریب خانے کی دہلیز پر تشریف لائے۔ میں نے انٹر اور بی۔ اے میں ان کی کتابیں "دنیائے افسانہ" "کردار اور افسانہ" نیز جدید اردو شاعری" دیکھی تھیں۔ اتنا بزرگ پروفیسر خود سے چل کر کالج کے ایک معلم کے گھر آئے اللہ اللہ! سبحان اللہ! سروری صاحب کو دیکھ کر قدرے امید شکنی ہوئی۔ خلافِ توقع ان کا گہرا سانولا رنگ دیکھ کر ایسا لگا جیسے دکن سے کوئی سبرا نیم چلا آیا ہے۔

باتوں باتوں میں انھوں نے پوچھا کہ "وکرم یونیورسٹی میں اردو کے بورڈ آف اسٹڈیز کے کنوینر آپ ہی ہوں گے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس وقت سے آخرِ دم تک سروری صاحب مجھ پر نہ صرف کمال مہربان رہے بلکہ عمروں کے تفاوت کے باوجود، میرے گہرے (سینیر) دوست بھی ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء سے انھوں نے بارہا مجھے عثمانیہ یونیورسٹی کی اردو کمیٹیوں میں بلایا، بارہا میں حیدرآباد اور سری نگر میں ان کی میزبانی سے نعمت اندوز ہوا۔ وہ بھی بارہا بھوپال میں میرے غریب خانے پر نمک چش ہوئے۔ وہ مجھے کالج سے نکال کر کسی یونیورسٹی

یں پہنچانے کے لیے کوشاں رہے۔ تنہا انھیں کی کوشش سے میں جموں یونیورسٹی میں پروفیسر ہو کر گیا۔

لیکن مجھے حیدرآباد کی حکایتِ لذیذ بیان کرنی ہے، اپنی اٹھان کی لاف وگزاف مقصود نہیں۔ ۱۹۵۷ء سے سروری صاحب کے کشمیر جانے تک میں کئی بار حیدرآباد گیا اور ان کے دولت خانے پر مہمان ہوا۔ وہ مجھے اسٹیشن سے کار میں لے جاتے تھے، اکثر حیدرآباد (نام پلی) کے اسٹیشن پر اور ایک آدھ بار سکندرآباد کے اسٹیشن پر۔ شمالی و وسطی ہند سے نکل کر جیسے ہی ریل آندھرا کی حدود میں داخل ہوتی، دکن کا تنوع دل کو بھاتا تھا۔ وہاں کی زمین، تودے اور ٹیلے، وہاں کے دراوڑی باشندے، اسٹیشنوں پر خور و نوش کی مختلف اشیا، چائے کی جگہ کافی، سموسے کی جگہ اڈلی وڑا، پوری کے بجائے دوسا دغیرہ، ان سب میں جاذبیت تھی کیوں کہ انسان تبدیلی پسند کرتا ہے۔

لیکن شہر حیدرآباد بقیہ آندھرا سے مختلف تھا۔ یہاں شمال و دکن، ہندو و مسلم، اردو و تیلگو سب ایک دوسرے میں سموئے ہوئے تھے یا کم از کم پرامن بقائے باہمی پر عمل پیرا تھے۔ شہر کے طلسمی مناظر نے میری آنکھوں کے سائبان اور دل کے دالان پر اپنا دام پھینکا اور اچک لیا۔ سکندرآباد اور حیدرآباد (نام پلی) اسٹیشن کے درمیاں حسین ساگر اور اس کے ساحل پر بڑے بڑے بولڈر کیا دل فریب سماں تھا! پھر عثمانیہ یونیورسٹی کی بلند و بالا عمارتیں، جو فنِ تعمیر کا شاہکار تھیں! ایسا یونیورسٹی کیمپس شمالی ہند میں نہیں دیکھا تھا۔ اور پھر حیدرآباد کے اردو والے شعبے کے اساتذہ سید محمد، رفیعہ سلطانہ، حفیظ قتیل وغیرہ! شعبے کے باہر ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی، تمکین کاظمی جیسے مشاہیرِ ادب سے ملاقات ہوئی۔

حیدرآباد کے پہلے سفر ہی میں میں سروری صاحب کے سامنے (ڈاکٹر) زور، زور کی ہانک لگاتا رہا، ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں سروری صاحب اور ڈاکٹر زور کے کشیدہ تعلقات سے واقف نہ تھا۔ سروری صاحب نے مجھے زور صاحب سے ملوایا اور کہا کہ یہ آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔ اسی سفر میں یا بعد میں زور صاحب کا ادارہ ادبیاتِ اردو دیکھا، ایک فرد کا بنایا ہوا دکنی ادب کا تاج محل۔ زور صاحب نے بہ نفسِ نفیس مجھے ادارے سے متعارف کیا۔ دیوار پر ٹنگے خط کوفی کے طغرے دکھائے۔ بغیر نقطوں کا زاویہ، قائمہ والا خط، میں اسے نہیں پڑھ پاتا تھا۔ زور صاحب نے ایک ایک کو پڑھ کر سنایا تو سمجھ میں آگیا کہ واقعی یہی لکھا ہے۔ بڑے عالم آدمی تھے۔ ادارے میں خواجہ حمید الدین شاہد سے ملاقات ہوئی۔ یاد نہیں وقار خلیل کو انھیں دنوں دیکھا یا بعد میں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر جعفر حسن سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ ان کی میز پر ایک گہری طشت میں پانی میں پان کے پتے تیرتے رہتے تھے جن سے وہ وقتاً فوقتاً شوق کرتے تھے۔ سروری صاحب نے فضل الرحمٰن صاحب سے بھی ملوایا۔ غرض مناظرِ قدرت کے طلسمات دل کو مسحور کرتے تھے تو علم و ادب کی بے پایاں دانش افروزیاں ذہن کو اسیر کر لیتی تھیں۔

۱۹۶۲ء میں سروری صاحب حیدرآباد سے سری نگر چلے گئے، ۱۹۶۵ء میں مجھے جموں بلا لیا۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں سروری صاحب ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے گئے، افسوس افسوس۔ دو ایک سال بعد گجرال کمیٹی میں میر عابد علی خاں کا ساتھ ہوا۔ کیسے مخلص و مہربان شخص تھے۔ مجھے حیدرآباد میں کیسے کیسے برگزیدہ، منتخبِ روزگار، بلند کردار، نیک اطوار کرم فرما ملے ہیں! یہ شہر ان اچھوں کی بستی ہے جو ایک غیر ملکی کو دل کھول کر خوش آمدید کہتے ہیں۔ گجرال کمیٹی جب حیدرآباد گئی تو میر عابد علی خان نے اپنے دولت خانے پر ارکانِ کمیٹی کی کیا نوابانہ ضیافت کی۔ طعام کے بعد عزیز وارثی کی قوالی سے دعوتِ قلب کی۔

انجمن ترقیِ اردو آندھرا پردیش نے ارکانِ کمیٹی کو اردو ہال میں ایک استقبالیہ دیا جس میں حیدرآباد کی دنیائے اردو کے جملہ آفتاب و ماہتاب، ثوابت و سیار جگمگا رہے تھے۔ میر اکبر علی خاں، مولوی حبیب الرحمٰن، راج بہادر گوڑ، سری نواس لاہوٹی، حسینی شاہد، زینت ساجدہ وغیرہ۔ اب یاد نہیں کہ اور کون کون سے علما تھے۔ میرا خیال ہے کہ بزرگ محترم میر اکبر علی خان سے میں پیش تر کبھی نہیں ملا تھا۔ انھوں نے بزرگانہ اپنے پن کے ساتھ کہا "کہو گیان چند، اچھے ہو؟"۔ وہ دن اور حیدرآباد میں میرے قیام کا آخری دن، ان کا لطفِ سرپرستانہ مجھے ہمیشہ

ملتا رہا۔ ۱۹۷۵ء میں وہ یو۔پی کے گورنر تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر احتشام حسین کا انتقال اواخر ۱۹۷۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد سے ان کے جانشین کی ڈھنڈائی ہو رہی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں جب میں نے درخواست دی تو الہ آباد کے وائس چانسلر رام سہائے نے مجھے بتایا "گورنر میر اکبر علی خان صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں الہ آباد کی پروفیسری کے لیے آپ کو ایک بہت مناسب نام تجویز کرتا ہوں اور وہ ہیں ڈاکٹر گیان چند" تب سے رام سہائے کی خواہش تھی کہ میں الہ آباد آجاؤں۔ مجھے اندازہ نہیں کہ اکبر علی خاں محترم مجھ مجہول الاسم کی کس ادائے کم سوادی سے متاثر ہو گئے تھے۔

آمدم بر سرِ مطلب۔ میں شہر حیدرآباد، حیدرآباد مرکزی یونیورسٹی اور یونیورسٹی کیمپس کو دل دے چکا ہوں۔ مارچ ۷۹ء کے آخر میں میں مرکزی حیدرآباد یونیورسٹی میں پہنچ گیا۔ جہاں مجھے اس یونیورسٹی کے شایانِ شان شعبہ اردو تشکیل دینا تھا۔ یہ یونیورسٹی بڑے ٹھنٹے کی ہے، جدید ترین امریکی وضع کی۔ اس میں سمسٹر سسٹم ہے اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی طرح جہاں بھی کوئی بھی ممتحن باہر کا نہیں ہوتا۔ جو پڑھاتا ہے وہی امتحان لیتا ہے۔ ان دو یونیورسٹیوں اور پانچ I.I.T ہی کی یہ خصوصیت ہے۔ میں نے دوسری مرکزی یونیورسٹیوں اور اہم ریاستی یونیورسٹیوں کے نصاب منگوا کر اپنی دانست میں ان سب سے بہتر نصاب ترتیب دیا۔ اندازہ ہوا کہ ریاستی یونیورسٹیوں اور مرکزی یونیورسٹیوں میں معیار کا وہی فرق ہوتا ہے جو کالج اور ریاستی یونیورسٹی میں نظر آتا ہے۔ مرکزی یونیورسٹیوں میں بھی مثالی یونیورسٹیاں صرف دو ہیں: نہرو یونیورسٹی اور حیدرآباد یونیورسٹی۔ دہلی یونیورسٹی کا معیار بھی بلند ہے لیکن ان دو یونیورسٹیوں کی سطح کا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ آخر الذکر دونوں یونیورسٹیوں میں طلبہ کی تعداد نہایت محدود رکھی جاتی ہے۔ ۱۹۷۹ء میں حیدرآباد یونیورسٹی میں طلبہ کی تعداد محض ۲۵۰ تھی، اب ۱۵۰۰ سے کچھ کم ہوگی۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں بھی دو تین ہزار کے درمیان ہوگی۔ اتنے کم، منتخب طلبہ کے ہوتے معیار کو سنبھالے رکھنا ممکن ہے۔ دہلی یونیورسٹی جیسی بڑی یونیورسٹی میں نہیں۔

حیدرآباد یونیورسٹی کے موسس ڈاکٹر گربخش سنگھ ہارورڈ (امریکہ) سے کیمسٹری میں ڈاکٹر تھے۔ میں نے متعدد وائس چانسلر دیکھے ہیں لیکن ان جیسا نہیں دیکھا۔ کتنے فعال تھے وہ، نئی یونیورسٹی تعمیر کرنے کے لیے ان سے بہتر افسرِ اعلیٰ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بلند مقصود اور ارفع نظر والے تھے۔ کوشش کر کے ملک بھر سے ڈھونڈ کر، ہوشیار سے ہوشیار اساتذہ مقرر کیے۔ کسی کوشش سفارش کا سوال ہی نہیں۔ دو ایک صورتوں میں ماہرین نے دھوکا دے کر بعض کم معیار اساتذہ کو مقرر کرا دیا تو گربخش سنگھ کا کیا قصور۔ بعد میں گربخش سنگھ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور پانچ سال کی میعاد پوری کی دہلی یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ شاذ ہے۔

وہ میرا بہت خیال کرتے تھے۔ بارہا مجھے اور میری بیوی کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ حیدرآباد یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ میرے گھر طعام پر آئے اور مجھ سے ذکر کیے بغیر اپنے ساتھ دہلی یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اور ان کی بیوی کو بھی لے آئے۔ ان میں وائس چانسلر والا تبختر نہ تھا، ایک اپنا پن تھا۔ میں جب حیدرآباد گیا تو ایک دن اپنے گھر پر ضمناً کہنے لگے کہ میں ۲۴ گھنٹے آنکھ جھپکائے بغیر کار چلا سکتا ہوں۔ مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے برجستہ کہا "سردار جو ہیں"۔ وہ اس بے تکلفی کی اجازت دیتے تھے۔ مجھے ان سے عقیدت ہے۔ ایسی شخصیتیں ہی اداروں کو بناتی ہیں، پدم بھوشن ڈاکٹر گربخش سنگھ جو اولاد سے محروم ہیں!

حیدرآباد یونیورسٹی میں، سائنس میں خصوصاً اور سماجی علوم میں عموماً کیسے کیسے قابل اساتذہ مقرر کیے گئے۔ انسانی علوم میں فلسفہ اور انگریزی کے شعبے بہت جاندار تھے۔ ہندوستانی زبانوں یعنی ہندی، اور اردو اور تیلگو کے شعبے معرکے کے نہ تھے۔ اردو میں مجھ سے پہلے ڈاکٹر ثمینہ شوکت ریڈر بن کر آچکی تھیں۔ میں نے ایک لکچرر ڈاکٹر بہادر حسین رضوی کو مقرر کیا۔ ظاہر ہے ایم۔اے کے لیے تین اساتذہ ناکافی تھے اس لیے عثمانیہ یونیورسٹی سے جزو وقتی یا مہمان اساتذہ کی مدد لی گئی۔ وہاں کے شعبے کی جان ڈاکٹر سیدہ جعفر اور ڈاکٹر مغنی تبسم تھے۔ ہمارے شعبے نے ان دونوں کی خدمات سے استفادہ کیا۔ میرے بعد تو ڈاکٹر سیدہ جعفر مستقلاً شعبے میں آگئیں۔

میں ذکر کر رہا تھا کہ اس یونیورسٹی میں اساتذہ کی اہلیت کا جو اوسط یا مجموعی معیار ہے وہ جے - این - یو کے علاوہ کسی دوسری یونیورسٹی میں نہیں مل سکتا یونیورسٹی کے کم عمر لیکچرر بھی ذہانت کی وہ تابندگی، فکر کی وہ بلندی اور تجزیے کی وہ گہرائی لیے ہوئے تھے کہ مستقبل کو ان سے اور انھیں مستقبل سے بہت سی امیدیں تھیں - ان میں سے کئی افراد ترقی پاکر دوسری یونیورسٹیوں میں چلے گئے اور شہرت پائی - ہر بڑی چھٹی میں اساتذہ کی کھیپ کی کھیپ امریکہ، یورپ اور جاپان وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں مہمان استاد کے طور پر جاتی رہتی تھی - ہندوستانی زبانوں کے شعبوں کو چھوڑ کر بقیہ سب شعبوں میں ایک بھی استاد ایسا نہ ہوگا جو مغربی یونیورسٹی میں نہ گیا ہو - اکثر کے پاس باہر کی ڈگریاں تھیں - میں ان فاضلوں کے کیا نام لوں - مجھے فخر ہے کہ میں ایسی ترقی یافتہ یونیورسٹی میں جاکر تدریس کے فرسودہ نظریات سے ابھر کر، علم و دانش کی تازہ بہ تازہ راہوں پر گام زن ہوسکا - اگر میں حیدرآباد یونیورسٹی میں نہ جاتا تو میں تدریسی سفر میں درماندہ رہ جاتا -

مجھے مناظرِ قدرت پسند ہیں پہاڑ، ٹیلے، سمندر، دریا، تالاب، نالے - اسی مناسبت سے ہموار میدانی سطح مجھے ناپسند ہے حالاں کہ اناج اسی میں اگتا ہے - بھوپال اور جموں میں چھوٹی پہاڑیاں تھیں - لیکن الہ آباد بالکل سپاٹ میدان تھا جس میں دل لبھانے والی کوئی بات نہ تھی - اس کے برعکس حیدرآباد میں انوکھی دل داری تھی - وہاں کی پہاڑیوں، دو وسیع و عریض جھیلوں، ان کے ساحل کے اندر یا باہر آڑے ترچھے بولڈروں، پہاڑیوں کی قوی ہیکل اور گرانڈیل چٹانوں میں عجیب دل ربائی تھی -

حیدرآباد یونیورسٹی کے دو کیمپس تھے - شہر میں عابد بازار کے پاس سروجنی نائڈو کی کوٹھی گولڈن تھریشولڈ اور شہر سے بہت دور پر گی باؤلی میں ۲۳۰۰ ایکڑ کا کیمپس - پہلے وائس چانسلر گربخش سنگھ بنارس یونیورسٹی سے آئے تھے - وہاں کا کیمپس ۱۵۰۰ ایکڑ کا تھا - سردار جی نے اس سے بھی بڑا ۲۳۰۰ ایکڑ کا کیمپس پسند کیا - حالاں کہ اس یونیورسٹی میں، اس وقت کل ملاکر ۲۵۰ طلبہ تھے - ہندوستانی یونیورسٹیوں میں یہ سب سے بڑا کیمپس ہے، ممکن ہے دنیا بھر میں سب سے بڑا ہو - اس کی کئی میل کی سنگین فصیل، دیوارِ چین پر چشمک زن ہے - ۷۸ - ۱۹۷۷ء میں اس کی تعمیر پر ۲۰ لاکھ روپیے لگے - کیمپس میں کوارٹر بننے پر ۱۹۸۰ء کے وسط میں میں یہاں آگیا -

کیمپس میں اساتذہ کے سوڈیڑھ سو خاندان رہتے ہوں گے - یہاں ہندوستان کا روشن ذہن نظر آتا ہے - ملک کے ہر صوبے اور ہر علاقے سے آئے ہوئے اساتذہ - یہاں متعدد جوڑے ایسے ہیں جن میں شوہر اور بیوی مختلف علاقوں اور مختلف لسانی گروہوں کے ہیں مثلاً شوہر مراٹھا بیوی کنڑ، شوہر تامل بیوی گجراتی، شوہر تیلگو بیوی ہندی گو، شوہر بنگالی بیوی کنڑ، شوہر اہل ہندی بیوی ملیالم اور یہ سب خوش گوار طریقے سے رہتے ہیں - سب کی بیویاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، پوسٹ گریجویٹ اور پی ایچ - ڈی - ان میں سے متعدد ملازمت کرتی ہیں لیکن سب گھر کا کام کاج کرتی ہیں - ذہنی اور علمی اعتبار سے اس کیمپس کے باشندوں کا معیار جتنا بلند ہے اتنا اور کہیں نہ ہوگا - گویا یہ کیمپس ملک کے ذہین طبقے کا نگار خانہ ہے لیکن اس میں کوئی صوبائی حد بندی نہیں - سب ملتے جلتے ہیں -

حسنِ فطرت کے لحاظ سے یہ کیمپس حیدرآباد کا سارا حسن رکھتا تھا - پہاڑیاں، بڑے بڑے بولڈر، سات چھوٹی چھوٹی جھیلیں، اشجار، چمن بندی! فصیل کے ساتھ جھاڑ کے فلک بوس پیڑ لگے تھے جن کی باریک نوکیلی پتیوں کے بیچ ہوا سیٹی بجاتی گذرتی تھی - ہم لوگوں نے اپنے اپنے کوارٹروں میں زبردست چمن بندی کی تھی - میں نے اپنے وسیع کوارٹر میں اور اس کے باہر، معلوم نہیں کتنے تناور درخت لگادیے - حیدرآباد کی آب و ہوا پودوں کو بہت راس آتی ہے -

۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۷ء تک میں روزانہ یونیورسٹی کی بس میں کیمپس سے گولڈن تھریشولڈ آجاتا تھا - ۲۲ کیلو میٹر جانا اور ۲۰ کلو میٹر آنا، آرام دہ اور فرحت بخش سفر تھا - ایک قوی ہیکل بولڈر پر ایک دوسرا بولڈر ٹکا ہوا، لیٹا ہوا، کھڑا ہوا - میں نے ایک غزل میں شعر کہا :

بس بولڈر کا خواب گراں دیکھتا ہوں میں   مواج، اس میں وقت کا دریا دکھائی دے

کیمپس سے شہر آتے جاتے راہ میں گولکنڈے کے مقبرے دور سے چشمک زن ہوتے تھے - حیدرآباد اور سکندرآباد کے بیچ حسین ساگر

کی جھیل، اس کے کنارے کی خوش نما سڑکیں اور عمارتیں، شہر سے دور ایک اور بڑی جھیل عثمان ساگر جہاں ہم بار ہا پکنک کے لیے گئے! یہ مناظر دل سے محو ہونے والے نہیں۔

سالار جنگ میوزیم جس کا ہر کمرہ تحفہ۔ طلسمات ہے، چار مینار کی پر اسرار عمارت، مکہ مسجد جہاں ایسا سیاہ پتھر ہے جس پر کوئی بیٹھ جائے تو وہ پھر کبھی حیدرآباد ضرور واپس آتا ہے، اسمبلی کی دودھ جیسی سفید عمارت، باغِ عامہ جس کے ایک طرف ریل جاتی ہے، عابد روڈ کا پر رونق بازار، پہاڑی پر تعمیر شدہ برلا مندر، نوبت پہاڑ، بنجارا ہلز، یہ سب دل خوش کن خواب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے حیدرآباد کی پرانی بستی اور عمارتوں کو بہت کم دیکھا ہے۔

اور پھر حیدرآباد کے اردو والے، اردو کے ادارے، کتب خانے۔ ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد حیدرآباد ہی میں ہے۔ یہاں کے مشہور کتب خانوں میں سالار جنگ لائبریری، آصفیہ لائبریری، گورنمنٹ مینو سکرپٹ لائبریری، عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری، ادارہ ادبیاتِ اردو، اسٹیٹ آرکائوز، مولانا ابوالکلام آزاد اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مرکزی حیدرآباد یونیورسٹی لائبریری اور ان سب پر مستزاد ہے عبدالصمد خاں کا ذاتی کتب خانہ جسے انھوں نے اردو ریسرچ سنٹر کا نام دے رکھا ہے۔ صمد خان اردو کے ادیب نہیں، شوقین ہیں، دل دادہ ہیں۔ ان کی ہابی کتابیں، رسالے اور مخطوطات جمع کرنا ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہند و پاک میں اتنا بڑا ذاتی کتب خانہ کسی اور فردِ واحد کا نہ ہوگا۔ جو شخص خود اہلِ قلم نہ ہو، جس نے اردو میں کوئی کتاب، کوئی مضمون نہیں لکھا ہو، وہ اپنے شوق اور محنت سے اتنا بڑا، اتنا بیش بہا مخزنِ کتب جمع کرلے جو یونیورسٹیوں کے کتب خانوں کو بھی شرمندہ کردے ایک عجوبہ روزگار کہا جائے گا۔ حیدرآباد کے بڑے کتب خانوں میں کل ملاکر اردو کی جتنی کتابیں ہیں دوسرے دیار و امصار میں اس کا ایک حصہ بھی نہ ہوگا۔

حیدرآباد والے کتنے خلیق، پر تواضع اور دل نواز ہیں۔ وہاں سے کیسے کیسے ادیب پیدا ہوئے، کیسے کیسے ادیب موجود ہیں: محقق، نقاد، ناول و افسانہ نگار شاعر، انشایئے والے۔ یہ شہر بنیادی حیثیت سے تحقیق کا گہوارہ ہے جس کی داغ بیل مولوی عبدالحق نے ڈالی، جسے پروان چڑھایا ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، سخاوت مرزا و نصیر الدین ہاشمی نے۔ آخر الذکر صاحب ہزار غیر محتاط ہونے کے باوجود لاتعداد کتابوں اور مخطوطات سے یاد اللہ تو رکھتے تھے۔ یہاں ایک چھپے عالم ہوئے ہیں احمد خاں درویش جو بقول ڈاکٹر مغنی تبسم مخطوطات کو اس روانی سے پڑھتے تھے جیسے کوئی مطبوعہ کتاب پڑھے، جو دکنی ادب، صوفیوں کے رسالوں اور نظام تصوف کے ماہر و عارف تھے۔ در پردہ کتنے بڑے بڑوں نے ان سے استفادہ کیا، کتنے تحقیقی مقالوں میں ان کے فیضان کی موجِ تہہ نشیں دوڑ رہی ہے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ افسوس کہ میں ان سے نہ مل سکا ایسی شخصیتیں مغتنماتِ روزگار ہوتی ہیں جن کی زیارت کرنی چاہیے۔

میرے ہم عصر محققین میں حنیف قتیل، حسینی شاہد، سیدہ جعفر، غلام عمر خاں ڈاکٹر محمد علی اثر اور بہت سے کم عمر قلم کار قابل ذکر ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنی طویل زندگی میں اور حیدرآباد یونیورسٹی نے اپنے مختصر سن و سال میں تحقیق کو فروغ دیا۔ مولوی عبدالحق کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے مولوی حبیب الرحمٰن، راج بہادر گوڑ، میر عابد علی خاں، سری نواس لاہوٹی اور حسینی شاہد اردو تحریک کو اپنے خون پسینے سے بالیدہ کرتے رہے۔ مغنی تبسم جیسے نقاد، مخدوم، سلیمان اریب اور شاذ تمکنت جیسے ملک گیر شہرت والے مرحوم شاعر، جیلانی بانو جیسی فکشن نگار جنھوں نے ایوان اردو جیسا یادگار ناول تخلیق کیا، یہ نام مشتے از خروارے ہیں۔ جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے زندہ دلانِ حیدرآباد ایسا ادارہ ہے جس کی نظیر اردو ادب میں نہیں ملتی۔ اب تو اس کی ذریات دوسرے دیاروں میں بھی پہنچ گئی ہیں۔ رسالہ شگوفہ کو اس کے سنجیدہ ایڈیٹر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے بابِ مزاح میں اس بلندی پر پہنچا دیا ہے جس کا ہمسر کوئی دوسرا رسالہ نہیں۔ زندہ دلان اور شگوفے کی بدولت طنز و مزاح کے میدان میں ایسے ایسے جغادری نثار و سخن شعار دندنا رہے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اب حیدرآباد تحقیق کا نہیں، تفریح و ظرافت کا شہر بن گیا ہے۔

حیدرآباد میں سردی نہایت معتدل ہوتی ہے۔ اخیر جنوری سے گرمیوں کا موسم شروع ہو جاتا ہے لیکن وہاں کی رات ہمیشہ خوش گوار ہوتی ہے، اپریل و مئی میں بھی۔ اوائل جون سے برسات کی خنکی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ وہاں کی برسات اتنی ٹھنڈی ہوتی ہے کہ بعض اوقات سویٹر پہننا پڑتا ہے۔ جاڑوں کے مہینے بھی اتنے خنک نہیں ہوتے جتنا موسم برسات۔ بڑی گرمی کسے کہتے ہیں اس سے اہلِ حیدرآباد آشنا نہیں۔ خواہ بارش نہ آئے لیکن ہوا میں خوش گوار طراوت بس جاتی ہے جو حوصلے کو امنگ عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد میں گل و گلبن پر جو رنگ و رونق ہوتی ہے وہ شمالی ہند میں کہاں۔ حیدرآباد کی مٹی میں نمو اور ہوا میں نشو و نما سمویا ہوا ہے۔

مجھے اہلِ حیدرآباد سے کیا کیا الفت و توقیر ملی۔ کیسے کیسے جان چھڑکنے والے شاگرد تھے۔ ان کی سعادت مندی میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ اہل شہر نے مجھ غیر ملکی پر مروت و مودت کے خم کے خم انڈیل دیے۔ رٹائر ہونے کے بعد جب میں مارچ ۱۹۹۰ء میں حیدرآباد چھوڑ رہا تھا، میر عابد علی خاں نے میرے لیے شان دار یادگار و داعی جلسہ منعقد کیا جو حیدرآباد کی جملہ اردو تنظیموں کی طرف سے تھا۔ ان کی تعداد ۱۳ یا ۱۴ تھی۔ ان میں انجمن ترقی اردو، ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد لٹریری فورم، زندہ دلانِ حیدرآباد وغیرہ شامل تھے۔ شرکا میں اور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر موجود تھے۔ مرکزی یونیورسٹی کے کرشنا، موراتی اور آندھرا پردیش کھلی یونیورسٹی کے چندر شیکھر راؤ۔ دونوں پورے وقت جلسے میں بیٹھے اور وداعی تقریر بھی کی۔ دوسرے مقررین میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، میر عابد علی خاں، ڈاکٹر مغنی تبسم وغیرہ شامل تھے۔ دعا ہے کہ اہلِ حیدرآباد ہمیشہ دل شاد رہیں۔ ان کی محبت (ان کی طرف سے بھی اور، میری طرف سے بھی) میرے دل پر نقش ہے۔

میں شمالی ہند کا باشندہ ہوں لیکن حیدرآباد، بالخصوص اپنی یونیورسٹی کے کیمپس میں رہ کر مجھے اہلِ دکن (تیلگو، کنڑ، تامل، ملیالم)، ان کی ثقافت، ان کے کھانوں سے لگاؤ ہو گیا ہے۔ میں نے وہاں سے نہ صرف اڈلی، دوسا اور وڑا کو پسند کیا بلکہ حیدرآباد کے مسلمانوں سے مسور کی دال کی کھچڑی دریافت کی اور اسے شوق سے کھانے لگا۔ لکھنؤ میں ان سب کی کمی محسوس کرتا ہوں، جنوبی زبانوں کے بولنے والوں کی صحبت کو ترس گیا ہوں۔ گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہا ہوں، اہلِ فکر کی صحبت سے محروم، اہل اردو کی بستیوں سے دور، اردو کے کتب خانوں کا حلقہ بیرون در۔ میرے تینوں بچے باہر کے ملکوں میں رہتے ہیں۔ شاید مجھے حیدرآباد کی یادیں اس لیے بھی زیادہ کچوکے دیتی ہیں کہ وہاں میں برسرِ روزگار تھا، اب رٹائرڈ زندگی گذار رہا ہوں۔ میری شریکِ حیات جو حیدرآباد جانے پر روئی تھیں، اب حیدرآباد چھوڑنے پر روتی ہیں۔ انھیں تو وہ شہر اور یونیورسٹی کیمپس مجھ سے بھی زیادہ پسند آیا۔ اب ہمارے پاس کوئی مستقبل تو ہے نہیں۔ اپنی ذہنی کیفیت ایک شعر میں بیان کی پھر اس میں ترمیم کر کے دوسرے الفاظ میں کہا۔ دونوں پیش کرتا ہوں:

ہمارے پاس کوئی حال ہے نہ مستقبل — فقط مجاورِ ماضی بنے ہوئے ہیں ہم
کیسا مستقبل، مجھے تو حال بھی ملتا نہیں — اپنے ماضی کے کھنڈر میں گھومتا رہتا ہوں میں

سوتے جاگتے ماضی کے جو خواب دیکھتا ہوں ان میں سب سے زیادہ دل آویز قیامِ حیدرآباد کے مرقع ہیں جنھیں کئی بار دیکھ چکا ہوں، ایک بار پھر دیکھنے کی ہوس ہے۔

OOOOOO

ڈاکٹر غیاث اقبال (مرحوم)

اردو شاعری کا سسی فس - فانی بدایونی

کارنتھ (CARINTH) شہر کا بادشاہ سسی فس، اے ولس (AEOLUS) کا بیٹا تھا اور اس کی شادی پلیاڈ میروپ سے ہوئی تھی۔ اس کا لڑکا گلاکس اور پوتا بیلروفان بھی یونانی اساطیر میں مشہور ہیں۔ دیو مالا میں اس کی شہرت دیگر کرداروں سے اس لیے زیادہ ہے کہ اسے زیر زمین رکھ کر درد جاودانی سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ یعنی اسے ایک سزا تجویز کی گئی تھی کہ وہ ایک وزنی چٹان کو ڈھکیلتے ہوئے پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی تک لے جائے۔ جب وہ چوٹی کے قریب پہنچتا تو چٹان لڑھک کر نیچے آجاتی تھی اور وہ دوبارہ اس وزنی چٹان کو ڈھکیلتے ہوئے چوٹی تک پہنچانے کی کوشش کرتا۔ اس طرح سسی فس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کار نامعقول پر مامور کر دیا گیا کہ وہ رہتی دنیا تک اس سے پابہ جولاں رہے۔ آخر اس سزا کی وجہ کیا تھی؟ اس ضمن میں اسطور ساز قدما میں اختلاف ہے۔ چند کا خیال ہے کہ سسی فس ایک ہوس پرست اور منافق شخص تھا جس نے اٹکا (ATTICA) نامی شہر کو برباد کیا تھا۔ اور آخر کار تھیسیس (THESEUS) نامی ہیرو نے اس کا قلع قمع کر دیا۔

بعض کا خیال ہے کہ وہ محض ایک پیشہ ور مخبر تھا اور اس نے دریاؤں کے دیوتا اسوپس کو خبر دی تھی کہ اس کی دختر کو زیوس (ZEUS) اغوا کر گیا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس نے دیوتاؤں کی پراسرار دنیا میں دخل اندازی کی تھی اور ان کا عتاب اس پر نازل ہوا تھا۔

اس کی بدعنوانیوں سے ناراض ہو کر زیوس نے تھنہ ٹاس (موت) کو کارنتھ کے بادشاہ کے پاس بھیجا کہ اس کا کام تمام کر دے۔ مگر سسی فس نے کافی چالاکی سے تھنہ ٹاس کو پابہ زنجیر کر لیا۔ اس کے نتیجے میں موت کا بازار از خود سرد پڑ گیا اور مردوں کی آبادی گھٹتی چلی گئی۔ زیوس نے بذات خود تھنہ ٹاس کو رہائی دلائی اور سسی فس کو گرفتار کر کے ہیڈیس (HADES) لے جایا گیا۔ سسی فس نے اس قید سے بھی چھٹکارا پانے کی کوشش کی اور فرار ہو گیا اور کافی عرصے تک زندہ رہا۔ زیوس نے سسی فس نے سنگین جرموں کی سزا میں اس پر کبھی نہ ختم ہونے والا عتاب نازل کیا اور اس کی ان صلاحیتوں کو بھی ختم کر دیا جن کے بل پر وہ فرار کے نت نئے راستے تلاش کر لیا کرتا تھا۔ اسے چٹان کے ڈھکیلنے کے کار نامعقول میں اس قدر مشغول کر دیا گیا کہ نہ وہ اس قید سے رہائی حاصل کر سکتا تھا اور نہ ہی نئے جرائم کی جانب راغب ہو سکتا تھا۔

یہ قصہ یونانی اساطیر سے ماخوذ ہے۔ اس کہانی سے جو نظریہ زندگی مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ انسان کو دعوت مبارزت دیتا ہے بالفاظ دیگر ہماری ہر سانس موت کے خلاف ایک جنگ کا تناظر پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انسانی زندگی کا فانی ہونا ہی اسے قابل قدر بناتا ہے اور اسی سے زندگی کو وقار نصیب ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ خدشہ ان کے تخلیقی میلانوں کو اکساتا ہے اور انھیں تکمیل ذات کی منزل کی طرف رواں دواں کئے جاتا ہے۔ ہر لحظہ جو گزرتا ہے، انسان کو موت کے قریب تر لاتا ہے جس کا تصور غم آگیں ہے لیکن دائمی جدوجہد اور آرزومندی اسے بھلاوے میں ڈال دیتی ہے اور وہ اکتا دینے والے "اب" سے گھبرا کر مستقبل میں اپنی آرزوؤں کا خواب دیکھتا ہے۔ - کاروان فکر)۔

شوکت علی خاں کے تخلص فانی سے مذکورہ بالا کیفیت انسانی کا مفہوم تو متبادر ہوتا ہی ہے، بایں ہمہ یہ حقیقت بھی

آشکار ہوتی ہے کہ فانی نے حیاتیاتی ارتقا کے ضمن میں وہ معصیت مول لی جس کو "شعور" کہتے ہیں اور باشعور انسان کے لیے زندگی درحقیقت نام ہے موت سے پہلو بچا بچا کر بھاگتے رہنے کا۔ موت زندگی کا منفی پہلو ہے اور فانی کے اشعار میں جس کثرت سے اس منفی پہلو کی بازگشت سنائی دیتی ہے اس سے یہ باوثوق گونج جنم لیتی ہے کہ کوئی اثباتیت کی تلاش میں سرگرداں ہے اور منفی پہلو سے مثبت کی جانب سرگرم سفر ہے۔ یعنی موت کے بطون سے زندگی کو برآمد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ فانی کے یہ شعر اس صورت حال پر دال ہیں:

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

موت ہے ایک وقفۂ موہوم زندگانی سے زندگانی تک
آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

شہروں کے رہنے والے جب رات کے پچھلے پہر نیم غنودگی میں محو ہوتے ہیں تو رات کے سناٹے میں ان کی سماعت پر وہ چند لمحے بڑے شاق گزرتے ہیں جب پہرہ دار کی کرخت آواز گونجتی ہے "جاگتے رہو"۔ آخر یہ پہرہ دار جس کو رات بھر جاگتے رہنے کا معاوضہ دیا جاتا ہے چلا چلا کر ہمیں جاگتے رہنے کی تلقین کیوں کرتا ہے؟ جب یہ سوال اس سے کیا جاتا ہے تو ظاہر ہے وہ یہی کہے گا کہ یہ تلقین وہ خود اپنے لیے کر رہا تھا کہ وہ خود کہیں محو خواب نہ ہو جائے۔ فانی نے اپنے اشعار میں موت کے متعلق بہ آواز بلند سوچنے کا جو انداز اختیار کیا ہے، ایک طرح کی پہرہ دار والی خود کلامی (SOLILOQUY) ہے اور خود کلامی وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جس کا شعور بیدار ہو، نیز وہ جو اپنے غم دروں کا اظہار، بے اعتنا گردانے جانے کے خوف سے کسی کے آگے نہ کر سکتا ہو۔ چناں چہ فانی کا یہ غم وہ تخلیقی درد ہے جو انسانی ہستی اور انسانی تفتیش کا ذریعہ بنتا ہے اور جس میں کائنات کا غم بن جانے کی قوت اور گیرائی موجود ہے۔

فانی کے غم کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی رقم طراز ہیں کہ:

"فانی کا غم وجودی (Existential) غم ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی اور اس کے متعلق فانی وجودی نظریے کے حامل ہیں لیکن احساس غم اور استقبال غم میں وہ بہت کچھ وجودی فلسفیوں کے مماثل نظر آتے ہیں۔ وجودی فلسفے کو غم سے خاص تعلق ہے۔ تقریباً ہر وجودی مفکر کے یہاں غم کا شدید احساس اور اعتراف نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مفکر "زندگی معتبر" اور "جیے جانے" میں امتیاز کرتے ہیں۔ جہاں تک جیے جانے یا محض حیوانی حیات کا تعلق ہے، حیوانات اور جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق نباتات بھی ذی حیات کہے جانے کے مستحق ہیں۔ لیکن زندگی یا زندگی معتبر کا مصداق صرف انسان ہی ہو سکتا ہے۔" (فانی کی شاعری ص ۵۵)۔

جس دکھ کو فرائڈ "غیر شعوری دکھ" کی بجائے "شعوری دکھ" کہتا ہے اور شعوری دکھ اس کے ہاں "آگاہی" ہے جس کو شیکسپیئر نے "پختگی" کا نام دیا تھا، اس آگاہی کو فرائڈ ایک بار امانت سے تعبیر کرتا ہے جسے اٹھائے بغیر انسان، انسان نہیں رہ سکتا۔ نیز فرائڈ انسان کی بلندی اسی میں دیکھتا ہے کہ یہ بار اٹھالیا جائے۔ اس کے نزدیک آزادی یہی ہے کہ انسان اپنی مجبوری کا شعور حاصل کرلے یعنی زندگی جبر اور اختیار کی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے۔ تاہم فانی کے ہاں تقدیر کو فوقیت حاصل ہے۔ فانی نے اپنے عقیدے کا اس طرح اظہار کیا ہے۔

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر کیا یہ ساری عمر منہ تکتی رہیں تقدیر کا
فکر راحت چھوڑ بیٹھے ہم، تو راحت مل گئی ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا
حسن تدبیر نہ رسوا ہو جائے راز تقدیر الٰہی کو نہ پوچھ

جب میں نے دعاؤں کا رخ سونے فلک دیکھا ۔ تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی
دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو اک جنازہ جارہا ہے دوش پر تقدیر کے
زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

سارتر آزادی کا طالب تھا مگر ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ موت کا منظر بھی اس کی نظروں سے او جھل نہیں تھا، جو زندگی کے مہمل پن اور اس کی الم ناکی کو اور زیادہ اجاگر کر دیتا ہے۔ اسی طرح کامو نے بھی بے شمار سوالات کیے تھے کہ آزادی کیا ہے؟ عدل و انصاف کیا ہے؟ وہ زندگی کی ان اقدار میں مفاہمت کا متلاشی رہا، ان کی تعریف اور تحدید کرنے کی عمر بھر کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اسی وجہ سے اس میں دنیا کی نامعقولیت کا احساس اور مایوسی کا رجحان پیدا ہوا۔

آزادی کے حصول کے تعلق سے نفسیات کا ایک کلیہ ملاحظہ فرمائیے۔ FREEDOM IS THE ANTI-THESIS OF FEAR یعنی آزادی خوف کا جواب دعویٰ ہے۔ دعویٰ اور جواب دعویٰ کے اتصال سے جو انضمام کی کیفیت جنم لیتی ہے وہ انسانی زندگی کی پختگی ہے۔ اس تناظر سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ باشعور ONTOLOGICAL BEING (انسان) کے لیے پوری زندگی خوف سے چھٹکارا حاصل کرنے کی عملی تگ و دو سے عبارت ہے۔ یعنی موت ایک ایسی کیفیت ہے جس کے تصور اور خیال سے خوف کا در آنا ثابت ہے۔ اس خوف کی تسخیر از خود انسانی وجود کو ثابت کرتی ہے۔ جس کو "سسی فس اسطور" سے تشبیہ دینا بھی غلط نہیں ہو سکتا۔

کیر کے گور (KEIRKEGARD) رقم طراز ہے "انسان جب اپنے لمحاتی وجود کے متعلق غور کرتا ہے تو اسے کسی طرح کی ابدیت کا سراب نظر نہیں آتا۔ دائمی جدوجہد کی جانب یہ اپنے ذہن اور فکر کی قوتوں کو متوجہ کرتا ہے اور عمل سے اپنے لمحاتی وجود کو بھلاوے میں ڈال دیتا ہے۔ جب اس کے اندر کا عمل غائب ہو جاتا ہے تو اسے دوبارہ موت کے غم آگیں اور کربناک تصور اور انسانی حد بندیوں سے رابطہ پڑتا ہے"۔ (کامیو، دی متھ آف سسی فس)۔

انسان بہرحال اپنے شعور کے بوجھ کو اپنی پیٹھ پر لادنے کا سزاوار ہے۔ کامیو اس اسطور سے استنباط کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسانی زندگی "لا یعنیت" یا "کارِ نامعقول" سے وابستہ ہے۔ زندگی ہر باشعور انسان کے لیے ایک بے معنی بوجھ بن چکی ہے۔ وہ اس زندگی کو اپنی پشت پر لادے، سسی فس کی طرح زندگی کے پہاڑ پر چڑھتا ہے چناں چہ اس بے معنویت نے زندگی کو ایک مہمل عادت بنا دیا ہے۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو فانی زندگی کے اس جبر سے ناخوش نہیں ہیں، بلکہ اس احساس کے ذریعے اپنے وجود کا اثبات چاہتے ہیں اور کہتے ہیں۔

دل وقفِ تپش ہے ہائے مگر وجہ تپش دل کوئی نہیں
بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں

ہوا نہ رازِ رضا فاش وہ تو یوں کہیے مرے نصیب میں تھی ورنہ سعیِ نامعلوم
فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

کبیر احمد جائسی نے لکھا ہے کہ وہ کسی نامعلوم حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہے، اسی حقیقت کی تلاش ان کا نظریہ زندگی ہے۔ (فانی ص ۱۰۷)۔

فرائڈ نے نظریہ زندگی کے تعلق سے ایک عمدہ نفسیاتی نکتہ حوالہ قلم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "انسان کو ہر لمحہ زندگی اور موت کے درمیان فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ ہر گھڑی انسان اپنے آپ کو بناتا ہے یا بگاڑتا ہے۔ آزادی حاصل کرتا ہے یا لاشعور کی

غلامی میں سے دست و پا ہو کے رہ جاتا ہے۔ جس کو فانی نے یوں پیش کرنے کی کوشش کی ہے

اب تجھی کو جنونِ تمام ہجر کا شکوہ ہے — خود ہی چھیڑی تھی حدیثِ طرۂ گیسوئے دوست
لطفِ حیات سے خلشِ مدعا کہاں — یعنی بقدرِ تلخی صہبا سرور تھا
لازم سی ہے حیات نہ فانی مفر نہیں — جینے کی تلخیوں کو گوارا کیجیے

ان اشعار سے محسوس ہوتا ہے کہ فانی نے لاشعور کی غلامی کو پسند نہیں کیا اور نہ بے دست و پا رہنے کی کوشش کی بلکہ خود کو ایک شعوری عمل سے منسلک کر لیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کو اپنے مقاصد میں وہ کامیابی نہیں ملی جس کے وہ طالب تھے اس لیے کہ فطرت کو انسانی مقصد کا شعور نہیں رہتا۔ اگر وہ چاہتے تو خود کو (IMMEDIACY PERCEPTION) یعنی قریبی ماحول کے شعور کی حد تک محدود رکھ سکتے تھے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ قریبی ماحول کے شعور کو حیوانی سطح کا غماز کہا گیا ہے اور فلسفۂ زیست یا نظریہ زندگی کی تلاش کرنے والوں کو IMMEDIACY PERCEPTION کا ذائقہ بقدرِ لب و دندان بھی نہیں ہوا کرتا۔

چناں چہ فانی نے اپنے جبلی مدار (ORBIT) سے کوچ کیا اور شعور کے دوسرے مدار میں قدم رکھنے کی کوشش کی۔ یہ ان کے اختیار کی بات تھی اور ان کی تدبیر تھی مگر تدبیر کو اپنا تے ہی ان کے ذہن میں کسی رعونت نے جنم نہیں لیا بلکہ انھیں اپنی ہستی نامعلوم۔ کا پورا ہوش تھا۔ اس سے آگے کی منزل یا مدار میں انھیں داخل ہونا پسند تھا مگر یہ خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ وہ کہتے ہیں

اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک — اس مرحلۂ سعی تماشا سے گزر جا
وہ جلوہ مفتِ نظر تھا۔ نظر کو کیا کہیے — کہ پھر بھی ذوقِ تماشا نہ کامیاب ہوا
مری حیات ہے محرومِ مدعائے حیات — وہ نقشِ پا ہوں جسے کوئی رہ گزر نہ ملا
جانے شاید پلٹ آتا ہوں کہ منزل سے قریب — نظر آتا ہے مجھے نقشِ کفِ پا اپنا

یہ ساری عملی تگ و دو سسی فس کے اس عمل سے مشابہ ہے کہ وہ چٹان لڑھکاتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے تک کا مختار ہے۔ مگر اس چٹان کو روکے رکھنے پر قادر نہیں اور چٹان پھر سے دامن کوہ تک لڑھک آتی ہے۔

مارٹن ہیڈ گر (Martin Heidegger) انسانی سرشت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا اپنا وجود دیگر مخلوقات سے جدا اور الگ ہے تو اسے یہ تجربہ Perplexing ہوتا ہے مگر یہ جذبہ تحیر جو ابتدا میں اس کی خود آگاہی کا محرک تھا آگہی کے بار گراں سے بوجھل ہو جاتا ہے تو انسان اپنے اطراف کے ماحول کو اجنبی اور بے معنی نظروں سے گھورنے لگتا ہے۔ اس کیفیت کو فلسفۂ زیست میں "موجود کو فراموش کرنا۔ (Forgetfulness of Existing)" کہتے ہیں۔ فانی کہتے ہیں۔

غم سے گھبرا کے کچھ ہوں بلا سے آگے جگا تو جاتے ہیں — ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

اس کیفیت ذہنی سے اگر "انسان۔ خود کو منہا کر لے تو یہی اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ ہیڈ گر کا خیال ہے کہ صحیح نوعیت کی بیداری (Awakening) انسان میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ موت کو سامنے پاتا ہے۔ چناں چہ موت صرف ایک کیفیت یا احساس انسانی کا نام نہیں بلکہ از خود ایک محرک بھی ہے جو انسان میں بیداری کے جذبے کو ابھارتی ہے فانی کے پاس موت صرف ایک کیفیت یا وصفی لفظ نہیں بلکہ وسیع تر امکانات کا ایک اشارہ گردانی جا سکتی ہے جس کے احساس سے ان میں جست لگانے اور زقند بھرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

ہذا فانی نے نفی میں اثبات تلاش کرنے کی جو خواہش کی تھی وہ دراصل اپنے وجود کے معنی دریافت کرنے کا ایک وسیلہ تھی جس کو کوین وانٹ ہیڈ نے Meaning Perception کہا ہے۔ اس سے پیش تر Immediacy Perception کے متعلق بحث آئی تھی جو حیوان اور انسان کے لیے ایک سی نوعیت رکھتی ہے یعنی اپنے قریبی ماحول کا شعور۔ دوسری سطح معنی، یا نام دینے کی ہے۔ جس کا قرآن مجید میں ذکر آتا ہے۔ "و علم آدم الاسماء کلھا" اور سکھائے آدم کو سب چیزوں کے نام یعنی اشیاء کے خواص کا علم حاصل کرنے کے لیے نام کا جاننا پہلا قدم ہے۔ یہاں زندگی کی اس سطح کی طرف اشارہ ہے جب کہ انسان نے ایک آزاد خودی (Ego) کا مالک ہونے کے علاوہ حقائق اشیا کا علم حاصل کیا تھا تاکہ ان پر تصرف حاصل کرکے انھیں اپنے لیے مفید بنائے۔

یعنی اس سطح پر انسان جس عمل سے منسلک ہوتا ہے اسے "تشخص ذات" کا نام دیا گیا ہے۔ ایک آزاد خودی اور اشیا کے خواص کا علم حاصل ہو گیا تو اس میں ایک نئی توانائی یاقوت کے در آنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یعنی نفی کے بطون سے کروٹ لی ہوئی انسانیت (P... ...) اور اس کے استبشار (Exhilaration) سے سرشار ہو کر انسان میں کائنات کو اپنے تصرف میں لانے کی خواہش کروٹ لینے لگتی ہے۔ اس طرح کے تصرف کے بعد کائنات کی بوقلمونی کے زاویے وسیع اور ان کی نوعیت شتق ثبت ہو جاتی ہے اور موجود کو فراموش کرنے کی سرشت دبے پاؤں ایک راہ سے داخل ہوتی ہے تو دوسری راہ سے عقل و خرد کی منطقیت مستحکم ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ یعنی CASSIRER کے لفظوں میں اسے "وہبی سوچ" کی جگہ "منطقی سوچ" لینے کا عمل کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اس سلسلے میں ایک عمدہ نظریہ پیش کیا ہے۔ انسان وہبی سوچ کی مدد سے اپنے بطون میں غواصی کرتا ہے اور وہاں سے قوت اخذ کرکے باہر کی طرف لپکتا ہے۔ یہ قوت منطقی سوچ ہے جس سے کائنات کو تصرف میں لانے اور تعقلات تاسیس کرنے کی روش پر گامزن کرتی ہے اور اس کی آگہی کے دائرے کو کشادہ کرتی ہے۔ مگر جب یہ قوت صرف ہو جاتی ہے تو انسان واپس آتا ہے اور وہبی سوچ کی مدد سے ایک بار پھر اپنے اندر اترتا ہے جہاں اسے دوبارہ نئی قوت ملتی ہے اور وہ ایک بار پھر باہر کی طرف لپکنے لگتا ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں کہ اندر اترنے اور باہر لپکنے کا یہ انسانی وطیرہ ازلی و ابدی ہے اور سسی فس کے اسطور سے گہری مماثلت رکھتا ہے کہ چٹان کو لڑھکا کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچایا جانے اور شام کو چٹان لڑھک کر دوبارہ زمین پر آجانے (انور سدید، وزیر آغا ایک مطالعہ ص ۲۴۸)۔

اس اسطور میں جو بے معنویت (ABSURDITY) کا احساس پیدا ہوتا ہے فانی کے کلام میں اس کی تلاش بے جہتی کا شکار ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو ان کی آگہی کے دائرے میں وسعت کے پیدا ہونے کا احساس ابھرتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ہستی (BEING) لامحدود ہے اور انسان کی آگہی اپنی تنگ دامانی کے باعث آگہی کی چند کلیوں پر ہی قناعت کر سکتی ہے اور گلشن وجود انسان کی اس تنگ دامانی سے یکسر بے نیاز ہے۔ فانی کے یہ اشعار اس پر دال ہیں

گرم راہوں، نقش پا بنتے گئے، مٹتے گئے	مسلک اپنا امتیاز جادہ و منزل نہیں
کیا سوال تو آواز بازگشت آئی	جواب مجھ سے طلب ہے مرے سوالوں کا
پڑتا نہیں اس آئینے میں عکس کوئی اور	دل میں تری تصویر سی رکھ دی ہے کسی نے
ہو بھی چکے تھے دام محبت میں ہم اسیر	عالم ابھی بقید زمان و مکان تھا

عرض کرنے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ فانی BEING کی لامحدود ذات سے پوری طرح آگاہ ہو چکے ہوں مگر یہ محسوس کیے بغیر چارہ کار نہیں کہ ان کی آگہی میں ایک طرح کی کشادگی بتدریج داخل ہو رہی ہے۔

ہستی نامعلوم کے احساس سے پابہ جولاں ہو کر بھی فانی، ذوق عمل سے محروم ہو جانے کی سرشت نہیں اپناتے بلکہ

آگہی کے نئے مدار کی جانب لپکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

ناکام ہے تو کیا ہے، کچھ کام پھر بھی کر جا   مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا
کشتی کا سہارا ہی تو گرداب ہے فانی   دریا ہی میں تو ڈوب کے دریا سے گزر جا

مردانہ وار جینے کی تمنا اور دریا ہی میں ڈوب کے دریا سے گزرنے کا عمل اپنی ذات کی غواصی کرنے سے عبارت ہے یا اوڈیسی ہے یا مہم جوئی ہے جس کا مقصد بے عملی سے گریز اور دامن بچانا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ہر انساں کے اندر ایک LOTUS EATER موجود ہے جو زود یا بہ دیر اس پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیند اور خوابیدگی میں انسان اپنے ارادے کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے دل میں حرکت کی خواہش کالعدم ہو جاتی ہے اور انسان خواہش کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ نیم غنودگی کے عالم میں رہ جائے۔ فانی کی مہم دراصل اس جذبے کو مات دینے کی کوشش تھی۔ چناں چہ فانی نے سسی فس، جلجامیس اور اوڈیسی کی طرح " موت" کو مات دینے کی سعی کی اور مردانہ وار زندگی گزار کر مردانہ وار مر گئے اور کہہ گئے:

غیرت ہو تو غم کی جستجو کر   ہمت ہو تو بے قرار ہو جا

فانی کی ذات سے جو غم منسوب تھا، حقیقت میں ہر باشعور انسان کا غم ہے بلکہ بیدار انسانی معاشرے کا غم ہے۔ فانی کے اس غم کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسی منفی کیفیت ذہنی کو اثباتیت کی جہت عطا کی اور آگہی کے عمل کو وسعت دینے کی کاوشوں سے شغف رکھا۔ ان کا یہ کہا بالکل سچ معلوم ہوتا ہے:

فانی کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود   شیرازہ آج دفتر غم کا بکھر گیا

فضا میں غم کی بکھری ہو کرچیں ہر کسی کے دامن شعور کو تار تار کر سکتی ہیں اور ان سے ہر کوئی مجروح ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کا شعور، آشوب آگہی کا متحمل ہو اس لیے کہ غم ہی زندگی کا صیقل ہے اور موت جینے کا شعور۔

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

***

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

ادبِ عام کا ارتقا

ادبِ عام در حقیقت تقابلی مطالعے کی ایک خاص انداز کی توسیع ہے۔ ان دونوں میں باہم ایک تعلق قائم ہے۔ دونوں کے درمیان واضح حدود قائم کرنا دشوار ہے۔ سب سے پہلے جس شخص نے ادب عام کا ذکر کیا وہ نیوموسن لرسیر Nepomucene Lemericier ہے۔ اس نے ۱۸۱۷ء میں ادب عام پر لکچر دیے۔ اس نے ان لکچروں میں عالمی ادب کا مطالعہ کیا۔ اس نے اس مطالعے میں ادب کے ڈاروِنی نظریے کے طرز پر ارتقا کے تصور پر زور دیا اور عالمی ادب کا ایک مرتب انداز سے نقشہ بنایا۔ اگرچہ لرسیر نے ادب عام کا اہتمام کیا اور اس موضوع پر اس احساس کے ساتھ لکھا کہ وہ ایک الگ فن پر کلام کر رہا ہے مگر اس سے قبل بھی بہت سے ایسے ادبا گزرے ہیں جنھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ان کو کبھی یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ ایک نیا علم پیش کر رہے ہیں یا اس کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ انھوں نے تو یہ سمجھا کہ وہ تقابلی مطالعہ پیش کر رہے ہیں۔ ایسے ادیبوں میں سے گوئٹے (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) ہے جو جرمن تھا دوسرا جرمن ادیب ہرمن ہٹنر (HERMONN HETTNER) ہے، تیسرا ڈنمارک کا رہنے والا جارج برانڈس GEORGE BRANDES

(۱۸۲۲ء، ۱۹۲۷ء) ہے اس کے بعد دو فرانسیسی ادیب آتے ہیں ایک ٹکسٹ ۱۸۹۰ء تا ۱۹۰۰ء اور دوسرا پال بازارڈ ۱۸۷۸ء تا ۱۹۴۴ء ہے۔ جرمنی کو اس عالمی ادبی روح کو عام کرنے میں سبقت حاصل ہے اس لیے کہ گوئٹے نے مستشرقین کے ترجموں کے ذریعے عربی و فارسی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے ایک دیوان مرتب کیا تھا جس کا نام ہی رکھا تھا دیوان مشرق و مغرب WEST-OSTILICHE DIVAN اس میں اس نے عربی و فارسی شاعری کا تتبع کیا ہے اور در حقیقت وہ عالمی ادب کے مطالعے کا داعی تھا جس کو جرمنی میں (WELI LITERATURE) کہا جاتا ہے۔ دوسرے جرمن عالم نے اعلان کیا کہ وقت آگیا ہے کہ عالمی ادب کی تاریخ لکھی جائے۔ اس نے ایک کتاب "انگلینڈ، فرانس اور جرمنی میں انیسویں صدی میں ادب کی تاریخ" لکھی اور اس کو ۱۸۰۶ء - ۱۸۶۷ء کے درمیان شائع کیا۔ ڈنمارک کے ایک ادیب سبرانڈس عالمی ادبی رجحانات اور یورپ پر جو اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں ان پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام رکھا:

"انیسویں صدی عیسوی میں یورپی ادب کے اہم رجحانات" (۱۸۷۲ء - ۱۸۹۰ء)

در حقیقت فرانس میں اس موضوع پر بہت کام ہوا ہے۔ ٹکسٹ نے اس موضوع پر اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس نے ایک تحقیقی کتاب "جان جیک روسو اور عالمی ادب کے مصادر" کے عنوان سے تصنیف کی۔ اور اس کو ۱۸۹۵ء میں شائع کیا۔ ٹکسٹ نے یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ جس طرح انسانی سماج اور انسانی زندگی مادی اشیا کا تبادلہ کرتی ہے، ایک ملک کا سامان دوسرے ملک میں بکتا ہے اور آپس

میں تجارتی لین دین کا سلسلہ جاری ہے بالکل اسی طرح سے قومیں آپس میں خیالات، ادبی افکار، تہذیبی قدریں اور زبان و ادب کا کاروبار بھی کرتی ہیں اور ان میں یہ تہذیبی لین دین ہمیشہ سے جاری ہے۔ جیسے جیسے ذرائع آمد و رفت بڑھتے جاتے ہیں، عالم کے فاصلے کم ہوتے جاتے ہیں اسی طرح یہ تہذیبی اور ادبی تبادلہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ملکسٹ اس بارے میں کہتا ہے کہ: جس دن یورپی ادب میں یہ رنگ جھلکے گا اسی دن ہر ملک کی تنقید میں بین الاقوامیت پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح دوستی کے تعلقات وطن کے حدود کو پار کر دیں گے اور یہ تعلقات جو ایک قوم کے دوسری قوم سے پیدا ہوں گے وہ پورے یورپ کو ایک وحدت سے منسلک کریں گے اور پھر اجتماعی اتحاد کی وہ روح جاگ اٹھے گی جو یورپ میں عہد وسطیٰ میں تھی۔" اس طرح ملکسٹ فرانسیسی ناقد، ادب عام کے ذریعے اتحاد کا خواب دیکھتا ہے۔ اسی طرح پول ہارڈ کی کتاب کا حال ہے جس نے انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کی فکری مشکلات کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اس نے اس کتاب میں اس روحانی خلا کا ذکر کیا ہے جو یورپ کی فکری زندگی میں عام ہے۔ ادب عام کے علم برداروں نے لوگوں کو اس جانب متوجہ کیا ہے۔ ولایات متحدہ امریکہ میں تقابلی ادب اور ادب عام دونوں خلط ملط ہوگئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں امریکہ کی جامعات میں عالمی ادب کے شاہ کار پڑھائے جاتے تھے مگر سرسری انداز سے۔ اس مضمون کا نام ادب عام رکھا گیا تھا۔ لیکن یورپ کی یونیورسٹیوں نے اس کو سطحی مطالعہ قرار دیا۔

بہر حال ادب عام کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ ادب عام وہ ہے جو ہماری زبان کے بارے میں نہ لکھا گیا ہو اور اس کی جڑیں عالمی ادب میں پیوست ہوں۔ قومی ادب کے وہ عناصر جن کا تعلق دوسرے آداب سے ہو وہ ادب عام ہے۔ لہٰذا ادب عام خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ کسی خاص مقامی ادب سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ وہ عام عالمی ادب کا حصہ ہے۔ تقابل ادب اور ادب عام میں فرق بہت مشکل ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ تقابلی مطالعے میں دو زبانوں کے آداب میں جو ایک نے دوسرے پر اثر ڈالا ہے اس سے بحث کی جاتی ہے اسی طرح ایک قوم کے ادب نے جو اثر قبول کیا ہے دوسرے ادب سے اور جو اثر اس نے دوسرے پر ڈالا ہے اس میں دونوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کیفیت کا مطالعہ دو یا مختلف قوموں کے ادب کے درمیان کیا جا سکتا ہے۔ اس میں قومی ادب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گویا تقابلی مطالعہ قومی ادب اور اس پر غیر ملکی اثرات کی نشان دہی کرتا ہے۔ تقابلی مطالعہ کرنے والے ناقدوں اور ادیبوں کو ان سرحدی چوکیوں پر چنگی اور ٹیکس وصول کرنے والے آفیسروں سے تشبیہ دی گئی ہے جو اگر ایک طرف غیر ملکی سامان پر ماہرانہ نظر رکھتے ہیں اور فوراً پہچان لیتے ہیں اور اس مال کو بڑے انشراح صدر سے آنے دیتے ہیں جس کا اندراج پہلے سے ہو اور جس کا ٹیکس ادا کر دیا گیا ہو۔ مشہور جرمن مصنف کرٹ وائس KURT WOIS نے اپنی کتاب کا نام ہی رکھا ہے "قومی ادب کے حدود پر" اس کے برعکس ادب عام پر ٹیکس وصول کرنے والے آفیسر کی تشبیہ صادق نہیں آتی اس لیے ادب عام قومی حدود کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ قومی و وطنی ادب سے اپنے آپ کو متصف کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ ادب عام کو ان ہوا بازوں سے اور پائلٹوں سے تشبیہ دی جاتی ہے جو ہوا میں چکر لگاتے ہیں جو انسانی فکر کی فضا میں اپنی جولانی سے جغرافیائی حدود و قیود کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے۔ چوں کہ یہ ہوا باز اوپر اوپر فضا میں چکر لگاتے ہیں لہٰذا ان کے یہاں گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی نظریں سطحی رہ جاتی ہیں زمین پر۔ اس کے برخلاف جو لوگ ادب عام کو اہم تصور کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایسا ادیب آفاقی ہوتا ہے جو انسان کی عظمت تک پہنچ کر اس کے اندر کی پوشیدہ کیفیات کا پتہ لگا لیتا ہے۔ وہ معلوم کر لیتا ہے کہ ہر امر کی اصلیت کیا

ہے اس لیے کہ اس کی نظر محدود نہیں ہوتی۔ وہ اوپر سے ہر شئے کا صحیح انداز سے مشاہدہ کرتا ہے۔

اب بات واضح ہو گئی کہ تقابلی مطالعے کے اندر دو عناصر ہیں ایک وطنی اور دوسرا غیر ملکی اور وہ دو آداب کے درمیان اثر ڈالنے اور اثر قبول کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ کیفیت کبھی دو ادبوں کے درمیان پیش آتی ہے اور کبھی اس سے زیادہ کے درمیان۔ مگر ادب عام تقابلی مطالعے سے نفع اٹھاتا ہے اور اس کو بھی اپنا جز بنالیتا ہے۔ وہ وطنی ادب کے حدود کو توڑ دیتا ہے۔ اس بنا پر وہ عالمی افکار، فکری تحریکات، ادبی رجحانات اور اعلیٰ عالمی ادبی شہ کاروں کے ذریعے اپنا قصر تیار کرتا ہے تاکہ وہ ایسے نمونے ادب کے پیش کرسکے جو سارے انسانوں کے لیے ہوں اور جس میں نسل، جنس اور زبان کا امتیاز نہ برتا گیا ہو۔

ادب عام سے قومی ادب کی اہمیت کم نہیں ہوتی اس لیے کہ وہ اپنی قوت ان ادب کے سوتوں سے حاصل کرتا ہے جو اس سے قبل گذر چکے ہیں وہ رنگ و روغن اس انسانی تہذیب سے حاصل کرتا ہے جو ترقی کا ایک مسلسل عمل ہے۔ ادب اور تہذیب ترقی و تقدم کے ایسے حلقے ہیں جو متقدمین کی کوششوں پر قائم ہیں۔ ایک باہمی جذب و کشش اور توازن ہے قوموں اور ملکوں کے درمیان۔ ہر متاخر، متقدم کے کاموں پر بنیاد رکھ کر آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ادب عام میں پہلے اس یونانی روح کا مطالعہ ضروری ہے جو سارے یورپ میں پھیلی پھر اس راہ سے کلاسکی، رومانی، تاثراتی، نفسیاتی، مارکسی اور وجودی تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے یورپ پر خصوصاً اور سارے عالم کے ادب پر عموماً اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یورپی ادب نے مشرقی ملکوں کے ادب پر اثرات ڈالے ہیں۔

اسی طرح ادب میں ہر زمانے میں ایک انداز ابھرتا ہے اور وہ سارے ادب پر بلکہ تمام ملکوں کے ادب پر چھا جاتا ہے۔ اسی کو روح ادب کہتے ہیں۔ فرض کیجیے اردو میں داستانوں کا ایک دور تھا جہاں جن و پری کے قصے عام تھے وہ ایک دور کی روح تھی پھر زمانہ بدلا، سماج بدلا اب معاشرتی اور سماجی ناولوں کا دور آیا اور انسانی زندگی کے حقائق کو ادب میں پیش کیا جانے لگا لہذا روح عصر کی تبدیلی نے قارئین کو حقیقت پسند بنادیا۔ اب ان کو خیالی پریوں کے قصے میں لطف نہیں آتا۔ پھر نظریاتی دور آیا جہاں ادیب اپنے نظریے کی تصویر اپنے ادب میں پیش کرتا ہے۔ کتنے ناول ایسے لکھے گئے جن میں یا تو ادیب اپنی زندگی پیش کرتا ہے یا اپنے نظریات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یا اس راہ سے ذہنوں کو انقلاب کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس کیفیت کا نام جرمن ادیبوں نے زمانے کی عبقریت رکھا ہے۔ زمانے کی فضا ایک خاص رجحان رکھتی ہے جس کے اثرات پورے ادب پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہی حال ادبی تحریکوں کا ہے جو اپنے دور کی آواز اور زمانے کا ساز ہوتی ہیں۔ یہ تحریکیں زمانے کا اور ادب کا مزاج بدل دیتی ہیں۔ فرض کیجیے یورپ میں ادب میں رحم و محبت کے جذبات کی ایک تحریک اٹھی جس کو (SENSIBLE RIE) کہتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے یورپ میں اس کے اثرات وضاحت سے ملتے ہیں۔ انگلستان میں تھامسن THOMSON اور رچرڈسن RICHARDSON، اور STERNE اسٹرن کے یہاں فرانس میں ڈیڈیرو DIDEROT اور روسو ROUSSEOU کے یہاں اور جرمن میں لسنگ LESSING کے یہاں یہ کیفیت بالکل نمایاں ہے۔ (الادب المقارن ص ۲۰۵)

قومی اور وطنی ادب سے ہم کو دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ ہر ادب میں جو عظیم عبقری ادبا ہوتے ہیں ان کے اندر عالمی ادب کے عناصر

ضاحت سے نمایاں ہوتے ہیں۔ خود ہمارے ادب میں غالب اور اقبال کو دیکھیے۔ غالب کا سارا سرمایہ فارسی سے ماخوذ ہے اور بغیر فارسی ادب کے ان کے کلام کا صحیح مطالعہ ممکن نہیں اس طرح ان کا ادب ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح علامہ اقبال پر فارسی اثر ہے مگر ان کے کلام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس کو یورپ کے مفکرین کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے اور اسلامی تاریخ کا بھی اس پر رہے۔

ادیبوں کے درمیان دوستی اور تعلق، فن کاروں کے درمیان فن کی عظمت کا باعث بن جاتا ہے۔ اس طرح کانفرنسیں اور سیمینار ں اس کتلیت کو آگے بڑھاتے ہیں اور ادب عام کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ چناں چہ فلسٹر بیو کی مجلس مشہور ہے اسی طرح مجلات بھی ادب عام عام کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

نوٹ: یہ مقالہ مندرجہ ذیل کتاب سے ماخوذ ہے۔

. ادب المقارن والادب العام مصنفہ ۱۹۷۲ء۔ ریمون طحان دار الکتاب اللبنانی، بیروت طبع اول ۱۹۷۲ء۔]

○ ○ ○

ڈاکٹر محمد انور الدین

حیدرآباد دکن میں بچوں کے رسائل

بچے کسی بھی قوم، معاشرے یا ملک کا مستقبل ہوتے ہیں اور عمر کا یہی حصہ ہوتا ہے جب انھیں سب سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے قدیم مشرقی ادب میں حکایتوں اور تمثیلوں کے ذریعے بچوں کی ذہنی تربیت کا ایک تصور تھا۔ لیکن انگریزی میں چھوٹے چھوٹے مضامین، انشائیوں، لطیفوں اور چٹکلوں وغیرہ کے علاوہ ایسے طریقے جن سے بچوں کی ذہنی تربیت ہوسکے انیسویں صدی کی پیداوار ہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں بچوں کے ادب کے سلسلے میں کیا رویہ تھا لیکن اردو میں حالی اور آزاد اور اس کے بعد اقبال نے بھی اپنی شعری کاوشوں کے ذریعے بچوں کے ادب پر خصوصیت سے توجہ دی۔ مولانا اسماعیل میرٹھی تو نظم و نثر دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور انھوں نے ہر طرح سے ایسے مضامین اور ایسی شعری تخلیقات پیش کیں جو بنیادی تعلیم سے لے کر ابتدائی تعلیم کے مرحلے تک ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دیتی تھیں۔

بچوں کے ادب کے سلسلے میں حامد اللہ افسر میرٹھی کا نام بہت مشہور ہوا۔ ان کے علاوہ چکبست، سرور جہاں آبادی اور شفیع الدین نیر نے بھی بڑی معرکے کی نظمیں کہیں اور دوسری زبان سے ترجمے بھی کیے۔

کسی بھی زبان کی ترویج و ترقی کے لیے اور عوام تک اپنی بات پہنچانے کے لیے رسائل و جرائد عام وسیلۂ اظہار ہیں۔ حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں جہاں ہر موضوع پر رسائل جاری ہوئے وہاں اس اہم موضوع کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ بچوں کے جو رسائل حیدرآباد دکن سے نکلے ان میں علمی، ادبی، تعلیمی اور سائنسی موضوعات، انکشافات، ایجادات، بہادری کے قصے، حب الوطنی پر مبنی تخلیقات پیش کی گئیں۔ ان رسائل کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ان میں خود بچوں کی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں جس سے ان میں آیندہ کے لکھنے کے لیے حوصلہ ملتا تھا۔ بچوں کا سب سے پہلا رسالہ مرزا احمد اللہ بیگ آغائی ابوالعلائی کی ادارت میں "ادیب الاطفال" کے نام سے افضل گنج حیدرآباد دکن سے جاری ہوا۔ مولانا امداد صابری مؤلف "تاریخ صحافت اردو" نے اس کا سن اشاعت ۱۹۰۹ء لکھا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ اپنی کتاب "حیدرآباد میں اردو صحافت" میں رسالہ "اتالیق" کو بچوں کا پہلا رسالہ قرار دیا ہے اور اس کا سن اجرا ۱۹۰۸ء بتایا ہے اور ساتھ ہی اس رسالے کے ایڈیٹر مولوی عبدالرب کوکب کو بچوں کے رسائل کا باوا آدم قرار دیا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

راقم الحروف کو اردو ریسرچ سنٹر (حیدرآباد) کے خزینۂ رسائل میں رسالہ "اتالیق" کے ابتدائی دو سال کے فائل اور بعض چیدہ چیدہ شمارے دستیاب ہوئے ہیں ان کے مطالعے سے اس رسالے کی حقیقی تاریخ اجرا کا تعین ہو جاتا ہے۔

رسالہ اتالیق کی جلد اول کا شمارہ ماہ فبروری ۱۹۱۸ء میں جاری ہوا۔ اس اعتبار سے یہ رسالہ حیدرآباد میں بچوں کا دوسرا رسالہ قرار پاتا ہے۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق حیدرآباد دکن میں بچوں کا پہلا رسالہ "ادیب الاطفال" ہے جو ماہ اگست ۱۹۱۱ء میں جاری ہوا۔ اس کا پہلا شمارہ اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس لحاظ سے حیدرآباد میں بچوں کے رسائل کے باوا آدم مولوی عبدالرب کوکب نہیں بلکہ مرزا احمد اللہ بیگ آغائی ہیں۔

ماہ نامہ "ادیب الاطفال" کے جوائنٹ ایڈیٹر رگھونا تھ راؤ تھے۔ یہ رسالہ مطبع اختر دکن واقع افضل گنج میں عموماً بتیس صفحات پر طبع ہوتا تھا اور اس کا سالانہ چندہ ایک روپیہ چودہ آنے تھا۔

اس رسالے کی اجرائی کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے مرزا احمد اللہ بیگ آغائی لکھتے ہیں۔

"اس کے اجرا سے مقدم غرض یہی ہے کہ یہ رسالہ تربیت اطفال میں والدین کا معین و مشیر ثابت ہو اور ملک کی ہونہار پود کے ہاتھ میں جانے اور اپنی غیر معمولی طاقت سے ان کے دماغ کی اصلاح کرے۔ تعلیمی اغراض وترقی کے اسباب بتانے، صنعت وحرفت کے قواعد سکھانے، دلچسپ معلومات بزرگوں کے اقوال اور ان کے حالات سنانے، اتحاد واتفاق کے خوش گوار نتائج پیش کرے، گورنمنٹ کی وفاداری و عظمت اور والدین کی اطاعت، محبت وبرزگی کا سبق پڑھانے۔۔

اس رسالے کے درج ذیل مقاصد بھی تھے:

۱۔ بچوں کے اخلاق کو اخلاقی مضامین کے ذریعہ سدھارنا، ان میں علم وعمل کا شوق پیدا کرنا اور مطالعے و مضمون نگاری کا ذوق پیدا کرنا۔

۲۔ اتباع شریعت کی ترغیب دلانا، طرز معاشرت کی اصلاح کرنا، تعصب سے نفرت دلانا، غلط تاریخی واقعات کی صحت کرنا، صلح جوئی وامن پسندی کے خیالات کو عام کرنا۔

۳۔ بچوں کے دلوں میں قومی و ملکی درد پیدا کرنا، قانون کی اطاعت کی رغبت دلانا، قانون کا احترام کرنا، والدین و بادشاہ وقت کی محبت وبزرگی ان کے دلوں میں پیدا کرنا اور ان کی اطاعت کی تعلیم دینا، اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا کرنا۔

۴۔ ہندو مسلمانوں میں اتفاق واتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرانا، بچوں میں مضمون نگاری کا ذوق پیدا کرنے کی غرض سے مضمون نگاری کے مقابلے کروانا۔

یہ ایسے صالح مقاصد تھے کہ جن کی اہمیت وافادیت سے آج بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

اس رسالے کے ایڈیٹر نے طلبہ میں مضمون نگاری کا ذوق پیدا کرنے کے غرض سے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ سب میں اچھے مضمون نگار طالب علم کو ایک چاندی کی جیب گھڑی بطور انعام دیں گے۔ اس رسالے کے مضامین عام فہم اور سادہ و سلیس زبان میں لکھے جاتے تھے تاکہ طلبہ آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکیں۔ یہ رسالہ کافی عرصے تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔

حیدرآباد دکن سے بچوں کا دوسرا ماہ نامہ ماہ فروردی ۱۳۲۷ف ماہ فبروری ۱۹۱۸ء میں نظامت تعلیمات سرکار عالی کی سرپرستی میں "اتالیق" کے نام سے شاہ علی بندہ سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر محمد عبدالرب کوکب مولوی فاضل (دارالعلوم) تھے۔ یہ رسالہ ابتدا میں صدر المطابع میں عموماً ۳۲ صفحات پر طبع ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ دو روپے تھا۔

اس رسالے کے اجرا کا اہم مقصد کمسن طلبہ کی اخلاقی نشوونما اور علمی ترقی میں مدد دینا تھا۔ اس ماہ نامے میں اخلاقی اور علمی مضامین خصوصاً سائنس، طبعیات، تاریخ، بڑے لوگوں کے بچپن کے حالات، بزرگوں کی سوانح عمریاں، نتیجہ خیز اور دلچسپ کہانیاں شائع کی جاتی تھی اس کے علاوہ بچوں کی نفسیات وضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے کھیل کود کے قصے، علمی لطیفے، حفظان صحت اور ورزش سے متعلق مضامین اور ایسے قصے اور واقعات جن کے پڑھنے سے بچوں میں قومی جوش، حب الوطنی، ایثار واستقلال، صداقت ورحم دلی، نیک نفسی، علو ہمتی، سعادت مندی کے جذبات پیدا ہوں شائع کیے جاتے تھے۔

رسالہ اتالیق ۱۹۳۳ء تک حیدرآباد میں کامیابی سے جاری رہا اس کے بعد اورنگ آباد سے شائع ہونے لگا۔ راقم الحروف کو اس رسالہ کے ۱۹۳۶ء تک کے چیدہ چیدہ شمارے اردو ریسرچ سنٹر میں دستیاب ہوئے۔

"نونہال" کے نام سے بچوں کا ایک ماہ نامہ محمد مرغوب الدین بی۔اے (علیگ) کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس کے معاون ایڈیٹر خواجہ احمد تھے۔ یہ رسالہ ابتدا میں عماد پریس میں عموماً ۲۴ تا ۵۶ صفحات پر طبع ہوتا تھا اس کا سالانہ چندہ دو روپے آٹھ آنے تھا۔ اس رسالے کے سرورق پر ذیل کے اشعار درج ہوتے تھے:

ہے قوم اگر باغ تو تم اس کے شجر ہو
ہے قوم اگر نخل تو تم اس کے ثمر ہو
ہے قوم اگر آنکھ تو تم نور بصر ہو

ہے قوم اگر چرخ تو تم شمس و قمر ہو
ہے قوم اگر کان تو تم لعل و گوہر ہو
نظارگی ہے قوم تو تم مد نظر ہو

اس رسالے میں ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جو بچوں اور طلبہ کے لیے مفید، کارآمد اور دلچسپ ہوں۔ اس رسالے میں جوش ملیح آبادی اور امجد حیدرآبادی جیسے نامور شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ "لڑکیوں کا صفحہ" کے عنوان سے ہر ماہ صغرا ہمایوں مرزا (ایڈیٹر النساء) دلچسپ اور مفید مضامین قلمبند کرتی تھیں یہ رسالہ سنہ ۱۹۳۱ء تک جاری رہا۔

اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ابوالمعانی وصف کی ادارت میں بچوں کا ایک مصور ماہ نامہ "ہزار داستان" کے نام سے چھتہ بازار حیدرآباد سے جاری ہوا۔ یہ رسالہ ابتدا میں تاج پریس میں عموماً ۳۲ صفحات پر طبع ہوتا تھا۔ بعد میں دوسرے مطابع میں طبع ہونے لگا اس کا سالانہ چندہ ڈھائی روپے تھا۔ اس رسالے کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے مدیر رسالہ لکھتے ہیں:

"اس رسالے میں چھوٹی نہیں پکی کہانیاں، مفید ادبی، اخلاقی، تاریخی جغرافیائی، دلچسپ مضامین ہیں۔ زبان بھی صاف اور بول چال کے موافق ہے۔ صنعت و حرفت سیکھنے والے لڑکے لڑکیاں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔"

یہ رسالہ نہ صرف بچوں کی تعلیم کے لیے بلکہ ان میں صحیح علمی ذوق بڑھانے کے لیے نکالا گیا تھا۔ مضامین اس قسم کے ہوتے تھے جو بچوں کی زبان اور استعداد سے مناسبت رکھتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ کوئی بار ان کے دماغ پر نہ پڑے ساتھ ہی ان کی معلومات میں اضافہ ہو اور ان کو از خود پڑھنے کا ذوق پیدا ہو۔ یہ رسالہ چند برس جاری رہ کر بند ہو گیا۔

جنوری ۱۹۳۸ء میں اردو کے نامور محقق و نقاد اور بانی ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد) ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے ایک ماہ نامہ "سب رس" کے نام سے جاری کیا جو ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ہے اور اسی کے ساتھ اس کا ایک علاحدہ ضمیمہ "سب رس" (بچوں کا) بھی جاری کیا۔ اس کے پہلے مدیر صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش تھے۔ ۱۹۳۹ء سے یہ معین الدین احمد انصاری بی۔ ایس۔ سی (علیگ) کی ادارت میں نکلنے لگا۔ بچوں کا سب رس ابتدا میں مکتبہ ابراہیمیہ پریس میں عموماً سولہ صفحات پر طبع ہوتا تھا اس کا سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔

سب رس (بچوں کا) کی اجرائی کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زور نے اداریے میں لکھا:

"سب رس میں بچوں اور طلبہ کے لیے جو سولہ صفحے وقف کیے گئے ہیں ان کو ایک علاحدہ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ضمیمے کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے تاکہ جو بچے اور طلبہ "سب رس" نہ خرید سکیں وہ سالانہ ایک روپیہ چندے میں ہر ماہ سب رس کے اس حصے سے فائدہ اٹھا سکیں جو ان کی دلچسپی اور ضروریات کی تکمیل کے لیے خاص اہتمام سے مرتب کیا جائے گا۔"

اس رسالے میں بچوں کے لیے دلچسپ اور سبق آموز قصے کہانیاں، مختصر معلوماتی مضامین، افسانے اور نظمیں وغیرہ شائع ہوتی تھیں اس کے علاوہ معمے، پہیلیاں اور لطیفے بھی درج کیے جاتے تھے۔

یہ ماہ نامہ نہ صرف زبان و بیان کے لحاظ سے بلکہ دوسری دلچسپیوں کے اعتبار سے وسطانی اور فوقانی مدارس کے طلبہ کے لیے بھی نہایت مفید تھا۔ اس رسالے کے بچوں کے لیے دکن نمبر (جنوری ۱۹۳۹ء) اور ریڈیو نمبر (جنوری ۱۹۴۱ء) بھی شائع کیے گئے تھے۔

اس رسالے کے دسمبر ۱۹۵۰ء تک کے شمارے کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں دستیاب ہیں۔

رائے جے رام پرشاد صدر مدرس دھرم ونت ہائی اسکول کی سرپرستی میں بچوں کے لیے ایک مصور ماہ نامہ "بزم ادب" کے نام سے ۱۳۵۲ف م ۱۹۴۲ء / ۱۹۴۳ء میں کوٹلہ عالی جاہ حیدرآباد دکن سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر بشوا ناتھ مدرس دھرم ونت کالج تھے۔ یہ رسالہ چشتیہ پریس میں عموماً ۲۴ صفحات پر طبع ہوتا تھا اس کا سالانہ چندہ ایک روپیہ چار آنے تھا۔

"بزم ادب" میں انگریزی کی Fairy Tales کے انداز پر راجہ، رانی، جن اور پریوں کی کہانیاں شائع کی جاتی تھیں۔ اس کے

علاوہ عام فہم سادہ و سلیس زبان میں صنعت و حرفت سے متعلق مضامین بھی درج ہوتے تھے اور لطیفے بھی شائع کیے جاتے تھے۔

اس رسالے کا مقصد بچوں کو ابتدا ہی سے تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم کی طرف بھی راغب کرنا تھا۔ یہ رسالہ تین سال تک پابندی کے ساتھ جاری رہ کر بند ہوگیا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں محمد صدیق جمال کی ادارت میں ایک بچوں کا ماہ نامہ "مسلم" کے نام سے جاری ہوا۔ یہ رسالہ شیام سندر پریس حیدرآباد میں عموماً بیس یا تیس صفحات پر طبع ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ مع محصول ڈاک تین روپیہ تھا۔ اس رسالے میں سبق آموز قصے، کہانیاں، تعلیمی اور اخلاقی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ نصیحت کی باتیں، لطیفے اور نظمیں بھی شامل کی جاتی تھیں۔ یہ رسالہ اپنے مندرجات کی مقبولیت کی بنا پر کافی عرصے تک جاری رہا۔

بچوں کے رسائل کے اس مختصر سے جائزے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حیدرآباد دکن سے نکلنے والے ان رسائل نے جہاں ایک طرف اردو زبان وادب کی ترقی و ترویج میں بنیادی کردار ادا کیا تو دوسری جانب بچوں کا ذہن بنانے میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوئے۔

وزیر آغا

یہی اپنا ٹھکانہ ہے

ستارہ جیسے آنسو ہے
تری پلکوں پہ آکر رک گیا ہے۔ تجھ سے کہتا ہے
یوں ہی بس دو گھڑی رک لوں... تو چلتا ہوں
مجھے بھیگی ہوئی کچھ اور پلکوں پر بھی جانا ہے
مسافر ہوں، مسافر کا بھلا کوئی ٹھکانہ ہے!

ستارہ اک مسافر ہے
ابھی کچھ دیر وہ مہماں ہے تیرا
پھر اس کے بعد... کالی رات کی پلکوں پہ چمکے گا
سحر دم اوس بن کر، پھول کی
آنکھوں میں اترے گا
پھر اس کے بعد جب
گہری گھنیری شام آئے گی
تو وہ بھی ساتھ آئے گا
معاً دیکھے گا مجھ کو
اور پھر یک دم پروں کو جوڑ کر
اک تیر کے مانند جھپٹے گا
مری بھیگی ہوئی پلکوں پہ اترے گا
اتر کر پر سمیٹے گا
کہے گا۔ بس یہی منزل تھی میری
اسی بستی میں آخر ایک دن ہم سب کو آنا ہے
یہی اپنا ٹھکانہ ہے!!

●●●

قاضی سلیم

مسفِٹ (Misfit)

وقت کے چاک پر
لوگ بنتے بگڑتے رہے
وہ بنا ہی نہیں تھا
بگڑتا بھلا کس طرح
جڑا ہی نہیں تھا
ابھرتا بھلا کس طرح
وہ جیا بھی تو شائد اکیلا جیا
یا پھر جیا ہی نہیں
وہ گیا بھی تو شائد اکیلا گیا
یا پھر گیا ہی نہیں
وہ تھا ہی کہاں۔
جو جاتا کہیں ...
وہ اگر جی رہا تھا
تو پرچھائیوں میں
دیوبالا میں شائد پڑھا تھا
یا کبھی ہم نے شاید اسی سے سنا تھا
ایک گندھروجاتی حسین اروشی نے
دکن دیس میں
اونچے پربت سے اونٹی کے آواز دی تھی
نیلی آنکھوں نے اس سے کہا تھا
"کہ مانو میں وہ آگ پیدا نہیں ہے
جو آکاش کے باسیوں سے ملادے"
سال ہا سال تک
وہ پوتر آگ کی کھوج کرتا رہا

جب وہ ہم میں تھا
تب بھی وہ ہم میں نہ تھا
روز و شب کے حصاروں سے بس جھانک لیتے تھے
کبھی پاس آیا تو ایسے لگا
کان اس کے کہیں ہیں اور آنکھیں کہیں
سوچ آکاش سے بھی پرے
یا کہیں دور زیر زمیں
وہ ہم سے ملا بھی تو ایسے ملا
جھیل میں ڈوبتے لوگ
جس طرح اک دوسرے سے ملیں

بارہا اس کو دیکھا، چھوا، بات کی
بھولی بسری کہانی کے کردار کو
جیسے چھوتے برتتے ہیں
... محسوس ہوتا ہے ہم مل چکے ہیں

وہ مگر اپنے بنائے ہوئے راستوں پر لگا
پوتر آگ کی کھوج میں گم رہا
اپنے سارے بزرگوں کو
پیپل کے چھتنار پیڑوں کو
بھائی بہنوں کو
چھوئی موئی کے پودوں کو
زندگی بھر جلاتا رہا

جانے وہ آگ کس طرح پیدا ہوئی
اور مکت ہوگیا وہ

(۲)

وقت کے چاک پر
لوگ بنتے بگڑتے رہے
وہ اکیلا مگر
چاک کی کیل میں پھنس گیا
اپنے ہی آپ میں دھنس گیا

ہم جو اپنے ہی چکر میں تھے
کھوجتے رہ گئے
کیسے سب کچھ اچانک ہوا
ایک لمحے کو کوئی رکا بھی نہیں
سب کو منزل کی جلدی تھی
۔۔۔ انتم سفر سب کو درپیش تھا

سرسری تذکرے
دوڑتے بھاگتے تبصرے
صبح سے شام تک
کھوجتی بے دلی
جیسے مٹھی میں کوئی
۔ ہوا کو پکڑنے کی کوشش کرے
یوں ہی چلتے چلاتے
ہر اک راہرو پر اچٹتی نظر
کہیں شائد اس کی جھلک ہی ملے
کھوج میں جس کی ہم
گیلی لکڑی کی مانند اندر ہی اندر سلگتے رہے
آگ بھڑکی جو دل میں تو ایسے ڈرے
چوری کرتے ہوئے جیسے پکڑے گئے

آج ہر ذہن کے اپنے اندھے کنویں تھے
اور اندھے کنوؤں میں
ان کے اپنے طلسمات تھے
اور طلسمات میں
ان کی پریاں تھیں
۔۔۔ اور راکھشس تھے
جو سب راستے روک کر
درمیاں میں کھڑے تھے
کسی کو بھی اس کی ضرورت نہ تھی

ایک چھیڑا ہوا ناگ ۔۔۔ پھنکارتا
اپنے ہر ہر چہیتے کو ڈس کر یہی پوچھتا تھا
۔۔۔ مرے سر میں یہ زہر کس نے بھرا ہے
باپ دادا
بھائی بہنوں نے
نقلی بیوی نے
یا پھر کسی اروشی نے
مرے سر میں یہ زہر کس نے بھرا ہے

کس کو فرصت تھی
سب ہی دھتکار کر آگے بڑھتے گئے
"نشہ کرتا ہے
۔۔۔ پاگل ہے"
شائد کسی میں یہ جرائت نہ تھی
خاندانی نجابت کی سیڑھی سے اترے
کیسے زیر زمیں بھیڑیے
رات دن اس پہ یلغار کرتے رہے
کیسے عذابوں کی طومار کرتے رہے

وہ تو بس ایک معمول تھا
کسی جن کی طرح بوتلوں ہی میں چھپا پھرا
بالآخر دھواں بن گیا

ایک سرچیلا گدلا دھواں
جو آنکھوں میں ہر موڑ پر اڈ آتا ہے
اور چند اشکوں میں جو ڈھل بھی جاتا ہے
رونے کی راحت بھی ملتی نہیں

یا تو پھر بات کچھ اور ہے
آج اپنا ضمیر ایک سوکھے ہوئے پیڑ کی طرح
... دم سادھے چپ چاپ اور مطمئن ہے

چلو اچھا بہانہ ملا
خاندانی عبا اور قبا پر
کوئی دھبا نہیں
اور اونچی حویلی کا ہر کام اب حسب دستور ہے
عافیت کوش نیکی کی ہر اک روایت سے معمور ہے
اور ہم بھی
پانچ جگ کی دعاؤں میں
محفوظ و مامون ہیں

• • •

قاضی سلیم

وعید

وقت کی صدا ہے خوف
کس قدر گھنا ہے خوف
لوگ سہم سہم کے
سوکھے ٹھنٹھ پیڑ بن گئے

جسم کی نسوں میں
راڈروں کے تار تن گئے
بے بسی کی بے نگاہ آنکھ سے
ایک دوسرے کو گھورتے ہیں
ایک دوسرے سے بولنے کا وقت اب کہاں

کیا کہیں
ہم ان سے آج کیا کہیں
جن کی سرزمیں پہ دو خدا تھے
ایک آگے آگے چل رہا تھا
آسمانی راستوں کی سب نشانیاں
لے کے مغربی فضاؤں کی طرف نکل گیا

دوسرا
مہرباں کارساز
گھر میں رحمتوں کی برکتوں کی روشنی
ہزاروں سال پیچھے
ست جگوں میں جا بسا
دل و نظر کا نور چھن گیا
بجھے چراغ کی کلونچ منہ پہ تھوپ کر
مہاناگن میں ڈولنے کا وقت اب کہاں

کیا نظام وقت ہے
دیکھتے ہی دیکھتے
سب اسوروں راکھشسوں کے ہول میں بدل گئے
کوئی سامری
کوئی ابرہہ
کوئی بھسماسور ہو گیا

جس کا بس چلا
زہر بو گیا
بے ضمیر...
نفرتوں کی فصل کاٹنے میں لگ گئے
طلسم شیطنت کے جال کھولنے کا وقت اب کہاں
جن کے گھر اجڑ گئے
جن کے پیر اکھڑ گئے
جن کے پاس خوف کے سوا
اب کوئی خدا نہیں
وہ بے پناہ ــــ
جیتے جی زمیں میں اتر گئے
جنگلوں میں سر چھپائے زخم کھائے جانور کی طرح
آہٹوں کو سونگھتے
جانے کب جھپٹ پڑیں
(رب ذوالجلال۔ آخرت کی خیر)
دہشت و ہراس کی درندگی
ہے وہ درندگی کہ جس کی کوئی حد نہیں
کسی کے پاس سچ کو تولنے کا وقت اب کہاں
کتاب حق
کتاب حق سے موتیوں کو رولنے کا وقت اب کہاں

•••

قاضی سلیم

بدلتے منظر

سوتے جاگتے چاند ستاروں کی مخمور نگاہوں نے دیکھا
بونے ٹھنڈے پودے
اور چھتنار تناور پیڑ جو اب تک
اپنے اپنے استھانوں پر پھلتے پھولتے
دور ہی دور سے
صرف ہواؤں کی پیغام بری پر خوش تھے
اپنی گہری اور گھنیری چھایا کے تانے بانے بنتے
اپنا اپنا پراگ چہیتوں کو بھجواتے
قدموں میں کچھ پھول نچھاور کرتے
پتوں کا سنگیت... سناتے
سنتے کھو جاتے
بوجھل اور گھنی راتوں میں جب شاخیں
سپنوں کے بوجھ سے جھک جاتیں
تب سو جاتے

•

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
یگوں یگوں کی پیو ملن کی پیاس بھڑک کر
کال کی ریکھاؤں میں پھیل گئی
ایسے لگا
جیسے ٹھنڈی جھیل میں
سورج کا ایک دہکتا ٹکڑا ٹوٹ گرا
چاروں اور مسلسل زلزلے دھمکے

شور دھماکے
دھاڑتے پربت
چیختے جنگل
گرج گرج برساتیں
جانے کتنی صدیوں کے دن تھے
کتنی صدیوں کی وہ راتیں

●

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
خاموشی ہی خاموشی ہے
بجتے کانوں میں لیکن گونج رہی ہیں
سناٹے کی سانسیں
سنکھوں سیپوں میں بس جاتی ہیں
روی بلونے جیسی
ساگر کی دھیمی دھیمی آوازیں
آوازوں کی تہہ میں
کانا پھوسی جیسے
ٹوٹے ہکلاتے لفظ
ادھورے بول
دور فضا کی پگھلی دھند میں
اک بے آب تڑپتی مچھلی
بھولا بھٹکا سا بے چین ہیولا
تنہا ڈولتا اڑتا پر

یہاں وہاں
دبی چھپی اک ہلچل سی
پھیر بدل کی خواہش سی
اک سازش سی
لگتا ہے

شاید اندھے پاتالوں کی
شانتی!
اکیلی اونگھتی گلئے
سینگ بدلنے والی ہے

●

سوتی جاگتی آنکھوں نے دیکھا
پودوں اور پیڑوں کی نس نس میں
بہتے رس کے بدلے
خون کی دھارا جاگ اٹھی
تپ تپ کرتے قاشے ہوئے
ارمان بڑھے
آپس میں ملے
مضبوط جڑیں دھرتی سے اکھڑیں --- چلنے لگیں

●●●

راشد آزر

بہتے جل کا درپن

○

اک دن شہر کے بے معنی
مصروف دنوں کے روگ سے تھک کر
میں خود سے باتیں کرنے کو
گھر سے نکلا
پاس ندی کے تٹ پر پہنچا

○

دھوپ کڑی تھی
میں بیٹھا ندی کے کنارے
سوچ رہا تھا
کوئی کتنا دھیرج رکھے
کب سے اپنے چہرے کی
میں ایک جھلک کو
ترس رہا ہوں
آئینہ اپنے اندر کے
سارے سچ کی جوت کو
مدھم کر دیتا ہے
اور ہماری آنکھیں سب کچھ
دیکھ کے بھی چہرے کے سچ کو
جھٹلاتی ہیں
شاید پانی میں جو عکس
ابھر آئے گا
میرا سچا روپ وہی ہو

اس میں کوئی
بھید بھاؤ کی بات نہیں ہے
یہ تو سیدھا سادہ اپنے
گیان کا اک پرتو ہے جس میں
ہم اپنے جیون کی چھب کا
ہلکا سا اک
سایہ دیکھ لیا کرتے ہیں

○

دھیرے سے اک
سنی ہوئی آواز سی آئی ۔
بالک یہ تو
ساون کی چڑھتی ندی ہے
یہ کوئی چھوٹی جھیل نہیں ہے
اس میں چہرہ کیا دیکھے گا
لہروں میں تو
پرچھائیں بھی کھو جاتی ہے
بہتے جل سے
درپن کیسے بن سکتا ہے

○●○

راشد آزر

قحط الرّجال

تمھیں خبر ہے؟
ضرور ہوگی
کہ آج موسم کی پہلی بارش ہے
گھر میں مٹی کی سوندھی خوش بو
مہک رہی ہے
گرجتے بادل برس رہے ہیں

بہت دنوں سے
زمین آنگن کی تپ رہی تھی
زمیں کی گرمی
ہوا میں تحلیل ہو کے
ساری فضا کو مرطوب کر گئی ہے
بدن کی حدت
مرے مسامات سے نکل کر
مرے بدن کو بھگو چکی ہے
میں اپنے محسوس، غیر محسوس درد کی چاپ
اپنے سینے میں سن رہا ہوں

مری رگوں میں لہو کا وہ زیر و بم نہیں ہے
کہ جس کی شدت شباب جیسی جنوں زدہ ہو

میں آرزوؤں کی دھیمی دھیمی
اداس سرگوشیوں میں گم ہوں

ہمارے آنگن میں سوکھی بیلیں
منڈیر کو ناخنوں سے اپنے
کرید کر زخمی کر چکی تھیں
مگر اب اس کو
وہ بھیگے بھیگے سے
نرم ہاتھوں سے چھو رہی ہیں

میں سوچتا ہوں
کہ اب تو موسم ہے بارشوں کا
تو میری حدِ نگاہ تک یہ
خوشی کا چہرہ اداس کیوں ہے
کہ گھر میں جس دن سے تم نہیں ہو
یہ آنکھیں مانوس صورتوں کو
ترس رہی ہیں
کہ جیسے سچ مچ
جہاں میں قحط الرّجال سا ہے

○ ○ ○

بانو طاہرہ سعید

نظمیں

○

ترجمان

رنگ بدلتی دنیا کا
تو کتنا صحیح ترجمان ہے
گرگٹ!

پرواز

پرندو..........
بے بسی کا احساس کیوں دلاتے ہو۔
میں تمہاری طرح پرواز نہیں کر سکتی۔

آلودگی

فضا..... ہوا..... پانی کی آلودگی
موضوع بنے ہوئے ہیں
لیکن دامن کا کیا علاج؟

کنجوسی

فریب کھایا ہے
دیا نہیں
شاید کنجوسی کر ڈالی!

خوش بو

میں صندل کی لکڑی ہوں
اگر تم مجھے
جلا بھی ڈالو
تو بھی میں
خوش بو ہی بکھیروں گی!

نمائندہ

بچھو کا سواگت کرنا ہی پڑے گا
رشتہ داروں کا
نمائندہ جو ٹھہرا!

فضا ابن فیضی

رباعیات

حلقۂ گرداب

خاموشی کہاں ۔ خیمہ حیرت میں ہے ؟
کہرام سا ۔ بازیچۂ حیرت میں ہے
حیرانی سے فارغ ہے ۔ ترا آئینہ
چہرہ ہی مرا ۔ ورطۂ حیرت میں ہے

ابھی زندہ ہے

باگرم دلی ۔ خوش نفسی ۔ زندہ ہے
باخود گری و خودنگری ۔ زندہ ہے
کرڈالا تھا ۔ تم نے تو اسے قتل ۔ مگر
وہ کون ہے ؟ مجھ میں جو ابھی زندہ ہے

بینش فرسا

جاں کا ہی تنہا کا صلہ ۔ کچھ بھی نہیں
سعیِ تپش افزا کا صلہ ۔ کچھ بھی نہیں
پتھر ہی پہ اب توڑدوں ۔ آئینے تمام
یاں ۔ دیدۂ بینا کا صلہ ۔ کچھ بھی نہیں

●●●

کیفی اعظمی

()

جانے کیا رشتہ تھا اس بت سے کہ ٹوٹا جب سے
ٹکڑے چُن چُن کے دِکھاتے ہیں کہ ہم ٹوٹے ہیں

ہاں وہ پتھر کا تھا ۔ پتھر کا جگر اس کا تھا
شیریں چشمے بھی مگر اس سے کئی پھوٹے ہیں

آبیاری یہ اسی کی ہے کہو ہے کہ نہیں
یہ جو صحراؤں میں ہریالی ہے ۔ گل بوٹے ہیں

سارے الزام اسی کو تو نہ دو معصومو
عہد میں اس کے فرشتوں نے مزے لوٹے ہیں

●●●

مصطفیٰ شہاب

○

وہ تماشا آپ کی جادو بیانی سے ہوا
ایک سناٹا ہماری بے زبانی سے ہوا

ایک پل میں اٹھ گئے پردے کئی اسرار سے
وہ نہ ہوتا جو ذرا سی بدگمانی سے ہوا

بڑھ گئی کچھ طاقتِ گفتار بھی رفتار سے
شور پیدا موجِ دریا میں روانی سے ہوا

اڑگئی خوش بو ہوا میں دھوپ رنگت لے اڑی
فائدہ کیا خاکِ گل کی پاسبانی سے ہوا

جو بھی ہونا تھا ہوا لیکن یہ حیرت ہے شہابؔ
آپ جیسے مہرباں کی مہربانی سے ہوا

●●●

فکر تو فکر تھی فغاں نہ بچی
بچ گیا سر تو کیا زباں نہ بچی

جن کو مرنا تھا جی گئے وہ لوگ
آگ سینوں میں مثلِ جاں نہ بچی

سرخوشی شب کی دن کے صدموں سے
بچ بھی جاتی مگر میاں نہ بچی

ہم کسی کے بھی میہماں نہ ہوئے
کیا کہیں مئے کہاں کہاں نہ بچی

سارا سودا زیاں رسیدہ تھا
نہ بکے ہم تو پھر دکاں نہ بچی

ہم ذرا سی بچا کے لائے شہابؔ
بچ گئی تھی وہاں یہاں نہ بچی

●●●

مشتاق پردیسی

○

میری سانس تو گنتی بھر ہے میری بات جدا ہے بابا
ان سے پوچھو جن کے آگے دشتِ عمر پڑا ہے بابا

اپنے یا بیگانے کیسے جانے یا انجانے کیسے
اس دل پر احسان ہے سب کا سب نے زخم دیا ہے بابا

فصلیں گزریں موسم بیتے چلتے چلتے یاد آیا ہے
کتنا کام کیا ہے پھر بھی سارا کام پڑا ہے بابا

آنے والا ہر دُکھ ہم کو اب بھی روز نیا لگتا ہے
ویسے جگ میں جتنے دکھ ہیں، دل سب جھیل چکا ہے بابا

کل کی دنیا آج کے خوابوں کی بہتر تعبیریں پالے
آنے والی نسلوں کو بس میری ایک دعا ہے بابا

بھیڑ بھری دنیا ہے پھر بھی لمحہ لمحہ تنہائی ہے
جس کے پاس نہیں ہے کوئی اس کے ساتھ خدا ہے بابا

وقتِ نزع ہے، آنکھیں پلٹیں لب لرزاں، ماتھے پہ پسینہ
کیوں آئی مشتاق کو ہچکی، کس نے یاد کیا ہے بابا

●●●

(حبیب علوی کے لیے)

○

ہوائیں چاندنی، خوش بو، گھٹا، کچھ مجھ کو بھائے نا
سبھی بے لطف ہیں جب تک مرا محبوب آئے نا

قیامت سے گزر کر ایک پل کو نیند آئی ہے
فرشتو اب قیامت میں کوئی مجھ کو جگائے نا

ذرا سا مسکرا کر، سر جھٹک کر زلف بکھرا دی
مرا کہنا کیا تم نے، تو بادل گھر کے آئے نا

ہمارے صبر کا تو امتحاں صدیوں سے جاری ہے
مٹا سکتی ہے یہ دنیا اگر ہم کو، مٹائے نا

ہمیشہ دوستی کا دم بھرا کرتی ہے یہ دنیا
مگر سچ ہے کہ سچی دوستی کوئی نبھائے نا

حسد، نفرت، تعصب، ظلم، دہشت، قتل، بربادی
دعا ہے کل کی دنیا آج جیسے دکھ اٹھائے نا

جو آنکھیں راہ تکتی ہیں سحر تک اس کے آنے کی
کہیں مشتاق کا جانا ان آنکھوں کو رُلائے نا

●●●

میر نقی علی خاں ثاقب

●

گمانِ ہوش نہیں اور بے خودی بھی نہیں
کمی بھی ہے تری محفل میں اور کمی بھی نہیں

وہ میرے چاکِ گریباں پہ طنز کرتے ہیں
بدن پہ جن کے ردائے برہنگی بھی نہیں

بکھر رہے ہیں بدن، برگِ خشک کی مانند
مگر کسی میں شعورِ شکستگی بھی نہیں

درِ نفس پہ کئی بار جا کے دستک دی
عجیب طرح کی چپ ہے وہاں کوئی بھی نہیں

بس اک سراب ہے موجِ کشاکشِ ہستی
رواں دواں بھی نہیں ہے رکی رکی بھی نہیں

جنوں کی بھیڑ میں سب پھر رہے ہیں انجانے
کسی کے ہاتھ میں تصویرِ زندگی بھی نہیں

●●●

●

میرا احساس وفا تیری بدولت کچھ ہے
خواب کچھ کہتے ہیں آنکھوں کی ضرورت کچھ ہے

آج اک پل کو ذرا خود سے لپٹ کر رولوں
آج مجھ کو مری تنہائی سے فرصت کچھ ہے

کس سے ممکن ہے بکھرتی ہوئی سانسوں کا حساب
مول کچھ ہوتا ہے، بازار کی قیمت کچھ ہے

●

مجھ سے مانوس نہیں میرا مزاجِ ہستی
اس کے تیور ہیں الگ، میری طبیعت کچھ ہے

دل کے سودے میں ذرا ہاتھ سنبھل کر رکھنا
ورنہ اس کھیل میں بک جاتی ہے رسوائی تک

منزلِ عشق میں صحرائے بدن کیا شئے ہے
ناپ دوں نس کے دریاؤں کی گہرائی تک

خلوتِ ذات میں جھانکو تو سمجھ جاؤ گے
مرحلے اور بھی ہیں انجمن آرائی تک

اک مسلسل سفرِ تیرہ شبی ہے دنیا
قوسِ مہتاب سے خورشید کی انگڑائی تک

●●●

حنا شیدائی

(۱)

مجھ سے نظریں ملاتے رہو
مست و بے خود بناتے رہو

رقص پروانہ رکنے نہ پائے
شمع کی لو بڑھاتے رہو

برق گرتی رہے گی یوں ہی
تم نشیمن بناتے رہو

دور کرنے کو تاریکیاں
اپنا گھر ہی جلاتے رہو

ہم سناتے رہیں حالِ دل
اور تم مسکراتے رہو

نہیں آتے نہ آؤ مگر
کم سے کم یاد آتے رہو

موسمِ گل بھی آجائے گا
تم گلستاں میں آتے رہو

مسکراتے ہوئے اے حنا
غم کی عظمت بڑھاتے رہو

خون بہاراں دیکھ رہے ہیں
چاک گریباں دیکھ رہے ہیں

ڈوبنے والے سوئے ساحل
تا حد امکاں دیکھ رہے ہیں

شہر کو سارے آگ لگاکر
جشنِ چراغاں دیکھ رہے ہیں

ہوتا ہے برباد گلستاں
اہلِ گلستاں دیکھ رہے ہیں

ہم تو سفینہ اپنا بڑھاکر
زورِ طوفاں دیکھ رہے ہیں

ہم کو حنا کرتے تھے جو حیراں
ہم انھیں حیراں دیکھ رہے ہیں

●●●

شکیل اعظمی

○

میرے بچے بھی پڑوسی کا ہنر لے لیتے
ان کو روکا نہیں جاتا، تو اثر لے لیتے

وہ تو اچھا ہوا، میں نے انھیں موقع نہ دیا
ورنہ یہ لوگ مرا دستِ ہنر لے لیتے

تم نہیں جانتے ان دل کے طلب گاروں کو
اور کچھ دیر جو رک جاتے تو سر لے لیتے

جس میں انسان محبت کا پیمبر ہوتا
ایسی بستی کوئی مل جاتی تو گھر لے لیتے

تیرے آنسو تجھے لوٹا دیے میں نے، ورنہ
میری آنکھوں میں جمی گردِ سفر لے لیتے

پھر یہ برفیلی ہوائیں بھلا کس گھر جاتیں
ہم بھی بازار سے کچھ دھوپ اگر لے لیتے

کیا ضروری تھا، کہ ہر بار وہی آتا شکیل
کوچ کے وقت تمھیں جاکے خبر لے لیتے

●●●

عبداللہ ندیم

○

مجھے تھی ان سے محبت یہ بھول جائیں وہ
نہ مجھ کو یاد کریں اب، نہ یاد آئیں وہ

جو بے سکوں ہیں دعا ہے سکون پائیں وہ
جو رو رہے ہیں تمنا ہے مسکرائیں وہ

جو مجھ پہ بیت چکی ہے نہیں غرض اس سے
جو ان پہ بیت رہی ہے وہی سنائیں وہ

جو مجھ کو دیتے ہیں الزام خود نمائی کا
یہ ان سے کہہ دو کہ مُنہ اپنا مت چھپائیں وہ

جو تیرے واسطے مانگی تھیں بے خودی میں کبھی
مجھے رلاتی ہیں یاد آکے اب دعائیں وہ

اگر ہے ان کو محبت، تو پھر ندیم میاں
میں ان سے روٹھ گیا ہوں مجھے منائیں وہ

●●●

منظور الامین

بروقت

ہماری ایک مشکل یہ ہے کہ ہمارے دوستوں کا حلقہ کچھ زیادہ وسیع ہے اور وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اس حلقے میں سبھی قابل ذکر ہیں، ان میں سے کئی ایک تو ایسے ہیں جو باتوں کے غازی ہیں جہاں کام کا وقت آیا یہ ندارد۔

آج ہم آپ سے اپنے ایک خاص دوست کی بات کرنی چاہتے ہیں جن کو ہم ایک زر نگار، رنگا رنگ - (Many splendored) شخصیت کہتے ہیں۔

یہ دوست ایسے ہیں کہ کبھی کوئی کام بروقت نہیں کرسکتے، کبھی کوئی فقرہ برجستہ نہیں کہہ سکتے، کبھی کسی برخوردار کو اس کی کسی غلط بات پر برملا نہیں ٹوک سکتے، کسی خطاکار سے کبھی برگشتہ خاطر نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس بہت سی ایسی باتیں برداشت کرلیتے ہیں جو عام طور پر برداشت نہیں کی جانی چاہیے۔ اکثر نامناسب لفظ برمحل استعمال نہیں کرسکتے وغیرہ۔

ہمارے یہ دوست اچھی خاصی موسیقی جانتے ہیں مگر ویسے بے وقت کی راگنی الاپنے میں ماہر ہیں۔ یعنی اگر ایرانی موسیقی کے لحاظ سے وہ "گنج سوختہ" کا وقت ہوتا تو ہمارے یہ عزیز "لحن داؤدی" میں "پردہ عشاق" چھیڑنے کی کوشش کرتے ہیں اگر ان سے درخواست کی جائے کہ ہندوستانی سنگیت کا کوئی مذکر راگ جیسے شری یا بسنت پیش کریں تو یہ کسی مونث راگنی راگ جیسے دھناشری یا بسنتی میں کوئی بندش پیش کرنے لگتے ہیں۔

اب ان کی وہ خصوصیت لیجیے کہ وہ کبھی بھی کوئی حملہ، کوئی فقرہ برجستہ یا برمحل نہیں کہہ سکتے، عام طور پر ان کے ساتھ ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی مدمقابل انھیں سخت سست سنا دیتا ہے تو یہ اس قدر سٹپٹا جاتے ہیں کہ حریف کو صرف دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ دنیا میں شاید دوسروں کا منہ دیکھنے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ اپنے گلے کی تواضع اپنے ہی گھونسے سے کرلیتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ جو مکا لڑائی کے بعد یاد آئے اسے اپنے ہی گلے پر مارلینا چاہیے کیوں کہ دشمن تو مرمت کرکے رفو چکر ہوچکا ہوتا ہے۔

ہم ان کو ان کی اس کمزوری پر بار بار ٹوکتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی کمزوری کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور ہر بار ہم سے وعدہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذہن کو چست بنائے رکھیں گے تاکہ کوئی انھیں سخت سست سنا کر ان کی بے عزتی نہ کرسکے۔ لیکن بار بار ان کے ساتھ وہی کچھ ہوتا ہے جو نہ ہونا چاہیے۔ اس پر ہم انھیں یہ مشہور حکایت سناتے ہیں:

ایک بار شاہ ایران کا ایک غلام محل سے فرار ہوگیا۔ بادشاہ نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ کچھ دنوں بعد ملک کی پولیس اسے گرفتار کرلائی اور بادشاہ کے حضور پیش کردیا اس وقت سلطنت کا ایک وزیر بھی دربار میں موجود تھا جو کسی وجہ سے اس غلام کا دشمن تھا۔ اس نے

بادشاہ کو مشورہ دیا کہ غلام کی گردن اڑادی جائے تاکہ عوام کو عبرت حاصل ہو۔ اچانک غلام کی زندگی داؤ پر لگ گئی مگر وہ ایک ذہین انسان تھا۔ اس نے برجستہ کہا۔

"عالم پناہ آپ جو چاہتے ہیں وہی ہوگا کیوں کہ آپ تو اس مملکت کے مالک ہیں لیکن ایک بات پر غور فرمالیں۔"

"وہ کیا بات ہے؟" شاہ نے دریافت کیا۔

"سرکار آپ جانتے ہیں قیامت برحق ہے۔" غلام نے عرض کیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ جب قیامت آئے اس دن آپ مجھ نابکار کے قاتل بے وجہ ٹھہرائے جائیں اور اس کی سزا پائیں، یہ گستاخی میں اس لیے کر رہا ہوں کہ میں نے جہاں پناہ کا نمک کھایا ہے۔"

"آخر تو چاہتا کیا ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"عالی جاہ، میں چاہتا ہوں کہ اس وزیر کو میں قتل کر دوں۔ تب آپ مجھے اس جرم کے لیے موت کی سزا سنادیں، اس طرح روز قیامت آپ پر یہ الزام نہیں آئے گا کہ آپ نے ایک بے گناہ کو قتل کروایا تھا۔"

بادشاہ یہ سن کر ہنس پڑا، اب اس نے وزیر سے اس کی رائے پوچھی۔ وزیر کانپ اٹھا اور بولا:

"حضور اس غلام کو آزاد کر دیجیے گا تاکہ یہ مجھے مصیبت میں گرفتار نہ کرادے۔"

ہمارے دوست اس قصے پر پسندیدگی کی مہر لگادیتے ہیں مگر کہتے ہیں۔ "یار مگر یہ جمہوریت کا زمانہ ہے، اب نہ تو بادشاہ ہیں نہ غلام!"

اب ملاحظہ ہو ہمارے ان دوست کی ایک اور خصوصیت۔ یہ کسی کو بھی کسی غلط بات کرنے یا کہنے پر برملا نہیں ٹوک سکتے اور کسی خطاکار سے کبھی برگشتہ خاطر نہیں ہوتے۔

مثلاً ایک دفعہ ان کا بھتیجا ان کے بی ڈی اڈرو ب سے ان کی دو چار اچھی ٹائیاں اڑانے گیا اور پھر ان ہی ٹائیوں کو ایک کے بعد ایک ان کے سامنے پہن کر آیا اور ان سے ہی داد کا طلب گار ہوا، انھیں علم تھا کہ یہ انھیں کی ٹائیاں ہیں مگر وہ اسے کچھ نہ کہہ سکتے۔ اس کی مثال کچھ ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسی کے دانتوں کا چوکا دھار لے اور یہ بتیسی خود لگا کر انھیں دکھا کر خود ان پر ہی ہنسے!

زندگی میں ایک بار ۔۔۔۔۔ صرف ایک بار ۔۔۔۔۔ انھوں نے ایک بے حد ضروری کام بروقت کیا تھا اور اگر بروقت نہ کرتے تو پھر وہ کہیں کے نہ رہتے، اس کے متعلق ایک واقعہ ہے اور یہ ایک سچا واقعہ ہے:

یہ اس وقت کا ذکر جو ہمارے ان دوست کی شادی کلکتے میں ہو رہی تھی اور یہ دلی میں تھے۔ شادی کے معاملے میں بھی یہ لیٹ لطیف تھے، یہ پہلی شادی ان کی اس وقت ہوئی جب ان کی عمر پچیس سے تجاوز کر گئی تھی، اس وقت تک شادی بھی یہ بروقت نہیں کر پائے تھے۔

ہاں تو یہ خود اپنی ہی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے نئی دلی ریلوے اسٹیشن سے راج دھانی ٹرین میں سوار ہوئے۔ اسٹیشن، اس دن یہ دیر ہی میں پہنچے تھے یعنی بروقت نہیں۔ ہمارے دیس کی راج دھانی ہی میں یہ راج دھانی ٹرین میں بیٹھے ضرور لیکن جلدی میں اس راج دھانی ٹرین میں جا بیٹھے جو بمبئی جارہی تھی، کچھ تو شادی کا Excitement کچھ کلکتہ پہنچنے کی جلدی۔ ٹرین میں بیٹھتے وقت یہ چیک کرنا بھول گئے کہ صحیح ٹرین کون سی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پورب کی اور جانے والی ٹرین کی جگہ پچھم کی طرف جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئے۔ یہ وہ

(بقیہ صفحہ ۶۲ پر)

ساگر سرحدی

ہرشد مہتا کا سوٹ کیس

لوک ناتھ بار بار وہ کے ہر تھونٹ سے ناتھ منہ بنا رہا تھا۔ میرا سر تو پہلے ہی چکرا رہا تھا۔ مہانگر میں میں نے فسادات کے بارے ایک آرٹیکل لکھا تھا۔ آرٹیکل لکھنے سے ایک نئی قسم کا جوش تھا جس میں ایک طرح کی گرمی میری رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ چھپنے سے پہلے میں اپنے آپ کو ایک شہید کے روپ میں دیکھ رہا تھا کہ آرٹیکل چھپنے کے بعد مجھے گولی مار دی گئی ہے اور میرے جنازے کے پیچھے شہر کے ہزاروں ناگرک چل رہے ہیں۔ اس جوش وخروش میں آرٹیکل کچھ اچھا لکھا گیا تھا۔ چھپنے کے بعد تھوڑی تعریف ہوئی تھی، حالاں کہ اتنی نہیں جتنی مجھے امید تھی۔ پھر بھی میں خوش تھا۔ لیکن دوسرے دن ہی شیو سینا کے کسی ممبر نے مجھے دھمکی دی کہ میری ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ میں نے جرنلسٹ کے کوٹے سے پہلی گاڑی لی اور دلی آکر لوک ناتھ کے ساتھ نقلی دارو پی رہا تھا جو میں بمبئی سے چلتے وقت کسی دوکان سے خرید لایا تھا۔ اس کا سر دارو سے گھوم رہا تھا اور میرا ڈر کے مارے۔ دونوں کی حالت ایک جیسی تھی۔ اس لیے میں آسانی سے سوال کر سکتا تھا۔

تمھارے اس لون کا کیا بنا؟

ارے کچھ نہیں یار۔

کیوں، پچھلی بار جب ہم ملے تھے تو تم نے کہا تھا کہ بنک مینیجر مان گیا ہے۔ پندرہ پرسنٹ طے بھی ہو گیا ہے اور زندگی کے ان دنوں تم مسکرانے بھی لگے تھے جو آج کل کے دنوں میں بہت مشکل ہو گیا ہے۔

لوک ناتھ نے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک فیکٹری ڈالی تھی۔ اور خوش قسمتی سے اس کا کام بھی چل نکلا تھا۔ میں جو اس وقت اس کے سامنے بیٹھا نقلی دارو پی رہا تھا اور ہمدردی کی رسم نبھا رہا تھا، اب بھی اسی کی دی ہوئی قمیض پہنے تھا۔ اس سے پہلے سیلز ڈپارٹمنٹ میں اچھی پوسٹ پر تھا۔ لوگ اتنی رشوت خوشی سے دیتے تھے، وہ قبول کر لیتا تھا۔ رشوت کے لیے وہ کسی کو پریشان نہ کرتا۔ اس لیے دھندے والے لوگ اسے بہتر افسر سمجھتے تھے۔ پھر اس میں یہ خوبی بھی تھی کہ رشوت لینے کے بعد کام بھی کر دیتا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اس نے کام پہلے کر دیا اور رشوت بعد میں لی تھی۔ کاروباری ان خصلتوں کے کارن اسے چاہتے بھی تھے۔ وہ کسی کو تنگ بھی نہ کرتا۔ ٹھیک سے، ڈھنگ سے، کان دار سے بات کرتا تھا۔ کئی اچھے سیٹھوں کے ساتھ تو اس کے ذاتی سمبندھ تھے۔ وہ شادی بیاہوں میں بھی بلایا جاتا اور اکثر وہ بیٹا اور بیٹی کی شادی میں گفٹ بھی لے کر جاتا۔ یعنی دوسرے افسروں کی طرح وہ لینا ہی نہیں دینا بھی جانتا تھا۔ سیٹھوں کے نوجوان بیٹے اسے لوک ناتھ انکل کہتے تھے اور وہ بیٹا کہہ کر ان سے مخاطب ہوتا تھا۔

ہم لوگوں نے لوک ناتھ کی نوکری کے دنوں میں بڑی موج کی تھی۔ دارو سے مست ہو کر ہمارا چار، پانچ چھ آدمیوں کا ٹولا کھانا کھانے کے لیے نکلتا تو ہمارے پاس بہت چانس ہوتی۔ جس ہوٹل میں کھانا کھانے بیٹھتے تو وہاں کے مالک لوک ناتھ کو دولھا کی طرح ٹریٹ کرتا اور ہم باراتیوں کی طرح ڈٹ کر کھاتے۔ سوئیٹ ڈش تک کھا کر ڈکار مار کر نکلتے۔ ہم سب جانتے تھے اور اندر سے اچھی طرح محسوس

کرتے تھے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس طرح کے ہوٹل میں اس طرح کے کھانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اور یہی کارن ہوتا، باہر نکلتے وقت ایک بار تو جسم کانپ اٹھتا یہ سوچتے ہوئے کہ اگر آج ہوٹل کا مالک بل مانگ بیٹھے تو۔ لیکن اپنے بھارت ورش میں ایسا ہوتا نہیں ہے کہ سینٹرل سیلز ٹیکس کے افسر سے پیسہ مانگے۔ ہم سب کا جسم تقریباً حرام کے اناج سے پلا تھا۔

اس کے علاوہ مجھے اگر کوئی چیز خریدنی بھی ہوتی تو لوک ناتھ کے ساتھ بازار میں نکلتا، من پسند چیز پر ہاتھ رکھتا، اور لوک ناتھ اس سے قیمت پوچھتا تو مالک مسکرانا شروع کر دیتا۔ لوک ناتھ ضد کرتا، ٹیگ پڑھتا، اور اگر وہ چیز ساڑھے سات سو کی ہو تو وہ مجھے تین سو روپے ادا کرنے کو کہتا۔ اس کے باوجود ہمارے لیے کولڈ ڈرنک آتی اور جب ہم نکلتے تو دکان دار ہمیں ہاتھ جوڑ کر وداع کرتا۔ اور میرے من سے پرارتھنا نکلتی کہ بھگوان بھارت دیش میں یہ نظام بنائے رکھے۔

اب لوک ناتھ ریٹائرڈ ہو گیا تھا۔ معقول سی رقم بنا کر گھر بنا لیا تھا جسے دلی کی زبان میں کوٹھی کہتے ہیں اور ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک فیکٹری بھی ڈال لی تھی۔ اس کی شکل اب ان راجوں کی سی ہو گئی جو اپنا راج پاٹ کھو چکے ہیں۔ شکل کے زاویے میڑھے میڑھے ہو گئے ہیں۔ آواز میں ایک چیخ سنائی دیتی ہے۔ جیسے آواز میں اب عقیدہ نہ رہا ہو۔ باتوں میں ایک کھیج بھی آگئی تھی۔ لیکن ہم دونوں دوستی کی ایک رسم نبھا رہے تھے اس نے بڑی تلخی کے ساتھ رونا رو دیا۔

یار کچھ میں نہیں آتا وہ حرام زادہ آخر چاہتا کیا ہے۔ جب بھی ملو ہنس کر بات کرتا ہے۔ اس کا ایجنٹ کئی بار فیکٹری میں آیا ہے۔ اپنی پرانی قمیص پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالتا ہے۔ نئی پہن لیتا ہے، کولڈ ڈرنک پی کر وعدہ کرتا ہے کہ کام اس ہفتے ہو جائے گا۔ اور کبھی کبھی سو پچاس لے بھی جاتا ہے۔ کئی بار تو جی بھی کرتا ہے کہ سالے کے دو جماؤں، لیکن ڈر لگا رہتا ہے کہ بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔ اس لیے غصہ پی جاتا ہوں اور گھٹن کی وجہ سے بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا ہے۔

کہیں اسے لڑکیوں کا شوق تو نہیں؟

تم مجھے کیا دلہ سمجھتے ہو! میں بھی ایک افسر رہا ہوں۔ میں نے کبھی زندگی میں بے جا بات نہیں کی۔

نہیں میں ایسے ہی سوچ رہا تھا۔ دور درشن میں میرا لکھا ہوا سیریل میرے ایک واقف کار نے ڈالا تھا۔ پیسے تو طے ہو گئے تھے۔ ان صاحب کو کیبرے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ تو وہ ان کو کیبرے دکھانے بھی لے جاتا۔ کیبرے دیکھتے ہوئے اس کی حالت عجیب سی ہو جاتی تھی۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اینٹھتا رہتا جیسے اس لڑکی کے ساتھ ------! ایک دن اس کا فون آیا۔ اتفاق سے میں بھی وہیں بیٹھا تھا۔ "لڑکی کا بندوبست کر سکتے ہو؟" واقف کار نے بھی یہی کہا جو تم کہہ رہے ہو "آپ مجھے دلہ سمجھتے ہیں؟" اور اس کا سیریل پاس نہیں ہوا۔

بھاڑ میں جائے وہ۔ لون ملتا ہے تو ٹھیک، نہیں ملتا تو میں کیا کروں۔ سر پیٹ لوں۔ میرا بزنس سامنے ہے۔ بزنس چل رہا ہے، اور دو لاکھ کا لون مانگ رہا ہوں۔ پندرہ پرسنٹ کی بات ہوئی تھی۔ وہ بھی میں نے ہاں کر دی۔ اس کے آگے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اور وہ یار تھوڑی بچی ہوئی شراب ایک ڈیک میں پی گیا۔

میں نے ایک اور تبدیلی لوک ناتھ میں دیکھی۔ اب شراب اس پر سوار ہونے لگی ہے اور شراب کا مزہ بھی نہیں لے پا رہا۔ ایک تو شراب نقلی، اور اس پر اس کا موڈ خراب ------ اب وہ شاید بے ہوش ہونے کے لیے دارو پیتا ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ لوک ناتھ تم اس معاملے کو ٹھیک سے ہینڈل نہیں کر پا رہے ہو۔ تمہارے چہرے پر ایک عجیب سی کھیج نظر آتی ہے شاید بینک مینیجر کو تمہاری شکل پسند نہیں آ رہی ہے۔

تو کیا اب میں اس کے لیے اپنی شکل بدل دوں۔ پلاسٹک سرجری کروالوں۔ ودیا رتھی یار، تم بھی کمال کی بات کر رہے ہو۔

تم میری بات سمجھے نہیں ہو۔ تمھیں رشوت لینے کی عادت ہے دینے کی نہیں۔ جب تم اسے رشوت دینے جاتے ہو تو تمھاری مجبوری نہ چاہ کر بھی تمھارے چہرے پر آجاتی ہے۔ بنک مینیجر شاید گھبرا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تمھارا پوری طرح بھارتیہ کرن نہیں ہوا۔

میرا بھارتیہ کرن نہیں ہوا! یار ودیا رتھی، تم گھاس کھا کر آئے ہو۔ یار تم کیوں میری ماں بہن کر رہے ہو۔ میری حالت ویسے ہی بہت خراب ہے۔ ذرا سا سمجھنے کی کوشش کرو اور خدا کے لیے مجھے ٹوکو نہیں۔ میرا CREATIVE PROCESS شروع ہو رہا ہے۔

تم ٹوکو گے تو فوراً بند ہو جائے گا۔ غور سے سنو، بھارت میں رشوت لینا دینا ایک WAY OF LIFE بن گیا ہے۔ اس پر کوئی چونکتا نہیں، کوئی شکایت نہیں کرتا۔ دینے والا چڑھاوا چڑھاتا ہے اور لینے والا پرشاد سمجھ کر لے لیتا ہے۔ تم رشوت دے کر خوش نہیں ہوتے ہو، اس لیے میں کہتا ہوں تمہارا بھارتیہ کرن نہیں ہوا ہے۔

اب وہ ہنسنے لگا۔

تو بھائی میرا بھارتیہ کرن کر دو۔

چنتا مت کرو۔ ودیا رتھی پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ تمھارا بھارتیہ کرن کرے۔ اس کے علاوہ میں تمھارا دین دار بھی ہوں۔ اس راج نگری میں تم نے مجھے ڈھیروں دارو پلائی ہے، کھانا کھلایا ہے۔ مجھے مفت کے کھانے کی ایسی عادت ہو گئی ہے کہ اب میرا ہاتھ جیب تک جاتا ہی نہیں۔ اکثر ویٹر انتظار کرتا رہتا ہے کہ صاحب بل چکائیں گے۔ اور میں انتظار کرتا رہتا ہوں کہ ابھی کوئی آدمی آئے گا اور میرا بل چکا دے گا۔ بل چکانے کے بعد کھانا بھی بدمزہ ہو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے تو میں بھی بھول گیا تھا کہ میں کیا کہنے جا رہا تھا۔ اپنی باتوں کی روانی مجھے اچھی لگتی ہے۔ اس ڈر کے مارے کہ میں اپنی بات بھول جاؤں، میں نے ذرا رک کر کہا:

تم ہرشد مہتا کے سوٹ کیس میں رقم لے کر جاؤ گے تو بینک مینیجر منا نہیں کرے گا۔

لوک ناتھ پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اسے مزید سمجھایا۔ آدمی سب ایک ہوتے ہیں۔ لیکن سوٹ کیس، سوٹ کیس میں فرق ہوتا ہے۔ اس سوٹ کیس میں برکت ہے۔ جادو ٹونا کیا ہوا ہے اس پر۔ اس میں پیسے ڈال کر آپ کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ کوئی چیکنگ نہیں ہوتی، کوئی پوچھتا ہی نہیں اس کے بارے میں۔ اور عام آدمی یعنی پولیس، سکیورٹی آفیسر کو تو وہ نظر ہی نہیں آتا۔ اور لینے والا اس سوٹ کیس کو دیکھ کر منا نہیں کر سکتا۔ لوک ناتھ مسلسل مجھے دیکھ رہا تھا، بنا پلک جھپکے، ٹکٹکی باندھے، جیسے وہ مجھے پہلی بار دیکھ رہا ہے یا میں کسی اور دنیا کا رہنے والا ہوں۔

اچانک وہ پھٹ پڑا:

بند کرو! بہت پیچھے رہ گئے ہو تم۔ جرنلسٹ ٹھینگے کے ہو۔ ارے میاں، ہم بھی اخبار پڑھتے ہیں۔ تھوڑی سی سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں تمھیں نہیں معلوم اس سوٹ کیس کو لے کر کتنی بحث ہو رہی ہے، سیمینار ہو رہے ہیں۔ جہاں کا انڈر ورلڈ اس سوٹ کیس کو ہتھیانا چاہتا ہے اور امریکہ کا مافیا بھی اس میں دلچسپی دکھا رہا ہے۔ تم جانتے ہو دنیا میں کیا چل رہا ہے، اس لیے اس سوٹ کیس کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ میری بساط کیا ہے کہ میں سوٹ کیس حاصل کروں۔

لوک ناتھ نے مجھے کچا کر دیا تھا۔ میرے پروفیشن پر بھی لات جما دی تھی۔ اب وہ نقلی دارو بھی اتر گئی تھی۔ میں نے ایک بڑا سا

پیگ بنایا۔ آدھا ڈکار گیا۔ بھول گیا کہ نقلی رم پینے سے آدمی اندھا ہو سکتا ہے۔ اب مجھے اپنی رہی سہی عزت بچانی تھی۔ ایک سگریٹ سلگایا۔ دھواں لوک ناتھ کے منہ پر مارا۔ لوک ناتھ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے اسے سخت چڑ تھی۔ اور میں چاہتا بھی یہی تھا۔

اچھا ایسا کرو، ایک ڈپلیکیٹ بنوالو۔

اب وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

ڈپلیکیٹ سے کام چل جائے گا کیا؟

مجھے اب ایک آئیڈیا سوجھا تھا تو میں اسے ہاتھ سے جانے نہیں دے رہا تھا۔

دیکھو، یہ تو تم مانتے ہو کہ ہم بھارت واسی پرمپرا کو بہت مانتے ہیں۔ دنیا کی ساری تباہیاں روز گزر رہی ہیں، یعنی عورتوں پر جبر ہوتے ہیں۔ اسٹوڈنٹس خود کشیاں کرتے ہیں، باڑھ سے لوگ بے گھر ہو جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ فساد ہوتے ہیں، بم پھٹتے ہیں، لیکن ہم اپنی پرمپرا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اور ہماری طاقت ہے سہن شیلتا، برداشت کرنے کا مادہ، اسی لیے ہمارا دیش مہان ہے۔

ودیارتھی جی! آپ کو دارو چڑھ گئی ہے، آپ بہک گئے ہیں۔

بالکل نہیں! آپ غور سے سنیں۔

اب میں فارم میں آرہا تھا۔

دیکھیے، ہم بھارت واسیوں کو نقلی چیزیں کھانے کی عادت ہے، دارو نقلی پیتے ہیں۔ آئیس کریم میں بلاٹنگ پیپر کھاتے ہیں۔ دوائیں نقلی لیتے ہیں۔ دودھ میں پوڈر ملا ہوتا ہے۔ گھی اگر آپ اصلی کھالیں تو آپ کو دست لگ جائیں گے، یعنی ہم نقلی زندگی جیتے ہیں اور اسی کو اصلی مانتے ہیں اور اعلان کے ساتھ اپنی پرمپرا کا بکھان کرتے ہیں۔ تم ہرشد مہتا کا سوٹ کیس اپنی گلی کے کاریگر سے بنواؤ، بنک کا مینیجر اس کو اصلی سمجھے گا۔ اور تمہارا دو لاکھ کا لون فوراً SANCTION ہو جائے گا۔

میری بھوشیہ وانی، آکاش وانی ثابت ہوئی جب لوک ناتھ پندرہ پرسنٹ کی رقم لے کر بینک میں داخل ہوا تو سارے کرم چاری درشنوں کو آئے۔ انھوں نے سر جھکا کر، ہاتھ جوڑ کر سوٹ کیس کو پرنام کیا۔ کچھ لوگوں نے نمسکار کرتے ہوئے سکے بھی چڑھائے، جو بعد میں لوک ناتھ کے بہت کام آئے۔

لوک ناتھ مینیجر کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں مینیجر ایک نئی شکل لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد نئے مینیجر نے بتایا کہ پچھلے مینیجر کا ہاتھ بینک اسکیم (SCAM) میں تھا۔ پورا ہاتھ نہیں تھا، جیسے انگلی ہی تھی کیوں کہ گھپلا صرف دو کروڑ کا تھا لیکن وہ روپیہ جو آپ کی امانت تھی اس میں خیانت پڑ چکی ہے۔ اس نے ایک کاغذ اٹھایا اور پڑھنے لگا۔ اس کی آواز بھاری ہو گئی، گلا بھر آیا۔ لسٹ میں بہت سی لون Applications تھیں۔ ایک بیوہ کو سلائی کی مشین کی ضرورت تھی۔ ایک سردار جی ٹیکسی ڈالنا چاہتے تھے۔ ایک آدمی کے جھونپڑے کو آگ لگادی گئی تھی۔ ایک ودیارتھی فارن پڑھائی کے لیے جانا چاہتا تھا۔ غرض کہ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض کے لیے مانگی گئی تھیں۔ ساری رقم کہیں اور پہنچ گئی تھی۔ بنک کی تجوری اب خالی ہو چکی تھی۔ اگر لوک ناتھ اپنے پندرہ پرسنٹ جمع کرادیں تو نئے سرے سے بنک کا کاروبار چل سکتا ہے۔

لوک ناتھ جب مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے آیا تو وہ بہت خوش خوش تھا۔ آخر اس کا بھارتیہ کرن ہو گیا تھا۔ اس نے یہ راز پالیا تھا کہ اس مہان دیش میں کوئی دیانت داری کا کام نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۴۷ سے ہماری پرمپرا یہی رہی ہے کہ دھوکے سے کیا ہوا کام ہی راس آسکتا ہے۔ نقلی

مظہر الزماں خاں

آخری داستان گو

(سلسلہ وار مکمل کہانیاں)

ہوا میں ہلکی سی خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ تاہم پورے آسمان پر ستارے پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ سب الاؤ کے گرد بیٹھے سانپ ڈسے آدمی کو بیدار رکھنے کے لیے اپنی اپنی کہانیاں سنا رہے تھے۔ شہرزاد پودے کے قریب بیٹھی زمین کرید رہی تھی کہ معاً سگریٹ والے آدمی نے ایک کہانی نگار کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے کہانی شروع کر دی۔

"رات ابھی شروع ہوئی تھی۔ وہ دونوں فوجی اپنے کیمپ میں بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ دونوں جنگ کے محاذ سے بس دو دن پہلے لوٹے تھے۔ دونوں طرف کی لاشیں ابھی اٹھائی جا رہی تھیں کہ لاشیں اٹھانے کا کام دنیا کا سب سے پرانا کام ہے۔ اور دونوں فوجی جو شاید ہم وطن تھے۔ بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ دفعتہً ایک زخمی کبوتر پھڑپھڑاتا ہوا کیمپ میں ان کے ٹیبل کے قریب آگرا۔ دونوں فوجیوں نے کبوتر کی طرف دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے کسی شکاری کی زد سے بچ کر نکل گیا ہے۔"

"مگر اب ہماری غذا بن جائے گا۔" ایک فوجی نے کہا۔ "شراب کے ساتھ پرندے کا گوشت بہت مزا دیتا ہے۔"

"نہیں یار! دوسرا بولا۔ اتنا سا ہے خواہ مخواہ ہلاک کرنے سے کیا فائدہ۔ زخم بھی زیادہ گہرا نہیں ہے۔ بس گردن کے پاس سے تھوڑا سا خون بہہ رہا ہے۔"

"اس کا اتنا سا خون پوری جنگ میں بہنے والے خون سے کہیں زیادہ ہے۔"

"مر جائے گا تو بیکار چلا جائے گا۔ پہلے فوجی نے کہا۔"

"نہیں! دوسرا بولا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ تھوڑی سی شراب اگر پلا دی جائے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ! اسے شراب پلا کر دیکھیں اور دونوں اٹھے اور کبوتر کی گردن پکڑ کر چمچہ چمچہ شراب اس کے اندر اتارنے لگے۔ اور جب چند چمچے شراب اس کے اندر پہنچ گئی تو دونوں فوجی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "ایک پیگ کا نشہ ہے یہ دنیا۔ زخم کی ٹیس کو وقتی طور پر کم کرنے کے لیے ایک چھوٹا سہارا۔ بس!"

"اور دنیا ایک چٹکی ہے کسی بچے کے گال یا ران پر لی ہوئی۔ یا پھر ایک جھینگر ہے اداس جنگل میں کسی نامرد کی جھنک! خیر چھوڑو۔ اس کبوتر کی طرف دیکھو۔ اور دونوں کبوتر کی طرف دیکھنے لگے۔ جو آہستہ آہستہ اپنے پنجوں پر کھڑے رہنے کی کوشش میں اپنے

دونوں بازو زمین پر مار کر اٹھ رہا تھا۔ گر رہا تھا۔ گر رہا تھا۔ اٹھ رہا تھا تمام انسانوں کی طرح۔ آخر چند لمحوں کی جدو جہد کے بعد وہ اٹھا اور پھراڑ کر باہر نکل گیا تو دونوں فوجیوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم سب کے سب اس پرندے ہی کی طرح ہیں۔ اور ہمارے اندر کے زخم اب دلدل بن چکے ہیں۔ اور ان گنت پرندے ان دلدلوں میں پھڑپھڑا رہے ہیں کہ پروجیکٹر پر ہماری کہانیوں پر بنی فلمیں ابھی چل رہی ہیں گو کہ انٹرول ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے کہ پوری زمین ایک اسکرین ہے۔"

"ہوں! دوسرے فوجی نے کہا! "یار و میں نے ایک بڑا عجیب خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑے میدان کے چاروں طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ کانٹے دار جھاڑیاں اور ہر کانٹے پر ایک آنکھ تھی۔ اور میدان کے اوپر ان گنت گدھ منڈلا رہے تھے اور میدان کے بیچوں بیچ ایک ننگ دھڑنگ نومولود انسانی بچہ زمین پر اوندھا پڑا مسلسل روئے جا رہا تھا۔"

خواب سنا کر وہ چپ ہو گیا تو دوسرے نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "آج میرے گھر سے خط آیا ہے کہ میری بیوی کا حمل ساقط ہو گیا ہے۔" دفعتہ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ....

کہانی کار نے ہچکی لی۔ سانپ ڈسے آدمی کی طرف دیکھا اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

O O O O O O O

ص. ۹۰ سے آگے

زندگی ہی صحیح زندگی ہے۔ اب اس نے کپڑے بنانے کی ریڈی میڈ فیکٹری بند کر دی ہے اور بر شد بھتا سوٹ کیس کی فیکٹری شروع کر دی ہے۔ اس کا خواس ہے کہ جب تک یہ سرکار رہے گی، اس سوٹ کیس کی کھپت رہے گی۔ میں نے اسے اس فیصلے کی بدھائی دی اور گاڑی میں بیٹھ کر اس مہانگر کی طرف چل پڑا جہاں شیو سینا راج کرتی ہے۔

.....OOOO......

سلسلہ ۵۶ سے آگے

زمانہ تھا جب دونوں راج دھانیاں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک ہی اسٹیشن سے نکلا کرتی تھیں۔ ٹرین میں رش نہیں تھا۔ دن بھر کی کشاکش کے بعد یہ اتنے تھک گئے تھے کہ ایک برتھ پر ٹانگیں پھیلا کر آرام سے سو گئے۔

صبح جب آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ جناب بڑودہ پہنچ گئے ہیں، شادی اس دن شام میں تھی۔ شادی کی گھڑیاں قریب آ رہی تھیں اور ہمارے دوست ملک کے مغرب میں، منزل مقصود سے کوسوں دور۔

پورب پورب ہے اور پچھم پچھم (East is east and west is west) ن ۰ان کرنے لگے تھے۔ قریب تھا کہ وہ ہونے والی بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھتے کہ کسی نیک انسان کی بروقت، برجستہ، برملا مدد سے بمبئی پہنچنے پر انہیں کلکتہ کے ہوائی جہاز میں سیٹ مل گئی اور یہ زندگی میں پہلی بار بروقت خود اپنی شادی میں شریک ہو سکے۔

شادی کی جائے واردات پر پہنچتے ہی ان کے لبوں پر مشہور انگریزی فلم My fair lady کا یہ نغمہ تھا:

But take me to the church on time!

انتونیو تبوکی

ترجمہ قدیر زماں

طائران فراانجیلکو

[فراانجیلکو اٹلی کا مشہور پینٹر گزرا ہے۔ اس کا دور حیات ۱۳۸۷ء تا ۱۴۵۵ء ہے۔ وہ رنگ آمیزی کے فن کا ماہر تھا۔ اس نے خاص طور پر روم اور فرانس کے کلیساؤں میں پینٹنگس کی تھیں۔ وہ خود سینٹ ڈومینک (۱۱۷۰ء تا ۱۲۲۱ء) کے قائم کردہ تنظیم کا ایک رکن تھا جس میں راہبانہ طرز زندگی کا رواج تھا۔ اس کے راہب بننے کے بعد لوگوں نے اسے فراگیوانی کے نام سے یاد کیا۔

کہانی کار انتونیو تبوکی اٹلی کا ایک مشہور ادیب ہے۔ ابھی حیات ہے۔ ڈسمبر ۱۹۹۴ء میں حکومت اٹلی نے ساہتیہ اکاڈمی دلی کے تعاون سے فن ترجمہ پر ایک کانفرنس منعقد کی تھی۔ اس کہانی کے اقتباسات کانفرنس میں پیش کیے گئے تھے اور فن ترجمہ پر بحث کی گئی تھی۔ مترجم]

جون کا مہینہ ختم ہونے کو تھا۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ شام کی عبادت کے لیے گرجا گھر میں تمام راہب جمع تھے۔ اتنے میں کہیں سے ایک مخلوق آپہنچی۔ فیسول کا فراگیوانی ابھی بھی اپنے کو گیواڈولینی ہی سمجھتا تھا۔ یہی نام تو اس نے اپنی گوشہ نشینی کے بعد دنیا میں چھوڑا تھا۔ وہ ترکاری کے باغ میں پیاز چن رہا تھا۔ یہ اس کا پیشہ تھا۔ تاریک الدنیا ہو کر اس نے اپنے باپ پیٹرو کے پیشے کو خیرباد کرنا نہ چاہا تھا۔ سان مارکو کے اس باغ میں وہ ٹماٹر، گاجر اور پیاز اگاتا رہا۔ پیاز کا رنگ سرخ تھا اور اس کے ڈلیاں بڑی بڑی ہوتی تھیں۔ انھیں گھنٹہ بھر بھگوئے رکھو تو سوندھے ہی سوندھے ہو جائیں اگرچہ انھیں تراشتے ہوئے آدمی رو پڑے۔ انھیں اکٹھا کرتے ہوئے وہ اپنی قمیض کو ایپرن کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ تب اس نے ایک آواز سنی۔ کوئی اسے بلا رہا تھا۔ گیواڈولینی۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں تو دیکھا کہ ایک پرندہ ہے۔ پیاز تراشنے کے سبب اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اسی حالت میں وہ کھڑے کھڑے پرندے کو گھورتا رہا۔ آنکھوں میں پانی کے تیرنے کی وجہ سے پرندے کی شکل مسخ ہو کر بڑی جسامت کی لگ رہی تھی جیسے وہ اسے کسی انوکھے عدسے کی مدد سے دیکھ رہا ہو۔ اس نے پلک جھپک کر اپنی آنکھوں کو خشک کیا۔ پھر دوبارہ نظریں اٹھائیں۔ وہ ایک گلابی رنگ کا پرندہ تھا۔ بڑا ہی ملائم، دبلا پتلا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے زردی مائل پنکھ کسی چھلے ہوئے مرغ جیسے پنکھ تھے۔ اس کے پاؤں پتلے پتلے لیکن جوڑوں میں ابھرے ہوئے۔ دونوں پنجے چینی مرغی کے پنجوں جیسے سخت کھردرے، چہرہ کسی بڑی عمر کے بچے کی طرح صاف شفاف، دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، بالوں کی جگہ بھورے رونگھٹے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ پرندہ اپنے تھکے ہوئے پنکھوں کی حرکت کو روکنے سے قاصر ہے جیسے اڑنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ اڑنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ ناشپاتی کے درخت کی پیچ دار شاخوں میں اٹک گیا۔ ناشپاتی کا موسم تھا۔ اس کے پروں کی حرکت سے کوئی نہ کوئی ناشپاتی زمین پر ٹپ سے گر پڑتی۔ وہ دیر تک مصیبت میں پھنسا وہاں لٹکا رہا۔ دونوں پاؤں دو شاخوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ اس کے جوڑوں پر دباؤ پڑ رہا تھا۔ اس کا دھڑ ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ گردن دوسری طرف مڑی ہوئی ورنہ وہ اوپر کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوتا۔ دونوں پنکھ درخت پر اس طرح پھیلے

تھے جیسے تکون بادبان ہوں۔ ہوا میں پتوں کے ساتھ اس کے پر بھی ہلنے لگے۔ پر رنگ برنگے تھے۔ گیروا، زرد، گہرے نیلے، دمبو ہنیا کے پودا جیسا گہرا سبز رنگ۔ وقفے وقفے سے وہ کسی پنکھے کی طرح کھلتے اور بند ہوتے۔ پھر آناً فاناً سمٹ جاتے اور ایک دوسرے کے پیچھے غائب ہو جاتے۔

فراگیوانی نے اپنی آنکھیں ہاتھوں کی پشت سے خشک کیں اور کہا۔ کیا تم نے مجھے بلایا تھا۔

پرندے نے اپنا سر ہلایا اور شہادت کی انگلی اس کی طرف کرتے ہوئے اسے حرکت دی۔

مجھے؟ فراگیوانی نے حیرت سے پوچھا۔

پرندے نے دوبارہ سر ہلایا۔

کیا خود میں نے اپنے آپ کو بلایا ہے؟ فراگیوانی کہہ اٹھا۔

اس دفعہ پرندے نے اپنی آنکھیں بند کیں اور دوبارہ انھیں کھولا۔ جیسے پھر سے ہاں کہہ رہا ہو۔ یا شاید تھکن کی وجہ سے کچھ کہنا اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ آپ اس کے چہرے کو اور اس کی آنکھوں کے اطراف بنے ہوئے حلقوں کو دیکھ کر بتا سکتے تھے۔ فراگیوانی نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہے۔ اس پر پسینے کی بوندیں چمک رہی ہیں۔ اگر چہ کہ بہہ نہیں رہی تھیں۔ شام کے وقت کی ہواؤں میں وہ تحلیل ہو رہی ہیں اور پھر سے ابھر رہی ہیں۔ فراگیوانی نے اس کی طرف دیکھا۔ اس پر رحم کھاتے ہوئے بڑبڑایا۔ "تم بہت تھک چکے ہو۔" پرندے نے اپنی غم ناک آنکھوں سے پلٹ کر دیکھا۔ آنکھیں موند کر پروں کو جھٹکا۔ ایک زرد، ایک سبز اور دو نیلے پر زمین پر گر پڑے۔ مسلسل تین بار ایسا ہوا۔ فراگیوانی اس کا مطلب سمجھ گیا اور آہستے سے کہنے لگا۔ "تم نے بڑا لمبا سفر کیا ہے۔" پھر اس نے سوال کیا۔ "تم جو کچھ کہتے ہو اسے میں کیوں سمجھ لیتا ہوں؟"

پرندے نے اپنے پیر جہاں تک پھیل سکتے تھے پھیلائے جیسے کہنا چاہتا ہو۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ تب فراگیوانی سمجھ گیا۔ "ظاہر ہے میں تمھیں سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ میں تمھیں سمجھتا ہوں۔" پھر اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ "درخت سے اترنے میں اب میں تمھاری مدد کروں گا۔"

باغ کے کونے میں چیری کے درخت سے لگی ایک سیڑھی رکھی تھی۔ وہاں پہنچ کر فراگیوانی نے اسے اٹھایا۔ پھر افق کے متوازی پکڑ کے اسے اپنے کاندھوں پر اس طرح رکھا کہ درمیان سے خود اس کا سر ابھر آیا۔ اس کے بعد اس سیڑھی کو وہ ناشپاتی کے درخت تک لے گیا اور اس کے آخری سرے کو اس طرح رکھا کہ پرندے کے پاؤں اس تک پہنچ سکیں۔ سیڑھی پر چڑھنے سے قبل اس نے اپنی قمیض اتار دی اور اسے کنویں کے کنارے سدا بہار کی جھاڑی پر ڈال دیا کیوں کہ قمیض کا دامن سیڑھی پر چڑھنے میں رکاوٹ پیدا کر رہا تھا۔ سیڑھی پر چڑھتے ہوئے اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا جو بہت پتلے اور سفید تھے۔ ان پر ایک بھی بال نہ تھا۔ اسے لگا اس کے اپنے پاؤں پرندے کے پاؤں جیسے ہیں۔ وہ مسکرایا کیوں کہ مماثلت انسان کو اکثر مسکرانے پر مجبور کرتی ہے۔ جیسے ہی وہ سیڑھی پر چڑھنے لگا اسے محسوس ہوا کہ اس کا عضو مخصوص انڈر ویر سے باہر نکل آیا ہے اور پرندہ حیرت و خوف سے اسے گھور رہا ہے۔ فراگیوانی نے اپنا انڈر ویر ٹھیک کیا اور کہنے لگا۔ "مجھے معاف کرو یہ ایک شئے، ہم انسانوں کے پاس ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک لمحے کے لیے اسے نرینا کا خیال آیا جو کئی سال قبل سینا کے فارم ہوز پر اسے ملی تھی۔ ایک سنہرے بالوں والی لڑکی سوکھے گھاس کے انبار پر۔ پھر اس نے کہا کبھی کبھی ہم انسان اسے بھلانے میں کامیاب ہو جاتے

ہیں لیکن اس کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اوپر آسمان پر منڈلاتے بادلوں کا تصور بھی ضروری ہے کیوں کہ انسان کا بدن وزنی ہوتا ہے اور ہمیشہ زمین کی طرف کھنچتا رہتا ہے۔

اس نے پرندے کو اس کے پاؤں سے پکڑا۔ اسے ناشپاتی کی ان شاخوں سے آزاد کیا جہاں وہ اٹکا ہوا تھا۔ اس کے پروں کو سمیٹا اور اسے اپنی پیٹھ پر لاد کر اس کے سر کو درختوں کی ڈالیوں سے بچاتا ہوا زمین پر لے آیا۔

عجیب مضحکہ خیز پرندہ تھا۔ وہ ٹھیک سے چل نہیں رہا تھا۔ زمین کو چھوتے ہی وہ لڑکھڑانے لگا اور ایک طرف کو لڑھک گیا پھر ہوا میں پاؤں ایسے مارنے لگا جیسے بیمار مرغ مارتا ہو۔ اس کے بعد ایک پکھوے پر لیٹ کر اس نے اپنے پیر پھیلا دیے۔ اور انھیں پن چکی کے پنکھوں کے طرح گھمانے لگا تاکہ وہ کھڑا ہو سکے۔ لیکن وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ تب فراگیوانی نے اس کے بغل میں ہاتھ دے کر اسے سمیٹا اور اپنی طرف کھینچا۔ جب وہ ایسا کر رہا تھا تو اس کے بے چین پر اوپر نیچے پھڑپھڑاتے ہوئے فراگیوانی کے چہرے کو مس کرنے لگے۔ وہ بالکل بغل کا حصہ تو نہیں تھا لیکن وہ اسے وہیں سے پکڑا اور لٹکا کر اس طرح چلنے لگا جیسے کسی چھوٹے بچے کو چلا رہا ہو۔ جب وہ دونوں چل رہے تھے تو پرندے کے پر اس طرح کھلتے اور بند ہوتے رہے کہ ان کی مخصوص زبان کو فراگیوانی سمجھ گیا۔ اس نے پوچھا تھا۔ "یہ کیا ہے۔" فراگیوانی نے جواب دیا "یہ زمین ہے۔ یہ زمین ہی ہے۔" باغ میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے وضاحت کی کہ یہ مٹی اور ڈھیلوں سے بنی زمین ہے جس پر ٹماٹر گاجر اور پیاز جیسے پودے لگتے ہیں۔ جب وہ دونوں حجرے کی کمانوں تک پہنچے تو پرندہ اڑ گیا۔ اس نے اپنے پاؤں زمین میں دھنسا لیے اور آگے جانے سے انکار کر دیا۔ فراگیوانی نے اسے گرانائٹ پتھر سے بنی بنچ سے ٹیکا لگا کر بٹھا دیا اور کہا وہ انتظار کرے۔ پرندہ بنچ سے لگا نیم خواب آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہوا وہاں ٹھیرا رہا۔

وہ حجرے کے اندر جانا نہیں چاہتا۔ فراگیوانی نے فادر سوپیریر سے کہا۔ وہ کبھی اندر نہیں رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اندر اسے ڈر لگتا ہے۔ کھلے آسمان کے بغیر اس کے پاس جگہ کا کوئی تصور نہیں ہے اور وہ جیومیٹری کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔" فراگیوانی نے مزید کہا کہ صرف وہی اس پرندے کو دیکھ سکتا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔ فادر سوپیریر چوں کہ فراگیوانی کا دوست ہے اس لیے اگر توجہ دے تو صرف وہ اس کے پروں کی سرسراہٹ کو سن سکتا ہے۔ پھر اس نے پوچھا۔ "کیا تم سن رہے ہو۔" اور پھر کہا کہ پرندہ راستہ بھول گیا ہے اور کسی طرح گھوم گھام کر یہاں تک پہنچا ہے۔ وہ کل تین پرندے تھے جو راستہ بھول گئے تھے۔ پرندوں کا یہ چھوٹا قافلہ اپنی ڈار سے بچھڑ گیا۔ پھر بلا مقصد وہ آسمانوں میں گھومتے رہے۔ پُر اسرار راہوں پر۔ اب یہ ایک ناشپاتی کے درخت پر گر پڑا۔ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا کہ اب ہمیں چاہیے کہ اسے رات بھر کے لیے آسرا دیں تاکہ وہ پھر سے خلاؤں میں کھو جائے۔ جب اندھیرا ہوتا ہے تو اس مخلوق کو کوئی طاقت اوپر کی طرف کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے۔ یہی تو اس کی فطرت ہے۔ اگر اسے روکا نہ جائے تو وہ ابتر کی طرح آسمانوں میں قلا بازیاں کھاتا رہے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ایسا ہونے نہ دیا جائے۔ اس خانقاہ میں پرندوں کی مہمان نوازی ہمارا فرض ہے کیوں کہ یہ پرندہ تو ایک زائر ہے۔

فادر سوپیریر نے ہاں کی۔ پھر اس نے پرندے کو آسرا دینے کے لیے مناسب جگہ کے بارے میں سوچا۔ کھلی جگہ بہتر ہوگی لیکن اسے کسی طرح رفعتوں کی تلاش کی شدت خواہش سے بچانا بھی ضروری تھا اب انھوں نے وہ چال نکالا جو ترکاریوں کو خار پشتوں اور گورموشوں

سے بچانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے فٹبول کے باسکٹ بنانے والے ماہرین نے سن کی ڈوریوں سے بنا تھا۔ جال کو انھوں نے چاروں کھمبوں پر پھیلا دیا اور ترکاری کے باغ کی منڈیروں سے اسے جوڑ دیا۔ کھلا چھپر تیار ہو گیا۔ مٹی کے ڈھیلے پرندے کے لیے حیران کن تھے۔ انھوں نے ان پر گھاس کی ایک تہہ بچھا دی اور اس پر پرندے کو چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر اپنے منحنی جسم کو اس نے ادھر ادھر کیا۔ پھر ایک کروٹ ہو کر لیٹ گیا۔ اسے بے حد سکون اور آرام ملا۔ آسمان کی سیر سے جو تھکن ہوئی تھی اس کو دور کرتا ہوا وہ فوراً گہری نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر سارے راہبوں نے اپنے اپنے خواب گاہوں کی راہ لی۔

دوسری صبح جب فراگیوانی اپنے مہمان کی خبر گیری کے لیے وہاں پہنچا کہ وہ ٹھیک سے سویا یا نہیں تو تب ہی دوسرے دو پرندے وہاں آپہنچے۔ صبح کی ہلکی گلابی شفق کی روشنی میں اس نے انھیں نیچے اترتے دیکھا۔ وہ دونوں اپنی اڑان کی بلندی قائم رکھنے کی کشمکش میں حواس باختہ تھے۔ خوف سے وہ اس طرح آڑے ترچھے ہو رہے تھے کہ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ باغ کے منڈیروں سے ٹکرا نہ جائیں۔ لیکن وہ بال برابر بچ نکلے اور غیر متوقع طور پر پھر ایک اڑان لی۔ ایک پرندے نے جو کابلی مکھی کی طرح تھا منڈلا کر پر پھیلائے اور منڈیر پر بیٹھنا چاہا۔ تھوڑی دیر اس کی ٹانگیں منڈیر پر اس طرح پھیلی رہیں جیسے وہ زمین پر کسی ایک طرف کو لڑھک جانا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اپنے سر کے بل گلاب کی کیاریوں کی طرف گر پڑا۔ اسی اثنا میں دوسرا پرندہ مرغولے کھاتا ہوا دوہرے لوپ کی طرح نظر آنے لگا۔ ایسے ہی جیسے کوئی بازی گر شعبدہ بازی میں ایک عجیب طرح کے گولے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہ پرندہ تھا بھی گول مٹول۔ اس کا نچلا دھڑ غائب، پستہ قد ایک پودے جیسا، دم موٹی اور سبزی مائل برش جیسی۔ اس پر بال کسی پنکھے پر سجائے کنگوروں کی طرح تھے اور جو بہ یک وقت پتوار کا کام بھی کر رہے تھے۔ وہ ایک گولے کی طرح گوبھی کی روش پر گر پڑا۔ دو یا تین بار اس نے قلابازیاں کھائیں۔ اس کی ہیئت اور اس کا سبزی مائل رنگ بتا رہے تھے کہ وہ بھی گوبھی کے پھولوں میں کا ایک بڑا پھول ہے۔ دوسروں سے ذرا بڑا اور چہل کرتا ہوا۔ اسے فطرت کی دین کہیے۔

تھوڑی دیر تک فراگیوانی فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ کس پرندے کی مدد پہلے کرے۔ پھر اس نے کابلی مکھی جیسے پرندے کا انتخاب کیا کیوں کہ اسے مدد کی فوری ضرورت تھی۔ اس کا سر گلاب کے پودوں میں دھنسا ہوا تھا۔ ایک پاؤں اوپر کی طرف معلق ہلتا ہوا جیسے وہ مدد کے لیے بلا رہا ہو۔ جب وہ اسے وہاں سے نکالنے گیا تو اسے لگا کہ یہ وہ کابلی مکھی جیسا بڑا پرندہ ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ اسے دیکھ کر کچھ ایسا ہی تصور قائم ہوا۔ یا یہ کہ وہ ایک بڑے ٹڈے کی طرح تھا۔ بالکل ویسا ہی دکھائی دیا۔ لمبا اور پتلا۔ سوکھی لکڑی کی طرح لاغر۔ اعضا ایسے کہ آپ انھیں چھونے سے گھبرائیں کہ کہیں سے ٹوٹ نہ جائے۔ مٹا ہوا، سبز رنگ۔ دیکھنے میں جوار کے تنے طرح جو ابھی سوکھا نہ ہو۔ اس کا سینہ بھی گھاس کے ٹڈے کے سینے کی طرح چپٹا نما۔ نوکدار جس پر ذرہ برابر گوشت نہ ہو۔ صرف ہڈی اور چمڑا۔ سنہرے پنکھ۔ بدن پر مہین، ملائم اور چمکتے ہوئے بال ایسے ہی جیسے اس کے سر پہ تھے۔ بالکل ویسے نہ سہی۔ اس کے جسم کی حالت بھی عجیب تھی۔ سر نیچے اور بالوں کی وجہ چہرہ چھپا ہوا۔

فراگیوانی نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور اس کے چہرے پر سے بال ہٹائے۔ پہلے اسے دو بڑی آنکھیں دکھائی دیں۔ پانی کی طرح بے رنگ اور حیرت سے گھورتی ہوئی۔ اس پر اس کا پتلا سا خوبصورت چہرہ۔ جلد سفید اور گال سرخ۔ کسی عورت کے چہرے کی طرح کیوں کہ اعضا نسوانی تھے اگرچہ کہ اس کا ڈھانچہ ایک کیڑے کی مانند تھا۔ "تم نرسنا جیسے ہو۔" فراگیوانی نے کہا۔ ایک لڑکی جسے میں کبھی جانتا تھا۔ اس کا نام نرسنا تھا۔ یہ کہہ کر وہ گلاب کی ڈالیوں سے پرندے کو آزاد کرانے لگا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا کوئی

عضو ٹوٹ نہ جائے۔ خاص طور پر اس کا وہ پنکھ جو بالکل کابلی مکھی کے پنکھ ہی جیسا تھا۔ ذرا بڑا، سڈول اور شفاف، نیلگوں، گلابی اور سنہرے رنگ کا۔ جس پر بنی باریک جالی کسی بادباں کے مشابہہ تھی۔ اس نے پرندے کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا۔ وہ بہت ہی ہلکا پھلکا تھا۔ گھاس پھوس کے چھوٹے بنڈل سے زیادہ وزنی نہیں۔ باغ میں بنے راستے پر چلتے ہوئے فراگیوانی نے وہی باتیں دہرائیں جو ایک دن قبل اس نے پہلے پرندے سے کہی تھیں۔ یہی کہ یہ مٹی اور ڈھیلوں سے بنی زمین ہے اور اس پر ٹماٹر، گاجر اور پیاز جیسے پودے لگتے ہیں۔

اس نے اس پرندے کو بھی پنجرے میں مہمان پرندے کے ساتھ رکھا اور تیسرے ننھے پرندے کو لینے کے لیے بھاگا۔ وہ گول مٹول پرندہ کوبھی کے پودوں کے درمیان زخمی پڑا تھا۔ وہ ایسا گول گول بھی نہیں تھا۔ جیسا پہلے نظر آیا تھا۔ اب اس کا جسم صاف طور نظر آنے لگا تھا اس کی شکل بالکل لوپ جیسی تھی یا پھر انگریزی کے ہندسے آٹھ جیسی جسے درمیان میں کاٹا گیا ہو۔ ایک تو اس کے سینے کا حصہ تھا اور دوسرے اس کی دم۔ وہ کسی شیر خوار بچے سے بڑا نہ تھا۔ فراگیوانی نے اسے اٹھایا اور زمین اور مٹی کے ڈھیلوں کے بارے میں اپنے خیالات دہراتا ہوا اسے پنجرہ کے پاس لے گیا۔ جب دونوں پرندوں نے تیسرے پرندے کو آتے ہوئے دیکھا تو وہ خوشی کے مارے ناچنے لگے۔ فراگیوانی نے اس گول گول پرندے کو بھی ان کے پاس گھاس پر رکھا اور حیرت سے ان تینوں کو تکنے لگا۔ وہ ایک دوسرے کو بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آپس میں اپنے پاؤں ٹکرا رہے تھے ایک دوسرے کو چاٹ رہے تھے۔ یکجا ہونے کی مسرت میں باتیں کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے پروں سے ہنس رہے تھے۔

صبح کی شفق غائب ہوئی۔ دن چڑھ آیا۔ سورج کی تمازت بڑھ گئی تو فراگیوانی کو فکر لاحق ہوئی کہ گرمی سے پرندوں کی جلد جھلس جائے گی۔ پرندوں سے پوچھا کہ انھیں کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں۔ اس نے کہا کہ وہ کسی طرح کا تکلف نہ کریں اور کسی بھی ضرورت پر اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر اسے بلالیں۔ یہ کہہ کر وہ پیاز کھودنے کے لیے چلا گیا تاکہ دوپہر کے کھانے پر وہ اس کا سوپ بنا سکے۔

رات خواب گاہ میں کابلی مکھی اس کی مہمان ہوئی۔ فراگیوانی سو رہا تھا کہ اس نے پرندے کو اپنے کمرے میں اسٹول پر بیٹھے دیکھا۔ اسے خیال ہوا کہ وہ اچانک جاگ پڑا ہے حالاں کہ وہ جاگ ہی رہا تھا۔ چودھویں کی رات۔ چاند کی تیز روشنی چوکور کھڑکی سے ہوکر اینٹ کے فرش پر ایک مربع کی شکل میں دکھائی دے رہی تھی۔ فراگیوانی کو تلسی کے پودے کی تیز بو آئی۔ اتنی تیز کہ اسے سر میں درد کا احساس ہونے لگا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "کیا یہ تلسی کی بو تمھارے پاس سے آتی ہے۔" پرندے نے اپنی انگلیاں جو حیرت انگیز طور پر لمبی تھیں اپنے منہ پر رکھ لیں جیسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا ہو۔ پھر وہ قریب آیا اور اسے گلے لگالیا۔ رات کا سماں اور تلسی کی بو۔ اس پر یہ بے رونق چہرہ اور لمبے بال۔ فراگیوانی کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے کہا "زرینا۔ کیا تم ہی ہو۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔" پرندہ مسکرایا اور وہاں سے جانے سے قبل اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر کہنے لگا۔ کل تم ہمیں پینٹ کروگے۔ اسی لیے تو ہم تمھارے پاس آئے ہیں۔

فراگیوانی ہمیشہ کی طرح صبح سویرے اٹھا اور عبادت کے بعد سیدھا پنجرے کی طرف گیا جہاں پرندے تھے۔ اس نے پہلا ماڈل منتخب کیا۔ کچھ ہی دن قبل خانقاہ کے تیسویں حجرے میں اس نے اپنے ساتھی راہبوں کے ہمراہ حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کا منظر پینٹ کیا تھا۔ اس نے اپنے مددگاروں سے کہا تھا کہ پس منظر میں گیروے، سیاہ اور شنگرفی رنگوں کو ملا کر رنگ بھرا جائے کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ ان رنگوں کی آمیزش سے بی بی مریم کے اس یاس و حسرت کے منظر کو پیش کرے جس میں وہ خوف زدہ ہوکر اپنے مصلوب ہوتے ہوئے بیٹے کی طرف

انگلی سے اشارہ کر رہی ہیں۔ لیکن اب تو اس کے پاس یہ گول گول پرندہ تھا جس کی دم پر کسی موہوم سے شعلے کا گمان ہوتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کنواری مریم کے غم کو ہلکا کرنے کے لیے اور یہ بتانے کے لیے کہ خدا کی مرضی ہی ان کے بیٹے کے سولی پانے کا سبب ہے وہ چند ملکوتی روحوں کو پینٹ کرے گا۔ ان ہی ملکوتی روحوں نے آسمانی حکم کے مطابق حضرت عیسیٰ کے ہاتھوں اور پیروں میں کیلیں گاڑدی تھیں۔ تب وہ پرندے کو حجرے میں لے گیا۔ اسے اسٹول پر پیٹ کے بل اس طرح بٹھایا کہ وہ اڑان کے لیے تیار دکھائی دیتا ہو۔ پھر اس نے صلیب کے سروں پر اسے اسی شکل میں پینٹ کیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں ایک ہتھوڑا بنایا جیسے وہ کیلیں ٹھونکنے والا ہو۔ وہ تمام راہب جنھوں نے حجرے کی دیواروں پر تصویریں بنائی تھیں اس کے کام کو دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ کس ناقابل یقین پھرتی سے اس نے برش چلا کر صلیب کے سائے تلے اس عجیب وغریب پرندے کو جیتا جاگتا پیش کر دیا ہے۔ وہ سب کے سب ایک ساتھ پکار اٹھے۔ واہ!

اس طرح پینٹ کرتے کرتے فراگیوانی کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہ کھانا پینا سب بھول گیا۔ استرکاری پر اس نے ایک اور تصویر بنائی۔ چونتیسویں حجرے میں جہاں پہلے ہی دیوار پر اس نے ایک اور تصویر بنائی تھی اور حضرت عیسیٰ کو باغ میں عبادت کرتے دکھایا تھا وہیں پر اس نے ایک اور تصویر کا اضافہ کیا۔ پینٹنگ کا کام پورا ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی جگہ خالی نہ تھی لیکن اس نے درختوں کے اوپر سیدھی جانب کونے میں تھوڑی جگہ ڈھونڈلی اور وہاں کابلی مکھی کو پینٹ کیا۔ اس کا چہرہ نرینا جیسا بنایا۔ پروں کو آئینے کی طرح شفاف اور سبز رنگ کا رکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ دیا کہ وہ حضرت عیسیٰ کو پیش کرے۔

اس کام کی تکمیل کے بعد اس نے اس پرندے کو پینٹ کیا جو سب سے آخر میں پہنچا تھا۔ اس کے لیے اس نے پہلی منزل کی کاریڈار کی دیوار منتخب کی۔ اس لیے کہ وہ ایک ایسی دیوار چاہتا تھا جو دور ہی سے نظر آسکے۔ پہلے اس نے ایوان خانے کو پینٹ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر کے کورنتھی کھمبوں اور ستونوں کے آخری سروں کو۔ آخر میں اس نے پرندے کو اس طرح بنایا جیسے وہ عبادت کے لیے گھٹنے زمین سے ٹیک کر کھڑا ہو۔ بیچ کی طرف جھکا ہوا تاکہ وہ گر نہ پڑے۔ دونوں ہاتھ سینے پر تعظیم سے ایک پر ایک رکھے ہوئے۔ پھر اس نے کہا "میں تم پر گلابی رنگ چڑھاؤں گا کیوں کہ تم بہت ہی بدہیئت ہو۔ کنواری مریم کو میں کل بناؤں گا۔ آج دوپہر تم رک جاؤ۔ اس کے بعد سب کے سب جاسکتے ہیں۔ میں اب حضرت عیسیٰ کی بشارت کا منظر پینٹ کرنے والا ہوں۔

شام تک اس نے کام ختم کیا۔ رات ہونے لگی تو اس نے تھکن محسوس کی۔ ساتھ ہی وہ غمگین بھی ہوا۔ یہ وہ غم تھا جو کسی کام کے پورا ہو جانے پر ہوتا ہے کہ اب کوئی اور کام باقی نہ رہا۔ وہ لمحہ گزر گیا تو وہ پنجرے کے پاس آیا۔ پنجرہ خالی تھا۔ صرف چار پانچ پر جال میں اٹکے ہوئے تھے۔ جو فیسول کے پہاڑوں سے آنے والی ہواؤں سے حرکت کر رہے تھے۔ فراگیوانی نے محسوس کیا کہ تلسی کی شدید بو آرہی ہے لیکن باغ میں تو تلسی کا کوئی پودا نہ تھا۔ وہاں تو پیاز ہی تھی جسے ایک ہفتہ قبل ہی استعمال کر لینا چاہیے تھا اور اب تو شاید وہ خراب ہو رہی تھی۔ جلد ہی وہ اس قابل نہ رہے گی کہ اس کا سوپ بنایا جاسکے۔ اس کے سڑنے سے پہلے ہی اسے نکال لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

○ ○ ○ ○ ○ ○

مردلا گرگ

ترجمہ: قاسم ندیم

بکھرتے خواب

سونما تالاب سے پانی بھر رہی تھی کہ اس نے دیکھا، وہی کل والے لوگ آج پھر آئے ہیں۔ وہی لمبی کالی گاڑی۔ وہ سانس روک کر عورت کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔ ایک جھک جھک سفید پوشاک پہنا ہوا آدمی کود کر اترا اور فوراً پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اتر گئی۔ گلے میں سونے کا موٹا ہار، ہاتھوں میں ڈھیر ساری سونے کی چوڑیاں، ایک ٹوکری بھر کالے بال سر پر، اور اس کی ساڑی، اتنی ملائم اور پتلی جیسے ہوا میں اڑتا ہوا بارش کا پہلا بادل ہو۔ ساتھ ہی آدمی بھی اتر آیا، ہاتھ میں وہی کل والا ڈبہ لیے ہوئے۔ کیا عجیب کپڑے پہنتی ہے، ہنسی آتی ہے۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے، اور سونما تھی کہ ادھر سے آنکھیں ہی نہیں ہٹا پا رہی تھی۔

کل آئے تھے تو سب مندروں میں گھومے تھے مگر جیسے اور دوسرے سیاح اور مسافر گھومتے ہیں ویسے نہیں۔ یہ تو ہر مورتی کے آگے سانس روک کر کھڑے ہو جاتے تھے، اور آدمی ڈبہ آنکھوں سے لگا لیتا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ بھی اس میں سے ایک بار دیکھے کہ اس میں سینما دکھائی دیتا ہے کیا؟ کیا ایک مرتبہ میلے میں اس نے دیکھا تھا۔ کیسے بولتا تھا وہ، آگرے کا تاج محل دیکھو، بارہ من کی دھوبن دیکھو، آؤ آؤ، کتنا مزہ آیا تھا۔ مگر فقیریا کہتا ہے یہ سینما نہیں ہے، کیمرہ ہے کیمرہ۔ بٹن دبانے سے فوٹو کھینچ آتا ہے۔ فقیریا اسکول میں کیا پڑھتا ہے اپنے آپ کو پرمیشور کا اوتار ماننے لگتا ہے۔ ساری صبح سونما ان کے پیچھے پیچھے گھومتی رہی اور جب سورج چڑھنے پر انھوں نے درگا مندر کے احاطے میں بیٹھ کر ٹوکری کھولی تو باپ رے اس کے منھ میں اتنا پانی آیا، اتنا پانی آیا کہ تھوکنا مشکل ہو گیا۔ کیا کیا سامان تھا اس میں۔ دہی چاول، املی چاول، پونگل، پوری، آلو بھاجی اور سفید سفید وہ کیا کہتے ہیں------ اس نے بازار میں کتنی ہی بار دیکھی ہے پر کھائی کبھی نہیں بریڈ! اور بھی نہ جانے کیا کیا تھا! ایک ہی دن میں، اک ہی وقت کوئی اتنا کھا سکتا ہے؟ اگر اسے ملے تو؟ ضرور کھا سکتی ہے مگر ملے گا کیسے؟ تبھی عورت نے اسے تاکتے ہوئے دیکھ لیا، اور وہ بھاگ کر تالاب پر جا پہنچی۔ اکیلی کیا وہی دیکھ رہی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے بچوں کا پورا جمگھٹ سارا دن دم کی طرح گھومتا رہا تھا۔ کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں تھا۔ کسی کے ہاتھ میں بریڈ، کسی کے ہاتھ میں کیلا، نہیں تو پوری اور بھی جانے کیا کیا؟ تبھی نا سب کے سب اما، اما پکار رہے تھے۔ کتنے بھلے لوگ ہیں۔ شانتما کہہ رہی تھی کہ ویرو کو تو اس نے ایک فاؤنٹین پین بھی لا کر دیا ہے۔ ویرو بھی اسکول میں پڑھتا ہے نا۔ بڑا چنٹ ہے، ذرا لاج شرم نہیں ہے اسے۔ جھٹ مانگ لیا اور اس نے لا بھی دیا۔ سچ رے شانتما بولی، جو مانگو وہی دے دیتی ہے۔ میں نے پوچھا تمھارے گلے میں کیا اصلی سونا ہے؟ تو بالکل پاس لا کر دکھا دیا۔ کیسے چم چم چمکتا ہے رے۔ اور ہے بھی کتنی خوب صورت۔ تو بھی مانگ لینا بریڈ------ روز روز تو کہتی ہے۔ اماں سے کہوں گی بریڈ لا دو۔

"مجھے نہیں چاہیے بریڈ فریڈ۔" اس نے جھڑک کر کہہ دیا۔ وہ جب سے تالاب سے ہو کر گئے ہیں، اس کا من جانے کیسا کیسا ہو گیا ہے۔

"تم لوگ کیا یہیں پانی پیتے ہو؟" اس نے پاس آکر پوچھا تھا۔

"ہاں اما۔" سونما نے ہنستی ہوئی آواز سے کہا تھا، چاہیے تمھیں، دوں؟"

نہیں نہیں، وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اور کچھ کہا نہیں تھا۔ مگر اس کے جسم سے نفرت بہہ نکلی تھی۔ چھی چھی

چھی۔۔۔۔کی آواز تالاب کے چاروں اور گونجنے لگی تھی۔

"ارے دیکھو نا، دھن کوبیر کی مورتی!۔ عورت نے ہاتھ بڑھا کر تالاب کے کنارے بنی مورتی دکھا کر کہا۔ لگتا ہے یہ تالاب بھی آنی ہول کے مندروں کے ساتھ ہی بنا ہو گا۔ پانچویں، چھٹی صدی میں۔۔

"یعنی ڈیڑھ ہزار سال سے یہاں کے لوگ اسی کا پانی پیتے آئے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھو، چھی، چھی۔۔۔۔۔، آدمی نے کہا۔

تو کیا ہوا؟ سبھی تو اس تالاب کا پانی لیتے ہیں۔ دادی کہتی تھی، وہ بھی بچپن میں پانی یہیں سے بھرتی تھی۔ اس نے بتایا تھا، یہ موٹے پیٹ والی مورتی دھن کوبیر کی ہے۔ وہ دھن کی حفاظت کرتے ہیں۔ دھن کیا ہوتا ہے، اس نے پوچھا تھا۔ یہی سونا، چاندی، پر یہاں تو سونا چاندی نہیں ہے۔ ارے پانی کیا کسی دھن دولت سے کم ہے۔ دادی نے کہا تھا۔۔۔ ہاں رے، ٹھیک تو ہے۔ تالاب کے پانی کی حفاظت کر رہے ہوں گے۔ جو بھی ہو، اسے بہت پسند ہیں۔ گول گول منھ، گول مٹول پیٹ اور اسے دیکھ کر ہنسی سے پیٹ پھول جائے۔ کتنی مرتبہ پانی بھرتے بھرتے وہ اس کے سامنے کھڑی ہو کر ہنستی رہتی ہے اور وہ بھی ہنستے ہیں مگر چپ چاپ۔ آخر دیوتا جو ٹھہرے۔

اچانک اسے خطرناک خیال آیا۔ اس عورت نے کتنا ڈھیر سارا سونا پہن رکھا ہے۔ کہیں دھن کوبیر نیل تالاب چھوڑ کر اس کی حفاظت نہ کرنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر مورتی کی جانب دیکھا۔ نہیں، وہ تو ویسے ہی ہنس رہے ہیں۔ وہ کہیں نہیں جائیں گے۔ پھر بھی اس کا دل پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ بے چینی بنی رہی۔

فقیریا تیزی سے بھاگتا ہوا آیا اور چلو بھر بھر کے غٹاغٹ پانی پینے لگا۔ دوسرے ہاتھ میں بریڈ پکڑے ہوئے تھا۔ لوگی؟ اس نے گلا تر کرکے ہاتھ نچا کر پوچھا۔

"تو ہی کھا، مجھے نہیں چاہیے۔۔

"کیوں؟ سب تو لیتے ہیں، تو کیوں نہیں مانگتی؟۔

"چل یہاں سے بدمعاش! پانی بھرنے دے۔۔

بدمعاش ہوگی تو۔" فقیریا نے کہا۔ پھر تھوڑی دور جا کر لوٹ آیا۔

"اس کے پاس کیمرہ ہے، کیمرہ! بٹن دباتے ہی کھٹ سے فوٹو کھینچ جاتا ہے۔ کہوں تیرے پونگل۔ پولی کی بھی کھینچ دے۔۔

"جانتا ہے کہ سر توڑوں؟"

اس نے جھک کر ڈھیلا اٹھالیا۔ فقیریا زبان نکال کر بھاگ کھڑا ہوا۔ نہ جانے کیوں اس مرے مردے سے پونگل پولی کے بارے میں کہہ ڈالا تھا۔ جب دیکھو چڑاتا رہتا ہے۔

دیکھا، عورت اور آدمی اس کے سامنے سے گذر رہے ہیں۔ نہیں چاہیے مجھے بریڈ فریڈ، اس نے زبان نکال کر چڑا دیا۔

تبھی، دیکھو تو دیکھو، کہہ کر وہ آدمی لگ بھگ چیخ اٹھا، وہ گھر تو دیکھو، دیوتا دیوی کے کندھوں پر۔۔

سوتما ایک دم بھونچکی رہ گئی۔ یہی تو اس کا گھر ہے۔ یہی تو اس کے پونگل پولی ہیں۔ عورت بھی ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔

"بے حساب خوب صورت ہے۔ اس نے کہا۔ پل بھر ٹھہر کر وہ ہنس پڑی۔

چالکیوں کے دیوی دیوتا ہمارے گھر ہوں تو سچ میں اور کچھ نہ مانگوں۔

"سچ مچ۔ آدمی بھی ہنس دیا۔

نہیں مذاق نہیں۔ عورت سنجیدہ ہو گئی، "یہ مجھے مل جائے تو ایک دم سادہ سا گھر بنا کر رہ سکتی ہوں۔ ایک لاکھ بھی

خرچ نہ کروں۔" اس نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔
"شاید مل بھی سکے ------ آدمی نے کہا۔ اسی وقت سو نما جھپٹ کر وہاں " پہنچ گئی۔
"کیا ہے ؟" اس نے کہا۔
"یہ گھر کس کا ہے ؟"۔
"ہمارا ہے"۔
ہم دیکھ سکتے ہیں ؟" نہیں"۔
"کیوں ؟" اندر اور بھی مورتیاں ہیں ؟" "نہیں"۔
مگر تبھی فقیر پا آ پہنچا۔ آؤ، اؤ میں دکھاتا ہوں۔ اس نے بندر کی طرح چھلانگ لگا کر کہا۔ اور انھیں اندر لے گیا۔ "بے وقوف ---- گدھا۔ سو نما نے دل ہی دل میں کہا، اور وہیں کھڑی رہی۔ سنا ہے ان کے گھر کے نیچے کبھی مندر تھا۔ اب تو بس کچھ ٹوٹے پھوٹے ستون بچے ہیں، اور اس کے پونگل پولی! انھیں پر مٹی پتھر رکھ کر یہ کیا گھر کھڑا کیا گیا ہے۔ مگر کتنے خوبصورت ہیں یہ پونگل پولی! بچپن میں ہی اسے ان دیوی دیوتا سے پیار ہو گیا تھا۔ وہ چاہتی تھی، انھیں کوئی بہت پیارا سا نام دے۔ جب سے وہ بس اس کے ہو جائیں۔ پتہ نہیں کیوں اس مرے مردے فقیر پا سے ایک بار کہہ ڈالا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس کے ہی ہیں۔ پونگل پولی نام اس نے ہی انھیں دیے تھے۔ پونم کی رات میں اماں پولی بناتی ہے اور دوسرے دن پونگل۔ نہ جانے کتنے دن پہلے سے وہ انتظار کرنے لگتی ہے۔ اس کی اماں جیسا پونگل کوئی نہیں بنا سکتا۔ اور پولی تو جیسے دیوتا کا تبرک ہو۔ کتنا ملائم، کتنا میٹھا۔ یاد کرنے سے ہی منھ میں پانی بھر آتا ہے۔ اسی لیے تو اپنے سب سے پیارے دیوی، دیوتا کو یہی نام دے دیے تھے۔
"کتنی خوب صورت ہے دیوی!۔
پتلی کمر وزن سے جھکی جا رہی ہے۔ اور ننھے ننھے پرندے جیسے ہونٹ، وہ اونچے بندھے موتیوں جیسے بال اور یہ ڈھیر سارے زیور!۔
کتنی ہی بار جسم کے کپڑے اتار کر وہ اس کے برابر کھڑی ہوئی ہے، کیا وہ بھی اتنی ہی خوب صورت دکھائی دیتی ہے ؟
مگر اس سے بھی خوبصورت ہے دیوتا۔ کیا چوڑی چھاتی ہے اور پولی کی طرح ہی پتلی کمر ہے۔ کتنے پیار سے اس کی کمر کو ہاتھ سے گھیر کر سینے پر ہاتھ رکھا ہے۔ اور اس کے ہونٹ جیسے اب بولے اور اب بولے۔ ہاتھ سے چھو کر دیکھا تو سانس رک گئی۔ اور ایک دن تو اس نے اپنے ہونٹ ہی اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے تھے۔ " نہیں، میں نہیں لے جانے دوں گی، کبھی نہیں کبھی نہیں!۔
وہ لوگ باہر آ رہے تھے، کیوں، سوچا نہیں تھا نا کہ اندر درزی کی دکان ہوگی ؟ آدمی خوب ہنس رہا تھا۔
"ہوں"۔ عورت نے کہا، اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔۔ آج ہی ؟"۔
ہاں، ہاں وہیں تو راجدھانی تھی۔ وہیں تو چالکیوں کے آرٹ کا عروج جھلکتا ہے۔ ان کے دور حکومت کی ترقی کی نشانیاں ہیں۔
"ابھی اور کتنی باقی ہے تمھاری تھیسس ؟" آدمی نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔
بس تھوڑا کام اور ہے۔ عورت نے پیار سے کہا، تھک گئے ؟ مگر سوچو تو یہی یہ سب پانچویں، چھٹی صدی میں بنا تھا۔ یہی مندر آرٹ اور کلچر کی جانے پیدائش ہے۔ چاہے جنوب کے مندر لو چاہے اڑیسہ کے۔۔
"اور اب کیا حال بنا ہوا ہے۔ اف، کس قدر گندگی ہے"۔
"غریب لوگ ہیں"۔ عورت نے نفرت اور لاپرواہی کی ملی جلی آواز میں کہا۔ "انھیں ماضی کا کیا علم ؟ مجھے تو سچ مچ بڑ

(بقیہ صفحہ ۷۶ پر)

[مطالعہ]

پروفیسر رفیعہ سلطانہ

"ورودِ مسعود" پر ایک نظر

ادب کی جملہ اصناف میں خود نوشت سوانح کا خاص مقام ہے کیوں کہ یہ حقیقت نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ دیگر اصناف جیسے شاعری، افسانہ نگاری، انشائیہ تخیل کی پیداوار ہیں۔ یہ فن عہد قدیم سے مقبول رہا۔ یورپی ادب میں یہ صنف اتنی مقبول ہوئی کہ شاعروں، ادیبوں کی خود نوشت سوانح عمریوں سے نقادوں نے ان کے فن کی پیمائش کی اور ان کے کارناموں کے نئے نئے گوشے منظر عام پر آئے۔ اس خصوص میں خود نوشت کے معلم اول روسو کے سوانح کا ذکر ضروری ہے جس نے بے کم و کاست اپنی زندگی اور تجربات کا حال لکھا ہے۔

خود نوشت سوانح نگار کا کام نہایت مشکل ہوتا ہے کیوں کہ اس کو تخیل کی کار فرمائی سے زیادہ حقیقت پر خامہ فرسائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو تخیل اس فن پارے کو بے رنگ اور بے رس کر دیتا ہے۔ خود نوشت سوانح کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔

(۱) ایک وہ جسے پڑھ کر موضوع یعنی صاحب سوانح سے محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

(۲) دوسری قسم وہ ہے جس میں موضوع کی شخصیت قاری پر رعب اور دبدبہ طاری کرتی ہے۔

(۳) تیسری قسم وہ ہے جب موضوع کی شخصیت کی کمزوریاں قاری کو اس سے ہمدردی پر مائل کر دیتی ہیں۔

ورودِ مسعود کی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھ کر موضوع سے بیک وقت محبت اور دل چسپی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ سنسکرت کے رسوں کی طرح اس میں جملہ "رس" موجود ہیں۔ شرنگار رس، پریم رس، بھگتی رس، ویر رس، کرودھ رس۔

پریم رس

پریم رس کا نمونہ موضوع کے بچپن کے حالات ہیں جب وہ چھوٹی سی عمر میں اپنے بیمار ماں کے پاس شرارت کرتے ہیں یا پھر نانی کے ساتھ لاڈ پیار، اور اپنے اردگرد کے ماحول سے محبت اور دل چسپی، کبھی اپنی دایہ سے، کبھی ماموں، ممانیوں اور کبھی ہم سن رشتہ داروں سے چوں کہ یہ بچپن میں والدین کی محبت سے محروم ہوگئے تھے اس لیے ان کے رشتہ دار ان کو بھرپور محبت دیتے تھے۔ اسی محبت کے سہارے ان کی شخصیت پروان چڑھی ہے۔ یہ اپنے اطراف کے ماحول سے دل کھول کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ورودِ مسعود کا یہ حصہ بہت جان دار ہے۔ اس میں قائم گنج کی کئی دل چسپ شخصیتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ سب سے پہلے تو "نانی" سے جو قدیم ہندوستانی نسوانیت کی مکمل تصویر ہیں۔ زیرکی کے ساتھ "بھولا پن"۔ مسعود صاحب نے اپنی نانی کی شخصیت کے بڑے دل چسپ پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جس سے متوسط ہندوستانی

مسلمان خواتین کے بہت ہی اہم پہلو سامنے آتے ہیں ۔ مثلاً ہندوستانی خواتین کی علاج معالجہ کی صلاحیت ۔ مذہب سے غیر معمولی شغف اور د
چسپی ۔ شام میں ہر گھر میں میلاد کی محفلیں ۔ یہ محفلیں بہت اہم اس لیے ہیں کہ ان کے ذریعے مسلمان لڑکیاں سیرت نبی صلعم اور اخا
تعلیمات سے آگاہ ہوتی تھیں (راقمۃ الحروف کی مذہبی معلومات کا بڑا ذریعہ بھی میلاد کی محفلیں تھیں) سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اس زمانے
گھریلو خواتین کو زندگی سے بیزارگی یا اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا تھا یا جذباتی تناؤ TENSION دور کرنے کے لیے دواؤں کی ضرورت
نہیں پڑتی تھی ۔ وہ زندہ دل اور خوش مذاق ہوا کرتی تھیں ۔ چناں چہ اس کا ثبوت ان کی نانی کا اپنے ایک رشتے کے دیور سے پس پردہ نوک
جھونک اور چہل مذاق تھا ۔ گھریلو کاموں میں معروفیت، تربیت اطفال کی اہم ذمہ داری ان کے سپرد تھی ان خواتین کے پاس اتنا فاضل وقت
ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اعصابی تناؤ یا ذہنی الجھنوں کا شکار بنیں ۔ اس حصے میں مسعود صاحب کا علم لسانیت کا ذوق بھی جھلکتا ہے جب وہ پٹھانو
کی بولی اور ان کی زبان کا جائزہ لیتے ہیں ۔

دوسرے باب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا حال نہایت دل چسپ ہے ۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چہل، دل لگی کے بیان کے علاوہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اولین دور جس کو "دور زرین" کہا جاسکتا ہے کی تفصیل ملتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں تعلیم کے ساتھ اخلا
و کردار کی اصلاح پر کس قدر زور دیا جاتا تھا ۔ مذہبی احکام کی پابندی کس طرح ہوتی تھی ۔ اس دور کے طالب علم آج کی طرح جماعت اسلامی
ممبر نہ بنتے ہوئے بھی کس قدر اسلام سے قریب تھے ۔ جامعہ ملیہ کے یہ چھ سالہ قیام (۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۳ء تک) کا عرصہ مسعود صاحب کی زندگی
میں بہت اہم ہے ۔ بقول ان کے یہیں انھیں قومی احساسات اور اخلاقیات کا درس ملا ۔ حالی اور اقبال کی صداؤں نے یہیں انھیں آئندہ زندگی
میں ایک پکا مسلمان اور سچا انسان بننے کی تلقین کی ۔ کشمیر سے ان کی محبت اسی زمانے سے شروع ہوئی جو آئندہ سالوں میں عشق میں تبدیل
ہو گئی ۔

۱۹۳۳ء کے بعد کا زمانہ تعلیمی مسابقت اور شاعری کی ابتدا کا زمانہ ہے ۔ ڈھاکے کے سرسبز و شاداب مرغزاروں نے مسعود صاحب کی
شاعری میں روح پھونک دی ۔ وہاں کے لہلہاتے کھیت، نرم روندیوں، نیز بنگال کے حسن ملیح سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی نظم روپ
بنگال لکھی ۔ روپ بنگال ان ہی خوش گوار دنوں کی یادگار ہے ۔ بڑی عجیب چیز جس سے مسعود صاحب متاثر ہوئے اہل بنگال کی اردو سے بے
اعتنائی تھی جو آگے چل کر بنگلہ دیش کی تعمیر کا باعث ہوئی ۔ بنگلہ دیش کی مملکت اسی لسانی تعصب اور اپنی مادری زبان بنگالی سے محبت کی بنا
وجود میں آئی جس کا اعتراف مسعود صاحب نے ۱۹۷۱ء کے "ہماری زبان" کے آخر کے صفحے پر کیا ہے لکھتے ہیں:

"مشرقی اور مغربی پاکستان کا موجودہ المیہ سیاسی و معاشی ہی نہیں ایک لسانی واقعہ بالمہ بھی ہے ۔ میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے جب م
سوچتا ہوں کہ اس زبان کے ستم گر اردو زبان سے منسوب ہیں ۔"

شرنگار رس

چوتھا باب مسعود صاحب کی کالج کی زندگی پر محیط ہے ۔ کالج کی زندگی کا یہ عرصہ اہم بھی ہے اور دل چسپ بھی ۔ مسعود صاحب وہ

کالج کے طالب علم تھے اور اپنے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاں مقیم تھے۔ اس میں مرحوم دہلی کالج کی چند اہم شخصیتوں کا حال خاصہ ہے۔ وہ شخصیتیں جو مستقبل میں ہندوستان کی قومی و سیاسی زندگی پر اثر انداز ہوئیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت و کردار کے بڑے اچھوتے نقوش اس تحریر میں ابھرے ہیں جس کی طرف ان کے سوانح نگاروں نے اشارے نہیں کیے۔ یہاں ڈاکٹر ذاکر حسین کی رفیق کار مس فلپس بورن کا تذکرہ ہے جو ذاکر حسین کی اہلیہ اور ذاکر حسین دونوں سے قریب تھیں۔ مس فلپس ان کی اہلیہ کو ذاکر حسین کی اعلیٰ خدمات سے واقف کرواتیں۔ اس باب میں مسعود صاحب نے ذاکر صاحب کے "جلال و جمال" دونوں کا احاطہ کیا ہے۔

علی گڑھ کی زندگی والا باب زیادہ تر تاثراتی ہے۔ مسعود صاحب نے اپنی عینک سے علی گڑھ کا مشاہدہ کیا۔ اس میں خارجی حالات کا منصفانہ تجزیہ نہیں۔ رشید صاحب اور سرور صاحب کا موازنہ بھی انھوں نے اپنے تاثر کی روشنی میں کیا ہے۔ سب سے جان دار حصہ علی گڑھ کی ادبی محفلوں اور مشاعروں کا احوال ہے۔ اس حصے کو پڑھ کر علی گڑھ کی عظمت رفتہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ جب علی گڑھ اردو کا ایک ممتاز اور اہم مرکز تھا۔

وردِ مسعود کا چھٹا باب حقیقی معنوں میں شرنگار رس کی تفسیر ہے۔ اس میں مسعود صاحب کی اولین محبت کا تذکرہ ہے۔ اس حصے میں غم جاناں اور غم دوراں دونوں کی کشمکش موجود ہے۔ خود نوشت سوانح کا یہ حصہ دل چسپ ہے۔ اس میں پٹھانوں کی کمزوریوں کی طرف اشارے کیے ہیں مثلاً ایک شادی (ان کے ماموں اور خسر کی شادی) کا حال جس میں باراتی یعنی پٹھانوں نے بیس بیس طشتریاں حلوے کے چٹ کر لیں۔ یا قائم گنج کے ایک پٹھان نور عالم خان کا کردار جنھوں نے "جوے" میں ایک لڑکی جیتی اور بیوی کی موجودگی میں نکاح پڑھوالیا۔ ان کی اولین محبوبہ جو آگے چل کر ان کی رفیقۂ حیات بنیں کی قربت اور ان کی معصومیت کا تذکرہ ملتا ہے۔

مسعود صاحب کو پہلی ملازمت ریڈیو اسٹیشن میں ملی۔ وہیں ان کی اردو کے مشاہیرن۔ م۔ راشد، مرزا محمود بیگ اور کئی مشہور اردو ناول نگاروں، افسانہ نگاروں اور شعرا سے ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن آواز کی دنیا کی یہ ظاہری چمک دمک ان کی علمی اور تحقیقی صلاحیت کو مسخر نہ کر سکی۔

ساتویں باب میں علی گڑھ کی مراجعت کا حال ہے جب انھوں نے اچھی خاصی سرکاری ملازمت کو خیرباد کہہ کر علمی دنیا میں اپنے قدم جمائے۔ اس زمانے میں ان کی زندگی کا وہ اہم حادثہ وقوع پذیر ہوا۔ یعنی "عشق" دو طرفہ ہوتے ہوئے بھی دو طرفہ نہیں کہا جاسکتا یعنی ایک پردہ نشین سے عشق۔ اس واقعے نے مسعود صاحب کی زندگی میں صنف نازک کے تعلق سے وہ کیفیت جسے حریر دو رنگ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے پیدا کر دی۔ بظاہر بہت سخت لیکن بہ باطن بہت نرم۔ شاید اسی وجہ سے وہ اپنی سخت گیری کے باوجود خواتین میں کافی مقبول اور محبوب ہیں۔ (بعض لوگ اسے ان کے حسن ظاہری پر محمول کرتے ہیں) یہ باب اس وجہ سے اہم ہے کہ اس میں ہندوستان کی سیاسی فضا میں بٹوارے کی وجہ سے جو تلاطم پیدا ہوا اس کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کا یہ شعر آزادی کے بعد کی بربادی کی صحیح تصویر ہے۔

کوئی بھی رونق محفل کو دیکھ سکتا ہے
تمھیں بتاؤ جب آنکھوں میں اس قدر نم ہو

اس اندھیرے میں روشنی کی کرن اس طرح پیدا ہوئی کہ مسعود صاحب کو اپنی محبوبہ جو ان کی بیوی بنیں، سے قربت نصیب ہوئی۔ یعنی دونوں شادی کے بندھنوں میں بندھ گئے۔

آٹھواں باب دیار فرنگ کو روانگی ہے۔ شادی کے بعد ڈھائی برس کا عرصہ لندن اور فرانس میں گذرا۔ لندن کے حسن نسوانی نے انھیں مسحور کیا لیکن کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ البتہ پروفیسر فرتھ کی شاگردی میں ہندوستانی لسانیات اور صوتیات کی ڈگری لی۔ ڈاکٹر زور کے بعد غالباً یہ دوسرے ہندوستانی تھے جنھوں نے اردو لسانیات اور صوتیات کی تحصیل کی۔ لندن کی زندگی کے واقعات دل چسپ بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی۔ یعنی لندن میں انگریز حکمرانوں کی کس مپرسی کا عالم۔ ایک محفل کا تذکرہ بہت پر لطف ہے جس میں اردو کے بی۔ بی۔ سی کے مشاہیر جیسے صدیق احمد، حفیظ جاوید غلام عباس، اعجاز بٹالوی، حبیب الرحمن، انوار انصاری وغیرہ موجود تھے۔ مسعود صاحب نے اپنی ذکاوت سے ان سب کو بیوقوف بنایا۔ انھوں نے غالب کے انداز میں ایک غزل لکھ کر اسے غالب کی غزل کے طور پر پیش کیا بالآخر اعجاز بٹالوی نے اندازہ کر لیا کہ یہ غالب کی نہیں مسعود صاحب کی تخلیق ہے۔ پیرس کے قیام میں مسعود صاحب نے بہت معرکتہ الآرا کارنامے انجام دیے۔ ہندوستان واپسی کے بعد یہاں گرمائی کورسس کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی، پروفیسر گمپرز وغیرہ کے ساتھ مسعود صاحب نے اردو صوتیات اور لسانیات کی تعلیم دی۔ یہ سلسلہ پانچ سال تک ہندوستان کی مختلف جامعات میں جاری رہا جس سے مسعود صاحب وابستہ رہے۔ ان ہی دنوں علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں منتقل ہوئے اور جب بقول ان کے علی گڑھ میں ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں تو وقتی طور پر ایک نئی راہ نکل آئی یعنی Association of Asian Studies سے لکچر دینے کا بلاوا آگیا۔ امریکہ کی عیش و عشرت کی زندگی میں ان کو اپنی محبوب بیوی نجمہ کی یاد ستاتی رہی۔ اس کے بعد حیدرآباد کی جامعہ عثمانیہ کے چھ سالہ قیام میں مسعود صاحب نے دکھنی کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ کئی قدیم متون ایڈٹ اور شائع کیے۔ اگست ۶۸ء میں پھر اپنی مادر جامعہ علی گڑھ لوٹ گئے اور ایک نئے شعبے لسانیات کی بنیاد ڈالی۔ مسعود صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں لسانیات کا وقوف و عرفان عطا کیا۔

کرودھ رس

پھر ایک بار زمانے نے کروٹ بدلی اور مسعود صاحب کو ان کی اولین درس گاہ جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر بنایا گیا۔ یہاں کے حالات و واقعات کرودھ رس کی یاد دلاتے ہیں۔ اندرونی ہنگامے، بیرونی اثرات، جامعہ کے اسٹاف اور اساتذہ کی سہل انگاری اور چپقلش۔ جامعہ ملیہ کی وائس چانسلری کا یہ دور مسعود صاحب کی زندگی کا معرکتہ الآرا دور رہا۔ انھیں نفرت بھی ملی اور محبت بھی۔ اپنی نگہہ بلند، سخن دل نواز اور جان پر سوز کے بھروسے انھوں نے یہ معرکے بھی سر کر لیے۔ ان حالات کو دیکھ کر کرودھ رس اور ویر رس کی معنویت سمجھ میں آتی ہے۔ ویر رس اس لیے کہ انھوں نے ناسازگار حالات میں اپنی جدوجہد ترک نہیں کی۔ وہاں سے مراجعت کے بعد کشمیر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ نے انھیں پروفیسر شپ آفر کی۔ وہاں کی طالبہ طالعہ مخدومی کے حسن و ذہانت نے انھیں اس درجہ متاثر کیا کہ انھوں نے کئی اشعار لکھ ڈالے۔ انھیں پڑھ کر قاری کا ذہن ڈانٹے کی طربیہ خداوندی کی طرف مائل ہو جاتا ہے کیوں کہ اس نے یہ نظم ایک نوخیز لڑکی Beltrice بیاٹرس

کے حسن سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ جب وہ تقریباً ساٹھ سال کا اور بیاترس سولہ سال کی تھی۔

مختصراً اور دو مسعود، اردو ادب کی ایک ایسی خود نوشت ہے جو بیسویں صدی کی اردو ادبی دنیا کا آئینہ ہے۔ اس نگار خانے میں ہندوستان کی تین عظیم جامعات، جامعہ عثمانیہ، علی گڑھ یونیورسٹی، جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی کی زندگی کی تصویریں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

مستقبل کا مورخ جب ہندوستان میں اردو کے عروج و زوال کا حال لکھنا چاہے گا تو وہ اس شخص سے ضرور ملے گا جس نے اردو ادب کی زلفوں کو سنوارا اور نکھارا۔ بقول غالب:

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

○ ○ ○ ○ ○ ○ ○

ص ۱۱۱ سے آگے

دکھ ہوتا ہے ان کے لیے۔۔

"ہاں۔۔آدمی نے کہا، "اب چلیں۔۔

"چلو۔ عورت نے چوڑیوں سے بھرا ہاتھ اٹھا کر ڈھیرے سے بال سنوارے۔

اچانک سونما نے دیکھا۔ یہ تو بالکل دیوی جیسی ہے۔ وہی پتلی کمر، سڈول سینہ، اونچے بندھے کالے بال، ننھے ننھے پرندوں جیسے ہونٹ اور یہ ڈھیر سارے زیور۔ دیوتا کے برابر کھڑی ہو جانے تو اس کی محبوبہ لگے، بالکل دیوی جیسی، اسے لگا جیسے کوئی خواب ٹوٹ کر اس کے چاروں اور بکھر گیا ہے۔ صرف ایک ہی دن میں ایک یگ بیت گیا ہے۔

○۔۔ ○ ۔۔○

[مطالعہ]

پروفیسر گیان چند

طالب علی خاں عیشی از ڈاکٹر شیمہ رضوی

ڈاکٹر عائشہ اعزاز شیمہ رضوی لکھنؤ کی مشہور ادیبہ ہیں۔ وہ لکھنؤ ٹیلی ویژن پر اردو ہندی میں خبریں سنانے اور ڈراموں میں اداکاری کی وجہ سے ایک مشہور و مقبول شخصیت ہیں۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ایک اچھی مصور بھی ہیں۔ میں نے ان کی بنائی ہوئی بڑی بڑی رنگین تصویریں دیکھیں تو انگشت بدنداں رہ گیا، منہ میں پانی بھر آیا کہ انھیں اچک لوں۔ ان کے ان اوصاف نے ان کی اصل حیثیت شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی کی لیکچرر شپ کو دبا دیا ہے۔ ان کی چوتھی پہچان یہ ہے کہ وہ ادب میں تخلیق، تنقید اور تحقیق تینوں ایوانوں کی رکن ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ، پرچھائیاں، بعض اچھے افسانوں پر مشتمل ہے۔ بچوں کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "ایک بار" مرتب کر چکی ہیں۔ تنقید میں ان کی کتاب "اردو غزل اور اس کا فکری و فنی نظام" ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔

ان کا تحقیقی مقالہ "طالب علی خاں عیشی، حیات اور کارنامے" ۱۹۹۲ء کے آخر میں سامنے آیا۔ اسے خود انھوں نے شائع کیا ہے۔ اس سے ان کی شخصیت کا ایک نیا رخ اجاگر ہوا۔ وہ دیکھنے میں ایک جدید خاتون معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کتاب کی سیر کرنے سے انکشاف ہوا کہ وہ فارسی کی بھی ماہر ہیں اور قدیم تذکروں سے بھی کماحقہ شناسائی رکھتی ہیں۔ فلیپ سے معلوم ہوا کہ وہ الحاج قاری سید وددالحق ندوی کے نعتیہ مجموعے "گلہائے عقیدے" کی بھی مرتب ہیں۔ اپنے مقالے کا انتساب والدین کے نام کیا ہے اور یہ بڑی سعادت مندی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ہدیے کا ان سے زیادہ مستحق اور کون ہو سکتا تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مقالہ نگار نے کتاب میں کسی کا مقدمہ شامل نہیں کیا۔ نئے لکھنے والے ایک نہیں کئی بیساکھیوں کا سہارا لینے کے لیے کتاب کو کم از کم ایک، بعض اوقات دو تین مقدموں سے مزین و مجلی کر دیتے ہیں اور جی بھر کر خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ شیمہ اگر چاہتیں تو مداح مقدمہ نگاروں کی کمی نہ تھی۔ انھوں نے خود اعتمادی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے مقدمے کے بجائے مقالے کے تینوں ممتحنوں ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر حکم چند نیر اور ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کی اصل انگریزی رپورٹوں کو چھاپ دیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ ان کے اقتباس کا اردو ترجمہ کر کے کتاب کے آخر میں دے دیتیں۔

پہلے دو باب پس منظری ہیں۔ ماضی میں سیاسی و سماجی پس منظر کی تفصیل و تسوید میں بڑا زور باندھا جاتا تھا۔ اب قارئین ان واقعات و عوامل سے واقف ہو چکے ہیں اس لیے پس منظر کے اختصار کو پسند کیا جاتا ہے۔ شیمہ نے سیاسی پس منظر ساڑھے چھ صفحوں میں اور سماجی پس منظر سات صفحوں میں قلم بند کیا ہے اور یہ بہت متوازن ہے۔

دوسرے باب کا عنوان "لکھنو کی شعری روایات" ہے۔ ۴۸ صفحوں کا یہ باب بہت بیش بہا ہے۔ اسے ایک چھوٹا موٹا لکھنو کا دبستان شاعری سمجھیے جس میں لکھنو کی جملہ اصناف یعنی غزل، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، ریختی، شہر آشوب اور واسوخت پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان میں آخری تین اصناف کا بیان زیادہ دلچسپ ہے۔ غزل کے ارتقا کے سلسلے میں انشا کے لیے لکھا ہے کہ جب دربار داری کے اثر سے آزاد ہوئے تو ان کے کلام میں شستگی اور سوز و گداز عود کر آیا۔ اور نمونے کے طور پر غزل دی ہے:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں (ص ۵۱)

آزاد نے آب حیات میں اس غزل کو انشا کے دور جنوں سے وابستہ کر کے ایک غلط فہمی کو رائج کیا۔ قاضی عبدالودود نے انکشاف کیا کہ یہ غزل مصحفی کے تذکرہ ہندی گویاں (تکمیل ۱۲۰۹) میں موجود ہے۔ اس کے بعد انشا نے لکھنو میں ڈٹ کر درباداریاں کیں۔

باب دوم عوامی دلچسپی کا تنقیدی باب ہے۔ باب سوم "سوانح عیشی" بیت الغزل ہے۔ جس میں نوجوان، لیکن فاضل مقالہ نگار نے جس طرح داد تحقیق دی ہے وہ واقعی داد طلب ہے۔ عیشی کی تاریخ ولادت کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ شیمہ نے فارسی کلیات عیشی سے صحیح سنہ ۱۱۹۷ھ دریافت کیا۔ مختلف تذکروں سے ان کی سوانح کی تشکیل کی اور اس سلسلے میں سید علی حسن خاں کے کم مشہور تذکرہ "صبح گلشن" کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس سے یہ غیر معمولی بات معلوم ہوئی کہ عیشی کی موت کے چار گھنٹے کے بعد ان کی بیوی بھی ان سے جاملیں۔ وہ رفیقۂ حیات ہی نہیں رفیقۂ ممات بھی ثابت ہوئیں۔

ان کی دوسری اہم تحقیق عیشی کے استاد کی دریافت ہے۔ انھوں نے مختلف تذکروں کے بیانات نقل کیے جن میں کہا گیا ہے کہ عیشی مصحفی کے شاگرد تھے۔ شیمہ لکھتی ہیں: "لیکن مصحفی نے کہیں بھی اپنے تلامذہ میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے تذکرہ "ریاض الفصحا" میں انھیں مرزا قتیل اور میر انشاء اللہ خاں سے خوشہ چینی کرنے اور فیض صحبت اٹھانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "اقرار شاگردی یک کس نمی کند" لیکن ایک داخلی شہادت سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ عیشی نے اقرار شاگردی کیا ہے اور بہت صراحت کے ساتھ سید انشاء اللہ خاں کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔" (ص ۱۱۳)

شیمہ نے عیشی کے کلیات اردو، نسخہ کلکتہ سے انشا کی مدح میں ایک قصیدے کے اشعار دیے جن میں انھوں نے صریحاً لکھا ہے کہ وہ انشا کے شاگرد ہیں۔ میں نے انشا پر ڈاکٹر اسلم پرویز اور ڈاکٹر عابد پشاوری کے تحقیقی مقالوں کو دیکھا ہے۔ مجھے ان میں کہیں عیشی کے اس قصیدے در مدح انشا کا ذکر نہ ملا، نہ یہ اطلاع کہ عیشی انشا کے شاگرد تھے۔ میں نے اردو ادب کی کسی کتاب میں یہ بیان نہیں دیکھا کہ کسی نے انشا کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔

مقالہ نگار نے انشا کے معاصرین کے سلسلے میں ص: ۱۲۶ تا ۱۲۷ پر، ۷ شعرا کے نام دیے ہیں۔ ستم یہ کیا کہ ان میں سے ۱۹ شاعروں کے سنہ ولادت و وفات بھی درج کر دیے۔ مجھے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ہدایت کی تھی کہ جو کچھ آپ کے موضوع تحقیق سے براہ راست تعلق نہ رکھتا ہو اس کے بارے میں تحقیقی بیان نہ دیجیے کہ اس سے آپ پر ایک بہت بڑی ذمہ داری آجاتی ہے۔

مقالہ نگار نے ص: ۱۲۷-۱۲۸ پر ۲۲ سطروں کی تحت عیشی کی سوانح کانچوڑ لکھ دیا ہے۔ اس میں جملہ مفید اور ضروری معلومات آگئی ہیں یہ طریقہ ایسا ہے کہ دوسرے مقالہ نگاروں کو بھی اس کی تقلید کرنی چاہیے۔ اس کے آگے چوتھا باب، "عیشی کی اردو شاعری، ایک تفصیلی جائزہ ہے۔ یہ باب ۲۷۹ صفحات پر مشتمل ہے یعنی مقالے کے نصف سے زیادہ۔ اس میں صنف وار جائزہ لیا ہے جن میں سب سے پہلے قصائد ہیں۔ عام طور سے دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی ادیب پر مقالہ لکھتے وقت مقالہ نگار اس کا نقاد بننے کے بجائے وکیل ہو جاتا ہے۔ اسے اس میں حسن ہی حسن دکھائی دیتا ہے، کوئی سقم نہیں۔ شکر ہے کہ ثیمرہ اس عدم توازن کا شکار نہیں۔ انھوں نے ص ۱۴۸ و ص ۱۵۲ پر عیشی کے دو قصیدوں کو ہلکا اور شکوہ سے خالی قرار دیا ہے۔ اک سلسلے میں قصیدہ ششم در مدح انشا کی تفصیل ص ۱۷۳ تا ۱۸۲ پر دی ہے۔ یہ قصیدہ واقعی شاندار ہے۔

قصیدوں کے بعد غزل کا نمبر آتا ہے۔ اس میں تمہید کے طور پر "اردو غزل کے تاریخی پس منظر کا اجمالی تعارف" ہے۔ یہ ۲۷ صفحوں پر محیط ہے۔ اس میں وجہی اور قلی قطب شاہ سے لے کر ناسخ تک غزل کا ارتقا دیا ہے۔

پھر ص ۲۲۸ سے ص ۲۸۹ تک عیشی کی غزل کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ آخر میں عیشی کے کلام سے فارسی تراکیب گنائی ہیں جو پانچ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ کئی سو ترکیبیں ہوں گی۔ یہ تفصیل قاضی عبدالودود کا وطیرہ تھی۔ ان کی تعداد کم کرنے کو عامتہ الورود قسم کی ترکیبیں چھوڑی جا سکتی تھیں مثلاً چاک گریباں، زخم جگر، چشم تر، غیر معمولی اور بہت بالشان ترکیبیں بھی کم از کم تین صفحوں سے کم پر نہ آئیں۔

غزلوں کے بعد مثنوی اور پھر مسدس (بہ شکل واسوخت در احوال خود) کا تعارف و تبصرہ ہے۔ لکھتی ہیں کہ قیصر امروہی نے اسے واسوخت کا نام دیا ہے لیکن چوں کہ اس میں واسوخت کا مضمون نہیں اس لیے ثیمرہ نے اسے "بہ شکل واسوخت در احوال خود" کا عنوان دیا ہے (حاشیہ میں ص ۳۲۵) مقالہ نگار کی یہ اصابت رائے قابل قدر ہے۔ مسدس کے بعد مرثیہ، تضمینات اور قطعے پر بحث ہے اور اس پر اردو شاعری کا تنقیدی حصہ ختم ہو جاتا ہے۔

پانچواں باب "عیشی کی فارسی شاعری، مجموعی جائزہ" ہے۔ عیشی نے اردو کے علاوہ ایک فارسی کلیات بھی چھوڑی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں پہلا حصہ شعری ہے دوسرا نثر پر مشتمل ہے۔ چوں کہ مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں پورے عیشی کو پیش کرنے کی ٹھانی ہے اس لیے انھوں نے فارسی کلیات سے صرف نظر نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ عیشی نے فارسی میں اتنا زیادہ کہا ہے۔ ان کی کلیات فارسی میں ۲۶ قصیدے، ۱۹۵ غزلیں، ۱۳ قطعے، ایک ترکیب بند، دو مخمس، ۱۹۱ رباعیاں اور ۳۵ مثنویاں ہیں۔ ان میں ایک مثنوی ۲۲۴ / اشعار کی اور دوسری ۲۸۰ ابیات کی ہے۔ چھٹے باب میں عیشی کی فارسی نثر کا تعارف ہے۔ ثیمرہ رضوی کو فارسی نظم و نثر سے دلچسپی ہو سکتی ہے (وہ فارسی کی ایک استانی کی دختر ہیں، ان کا ربھنا فارسی کا پروفیسر ہے) مجھے فارسی سے دلچسپی نہیں ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔

آٹھ صفحوں کے آخری باب کا عنوان ہے "اردو ادب میں عیشی کا مقام اور ان کی ادبی قدر و قیمت" ہے۔ مقالہ نگار انھیں اردو شعرا کی صف میں ایک منفرد مقام کا مالک سمجھتی ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۸۹ پر)

نقد و نظر

(تبصرہ نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں ارسال کریں)

نام کتاب : اردو مثنوی۔ مطالعہ اور تدریس بار اول ۱۹۹۲ء۔ قیمت : سو روپے

ملنے کا پتہ : ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈی ۱۱ / سی ۱ ، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

اردو مثنوی پر ہرچند کہ قابل لحاظ کام ہو چکا ہے لیکن جیسا کہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اپنی کتاب "اردو مثنوی۔ مطالعہ اور تدریس" میں لکھا ہے، یہ مبالغہ نہیں کہ "اردو مثنویوں کا بھرپور مطالعہ ابھی توجہ طلب ہے۔" اردو مثنوی، فہمیدہ بیگم کے لیے کوئی نیا موضوع نہیں۔ وہ نہ صرف عرصہ دراز سے اس موضوع پر کام کر رہی ہیں بلکہ یہ ان کا خصوصی موضوع رہا ہے۔ "ریاست میسور میں اردو مثنوی کا ارتقا" پر مقالہ تحریر کرکے انھوں نے میسور یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ و نیز انھوں نے شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی کے جریدہ "فکر و ادب" کا گراں قدر "مثنوی نمبر" بھی ترتیب دیا۔ جس میں ان کی مرتبہ "کتابیات اردو مثنوی" خاصے کی چیز ہے۔ یہ نمبر اس وقت بھی میرے سامنے ہے جس سے اردو مثنوی پر فہمیدہ بیگم کی گہری نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو مثنویوں اور مثنوی نگاروں پر ان کے مضامین بھی ہیں اور اب انھوں نے اپنی کتاب "اردو مثنوی۔ مطالعہ اور تدریس" میں اردو مثنوی کا کچھ اور ہی زاویہ سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ "طالب علموں کو اردو مثنویوں کے بارے میں ایسا مواد ملے جس سے کسی حد تک اردو مثنوی کی اہمیت کا اندازہ ہو اور مطالعے کا موقع بھی ملے۔" اپنی اس کوشش میں بلاشبہ وہ کامیاب ہیں۔

مثنوی، ہمارے ہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصابات میں شامل ہے۔ اس کی تدریس پر کچھ اور توجہ کی ضرورت ہے۔ پھر یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ نصاب کا حقیقی مقصد تکمیل پائے اور طلبہ واقعی مثنوی سے دلچسپی لیں اور پڑھ کر لطف اندوز ہوں۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کے پیش نظر یہی مقاصد رہے ہیں اور انھوں نے کوئی (15) مثنوی نگاروں اور ان کی کوئی (22) مثنویوں سے انتخاب کیا ہے۔ اس میں شمالی ہند اور جنوبی ہند کی تخصیص سے گزر کر اردو مثنوی کا بالا ستیعاب مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے مثنوی نگاروں اور ان کی مثنویوں کا انتخاب اہتمام سے کیا ہے۔ نمائندہ مثنوی نگاروں اور ان کی نمائندہ مثنویوں کو ترجیح دی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ خاص طور پر قدیم اردو (دکنی) کی مثنویوں کے ایسے الفاظ کے معانی حاشیے میں دے دیے گئے ہیں جو یا تو ثقیل ہیں یا اب متروک ہو چکے ہیں۔ یوں طلبہ کے لیے ان مثنویوں کی تفہیم سہل ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اردو مثنوی کی ابتدا اور تدریس کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مثنویوں کو بہ اعتبار موضوع تقسیم کیا ہے، قدیم مثنویوں کے موضوعات کا تعین کیا ہے، ان کے کرداروں پر روشنی ڈالی ہے اور مثنویوں کے ذیلی عنوانات کی خصوصیات تحریر کی ہیں۔

تدریس مثنوی کے سلسلے میں یہ پہلی عمدہ کوشش ہے۔ ہمارے اساتذہ کے لیے بھی کارآمد! ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے مثنوی کی تدریس کے سلسلے میں جن نکات کو درج کیا ہے ہر مثنوی کے ذیل میں اجمالاً انھیں واضح بھی کیا ہے۔ مثلاً مثنوی کے قصے کے ماخذ، قدیم مثنویوں کی تاریخ تصنیف کی نشان دہی، تحریر مثنوی کی مدت، قدیم مثنویوں میں مثنوی کے نام کی

صراحت اور مثنوی میں دیگر اصناف نظم وغیرہ پر انتہائی جامعیت کے ساتھ قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مثنوی لیلی مجنوں، مینا ستونتی، خاور نامہ، ماہ پیکر، ابراہیم نامہ، سیف الملوک بدیع الجمال اور خنجر عشق وغیرہ پر بھرپور معلومات ملتی ہیں۔ جن نمائندہ مثنویوں کو انھوں نے اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ ان کے شاعر کا نام، اس کے حالات، اس کی دیگر تصانیف، اس کی مثنوی نگاری، متعلقہ مثنوی کی تاریخ تصنیف، اس کا موضوع، اشعار کی تعداد، کتنی مدت میں مثنوی مکمل ہوئی، تاحال اس مثنوی کو کن کن اصحاب نے مرتب کیا ہے، اس کے کتنے نسخے ہیں اور کہاں کہاں پائے جاتے ہیں، مثنویوں کا خلاصہ اور اس کے اہم پہلوؤں کا جائزہ بھی شامل ہے۔ کئی مثنویوں کے بارے میں محققین اور ناقدین کی تحقیقات اور تنقیدات کا حوالہ بھی ہے اور متنازعہ فیہ امور کی ممکنہ حد تک صراحت بھی کر دی گئی ہے۔ یہ سب کچھ اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ ہے اور پھر انداز تحریر بھی ایسا سادہ اور سہل ہے کہ عام طالب علم بھی آسانی سے سمجھ جائے۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے کتاب میں زیادہ سے زیادہ معلومات پیش کی ہیں۔ تذکرے سے بھی کام لیا ہے اور تبصرے سے بھی۔ تنقید سے کچھ کم -- لیکن جہاں بھی انھوں نے اپنی آرا پیش کی ہیں اس سے ان کے گہرے تنقیدی شعور اور اردو مثنوی کے وسیع مطالعہ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ سلجھے ہوئے طریقے پر بات کہنے کا ہنر جانتی ہے۔ اردو مثنوی کے تعلق سے ان کی یہ کتاب یقیناً قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

(سلیمان اطہر جاوید)

کتاب کا نام: Faiz Ahmed Faiz - Selected poems مترجم: پروفیسر شیو - کے - کمار

ناشر: Viking Penguin India - سائز: 1/8 ڈیمائی - مجلد: قیمت ۱۹۵ روپے

فیض احمد فیض کی شاعری کے دنیا کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ جس سے ان کی عالمی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خود انگریزی زبان میں ان کی نظموں اور غزلوں کے کئی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ہر مترجم نے فیض کی شاعری کو اپنے انداز میں محسوس کیا اور اپنی استعداد کے مطابق انگریزی میں منتقل کیا۔

سائیں سچا (مشتاق احمد) پاکستانی ہیں اور سویڈن میں مقیم ہیں۔ انھوں نے فیض کی تینتیس نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ان ترجموں کو Memory کے نام سے شائع کیا۔ ان میں تین پنجابی نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ ترجمے زیادہ تر لفظی ہیں۔

فیض کی ایک مشہور مترجم وکٹر کیرنن ہیں۔ انھوں نے فیض کی چون نظموں کو انگریزی میں منتقل کیا۔ ان ترجموں کو Poems by Faiz کے نام سے یونسکو نے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔

امریکی شاعرہ لیوی لزرڈ نے ایک نئے ڈھنگ سے فیض کے کلام کو انگریزی میں منتقل کیا۔ فیض اپنی نظم کا لفظی ترجمہ کر دیتے تھے لیوی لزرڈ امریکی انگریزی کے متبادل محاوروں، استعاروں، کنایوں اور محاکات کو استعمال کرتے ہوئے اس نظم کی باز تخلیق کرتیں۔ یہ ایک انوکھا اور کامیاب تجربہ تھا۔

انگریزی کے جدید شاعر آغا شاہد علی نے بھی فیض کی نظموں کے تخلیقی ترجمے کیے۔ ان کے علاوہ پروفیسر داؤد کمال، وکرم سیٹھ اور بعض دیگر حضرات نے بھی فیض کی چیدہ چیدہ نظموں کو انگریزی کے روپ میں پیش کیا۔

زیر نظر کتاب اس سلسلے کی تازہ ترین کاوش ہے۔ پروفیسر شیو - کے - کمار انگریزی زبان کے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پانچویں شعری مجموعے Trapfalls In The Sky کو ساہتیہ اکیڈمی اوارڈ مل چکا ہے۔ اس مجموعے کی نظموں کا خوب صورت ترجمہ ڈاکٹر یوسف کمال نے کیا ہے "آسماں میں کمیں گاہیں" کے نام سے ساہتیہ اکیڈمی نے شائع کر دیا ہے۔ پروفیسر کمار اچھے ناول نگار اور ڈرامہ نویس بھی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں فیلو آف رائل سوسائٹی آف لٹریچر بنایا گیا جو بہت بڑا اعزاز ہے۔ پروفیسر کمار کا چھٹا مجموعہ کلام Wool Gatherings زیر اشاعت ہے۔ Faiz Ahmed Faiz

Selected Poems کو بھی پروفیسر کمار کا تخلیقی کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے فیض کی نظموں کے جو ترجمے کیے ہیں وہ خاص تخلیقی شان رکھتے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ متن سے بھی وہ بڑی حد تک وفادار رہے ہیں۔ فیض کے مترجمین میں پروفیسر کمار کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ فیض کے ہم وطن ہیں۔ اسی کالج کے فارغ التحصیل ہیں جہاں فیض نے تعلیم پائی اور دونوں کا قومی مزاج Ethos ایک ہے۔ ادب کی دیگر اصناف کے ترجمے کے لیے دونوں زبانوں پر عبور کافی ہے لیکن شاعری کا اچھا مترجم اور ترجمان شاعر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کا ثبوت پروفیسر کمار کے ان کامیاب ترجموں سے ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں فیض کی سو منتخب منظومات کے تراجم شامل ہیں اتنی بڑی تعداد میں اس سے پہلے کسی مترجم نے فیض کی نظموں کے ترجمے نہیں کیے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ ہندوستان میں فیض یوں بھی بہت مقبول شاعر ہیں پروفیسر کمار کے ترجموں نے ان کی شاعری کو انگریزی داں حلقے میں پہنچا کر ان کی مقبولیت میں اور اضافہ کر دیا ہے

(مغنی تبسم)

نام کتاب: شعلہ۔ گل (شاعری)   مصنف: سردار الہام   سائز 1/8 ڈیمائی   صفحات: ۱۲۸
ناشر: مصنف   ملنے کا پتہ: حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان۔ حیدرآباد   قیمت: چالیس روپے

نئی نسل کے لیے سردار الہام کا نام اجنبیت رکھتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے وہ شعر و ادب کی محفلوں سے کنارہ کش رہے۔ شاعری بھی بہت کم کی۔ لیکن ایک زمانہ تھا جب حیدرآباد کے نوجوان ترقی پسند شاعروں میں انھیں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں میں ابراہیم جلیس، عالم خوندمیری، میکش، نظر حیدرآبادی، سلیمان اریب، سری نواس لاہوٹی وغیرہ ان کے معاصرین میں تھے۔

اپنے ہم عصر حیدرآبادی شعرا میں سردار الہام کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ انھوں نے، جب کہ دوسرے شاعر پابند نظمیں لکھ رہے تھے، کئی آزاد نظمیں کہیں۔ ان دنوں شاید مخدوم محی الدین کی صرف ایک آزاد نظم "اندھیرا" شائع ہوئی تھی۔ سردار الہام نے پابند نظموں کے سانچوں میں بھی مختلف تجربے کیے۔ غزلیں اس دور میں انھوں نے نہیں کہیں۔ اس زمانے میں سردار الہام کی نظمیں اردو کے موقر جریدوں میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دس بیس برس تک شعر کہتے رہنے کے باوجود مجموعۂ کلام چھپوانے سے گریز کرتے تھے جب کہ آج شاعر شعر گوئی کے آغاز کے سال ڈیڑھ سال بعد مجموعہ چھپوا لیتا ہے۔ سردار الہام کا یہ خیال تھا کہ پہلے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے بعد شاعر کے بارے میں ایک رائے قائم ہو جاتی ہے بعد ازاں وہ اپنے فن میں کتنی ہی ترقی کرے اس کے بارے میں پہلا تاثر ہی قائم رہتا ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام شائع نہیں کروایا۔ اس کے بعد وہ گردش روزگار میں ایسے پھنسے کہ شاعری قریب قریب ترک کر دی۔ مجموعہ۔ کلام اگر انھیں دنوں شائع ہو جاتا تو شاید ترک سخن کی طرف مائل بھی نہ ہوتے۔ شعر گوئی کی لگن باقی رہتی اور بحیثیت شاعر ان کا ایک مقام بن جاتا۔ بڑی مدت بعد انھیں یہ خیال آیا کہ جو کچھ بھی سرمایہ سخن ہے اسے یکجا کر کے شائع کر دینا چاہیے تا کہ وہ محفوظ رہ جائے۔

بہر حال یہ مجموعہ۔ کلام بہت تاخیر سے ہی شائع ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔ اس مجموعے کی رومانی نظمیں، ممکن ہے اب بھی نوجوانوں کی تسکین کا ذریعہ بنیں لیکن اس میں کسی قدر شبہ بھی ہے کہ اب عشق و محبت کے معیار بدل چکے ہیں۔ سماجی حالات بھی وہ نہیں رہے۔ البتہ اس مجموعے کی مسائلی اور فکر انگیز نظمیں آج کے حالات سے بھی مطابقت رکھتی ہیں اور اپنی فنی خوبیوں کی وجہ سے یقین ہے کہ اردو نظم کے قابل قدر سرمائے کا حصہ بن جائیں گے۔ مثالیں دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ مجموعہ اس لائق ہے کہ اسے خرید کر پڑھا جائے۔

(مغنی تبسم)

مجلہ نوائے گلبرگہ (حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز نمبر)   شمارہ نمبر ۲۔ ۱۹۹۵ء
مدیر اعلیٰ، پروفیسر قیوم صادق   مدیر: محمد عبد الباری   شریک مدیر: محمد افضل فاروقی

یہ گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے شائع ہونے والے مجلے نوائے گلبرگہ کا خاص نمبر ہے۔ اس میں شامل مقالوں میں حضرت خواجہ بندہ نواز کی حیات، سیرت اور تصانیف کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کے مضامین کے علاوہ مشاہیر ادب کے مقالے بھی شامل ہیں جن میں سے بعض غالباً حضرت بندہ نواز کے عرس کے موقع پر منعقدہ سمیناروں میں پڑھے گئے تھے۔ بعض مضامین دیگر رسالوں سے ماخوذ ہیں۔ قومی یک جہتی اور خواجہ بندہ نواز کے موضوع پر چیدہ مضامین شامل ہیں اور ان میں غیر ضروری تکرار ہوئی ہے۔ معراج العاشقین اور حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب قدیم اردو کی تصانیف پر بھی بعض مقالہ نگاروں نے روشنی ڈالی ہے۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر سید محمد، پروفیسر سید مصباح الدین رفعت، محمد اکبر الدین صدیقی صاحب، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، سراج الدین علی خان صاحب، پروفیسر میر محمود حسین، سجادہ نشین روضہ خرد، پروفیسر قیوم صادق، جناب وہاب عندلیب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مضامین کے علاوہ اس مجلے میں پروفیسر راہی قریشی، وقار خلیل، حمید الماس، محمد عبدالرحیم آرزو، رشید احمد رشید، لطیف انجم قادری، غلام اثر اور محمد ماجد علی داعی کی منقبتیں بھی شامل ہیں۔ مجلے کو زینتِ تقریظ حضرت سید محمد حسینی سجادہ نشین روضہ بزرگ سے ملی ہے۔

مجلے کی کتابت نہایت ناقص ہے۔ اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مجموعی طور پر یہ مجلہ کافی معلومات افزا ہے۔ اس کے منتخب مضامین کو علاحدہ کتابی صورت میں شائع کرنا مناسب ہوگا۔

(ڈاکٹر صبیحہ نسرین)

کتاب کا نام: مضراب (شاعری) مصنف: امام الدین فدا صفحات: ۱۰۲ سائز: 1/8 ڈیمائی

پتہ: A/12 /867-2-16 جیون یار جنگ کالونی، سعید آباد، حیدرآباد-659

امام الدین فدا، بزرگ شاعر، صحافی اور ادبی کارکن کی حیثیت سے جانے جاتے رہے ہیں تقریباً چار دہوں سے وہ حیدرآباد کی ادبی، شعری اور صحافتی برادری کے ایک حرکیاتی فرد رہے ہیں۔ علی اختر، ماہر القادری، عبدالقیوم خاں باقی، نجم آفندی، حیرت بدایونی کی محفلوں اور علمی صحبتوں سے استفادہ کیا، ادارہ ادبیات اردو کی شعری محفلوں میں بھی شرکت کی۔ ریاست حیدرآباد میں بزم اقبال ایک سرگرم ادبی انجمن تھی۔ امام الدین فدا اس بزم کے شریک معتمد بھی رہے۔ ہفتہ وار "مضراب" بھی برسوں شائع کیا۔ غرض حیدرآباد قدیم کی علمی ادبی اور شعری محفلوں میں فدا نے شاعری کی شمع روشن رکھی۔

عرصہ بعد ان کا مختصر مجموعۂ کلام مضراب کے نام سے شائع ہوا ہے، اس مجموعے میں نظمیں اور غزلیں، حمد و نعت اور سلام و منقبت سبھی شامل ہیں۔

فدا روایتی اور کلاسیکی طرز و اسلوب کے شاعر ہیں، عصری مسائل اور زندگی کی سچائیوں کا ادراک بھی ان کی شاعری میں اپنا تاثر چھوڑتا ہے

چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہر ایک رات تشدد نواز تھی لیکن — جنوں نواز سویرا مرے گماں میں نہ تھا

تہذیب کے دعوے داروں نے بنیاد کے پتھر توڑ دیے — تعمیر کے نقشے بدلیں گے، معمار بدلنے والے ہیں

نظر نظر پہ سلاسل، قدم قدم زنداں — عجیب حال میں انساں ہے کیا کیا جائے

ڈاکٹر علی احمد جلیلی کی تحریر کے مطابق "فدا نے بڑی سنجیدگی، فن کاری اور کسی قدر اعتماد کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر طے کیا ہے۔"

اس مجموعے پر ڈاکٹر رحمت یوسف زئی نے بھی اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔ اس کتاب میں ایک غزل جو بہت اچھی لگی، اس کے چند شعر یہ ہیں:

رقصِ جنوں پہ سر بہ گریباں ہے زندگی — دھوکا فریب، جرم و خطا خیریت سے ہیں

چارہ گری کے نام پہ جاری ہے زر گری — ہمدردیاں، سلام و دعا خیریت سے ہیں

نفرت فروشیاں ہیں قیادت کے بھیس میں — رسم وفا، خلوص، فدا خیریت سے ہیں

(وقار خلیل)

---0000---

ادارے کی خبریں

ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں جناب انصر بیگ صاحب صدر نشین آندھرا پردیش اردو اکیڈمی اور دیگر عہدیداران اکیڈمی کا خیر مقدم

۱۴/ جولائی ۹۵ء کو جناب انصر بیگ صاحب صدر نشین آندھرا پردیش اردو اکیڈمی، جناب اعجاز قریشی صاحب ڈائرکٹر / سکریٹری اردو اکیڈمی، جناب غضنفر علی صاحب جوائنٹ ڈائرکٹر اردو اکیڈمی، جناب حسن فرخ صاحب پی۔آر۔او اردو اکیڈمی نے ادارۂ ادبیات اردو کا معائنہ کیا۔ صدر ادارہ پروفیسر جعفر نظام نے عہدہ داران اردو اکیڈمی کا خیر مقدم کیا اور ادارے کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کے لیے اکیڈمی سے مالی تعاون کی خواہش کی۔ پروفیسر مغنی تبسم نے ادارے کی ہمہ جہت سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے دکنی ادب اور کلچر کو فروغ دینے کے سلسلے میں ادارے کی خدمات کی تفصیل بیان کی۔ جناب زاہد علی خاں صاحب مدیر روزنامہ سیاست و رکن مجلسِ انتظامی ادارۂ ادبیات اردو نے بتایا کہ کس طرح عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ، ادارۂ ادبیات اردو کے تعاون سے اردو خواندگی کی مہم کو وسیع پیمانے پر آگے بڑھا رہا ہے۔ مرزا انصر بیگ صاحب صدر نشین اردو اکیڈمی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اردو کے ادارے جنگی خطوط پر اردو محاذ پر سرگرم عمل ہوں اور اپنے حقوق منوانے کی جدوجہد کو تیز کریں۔ انھوں نے ادارے کی سرگرمیوں کی ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس ادارے کی زیادہ سے زیادہ مدد کرنا چاہتے ہیں تاکہ نادر علمی ادبی کتابوں اور مخطوطات کا ذخیرہ اسکالرس کے استفادے کے لیے اچھی حالت میں رہے۔ اس کے لیے ادارے کو مائیکرو فلم یونٹ خریدنا چاہیے۔ جناب اعجاز قریشی صاحب نے کہا کہ وہ ڈاکٹر زور کے زمانے ہی سے اس ادارے کی سرگرمیوں سے وابستہ رہے ہیں۔ اب ادارے کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں جو بہت خوش آئند بات ہے۔ ادارہ ادبیات اردو، دکن کے اردو بولنے اور پڑھنے والوں کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے جس کی حفاظت اور ترقی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ جناب غضنفر علی صاحب نے بھی مخاطب کیا۔ اس موقع پر شریک معتمد صفی الدین قادری صاحب مجلس انتظامی کے اراکین راجہ پر مانند سنگھی، بلقیس علاء الدین صاحبہ، محمد منظور احمد صاحب، فاطمہ عالم علی خاں صاحبہ، غلام جیلانی صاحب، معتمد شعبہ امتحانات، پروفیسر اکبر علی بیگ کے علاوہ راشد آذر صاحب، ڈاکٹر داؤد اشرف، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، ڈاکٹر بیگ احساس، ڈاکٹر محمد انورالدین، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، محسن علی صاحب، سید جلیل الدین صاحب اور دوسرے اہلِ قلم اصحاب موجود تھے۔ معتمد عمومی پروفیسر مغنی تبسم نے شکریہ ادا کیا۔

ادارۂ ادبیات اردو کا معائنہ

جولائی 95ء اور اگست 95ء میں حسب ذیل معززین نے ادارۂ ادبیات اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے ادارے کی ممکنہ اعانت کا وعدہ کیا اور کتاب الرائے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے۔

1۔ جناب انصر بیگ صاحب صدر نشین آندھرا پردیش اردو اکیڈمی، حیدرآباد۔
2۔ جناب غضنفر علی جوائنٹ ڈائرکٹر اردو اکیڈمی، حیدرآباد۔
3۔ جناب اعجاز قریشی ڈائرکٹر و سکریٹری آندھرا پردیش اردو اکیڈمی، حیدرآباد۔
4۔ ڈاکٹر محمد مقبول حق (مقیم امریکہ)
5۔ محترمہ شاہین حق (مقیم امریکہ)
6۔ ڈاکٹر سید عبدالسمیع (مقیم لاس اینجلز۔ امریکہ)

7- جناب ساگر سرحدی (بمبئی)
8- جناب معین الدین عثمانی (جلگاؤں، مہاراشٹرا)

شعبۂ خواتین ادارہ ادبیات اردو

شعبہ خواتین ادارۂ ادبیات اردو کا ادبی اجلاس ۲۵/ جون صبح ساڑھے دس بجے ایوان اردو میں منعقد ہوا۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین نے صدارت کی۔ محترمہ حنا شبیدی نے اپنی تین غزلیں پیش کیں۔ پروفیسر مغنی تبسم نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ حنا شبیدی کے کلام پر ان کے والد حضرت سعید شہیدی کا رنگ سخن غالب ہے۔ انھیں اپنا الگ اسلوب پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جناب وسیم عباس اور ڈاکٹر سید حسن نے کہا کہ حنا شبیدی کے کلام میں عصری حسیت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جناب وقار خلیل نے کہا حنا شبیدی کی شاعری میں بڑے امکانات ہیں وہ نظم کی صنف پر بھی توجہ دیں تو بہتر ہے۔ حنا شبیدی نے اعتراضات کے جواب دیے۔ محترمہ سکینہ وسیم عباس نے اپنا تازہ افسانہ "برزخ" پیش کیا جسے عام طور پر پسند کیا گیا۔ پروفیسر مغنی تبسم، جناب وسیم عباس اور محمود حامد نے افسانے کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا۔ صدر جلسہ محترمہ سلطانہ شرف الدین نے پیش کردہ تخلیقات کو سراہا۔ انھوں نے حنا شبیدی کے بارے میں کہا کہ وہ ہم عصر شاعرات میں اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ قمر جمالی کے شکریے پر محفل اختتام کو پہنچی۔

- شعبۂ خواتین ادارہ ادبیات اردو کا ادبی اجلاس ۳۰/ جولائی ۹۵ء کو صبح گیارہ بجے ایوان اردو میں منعقد ہوا۔ محترمہ لکشمی دیوی راج نے جلسے کی صدارت کی۔ پروفیسر اشرف رفیع نے "دکنی تہذیب، تاریخ و ادب۔ تحقیقی امکانات۔" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے بتایا کہ دکنی ادب بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی دور کی تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ اسے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام ادارہ ادبیات اردو انجام دے سکتا ہے اور دے رہا ہے۔ انھوں نے تحریری ادب کے علاوہ دکنی کے ضرب الامثال، لوک گیتوں، پہیلیوں وغیرہ کو اکٹھا کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا اور کہا کہ اس ورثے کو نئی نسل تک پہنچانا چاہیے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے کہا کہ ادارۂ ادبیات اردو، جامعۂ عثمانیہ اور یونیورسٹی آف حیدرآباد کے تعاون سے دکنی تحقیق کے کام کو آگے بڑھایا جائے گا۔ آج ہمارے محققین اور طلبہ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ دکنی زبان کے تلفظ کا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آڈیو کیسٹ تیار کیے جائیں۔ قمر جمالی نے تجویز پیش کی کہ دکنی پہیلیوں کو بوجھنے کا ایک کوئز پروگرام ماہ اکتوبر ۹۵ء میں منعقد کیا جائے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ علی فاکھی نے بھی دکنی زبان و ادب پر تحقیقی کام کی ضرورت پر زور دیا۔ صدر جلسہ محترمہ لکشمی دیوی راج نے دکنی زبان و ادب کے بارے میں شعبۂ خواتین کی تحریک کا خیر مقدم کیا اور اس سلسلے میں مفید مشورے دیے۔ قمر جمالی نے شکریہ ادا کیا۔

- ۲۷/ اگسٹ ۱۹۹۵ء کو صبح گیارہ بجے ایوان اردو میں شعبۂ خواتین کا اجلاس محترمہ سلطانہ شرف الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ بشریٰ عبد الواحد نے اپنا مضمون "پالکس"، اور محترمہ فاطمہ عالم علی خاں نے انشائیہ "انھیں شکایت ہے"۔ پیش کیا۔ پروفیسر اشرف رفیع نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ بشریٰ صاحبہ سماجی کاموں میں عملی طور پر حصہ لیتی ہیں۔ سماجیات اور سیاسیات پر ان کی گہری نظر ہے۔ فاطمہ عالم علی خاں صاحبہ نے اپنے انشائیے میں ہمارے معاشرے کے مسائل پر اور بالخصوص اخلاقی اقدار پر عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ ثریا مہر صاحبہ نے اپنی شعری تخلیقات پیش کیں جنھیں سامعین نے پسند کیا اور داد دی۔ مباحث میں پروفیسر اشرف رفیع کے علاوہ معان منظور، نصرت محی الدین اور وقار خلیل نے حصہ لیا۔ صدر جلسہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ نے اس اجلاس میں پیش کردہ تخلیقات پر اظہار خیال کیا اور آخر میں قمر جمالی صاحبہ نے شکریہ ادا کیا۔

اجلاس کے بعد محترمہ عالم علی خاں صاحبہ کی صدارت میں شعبہ خواتین کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ شعبے کی معتمد پروفیسر اشرف رفیع نے جلسے کی کارروائی چلائی۔ مجلس عاملہ نے طے کیا کہ ۱۴/اکتوبر ۹۵ء کو "بوجھو تو جانیں" کے عنوان سے جونیر کالجوں اور ڈگری کالجوں کے طلبہ اور طالبات کے لیے پہیلیوں کا مقابلہ منعقد کیا جائے۔

شعبۂ امتحانات ادارہ ادبیات اردو

ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام اردو امتحانات اردو فاضل، اردو عالم اور اردو ماہر ۲۷/اپریل سے ۳۰/اپریل تک حیدرآباد مرکز اردو ہال (حمایت نگر) کے علاوہ بصراحتِ ذیل مقامات پر منعقد ہوئے۔ بودھن، بھینسہ، پوچم پاڈ پراجکٹ، نیکمال، جگتیال، سرپور کاغذ نگر، سنگاریڈی، شمس آباد، عادل آباد، کرنول، کریم نگر، گلبرگہ (کرناٹک)، محبوب نگر، نارائن پیٹھ نظام آباد، نلگنڈہ، سلطان پور کناری ضلع بہردوئی (اترپردیش)۔

اردو ماہر۔ شرکاء: ۲۱۰ اُمیدوار، درجۂ اول (۱۲۹)، دوم (۲۸) سوم (۳) تکمیل (۲) نتیجہ: ۱%۷

اردو عالم: شرکاء: ۲۸۹ اُمیدوار، اول (۳)، دوم (۱۱۰)، سوم (۴۱)، تکمیل (۴۱) نتیجہ ۳%۷

اردو فاضل: شرکاء: ۴۳۵ امیدوار: اول (۳۲)، دوم (۹۸)، سوم (۳) تکمیل (۴۷)، کامیاب پارٹ ا (۵۵) پارٹ اا (۵۵)۔۔۔۔۔۔ نتیجہ ۲%۷

مجلس انتظامی شعبۂ امتحانات کا اجلاس ۲/جولائی ۹۵ء کو ایوان اردو میں پروفیسر مغنی تبسم صاحب نائب صدر شعبہ امتحانات کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں امتحانات منعقدہ اپریل 95 کی توثیق کی گئی اور آئندہ امتحانات اکتوبر ۹۵ کی منظوری دی گئی۔ اس کے علاوہ امتحانات کی فیسوں میں اضافے اور ممتحن صاحبان کے الاؤنس پر بھی نظرثانی کی گئی اور نئے مراکز کی اجازت پر غور کیا گیا۔ اس اجلاس میں معتمد شعبۂ امتحانات پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ، ڈاکٹر محمد علی اثر، جناب محمد منظور احمد، ڈاکٹر اندو وششٹ اور جناب سید جلیل الدین (اراکین) نے شرکت کی۔

مرکز خوش نویسی ادارۂ ادبیات اردو

ترقی اردو بیورو (مرکزی وزارت تعلیم و انسانی بہبود حکومت ہند) کے زیر انتظام ادارہ ادبیات اردو کے مرکز خوش نویسی کا سالانہ امتحان ۲۳/اور ۲۴/اگست ۹۵ء کو ایوان اردو میں منعقد ہوا۔ امتحانات کی کمیٹی میں صدر ادارہ پروفیسر جعفر نظام، معتمد عمومی ادارہ پروفیسر مغنی تبسم، نمائندہ ترقی اردو بیورو جناب مصطفٰے ندیم خاں غوری اسسٹنٹ ڈائرکٹر ٹی یو بی (حیدرآباد برانچ) اور مس سنجیدہ بیگم سینئر ٹیچر شامل تھیں۔

دو سالہ خوش نویسی کورس کی تکمیل مندرجہ ذیل امیدواروں نے کی

درجۂ امتیاز۔ محمد عبدالغفار، سیدہ عرفانہ، درجہ اول، مرزا محمود بیگ، صدیقہ سلطانہ،

درجۂ دوم۔ احمد مقیم الدین، زینب بیگم، سید فیض پاشاہ حسینی

سالِ اول۔ امتیاز۔ محمد سردار علی، شاہ تاج بیگم، اسریٰ تبسم

درجۂ اول۔ محمد عارف علی۔ راحت النساء، درجہ دوم۔ سید طاہر علی، محمد ظہیر الدین۔

۲۸/اگست ۹۵ کو مرکز خوشنویسی کے لیے جونیر استاد کا انٹرویو ہوا۔ سلکشن کمیٹی جس میں پروفیسر جعفر نظام (صدر ادارہ) پروفیسر مغنی تبسم (معتمد عمومی ادارہ) جناب مصطفٰے ندیم خاں غوری (TUB) اور مس سنجیدہ بیگم نے بہ اتفاق آرا جناب رضی الدین اقبال (سابق فارغ التحصیل مرکز خوش نویسی ادارہ) کے بہ حیثیت جونیر استاد تقرر کی عارضی منظوری دی۔ اسی روز نئے امیدواروں کا تحریری امتحان اور انٹرویو بھی لیا گیا اور کمیٹی نے (۱۸) امیدواروں کو منتخب کیا۔ یکم ستمبر ۹۵ء سے مرکز خوش نویسی کی باقاعدہ کلاسوں کا آغاز ہوا۔ سال اول میں ۱۸ اور سال دوم میں ۷/امیدوار خوش نویسی کی تعلیم اور تربیت حاصل کررہے ہیں۔

***

ادارۂ ادبیات اردو کے بارے میں مشاہیر اور معززین کی آراء

ہم کو ادارۂ ادبیات اردو آنے اور یہاں کے نایاب ادبی ذخائر کے دیکھنے کا موقع ملا۔ ساتھ ہی ساتھ ہم اہل اردو کی اپنی زبان اور ادبی ورثے سے بے اعتنائی کا بھی شدید احساس ہوا۔ اپنی ناقدرشناسی کی شاید کسی اور زبان میں کوئی مثال نہ ملے۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لیے اردو والوں میں بیداری اور حسیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

جناب انصر بیگ صاحب صدر نشین آندھراپردیش اردو اکیڈیمی
جناب غضنفر علی جوائنٹ ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی۔ 12/ جولائی 1995ء

ایک بار پھر ادارۂ ادبیات اردو دیکھا اس کے خزانے دیکھے ادارہ دیکھنے کی چیز ہے۔ دیکھ کر اس کے محاسن بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے۔

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

ادارے میں ادب اور تہذیب کا جو ورثہ محفوظ ہے وہ آنے والی نسلوں کو اردو زبان اور اس کی تہذیب کی عظمت اور بلندی کا احساس دلاتا رہے گا۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادارے کی سرگرمیوں کا اس بڑے پیمانے پر احیا عمل میں آرہا ہے جس پیمانے پر ڈاکٹر زور مرحوم کے زمانے میں یہ سرگرمیاں جاری تھیں۔ یہ ادارہ اردو والوں کے لئے خاص کر دکن کے اردو بولنے اور پڑھنے والوں کے لیے ایک مقدس ورثہ ہے۔ اس کے حفاظت اور اسے پروان چڑھانے کے لیے جو بھی کام کیا جائے کم ہے۔

اعجاز قریشی۔ ڈائرکٹر و سکریٹری آندھراپردیش اردو اکیڈیمی۔ 12 / جولائی 1995ء

ہم کو ایوان اردو کو دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ یہاں اردو زبان اور دکنی ادب اور کلچر کو فروغ دینے کے لیے اہم کام کیا جارہا ہے۔ ہم کو اس ادارے کی خدمت کرنے کی بڑی خواہش ہے۔ جو کچھ ہم سے ممکن ہو گا ہم ادارے کے لیے کریں گے۔ ہم ادارے کے عہدہ داروں اور کارکنوں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد مقبول حق اور شاہین حق، امریکہ۔ 22 / جولائی 1995ء

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آج ادارۂ ادبیات اردو کے نوادرات اور لائبریری کے معائنے کا موقع ملا۔ انتہائی خوش ہوں کہ آج بھی حیدرآباد میں ایسی نایاب کتابیں، مخطوطات اور اخبار و رسائل محفوظ ہیں تاکہ آنے والی نسلیں ہندوستان کی ملی جلی اردو تہذیب کے صحیفوں سے استفادہ کرسکیں۔ ادارے کے تمام کارکن اور ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب قابل تحسین و مبارکباد ہیں کہ ان چیزوں کی بقا کے لیے پوری کوشش کی جارہی ہے۔ میری نیک تمنائیں اس ادارے اور زبان اردو کے ساتھ ہیں اور انشاء اللہ اس مقصد کی کامیابی کے لیے جو ممکن ہوسکے گا کرتا رہوں گا۔ شکریہ۔

ڈاکٹر عبدالسمیع کارڈیالوجسٹ (مقیم لاس اینجلز۔ امریکہ)۔ ۲۲/ جولائی ۹۵ء

ادارے کا ذرا سا جائزہ لیتے ہی آدمی اپنے ہوش کھو بیٹھتا ہے کہ کس پیار اور لگن کے ساتھ اس پرانے تہذیبی ورثے کو حفاظت سے رکھا ہے۔ ماضی کے ان تمام جلوہ فروزیوں کے ساتھ اپنے نقش و نگار کے ساتھ آنکھوں کو چکاچوند کردیتا ہے۔ اس ادارے کی مدد کرنا اور اس کو بچانے رکھنا ہر فرد ہر حکومت کے لیے ضروری فرض بنتا ہے نہیں تو ہم اس عالی شان سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

ساگر سرحدی۔ بمبئی۔ 21 / اگست 1995

آج اتفاق سے حیدرآباد کا قدیم ترین ادارۂ ادبیات اردو دیکھنے کا موقع ملا۔ یقین جانیے نوادرات اردو دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ بس دعا ہے کہ اللہ انھیں آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ فرمائیں۔ یہاں کا انتظام اور اراکین حضرات کا سلوک بھی ادارے کے قیام اور اسے بہتر چلانے کی مناسبت سے کافی حوصلہ افزا محسوس ہوا۔ میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

معین الدین عثمانی۔ جلگاؤں (مہاراشٹرا)۔ 21/ اگست 1995ء

وقار خلیل

وفیات

عوض سعید مرحوم: بر صغیر ہند و پاک کے نامور افسانہ نویس اور خاکہ نگار ادیب جناب عوض سعید ۲ جولائی ۱۹۹۵ء کو شکاگو (امریکہ) میں رحلت کر گئے۔ وہ اپنی صاحب زادی ڈاکٹر سیما اور داماد ڈاکٹر وجاہت سے ملنے کے لیے کوئی پانچ ماہ قبل اپنی شریک حیات محترمہ کنیز فاطمہ کے ساتھ حیدرآباد سے شکاگو کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ وہ قلب کے عارضے میں مبتلا تھے۔ صحت بہتر ہونے لگی تھی۔ شکاگو میں "عوض سعید کے ساتھ ایک ادبی شام" کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس میں انھوں نے اپنی نئی کہانی سنا کر داد پائی تھی۔ اس تقریب میں ان کے دوست جناب قدیر زماں نے بھی شرکت کی تھی۔ اچانک اُن کے قلب پر حملہ ہوا۔ اوپن ہارٹ سرجری بھی عمل میں آئی تھی، جو کامیاب نہ ہو سکی۔ عوض سعید مرحوم کی تدفین شکاگو (امریکہ) میں ہوئی۔ جلوس جنازہ میں ہند و پاک کے تارکان وطن ادیبوں اور قلم کاروں نے شرکت کی۔ مرحوم کے صاحب زادے ڈاکٹر اوصاف سعید ج الفیسر سعودی عربیہ مقیم جدہ بھی تدفین کے وقت شکاگو پہنچ گئے تھے۔ عوض سعید مرحوم، اردو کے نامور دانش ور، نقاد، ادیب اور شاعر پروفیسر مغنی تبسم صاحب کے برادرِ نسبتی (بہنوئی) تھے۔

عوض سعید ۶ ڈسمبر ۱۹۳۳ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے، فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے دفتر میں کارگزار رہے۔ طبعاً منکسر مزاج، خوش اخلاق، وضع دار، کم سخن اور گہری بصیرت رکھنے والے باشعور افسانہ نویس ادیب تھے۔ ادب اور زندگی کی صحت مند اور ترقی پذیر قدروں کو تادم واپسیں عزیز رکھا۔ ان کے افسانوں کا افق زندگی اور انسانیت سے عبارت رہا۔ تجریدی اور علامتی اظہار عوض سعید کی کہانیوں کا منفرد اور نمایاں وصف رہا ہے۔

کہانیوں کے چھ مجموعے اور خاکوں پر مشتمل ایک کتاب چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ جن کی تفصیل یوں ہے۔

۱۔ سائے کا سفر (۱۹۶۹ء) ۲۔ تیسرا مجسمہ (۱۹۷۳ء) ۳۔ رات والا اجنبی (۱۹۷۷ء) ۴۔ کوہِ ندا (۱۹۷۹ء) ۵۔ خاکے (۱۹۸۵ء) ۶۔ بے نام موسموں کا نوحہ (۱۹۸۷ء) ۷۔ کنواں، سمندر اور آدمی (۱۹۹۳ء)

میر نقی علی خاں ثاقب مرحوم: مملکت آصفیہ حیدرآباد دکن کے آخری تاجدار نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کے پوتے، نواب تقی جاہ کے صاحب زادے پرنس میر نقی علی خاں ثاقب جن کے پانچ شعری مجموعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں ۸ جولائی ۱۹۹۵ء کو بہ عارضہ قلب رحلت کر گئے۔ احاطہ مسجد جودی (کنگ کوٹھی۔ حیدرآباد) میں تدفین عمل میں آئی۔

ثاقب مرحوم، جدید لب و لہجے کے منفرد شاعر، وضع دار شخصیت اور عہد کے کرب سے آشنا فرد تھے۔ خاندانِ آصفی کی روایات کے پاس دار ہوتے ہوئے بھی مزاج قلندرانہ پایا تھا طبیعت میں سادگی، سنجیدگی اور ایک گونہ بے خودی و سرشاری تھی۔

۲۹ نومبر ۱۹۳۹ء تاریخ پیدائش ہے۔ ۱۹۵۴ء سے شعر کہنے لگے۔ حضرت خورشید احمد جامی سے تلمذ رہا۔ پہلا شعری مجموعہ "نقشِ جاوداں" ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد "کتاب سحر" ۱۹۷۱ء میں طبع ہوا۔ دو سال بعد "دشت نارسا" کے نام سے تیسرا مجموعہ کلام منظرِ عام پر آیا" وقفۂ خواب" جو ۱۹۹۰ء میں چھپا ان کا چوتھا شعری منظر نامہ ہے۔ آخری مجموعۂ کلام "بوند بوند آسمان" کا ہندی ایڈیشن وفات سے دو ماہ قبل منظرِ عام پر آیا اور اسی مجموعے کا اردو ایڈیشن بعد از مرگ ۲۱ اگست ۱۹۹۵ء کو ایک تقریب میں جاری ہوا جس کی صدارت پروفیسر مغنی تبسم صاحب معتمد اعزازی ادارہ ادبیات اردو نے کی۔ اس مجموعے کو رحیل پبلی کیشنز حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔

نقی علی خاں ثاقب کی غزلیہ شاعری ان کے انفرادی شعور اور عصری حسیت اور لہجے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسی سبب انھیں شاہی گھرانوں کے روایتی شاعروں سے علاحدہ کر کے پڑھا جانا چاہیے۔

مرتب: سید خلیل الدین
ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ فل

اشاریہ ماہ نامہ "سب رس" حیدرآباد

جنوری تا ڈسمبر ۱۹۹۴ء

مصنف	مقالے		صفحات
ابراہیم یوسف	اردو مثنویوں سے ماخوذ ڈرامے	مارچ و اپریل	۶
اطہر ۔ محمد علی، ڈاکٹر	مولانا محمد باقر آگاہ ۔ جدید تحقیق کی روشنی میں	اگست	۲۳
داؤد اشرف ۔ سید، ڈاکٹر	۱۔ ریاست حیدرآباد میں گوکھلے میموریل اسکالرشپ کا قیام ۔ آصف سابع کی وسیع النظری	مارچ و اپریل	۲۳
	۲۔ حضرت امجد حیدرآبادی ۔ (وظیفے کی اجرائی میں خاص رعایت)	جولائی	۲۰
زور سیدہ پروین	آرکائیوز میں محفوظ آصف سادس و آصف سابع کے فرمان	اگست	۳۲
عبدالمنان ۔ سید، ڈاکٹر	عثمانیہ میڈیکل کالج	مارچ و اپریل	۴۷
فاروق محمد خان ۔ پروفیسر	عہد سراج کا اورنگ آباد	جنوری و فبروری	۴۳
قادری ۔ سید محمد مرتضیٰ	۱۔ انسان کامل	جنوری و فبروری	۱۵
ایضاً	۲۔ قرآن مجید	جنوری و فبروری	۱۷
ایضاً	۳۔ مدینے میں دس دن	جنوری و فبروری	۱۹
ایضاً	۴۔ سنہ ہجری	جنوری و فبروری	۲۳
ایضاً	۵۔ تصوف اسلام	جنوری و فبروری	۲۶
ایضاً	۶۔ دکن کے مشہور بزرگ حضرت شاہ افضل بیابانی	جنوری و فبروری	۲۹
ایضاً	۷۔ طریقۂ رفاعیہ حضرت سید احمد کبیر رفاعی	جنوری و فبروری	۳۱
ایضاً	۸۔ مولانا جلال الدین رومی	جنوری و فبروری	۳۳
ایضاً	۹۔ بہادر شاہ ظفر	جنوری و فبروری	۳۶
ایضاً	۱۰۔ چندر بھان برہمن	جنوری و فبروری	۳۸
------	۱۱۔ علامہ اقبال سے ایک استفسار اور اس کا جواب	جنوری و فبروری	۴۰
مسعود حسین ۔ پروفیسر	مثنوی کدم راؤ پدم راؤ پر ایک نظر	اکتوبر تا ڈسمبر	۱۹

شخصیات

انشائیے

کتاب

افسانے

نظمیں

غزلیں

	پہ ہم، زمین پہ چلی گرد واطراف میں گے	جون	۲۶

یادیں

مصنف	عنوان	ماہ	صفحہ
اقبال متین	۱۔ باتیں ہماریاں	جنوری و فبروری	۴۴
	۲۔ باتیں ہماریاں	مئی	۲۸
نور الدین۔ محمد	بھولی بسری باتیں	جولائی	۴۵

توقیت نامہ

مصنف	عنوان	ماہ	صفحہ
اقبال متین	توقیت نامہ (ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب کی زندگی کے چند اہم سنین اور تاریخیں)	مارچ و اپریل	۵۳

اشاریہ

مصنف	عنوان	ماہ	صفحہ
جلیل الدین۔ سید	اشاریہ ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد جنوری تا ڈسمبر ۱۹۹۳ء	مارچ و اپریل	۸۰

اداریے

مصنف	عنوان	ماہ	صفحہ
ادارہ	پہلی بات	جنوری و فبروری	۴
مغنی تبسم	۱۔ پہلی بات	مارچ و مارچ	۵
	۲۔ پہلی بات	جون	۵

مطالعہ

مصنف	عنوان	ماہ	صفحہ
جواد رضوی	مخدوم محی الدین مصنف: الیکسی سوخاچیف مترجم: اسامہ فاروقی	جولائی	۳۷
جین۔ گیان چند، پروفیسر	محمد نسیم الدین فریس کی "تخلیقات"	مئی	۴۴
فاطمہ عالم علی خاں	"ہم کہتے ہیں۔ تم بھی سنو" مصنفہ: عالیہ خاں	اکتوبر تا ڈسمبر	۹۱

تبصرے

مصنف	عنوان	ماہ	صفحہ
اکبر علی بیگ۔ مرزا، پروفیسر	۱۔ میر عثمان علی خاں اور ان کا عہد مصنفہ: طیبہ بیگم	جولائی	۴۵
	۲۔ ایوان شاہ کا ایک مشاعرہ (تمثیل) مصنف: غلام جیلانی	اکتوبر تا ڈسمبر	۱۵
مغنی۔ کمال الدین حسن	یادش بخیر (خاکے اور مضامین)	اگست	۳۴

روئیدادیں

○ ○ ○

گزارش

چندہ دہندگان، خریداران یا اعزازی طور پر "سب رس" حاصل کرنے والے ہندوستانی و بیرونی حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اپنے موجودہ صحیح پتے سے آگاہ کریں تاکہ ان کو رسالہ ملنے میں آسانی ہو۔ شکریہ

شعبۂ اشاعت

سن اجراء: ۱۹۳۸ء — یادگار سید محی الدین قادری زور — فون: 310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۵۷ — اکتوبر، نومبر ۱۹۹۵ء — شمارہ: ۱۰، ۱۱

اس شمارے کی قیمت: بیس روپے

فی پرچہ	۷ روپے	مشرق وسطی اور امریکہ	:	۳۰ ڈالر
زر سالانہ :	۷۵ روپے	پاکستان، برما، سری لنکا	:	۱۵ ڈالر
کتب خانوں سے :	۱۰۰ روپے	انگلستان	:	۱۲ پونڈ

کمپیوٹر کتابت: شارپ کمپیوٹرس، محبوب بازار، بہادر گھاٹ، حیدرآباد - ۲۴ (فون-4574117)

ناشر: ادارہ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے بے ایس - ایس - گرافکس، نارائن گوڑہ میں طبع کروا کے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

معظم جاوید۔ افتخار نسیم۔ صدیقہ شبنم۔ مشتاق پردیسی۔ اسلم عمادی۔ رؤف خیر

پہلی بات

۲۲ / اکتوبر ۱۹۹۵ء کو رفیقِ ادارۂ ادبیاتِ اردو نواب سراج الدین احمد صاحب رحلت کر گئے۔ ان کی وفات سے ادارہ اپنے ایک شفیق رہنما اور بہی خواہ سے محروم ہو گیا۔ بحیثیت رکن مجلس انتظامی ادارے کے مسائل کو سلجھانے اور ادارے کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں ان کے مشورے نہ صرف مفید ہوتے تھے بلکہ ان سے کارکنوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی تھی۔ وہ ادارے کے شعبۂ امتحانات کے صدر بھی رہے۔ انھوں نے اس شعبے کے کام میں باضابطگی پیدا کی اور کئی اصلاحیں کیں۔

نواب سراج الدین احمد، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے برادرِ نسبتی تھے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو سے رسمی وابستگی سے پہلے بھی وہ ادارے کے کاموں میں دل چسپی لیتے تھے اور ڈاکٹر زور ان سے مشورے لیا کرتے تھے۔

نواب سراج الدین احمد ادارۂ ادبیاتِ اردو کے علاوہ دوسرے علمی اداروں سے بھی وابستہ رہے جن میں انجمن علم و عمل، سر نظامت جنگ لائبریری اور ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ قابلِ ذکر ہیں۔

مرحوم اعلیٰ صفات کی حامل شخصیت تھے۔ انھوں نے نہایت دیانت داری اور اصول پسندی کے ساتھ سرکاری ملازمت کے فرائض انجام دیے۔ افرادِ خاندان اور عزیز و اقارب کے ساتھ ان کا برتاؤ مشفقانہ اور ہمدردانہ رہا۔ ضرورت مندوں کی ممکنہ مدد کرتے۔ وہ تہذیب و شائستگی کا مجسمہ تھے۔ ایسے انسانوں کا دنیا سے اٹھ جانا سارے معاشرے کا نقصانِ عظیم ہے۔

ذاتِ باری سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

(ادارہ)

سید ہاشم علی اختر (شکاگو)

جناب سراج الدین احمد صاحب

(حیدرآبادی تہذیب کا ایک مکمل نمونہ نہ رہا)

نواب رفعت یار جنگ بہادر صوبہ دار کے صاحبزادے، سر نظامت جنگ صدر المہام (وزیر) فینانس حکومت نظام کے بھتیجے اور ڈاکٹر
سید محی الدین قادری زور کے برادر نسبتی جناب سراج الدین احمد صاحب وظیفہ یاب ڈپٹی کمشنر کمرشیل ٹیکسز کے انتقال پر ملال سے حیدرآباد
میں حیدرآبادی تہذیب کے ایک اعلیٰ نمائندے کی کمی ہو گئی۔ نواب فخرالملک کے محل ارم منزل کے عین مقابل رفعت منزل نامی عالی شان
عمارت میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے اور نواب احمد علی خاں
صاحب ناظم تعمیرات (برادر بزرگ نواب میر اکبر علی خاں صاحب سابق گورنر یوپی اور اڑیسہ) کی صاحبزادی یسین بیگم سے شادی ہوئی۔ اور
اب دو صاحب زادے ضیاء الدین احمد منصور اور شجاع الدین احمد مجاہد پس ماندگان میں شامل ہیں۔ حیدرآباد کے پرانے لوگ رفعت یار
جنگ بہادر کی اصول پرستی، انصاف پسندی اور سب سے زیادہ ان کی تہذیب اور شائستگی سے واقف ہیں۔ سراج الدین صاحب ایسے انداز کے
ہی رہے اور اپنے لباس، وضع قطع، خودداری، اصول پرستی اور حق گوئی کی وجہ سے جس محکمے میں بھی رہے اپنا ایک مقام اور وقار باقی رکھا۔
۱۹۵۰ء میں جب میں کلکٹر کسٹم تھا ان کا تقرر بحیثیت کمرشیل ٹیکس آفیسر کسٹم ہوا اور میرے ہم زلف ہونے کی وجہ سے ان سے ہمیشہ ملاقات
ہوتی تھی۔ ناشتے سے رات کے کھانے کے بعد تک وہ ہمیشہ اپنی نفیس سلوائی کی شیروانی، بہترین استری کیے ہوئے پاجامے، پاتابوں اور
چمکدار پالش کیے ہوئے جوتوں میں ملبوس رہے اور اپنے گھر میں رہنے کے باوجود میں نے کبھی انھیں مخلع بالطبع نہیں دیکھا۔ ناشتے کے بعد سے
شام کے کھانے تک وہ دفتر میں مسلسل مصروف رہتے تھے اور چند ہی دنوں میں محکمہ کی آمدنی میں زبردست اضافہ کر دکھایا۔

پولیس ایکشن سے کچھ پہلے ان کی بیگم صاحبہ وقار آباد کے سینی ٹوریم میں زیر علاج تھیں۔ اس زمانے میں جمعہ کی چھٹی ہوا کرتی تھی۔
سراج الدین صاحب جمعرات کی شام کی ٹرین سے وقار آباد جاتے اور ہفتہ کی صبح واپس ہوا کرتے تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد کے خطرناک
حالات میں جب ریلوں کو روک کر لوگوں کو مارا پیٹا جارہا تھا۔ دوستوں اور رشتہ داروں کے روکنے کے باوجود سراج الدین صاحب برابر اپنی
شیروانی اور ٹوپی کے ساتھ آتے جاتے رہے اور شاید ان کی شخصیت میں کوئی خاص بات تھی کہ بلوائیوں نے روکا بھی تو ان کے ساتھ کوئی
بدسلوکی نہیں کی۔ وہ خود اتنے غیر متعصب تھے کہ میں نے ہندو اور سکھ عہدہ داروں سے جو ان کے تحت کام کرتے تھے برسوں بعد ان کا ذکر
نہایت عزت اور احترام سے کرتے ہوئے سنا ہے۔ جو ان کی سخت گیری کے ساتھ ساتھ ان کے بااصول انصاف پسندی اور بے خوف طریقہ کار
کے بڑے مداح تھے۔ فرحت منزل رام کوٹ (جو سابق میں جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور کا مشہور ہاسٹل تھا) اور جس میں نواب احمد علی خاں
صاحب رہتے تھے ایک بڑے کمپاؤنڈ میں چار بنگلوں والا ایک وسیع اور عریض مکان تھا جس میں ان کے صاحب زادے لیاقت علی خاں
اسسٹنٹ کمشنر پولیس اور جناب مختار علی خاں صاحب ایچ۔ سی۔ ایس ناظم پولیس اور ڈاکٹر ابو طاہر عبد القادر ناظم میڈیکل ڈپارٹمنٹ، سراج

...رین احمد صاحب اور حفیظ الکبیر خاں آئی۔ سی۔ ایس ناظم عدالت ابوالحسن حبیب اللہ جنرل منیجر بھارت بیدی الکٹریکلز اور میں رہا کرتے تھے۔ ...یک اور داماد سید عبدالطیف رضوی ڈیولپمنٹ کمشنر کرمالک نواب محمود یار جنگ وزیر مال کے مکان سوماجی گوڑہ میں رہا کرتے تھے۔ اس ...مارے گروہ میں سراج الدین احمد صاحب اپنی باوقار عادتوں اور تہذیب اور شائستگی کی وجہ سے ایک ممتاز مقام رکھتے تھے اور بے تکلف ...شتے کے باوجود کسی کو ان سے مذاق کرنے کی جراءت نہیں ہوتی تھی۔ موصوف ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کے برسوں تک بڑے ...عال رکن رہے اور چند سال قبل میرے دور صدارت میں جب محترمہ بیگم زور صاحبہ اور اردو کے ممتاز محقق جناب اکبرالدین صدیقی ...صاحب مرحوم کو ادارے کا رفیق بنایا گیا۔ جس کا درجہ مجلس انتظامی سے اونچا تھا۔ وہ سرنظامت جنگ لائبریری (مدینہ منشن نارائن گوڑہ) کے ...رکن مجلس انتظامی رہے۔ ان کی موت سے حیدرآبادی تہذیب کے ایک خاموش نمائندے اور اردو کے مخلص خدمت گذاروں میں ایک اہم شخصیت کی کمی ہو گئی ہے۔ خدا انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں۔ ان کی بردباری او دوسروں کے احساسات اور جذبات کے احترام کی ایک مثال دینا مناسب خیال کرتا ہوں۔ میری بڑی لڑکی سارہ ا. ر فاروق سلطان کی شادی میں سانچق مہندی کی رسم کے بعد علی الصبح واپس ہونے والے موٹروں کے قافلے میں ان کی نئی ایمبیسڈر کار الٹ کر نظام کلب کے سامنے منٹوں میں جل گئی اور ان کا لڑکا مجاہد بڑی مشکل سے بچ کر نکل سکا۔ اسی واقعے کی اطلاع جب ان کو ہوئی تو انھوں نے کسی پریشانی کا اظہار کیے بغیر صرف پوچھا کہ کیا کسی اور کو چوٹ تو نہیں لگی اور پھر کئی دن سواری نہ ہونے کے باوجود اس واقعے کا کبھی ذکر نہیں کیا۔

○ ○ ○

---

(۱) مجھے آج پہلی بار ادارہ۔ ادبیات اردو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ خدا کرے کہ یہ آخری بار نہ ہو۔

فدایان اردو کے لیے یہ ادارہ گوشہ جنت سے کم نہیں۔ یہاں سیکڑوں حوریں کاغذی پیرہن زیب تن کیے آپ کی تفریح اور دل جوئی کی خاطر موجود ہیں۔ اور منتظر ہیں کہ آپ ان سے ہم کلام ہوں۔ اس جنت کے دربان ڈاکٹر محی الدین زور ہیں جن کا خدا تعالیٰ نے نگاہ خاص سے انتخاب کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس دربان کا شیوہ تخصیص و امتیاز نہیں بلکہ چوراہے پر کھڑے ہو کر یاران نکتہ داں کو صلائے عام کی صدا دیتا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو کی جو خاموش مگر ٹھوس خدمت کی ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ یکم / جنوری۔ ۱۹۶۱ء

---

(۲) آج جب کہ اردو کا بیڑا غرق کر دینے کی خاطر، دنیا کے ساتوں سمندر حملہ آور ہو چکے ہیں، ادارہ۔ ادبیات اردو ایک سنگین بند کی حیثیت سے ان کا مقابلہ کر رہا ہے اور زور صاحب کی قوت بازو ناخدائی کر رہی ہے۔

جوش ملیح آبادی۔ ۱۳/ جنوری۔ ۱۹۶۱ء

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

نواب سراج الدین احمد صاحب کی یاد میں

۲۲/ اکتوبر ۹۵ء کی صبح دس بجے، شفیق و محترم استاد پروفیسر مغنی تبسم صاحب معتمد عمومی، ادارہ ادبیات اردو، نے ٹیلی فون پر یہ اندوہناک اطلاع دی کہ نواب سراج الدین احمد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ تدفین ڈاکٹر زور مرحوم کے والد حضرت غلام محمد زعم رفاعی القادری کی خانقاہ عنایت الہٰی، محاذی پلن مسلم جنگ کے احاطے میں بعد نماز ظہر عمل میں آئے گی۔ میں اور پروفیسر مغنی تبسم صاحب بادیدہ نم وہاں پہنچے۔ ہم نے مرحوم کے چھوٹے صاحب زادے شجاع الدین احمد مجاہد اور ارکان خاندان جن میں قابل ذکر جناب تقی الدین قادری صاحب، جناب صفی الدین قادری صاحب، جناب علی الدین قادری صاحب اور جناب رفیع الدین قادری صاحب (فرزندان ڈاکٹر زور مرحوم) کو پرسہ دیا۔

نواب سراج الدین احمد صاحب، نواب رفعت یار جنگ بہادر ثانی (جناب ضیاء الحق فصیح الدین احمد مرحوم) کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ ان کے والد اور دادا جناب احمد حسین صاحب (نواب رفعت یار جنگ بہادر اولی) دونوں صوبہ دار ریاست حیدرآباد رہے۔ ان دونوں بزرگوں نے بیدر، اورنگ آباد اور ورنگل میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ورنگل میں قالین کی صنعت کو فروغ دیا۔ بیدر میں بیدری کام کو اور اورنگ آباد میں ہاتھ سے بنائے ہوئے کاغذ (Hand Made Paper) کی صنعت کو ترقی دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ ریاست حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں نواب سراج الدین احمد کا خاندان کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے خاندان کے بزرگوں میں نواب عماد جنگ بہادر، نواب سعد جنگ بہادر، نواب نظامت جنگ بہادر کی خدمات مثالی رہی ہیں۔

نواب سراج الدین احمد ۱۵/ جون ۱۹۱۵ء کو ورنگل میں پیدا ہوئے۔ ان کے دو بڑے بھائی نواب غازی الدین احمد انجنیر اور نواب ناصر الدین احمد میسور میں کلکٹر تھے۔ نواب سراج الدین احمد کی سب سے بڑی ہمشیرہ رفعت النساء بیگم صاحبہ جسٹس باسط علی خاں، جج ہائی کورٹ کی اہلیہ تھیں۔ منجھلی ہمشیرہ عظمت النساء بیگم صاحبہ زوجہ ڈاکٹر ظہور الحسن انصاری تھیں۔ تیسری ہمشیرہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ اردو کے ممتاز ادیب، محقق، نقاد، شاعر اور استاد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی رفیق حیات ہیں۔ سب سے چھوٹی ہمشیرہ لیاقت النساء بیگم صاحبہ جناب افضل الدین صاحب آئی۔ پی۔ ایس۔ موظف ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کی زوجہ تھیں۔

نواب سراج الدین احمد کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم گورنمنٹ سٹی کالج میں ہوئی انٹرمیڈیٹ بھی انھوں نے گورنمنٹ سٹی کالج ہی سے کامیاب کیا تھا۔ انھوں نے امتیاز کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ اس کے بعد ایل۔ ایل۔ بی۔ میں انھوں نے داخلہ لیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال تعلیم پانے کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ان کے ہم جماعت ساتھیوں میں جناب اسد اللہ سعید صاحب آئی۔ اے۔ ایس۔ اور جناب احمد علی خان صاحب آئی۔ اے۔ ایس قابل ذکر ہیں۔ گریجویشن کے بعد ہی وہ زمرہ ملازمت میں داخل ہوگئے۔ سیول سپلائز ڈیپارٹمنٹ میں وہ اسسٹنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ ایک عرصہ دراز تک وہ اس محکمہ میں رہے بعد میں وہ کمرشیل ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے منسلک ہوگئے

اور کمرشیل ٹیکس آفیسر کی حیثیت سے ورنگل، کھمم پر ایک عرصہ تک خدمت انجام دی۔ انضرام ریاست حیدرآباد سے پہلے وہ سیلس ٹیکس آفیسر اورنگ آباد بھی رہے بعد ازاں ان کی ترقی ڈپٹی کمشنر، کمرشیل ٹیکس ڈپارٹمنٹ کی حیثیت سے ہوئی۔ جون ۱۹۷۳ء میں وہ وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوگئے۔

۱۹۴۴ء میں نواب سراج الدین احمد کی شادی خانہ آبادی محترمہ یسین بیگم صاحبہ دختر میر احمد علی خان صاحب مرحوم انجینیر (بیرسٹر علی خان مرحوم گورنر اڑیسہ اور یو۔پی کے بڑے بھائی) سے ہوئی۔ ان کے دو صاحب زادے ہیں۔ بڑے صاحب زادے ضیاء الدین احمد منصور پیشے کے لحاظ سے الکٹریکل انجنیر ہیں انھوں نے ٹکساس یونیورسٹی (امریکہ) سے الکٹریکل انجنیرنگ اور ایم۔بی۔اے۔ کیا ہے ایک عرصہ تک وہ ہوسٹن (امریکہ) میں مقیم تھے اس وقت آرامکو کمپنی، دہران (سعودی عرب) میں الکٹریکل انجنیر کی حیثیت سے کارگزار ہیں اپنے قیام امریکہ میں انھوں نے ہوسٹن میں "حیدرآباد اسوسی ایشن" ریاض الدین احمد (بہزاد دکن فیاض الدین احمد نظامی) میر مشیر علی خاں (فرزند میر شبیر علی خاں) اور خالد رضوی ایڈیٹر تہذیب دکن کے تعاون سے قائم کی۔ منصور صاحب کی شریک حیات عاصمہ سلطانہ جناب خواجہ محمد واسع سپرنٹنڈینٹ انجنیر مہاراشٹر کی صاحب زادی ہیں۔ منصور صاحب کو تین صاحب زادے پرویز فصیح الدین احمد، مسرور نور الدین احمد اور شہزاد عماد الدین احمد ہیں پرویز اس وقت گریجویشن کے طالب علم ہیں اور امریکہ میں زیر تعلیم ہیں۔

نواب سراج الدین احمد کے چھوٹے صاحبزادے شجاع الدین احمد مجاہد میکانیکل انجنیر ہیں۔ آج کل وہ کنسٹرکشن سے وابستہ ہیں۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے سعودی عرب میں کنسٹرکشن ہی کی ایک کمپنی میں خدمات انجام دیں۔ حیدرآباد میں وہ سیٹ ون کے سلف امپلائمنٹ اسکیم کے ایڈوائزر بھی رہے۔ مجاہد صاحب کی شریک حیات ڈاکٹر مہرین کمیسٹری میں پی۔ایچ۔ڈی۔ ہیں وہ جناب ابوالحسن محمد حبیب اللہ سابق جنرل مینیجر بھارت ہیوی الکٹریکل کی صاحب زادی ہیں۔ مجاہد صاحب کو دو لڑکے اور ایک لڑکی ہیں۔ لڑکی مہ جبین گاندھی میڈیکل کالج حیدرآباد میں ایم۔بی۔بی۔ایس۔ سال دوم کی طالبہ ہیں۔ صاحب زادے آدم سیف الدین احمد اور عمیر سعد الدین احمد ہائی اسکول اور پرائمری اسکول کے طالب علم ہیں۔

نواب سراج الدین احمد ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد علمی اور ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ وہ انجمن علم و عمل سوسائٹی (قائم کردہ سر نظامت جنگ جو سراج الدین صاحب کے حقیقی چچا تھے) کے ٹرسٹی رہے۔ سر نظامت جنگ بہادر ٹرسٹ کے بھی وہ عرصے تک ٹرسٹی رہے۔ سر نظامت جنگ لائبریری کے وہ رکن مجلس انتظامی بھی رہے۔ ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد سے بھی وہ منسلک رہے۔

نواب سراج الدین احمد اردو کے ایک خاموش اور مخلص خدمت گزار تھے۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے ان لائق سپوتوں میں ایک امتیاز مقام رکھتے تھے جنھوں نے ادارہ ادبیات اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ جس پودے کو ان کے حقیقی بہنوئی، اردو کے ممتاز ادیب محقق، نقاد، شاعر اور استاد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے لگایا تھا اس کو پروان چڑھانے میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر صدیقی، مولوی نصیر الدین ہاشمی، نواب مہدی یار جنگ، نواب اعظم جنگ بہادر، نواب عنایت جنگ بہادر، ہاشم علی اختر آئی۔اے۔ایس۔ وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور سراج الدین احمد کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ نواب سراج الدین احمد کی ہمشیرہ محترمہ تہنیت النساء بیگم (بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور) نے ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی عمارت کے لیے ایک قطعہ

دی۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو رجسٹری کروادی۔ ڈاکٹر زور کے اس مثبت تعمیری کام کے لیے متعدد اصحاب نے تعاون کیا اور یہ ادارہ ایک علمی ادبی اور تحقیقی ادارہ بن گیا۔ ۵۲ سال سے یہ ادارہ اردو ادب کی خاموش خدمت کر رہا ہے۔ ڈاکٹر زور کے انتقال کے بعد نواب سراج الدین احمد کسی نہ کسی حیثیت سے ادارہ کی خدمت انجام دیتے رہے وہ طویل عرصے تک مجلس انتظامی شعبہ کے معزز رکن رہے۔

بعد ازاں وہ ممتاز ماہر تعلیم سید علی اکبر کی جگہ شعبہ امتحانات کے صدر مقرر کیے گئے۔ وہ بڑی ہی فعال شخصیت رکھتے تھے۔ جناب سید ہاشم علی اختر صاحب وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی و مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دور صدارت ادارہ ادبیات اردو میں محترمہ تہنیت النساء بیگم (بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور) اور پروفیسر مہندر راج سکسینہ کو سرپرست ادارہ اور نواب سراج الدین احمد اور جناب اکبر الدین صدیقی کو رفیق ادارہ منتخب کیا گیا۔ اردو والوں نے نواب سراج الدین احمد کی خدمت میں اس طرح ان کی بیش بہا خدمات پر ان کی زندگی ہی میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔

تقریباً ۲۸ سال سے میں ادارہ ادبیات سے وابستہ ہوں یہ بات راقم الحروف کے لیے باعث افتخار بھی ہے۔ اردو کے ممتاز محقق و ادیب جناب محمد اکبر الدین صدیقی، جناب عارف الدین حسن مرحوم کے انتقال پر ملال کے بعد معتمد اعزازی شعبہ امتحانات مقرر ہوئے اور ایک عرصہ دراز تک یہ خدمات انجام دیں۔ جب خرابی صحت کی بنیاد پر انھوں نے استعفیٰ دے دیا تب پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ اپنی معتمدی کے زمانے میں پروفیسر مغنی تبسم صاحب تین بار یورپ تشریف لے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں، میں نے کارگزار معتمد اعزازی کی خدمات انجام دیں اس زمانے میں شعبہ امتحانات کی میٹنگوں میں بارہا سراج الدین احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ ملا۔ پروفیسر مغنی تبسم صاحب جب جناب زمن راج سکسینہ صاحب (موجودہ نائب صدر ادارہ ادبیات اردو) کی جگہ ادارہ ادبیات اردو کے معتمد عمومی مقرر ہوئے تب معتمد اعزازی شعبہ امتحانات کی ذمہ داری راقم الحروف کو سونپی گئی۔ تقریباً تین سال سے میں معتمد اعزازی شعبہ امتحانات کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات کے انعقاد و انتظامات کے لیے ماہرین پر مشتمل ایک مجلس انتظامی تشکیل دی گئی ہے۔ ایک طویل عرصے تک نواب سراج الدین احمد اس مجلس انتظامی کے صدر رہے۔ خرابی صحت کے باوجود ہر میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے وہ بنفس نفیس خود ادارہ ادبیات اردو بہ پابندی وقت تشریف لایا کرتے تھے۔ مجلس انتظامی کے ہر رکن سے خندہ پیشانی سے ملتے روئیداد کو غور سے پڑھتے، مفید مشوروں سے نوازتے۔ تمام اراکین مجلس انتظامی شعبہ امتحانات نواب سراج الدین احمد کا دل سے احترام کرتے تھے ان کی اصول پسندی اور انصاف پسندی کی قدر کرتے تھے۔ ادارے کے امتحانات سال میں دو بار منعقد ہوتے ہیں نواب صاحب پابندی کے ساتھ حیدرآباد کے مراکز کا معائنہ کرتے تھے۔ اپنی صدارت کے دوران انھوں نے میرے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کیا۔ ان کی ہمت افزائی اور مفید مشوروں کی وجہ سے میں یہ اعزازی خدمت بخوبی بجالا سکا۔ جب ان کی صحت بہت ہی خراب ہو گئی تب انھوں نے شعبہ امتحانات کے اجلاس اپنے دولت خانہ پر منعقد کرنے شروع کیے تمام اراکین کی خاطر تواضع کا وہ خاص خیال رکھتے تھے۔ ایک بار میں اور پروفیسر مغنی تبسم صاحب ایک اجلاس میں شرکت کے لیے ان کے دولت خانہ پر حاضر ہوئے اطلاع کروائی ملازم نے ہم کو ان کے دیوان خانہ میں بٹھایا۔ نواب صاحب ہمیشہ کی طرح اپنی نفیس سلوائی کی شیروانی، بہترین استری کیے ہوئے پاجامے، بہترین پائتابوں اور پالش کیے ہوئے جوتوں میں ملبوس تشریف لائے۔ ہم دونوں نے ان کے دیوان خانے کی قالین خراب نہ ہو اس خیال سے اپنے جوتوں

کو دیوان خانے کے باہر چھوڑ دیا تھا۔ نواب صاحب نے بغور اس کا مشاہدہ کیا۔ علیک سلیک کے بعد وہ فوراً دیوان خانے کے باہر تشریف لے گئے اور خاموشی سے اپنے جوتے وہاں اتار دیے اور واپس آکر ہمارے درمیان بیٹھ گئے تہذیب و شائستگی اسے کہتے ہیں۔

نواب سراج الدین احمد اپنے بچوں، پوتے اور پوتیوں کے لیے ایک شفیق باپ اور دادا تھے۔ دوستوں کی طرح وہ ان کے درمیان بیٹھ کر خوش ہوتے تھے۔ وقت کی پابندی شروع سے آخر تک رہی۔ فجر سے پہلے وہ بیدار ہو جاتے تھے۔ سات بجے صبح وہ لباس زیب تن کرکے ناشتے کی میز پر آجاتے تھے۔ تمام عمر انھوں نے شیروانی ہی پہنی مغربی لباس انھوں نے نہ کبھی سلایا اور نہ ہی پہنا۔ وہ نماز اور روزے کے پابند تھے۔ بیماری کی وجہ سے کچھ عرصے سے وہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے تھے۔ مطالعے کے وہ بہت ہی شوقین تھے اردو اخبارات کا بہت پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ اردو کے علاوہ وہ عربی اور فارسی سے بھی واقف تھے۔ اردو کی کلاسیکی کتابیں خصوصاً سوانح عمریاں انھیں بے حد پسند تھیں خاص طور پر نابغہ۔ روزگار شخصیتوں کے بارے میں ان کی معلومات کافی وسیع تھیں۔ نواب بہادر یار جنگ کو وہ ایک مثالی رہبر تصور کرتے تھے۔ ان کے انتقال سے اردو دنیا میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ جس کا پر ہونا بہت ہی مشکل ہے۔

مرحوم کے بڑے صاحبزادے ضیاء الدین احمد منصور طیارے میں نشست نہ ملنے کی وجہ سے تدفین کے وقت تشریف نہیں لا سکے۔ دو دن بعد وہ تشریف لائے۔ میں ان کو پرسہ دینے کے لیے ان کی رہائش گاہ موقوعہ ہمایوں نگر پہنچا۔ گھر میں اطلاع کروائی گھر میں ایک سوگواری کی فضا سی چھائی ہوئی تھی گھر کا مکیں ہی نہیں رہا مکان کو دیکھتے ہوئے غالب کا یہ شعر بے ساختہ میری زبان سے نکلا:

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسد   مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

○ ○ ○

(۳) مجھے کامل یقین ہے کہ ادارہ ادبیات اردو زور صاحب کی قیادت میں اردو کو اپنا مقام دلانے میں کامیاب ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی:

بنا کر زورؔ نے ایوانِ اردو   بڑھا دی ملک بھر میں شانِ اردو

تلوک چند محروم - ۱۵/ جنوری - ۱۹۶۱

(۴) ادارہ ادبیات اردو اور اس کے بانی جناب ڈاکٹر محی الدین زور سے غائبانہ تعارف کی بنا پر ان کی جو قدر و منزلت میرے دل میں تھی وہ اب گہری ارادت اور ایک ایسے تعلق میں تبدیل ہو گئی ہے جس پر عشق کے آثار محسوس ہوتے ہیں۔ میں ان کی علمیت کا ہمیشہ سے معترف تھا لیکن ان کے خلوص اور حسن عمل کے ان کرشمات کو آنکھ سے دیکھا تو ان کی شخصیت کی زیادہ مکمل تصویر نظر کے سامنے آئی جو میری نظر میں بڑی محبوب، بڑی حسین اور قابل پرستش ہے۔

میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ دکن میں ایوان اردو کا وجود اور خدمت اردو کی وہ روایت جو اس ادارے کے ساتھ مخصوص ہو گئی ہے، اردو کی بقا کی ضامن ہے۔

شان الحق حقی - ۱۹/ جنوری - ۱۹۶۱

سید رفیع الدین قادری

نواب سراج الدین احمد صاحب مرحوم
(حیدرآباد کی ایک وضع دار شخصیت)

سراج الدین احمد صاحب اس رفیع الشان خاندان کے فرزند تھے جن کے اکثر و بیش تر افراد عالم، فاضل اور بڑی گراں قدر و اہم ترین خدمات انجام دے کر مورد الطاف و انعامات شاہان وقت رہے اور ان میں سے بعض علماء کرام و مشائخین عظام، واعظین و مبلغین گزرے ہیں اس خاندان کے افراد بہ لحاظ رشد و ہدایات اعلیٰ معیار اخلاق، فضل و کمال سلطنت ہائے بیجاپور، اورنگ آباد، حیدرآباد و میسور میں نہایت عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ حیدر علی والی میسور اور ان کے بیٹے ٹیپو سلطان نیز شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے اس خاندان سے متوسل ہونے کو اپنی سعادت سمجھا اور اس کا احترام کیا۔ اس خاندان کے حالات شرح و بسط کے ساتھ اکثر معتبر تواریخ دکن میں موجود ہیں۔

سراج الدین صاحب کا سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے جد اعلیٰ ملا عطا اللہ محمود ساتویں صدی ہجری میں اپنے چند افراد خاندان کے ساتھ عرب سے بخارا ہوتے ہوئے سلطان معزالدین سام کے عہد میں دہلی منتقل ہوئے۔ جہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد سلطان نے آپ کی علمیت و قابلیت سے متاثر ہو کر قاضی ناگور مقرر کیا۔ ملا عطا اللہ محمود کے بعد آپ کے فرزند قاضی حمید الدین ناگوری کو جو خود بھی عالم وقت تھے خلیفۂ اعظم بنایا گیا۔ آپ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے استاد تھے۔

آپ کے اکثر افراد خاندان عہد جہاں گیر و عہد شاہ جہاں میں بڑے بڑے عہدوں جیسے وزارت اور صوبہ داری پر فائز رہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے ساتھ بعض افراد خاندان دکن منتقل ہوئے اور وہ کچھ عرصے تک دولت آباد و خلد آباد میں رہے اور آصف جاہ اول کی خود مختاری کے بعد اورنگ آباد منتقل ہوئے اور وہاں انھوں نے مکمل سکونت اختیار کی۔

سراج الدین صاحب کے دادا نواب رفعت یار جنگ اول ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے آپ کا اصلی نام شیخ احمد حسین تھا۔ آپ حافظ و قاری شیخ عبدالرحمان صاحب کے فرزند اور شیخ عبدالحکیم صاحب کے نبیرہ تھے۔ آپ کا ننھیالی سلسلہ حضرت شہاب الدین سہروردی سے ملتا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگ وار اور گم نام دار مولوی محمد حسین صاحب نقشبندی سے حاصل کی۔ بعد میں مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہو کر امتیازی وظائف حاصل کرتے ہوئے فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ اردو، عربی، فارسی میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ آپ کی ذہانت خدا داد، آپ کا تدبر لائق صد ستائش اور آپ کا علم نہایت وسیع تھا۔ آپ کی اعلیٰ خدمات کے عوض ۱۳۰۵ھ میں جشن سال گرہ کے موقعے پر حضرت غفران مکان نے خانی و بہادری و خطاب نواب رفعت یار جنگ عطا کیا علاوہ ازیں منصب دو ہزاری، ایک ہزار سوار اور علم و ماہی سے سرفراز فرمائے گئے۔

آپ ایک روشن خیال مدبر، ہمدرد و رحم دل، منصف مزاج، مردم شناس وضع کے پابند خوش اخلاق ہر دل عزیز اور غرباء پرور حاکم تھے۔ چناں چہ شمس العلما نواب عزیز جنگ مرحوم نے آپ کی تعریف ان الفاظ میں کی۔

"رعایائے مال گزار آپ کی پرستش کرتی تھی۔ آپ کا ہر ایک کام اصول کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا تھا" آپ کے رفاہ عام کے کاموں میں "مدرسہ نظامیہ"، "مدرسہ اعزہ"، "سیول سرویس کلاسس" اور نظام کلب شامل ہیں۔ آپ نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے طلبہ کو تیار کرنے اور وظیفہ دے کر روانہ کرنے کی تحریک کی تھی۔ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے پر زور دیا اور اس بارے میں زبردست تحریک کی جو جامعہ عثمانیہ کی شکل میں موجود ہے۔ اضلاع میں بیسیوں مدرسے قائم کیے۔ نواب سراج الدین صاحب کے والد نواب رفعت یار جنگ ثانی تھے۔ آپ کا اصلی نام ضیاالحق فصیح الدین احمد خان تھا۔ ۱۸۶۹ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اردو، فارسی، عربی دینیات سے اپنے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ پھر وہ مدرسہ اعزہ میں شریک ہوئے اس کے بعد سینٹ جارجس گرامر اسکول میں داخل ہوئے بعد ازاں مدرسۃ العلوم علی گڑھ روانہ ہوکر انگریزی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، دینیات اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ حیدرآباد لوٹنے کے بعد "اصلاح خیالات و ترقی" کے واسطے مجلس اتحاد، ایک کتب خانہ اور ایک کرکٹ کلب قائم کرکے آپ نے کامیابی کے ساتھ معتمدی کے فرائض انجام دیے۔

۱۸۸۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن روانہ ہوئے۔ وہاں لندن یونیورسٹی میں انگریزی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی اور عربی کا درس بھی لیتے رہے۔ ٹرینٹی ہال کالج میں سربندی سے قانون کی تعلیم حاصل کی پھر آپ نے مڈل ٹمپل میں قانون کی تکمیل فرمائی۔ لندن میں "انجمن طلبائے ہند" قائم کی اور جشن میلادالنبی منانے کی بناء ڈالی۔ کوئین وکٹوریہ کے جشن جوبلی میں شرکت فرمائی جو بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ وہاں آپ مشہور مبلغ اسلام مسٹر عبداللہ کولئیم کے شریک کار رہے اور آپ نے وہاں تبلیغ کا کام ایسا کیا کہ بڑے بڑے لارڈس اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے۔

حیدرآباد لوٹنے کے بعد آپ سرکار عالی سے منسلک ہوگئے مختلف عہدوں پر اپنی اعلیٰ خدمات انجام دیتے ہوئے صوبہ داری کے جلیل القدر عہدہ پر مامور ہوئے۔ آپ نے اپنی ملازمت کے دوران مفید اصلاحیں کیں گورنمنٹ اور رعایا میں ربط و اتحاد میں نئی نئی راہیں نکالیں رعایا پر سرکاری رعب و اقتدار قائم فرمایا۔

بہ زمانہ صوبہ داری بیدر و اورنگ آباد بیدری صنعت و حرفت و کاغذ سازی اورنگ آباد کو آپ نے از سر نو زندہ کیا۔ مالیگاؤں کی جاترا جاری کروائی۔ ایسی ہی خدمات کی بنا پر عوام آپ کو "دھرما اوتار" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

آپ نے کئی کتب خانے دارالمطالعے قائم فرمائے۔ ملک میں صنعتی نمائشوں کی بنیاد آپ ہی نے ڈالی۔ صنعت و تجارت و زراعت کو خوب فروغ دیا۔ ہمیشہ ایک نہ ایک رفاہ عام کے کام کی فکر میں لگے رہتے۔ حضرت غفران مکان کو آپ کی ذات پر کامل اعتماد تھا۔ بہ تقریب جشن چہل سالہ جوبلی ۱۳۰۹ھ میں آپ کو "رفعت یار جنگ ثانی" کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ آپ سرکار عالی کے علاوہ برٹش ریذیڈنسی اور یوروپین عہدہ دار بھی آپ کی نہایت قدر و منزلت کرتے اور آپ کو حیدرآباد کے اعلیٰ ترین افراد میں شمار کرتے تھے۔

آپ باوجود خاندانی وجاہت و امارت کے جس کسی سے ملتے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے۔ غرور و تکبر نام کو نہیں تھا۔ آپ کے اخلاق حسنہ و عادات پسندیدہ کی بدولت جو شخص بھی آپ سے ایک بار ملتا، ہمیشہ ملنے کا متمنی رہتا۔

نادار طلبہ اور بیواؤں کی اس طرح مدد کرتے کہ اس ہاتھ سے دیتے تو اس ہاتھ کو خبر نہ ہوتی۔ آپ حقیقی معنوں میں ہر دل عزیز تھے۔

خوش خلق، ملنسار، نہایت سادہ طبعیت، بلند ہمت، نفاست پسند، بے تعصب عالی دماغ، صائب الرائے پابند وضع قدیم و پابند صوم و صلواۃ، ہمدرد بنی نوع انسان اور اپنی نظیر آپ تھے۔

آپ کی شادی نجم العلماء ظہور احسن صاحب فرنگی محل جاگیر دار سرکار عالی کی دختر سے ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ جس میں حضرت غفران مکان نے اپنے دست مبارک سے سہرہ باندھ کر عزت افزائی فرمائی۔

نواب سراج احمد صاحب مرحوم نے بھی اپنے بزرگوں کی پیروی کی اور وہ ان ہی کے اوصاف حمیدہ کی حامل شخصیت تھے۔ آپ بھی ایک روشن خیال نواب، ایک فرض شناس اور ایمان دار عہدہ دار ہی نہیں تھے بلکہ اپنی ذات سے ایک تحریک تھے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(باقی سلسلہ ص ۳۶)

اس سارے عمل میں محنت کی پیداوار اگر محنت کش کے لیے عذاب بن جاتی ہے تو غیر محنت کش مالک کے لیے عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح محنت کا ثمر یعنی پیداوار اس کے قبضے اور ملکیت میں نہ ہونے کے سبب محنت کش کے لیے یہ پیداوار ایک بیگانہ اور اس کی ذات سے جدا ایک طاقتور دشمن کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے لہذا یہ پیداوار محنت کش سے جدا ہو کر جس کی ملکیت اور تصرف میں آجاتی ہے وہ مالک بھی محنت کش کے لیے ایک بیگانہ اور طاقتور دشمن اور حریف قرار پاجاتا ہے۔ اس طرح طبقاتی جنگ معرض وجود میں آجاتی ہے۔ اس لیے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ محنت کش سے اس کی محنت اور اس کے ثمر (پیداوار) کی بیگانگی، ذاتی ملکیت کو لازمی طور پر وجود بخشتی ہے یعنی ذاتی ملکیت اس خارجی رشتے کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے جو محنت کش، فطرت اور اپنی ذات سے قائم کرتا ہے دوسرے لفظوں میں اگر محنت کی پیداوار کا مالک خود محنت کش بن جائے تو ذاتی ملکیت کا نظام کبھی پیدا نہ ہوگا اور نہ ہی طبقات پیدا ہوں گے نہ طبقاتی کشمکش یا جنگ وجود میں آئے گی اور نہ ہی بیگانگی ذات کا عفریت جنم لے گا۔ انسان، فطرت اور معاشرہ سب مل کر ایک وحدت قائم کرلیں گے جس میں شرک کا شائبہ تک بھی نہ ہوگا۔ لہذا ظلم اپنی کسی شکل میں باقی نہ رہے گا اور یہ عین منشاء الہیٰ کے مطابق ہوگا۔

نجی ملکیت اور اخلاق کا رشتہ

سرمایہ دار طبقاتی معاشرے میں کام کا محرک جذبہ انسانی بہبود کی بجائے نفع حاصل کرنے پر مبنی ہوتا ہے اس کی اساس باہمی تعاون کی بجائے مسابقت اور مقابلے پر ہوتی ہے اس لیے ہر پیشے کا انسان دوسرے انسان کو اپنا حریف سمجھتا ہے۔ زندگی کا مقصد ایک طرف روزی حاصل کرنا تو دوسری طرف ہر جائز و ناجائز ذریعے سے دولت جمع کرنا بن جاتا ہے۔

اس مسابقت اور مقابلے کے ماحول میں ترقی کا راستہ ایک دوسرے سے تعاون، ہمدردی اور محبت کی بجائے مقابل کو دھتکارنے، اس کے حقوق کو روندنے سے کسی بھی طرح راستے سے ہٹانے میں سے گذرتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طبقاتی معاشرے میں کامیابی اور عزت و وقار کی انتہا تک پہنچنے والا فرد عام طور پر انتہائی خود غرض، سفاک، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے والا کٹھور، سنگ دل اور اپنی ہی انا کے گرد طواف کرنے والا ہوتا ہے۔

لہذا ایسے غیر انسانی ماحول میں محنت کش صرف اپنی پیداوار ہی سے بیگانہ نہیں ہوتا بلکہ وہ انسانوں سے بھی متنفر ہو جاتا ہے اور اخوت و محبت کی اقدار اس کے لیے بے اثر ہو جاتی ہیں اور صورت حال یہ بن جاتی ہے کہ طبقاتی معاشرے میں ہر طرف نفسا نفسی، چھینا جھپٹی اور دار و گیر کا سماں پایا جاتا ہے۔

* * *

ایس کے آر مصطفیٰ جرنلسٹ

بڑے صاحب۔ کچھ پرانی یادیں

جناب عابد علی خاں کی پہلی برسی پر پیار اور عقیدت بھرا خراج

سرزمین شہر حیدرآباد نے یوں تو بہت سی باکمال ہستیوں کو پیدا کیا ہے لیکن جناب عابد علی خاں کی شخصیت میرے لیے ایسی تھی جنھوں نے مجھے ہمیشہ اپنی عنایتوں اور مہربانیوں سے نوازا۔ جناب عابد علی خاں کی علمی، سماجی اور صحافتی خدمات سے ہٹ کر میں یہاں ان کی شخصیت کے اس فیضان کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے میں تاحیات بھلا نہیں سکوں گا۔ انھوں نے مجھے ہمیشہ اپنی شفقت اور پیار دیا۔ مجھے کبھی ملازم نہیں سمجھا۔ چناں چہ ہم سب کارکنان سیاست و انتخاب پریس پیار سے مرحوم کو بڑے صاحب پکارا کرتے تھے۔

جناب الحاج عابد علی خاں صاحب مرحوم کا تعلق جاگیردار گھرانے سے تھا۔ ان کے دادا نواب انتخاب جنگ بہادر شہر کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معتبر شخصیت کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ انتخاب پریس (جو کہ دفتر روزنامہ سیاست کے احاطے میں قائم ہے) انھیں کے نام سے موسوم ہے۔ انتخاب پریس کا ابتدائی دور بڑا شاندار دور رہا ہے۔ اس کی عمدہ طباعت، کام کی نفاست اور بروقت آرڈرس کی سربراہی کے باعث انتخاب پریس کا دور دور تک چرچا تھا۔ چناں چہ دور دراز سے لوگ طباعت کا کام لے کر آیا کرتے تھے۔

اسکول کے ابتدائی زمانے میں مجھے تعطیلات میں کام کی تلاش تھی پھر ۴/ مارچ ۱۹۸۳ء کو روزنامہ سیاست میں ایک اشتہار دفتر سیاست میں آفس بوائے کی ضرورت سے متعلق شائع ہوا۔ میں درخواست لے کر فوراً دفتر سیاست پہنچا۔ وہاں میری ملاقات جناب مرزا مصطفیٰ علی بیگ صاحب سے ہوئی۔ بیگ صاحب اس وقت منیجر کی حیثیت سے کام کیا کرتے تھے۔ انھوں نے میری درخواست لی اور مجھ سے کہا کہ ہم خط کے ذریعے آپ کو مطلع کریں گے۔ میں وہاں سے لوٹ آیا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے دفتر سیاست سے ایک خط موصول ہوا کہ فوراً دفتر آکر ملو۔ میں خوشی خوشی دفتر پہنچا اور اس طرح دفتر سیاست میں آفس بوائے کی حیثیت سے میرا تقرر ہو گیا۔ اس وقت میری تنخواہ ۱۲۵ روپے ماہانہ تھی۔ آفس بوائے کی حیثیت سے مجھے جناب عابد علی صاحب کی خدمت کا موقع نصیب ہوا۔ صبح صبح جناب عابد علی خاں صاحب سے ملاقات ہوا کرتی۔ روزانہ ساڑھے نو بجے مجھے حاضری کا رجسٹر چیک کروانے کے لیے ان کے پاس جانا پڑتا تھا۔ موصوف روزانہ باقاعدہ رجسٹر چیک کیا کرتے پھر مجھ سے بڑے پیار سے دفتر کے دیگر امور دریافت کیا کرتے اور یہ ضرور پوچھتے کہ آج کون کون غیر حاضر ہیں۔ کبھی کبھی اشتہارات پڑھنے کے لیے مجھے طلب کرتے اور بعض اوقات اشتہارات کے ترجمے کے بارے میں مجھے سمجھاتے۔ جناب عابد علی خاں صاحب صبح نو بجے ہی دفتر پہنچ جاتے اور دوپہر کے وقفہ میں ایک بجے دن گھر چلے جاتے اور پھر ایک گھنٹے بعد واپس آجایا کرتے اور شام کے سات بجے تک دفتر میں ہی رہتے حتیٰ کہ تعطیل کے دن بھی وہ دفتر میں موجود رہتے۔

۱۹۸۷ء میں مجھے ترقی دے کر انتخاب پریس میں اسسٹنٹ منیجر بنا دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی میری تنخواہ میں قابل لحاظ اضافہ ہو گیا اور مجھے دوہری خوشی ہوئی۔ بڑے صاحب اکثر تنخواہ کے علاوہ اپنے پاس سے مجھے پیسے دیا کرتے تو مجھے اور بھی خوشی ہوتی۔ ایک دن مجھے دفتر کے بعد ایک دعوت میں جانا تھا اس لیے نئے کپڑے پہن کر میں نے اس پر ٹائی بھی باندھ لی۔ بڑے صاحب کے پاس جب پہنچا تو مجھے فوراً ٹائی نکال

دینے کے لیے کہا۔ میں نے فوری ٹائی کھول دی اور تب بڑے صاحب نے خود میرے گلے میں ٹائی باندھی اور مجھے ٹائی باندھنا سکھایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجھے ٹائی باندھنا نہیں آتا تھا جب بھی کبھی ٹائی باندھنی ہوتی تو مجھے فوٹو اسٹوڈیو جانا پڑتا تھا۔

بڑے صاحب کی بڑی بڑی خوبیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے نوکروں کو نوکر نہیں سمجھا۔ اکثر مجھ سے پیار اور شفقت کا سلوک کرتے تھے۔ میرے علاوہ بھی دوسرے نوکروں کو بھی برابر کے ساتھی سمجھتے۔ سب ہی سے نرم اور پیار بھرے لہجے میں گفتگو کرتے۔ بڑے صاحب نے میری فرمائش کے بغیر خود ہی فرمایا: "میں جب بھی باہر جاؤں تمھیں ٹائی ضرور لا کر دوں گا۔" روزانہ میرا ٹائی باندھنا اب تو میرا معمول بن گیا۔ بڑے صاحب کی اسی پسند نے مجھے روزانہ ٹائی باندھنے کا حوصلہ دیا اور میں باقاعدہ ٹائی باندھ کر دفتر آیا کرتا جب کہ دفتر سیاست میں اور کوئی بھی ٹائی نہیں باندھا کرتے۔

ایک دفعہ اندرا پریہ درشنی آڈیٹوریم میں کوئی کلچرل پروگرام تھا۔ بڑے صاحب نے مجھ سے کہا کہ مصطفیٰ یہ کارڈ لو اور تم اس پروگرام میں ضرور شرکت کرو۔ پھر مجھے تاکید فرمائی کہ اس پروگرام میں ضرور ٹائی باندھ کر جانا۔ پھر کام ختم کرکے جب میں پیدل جارہا تھا تو راستے میں گاڑی روک کر مجھے اپنے بازو بٹھالیا اور مجھے باغ عامہ تک چھوڑ گیا۔ اس واقعے سے بڑے صاحب سے میری عقیدت اور محبت اور بھی بڑھ گئی کہ مجھ ناچیز کو بڑے صاحب نے اتنی عزت دی کہ گاڑی میں اپنے بازو بٹھایا۔ حالاں کہ میری حیثیت ان کے نوکر کی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بڑے صاحب کو اسپورٹس سے بڑی دل چسپی تھی۔ اسپورٹس سے بڑے صاحب کی ذاتی دل چسپی اور لگاؤ کی ہی شاید وجہ تھی کہ سیاست میں بہت پہلے ہی سے باقاعدہ اسپورٹس کے لیے علاحدہ رپورٹر مقرر کیا گیا۔ بڑے صاحب اکثر کرکٹ میاچ کے دن اپنے ساتھ ایک چھوٹے سائز کا ٹرانسسٹر لے کر آتے۔ اگر کسی وجہ سے ٹرانسسٹر نہ لاسکے تو مجھ سے اکثر اسکور دریافت کیا کرتے۔

بڑے صاحب کی اس عنایت اور مہربانی کو میں زندگی بھر بھلا نہیں سکتا کہ میری شادی کے وقت مجھے موٹر کی ضرورت پڑی تو میری ہمت نہیں ہوسکی کہ بڑے صاحب سے کار مانگوں لیکن مجبوراً ہمت کرکے میں نے بڑے صاحب سے شادی کے لیے ایمبسیڈر کار مانگی تو فوراً انھوں نے مجھ سے کہا شادی کے موقع پر ایمبسیڈر کار کی بجائے میری کیسل ۱۱۸ کار لے جاؤ۔ یہ سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی پھر بڑے صاحب نے ڈرائیور کو طلب کرکے ہدایت دی کہ مصطفیٰ کی شادی میں یاد سے میری کار لے کر جانا۔ میری خوشی کا اس وقت ٹھکانا نہیں رہا جب شادی کے دن بڑے صاحب مجھ سے پہلے ہی شادی خانے پر موجود تھے۔

یوں تو بڑے صاحب کی عنایتیں اور مہربانیاں بہت ہیں جن کا تفصیل سے ذکر نہیں کرسکتا اس لیے اختصار کے ساتھ میں نے اپنی ذاتی مشاہدات اور جذبات کا یہاں ذکر کیا ہے۔ اس سے یقیناً ان کی شخصیت کی عظمت اور بڑائی کا اظہار ہوتا ہے۔ جناب عابد علی خاں صاحب کے انتقال سے ذاتی طور پر ایک مشفق مہربان اور سرپرست سے میں محروم ہوگیا۔ الغرض بڑے صاحب کی ہربات بڑی تھی۔

خدا تعالیٰ مرحوم کو جنت ِفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔۔۔آمین

○ ○ ○

کتاب: مرزا غالب
مصنف: ڈاکٹر نتالیا پری گارنا
مترجم: اسامہ فاروقی

باب ۱۰

گدائے بے نیاز

ہم قسمت کے سامنے اندھوں کی طرح کھڑے ہیں، اس کا نقاب اتارنا ہمارے
بس کی بات نہیں ہے۔ تیوت چیف

غالب جب گویا کہ روحانی اعتبار سے تازہ دم ہو کر کلکتے سے لوٹے تو ان کے ساتھ ہندوستان میں انگریزوں کے پایہ تخت کلکتے کی رنگا رنگ اور ہنگامہ خیز زندگی کے تاثرات تھے اور ذہن میں نئے ادبی منصوبوں کی افراط تھی۔ سب سے مقدم وہ چاہتے تھے کہ اپنے اردو کلام پر دوبارہ نظر ڈالیں۔ ۱۸۲۹ء میں وہ اپنا پہلا دیوان اردو مرتب کرتے ہیں، جسے "انتخاب" کا نام دیتے ہیں۔ یہ قدم انھوں نے مولوی سراج الدین اور ان کے دوست مولوی غلام امام شہید کے اصرار پر اٹھایا۔ ۱۸۳۰ء کے آس پاس تحریر شدہ، مولوی سراج الدین کے نام ایک خط میں مرزا "انتخاب" کے بارے میں لکھتے ہیں اور مطلع کرتے ہیں کہ ان کے اگلے منصوبوں میں دیوان فارسی اور مجموعۂ نثر فارسی کی تالیف بھی شامل ہے۔ اگر "انتخاب" کی تالیف فنی اعتبار سے نسبتاً آسان مسئلہ تھا کیوں کہ غالب نے پہلے بھی یہ کام کئی بار شروع کیا تھا اور "گل رعنا" کے قلمی نسخے سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے اپنے اردو کلام کے ایک حصے کو اس وقت موجود قلمی دیوان کی بنیاد پر ترتیب دیا تھا، تو مجموعہ "گل رعنا" میں شامل فارسی کلام کی ترتیب دیوان کی تالیف کے مسلمہ قواعد کے مطابق نہیں تھی، جس کے مدِ نظر مالک رام توضیح کرتے ہیں کہ غالب نے بہ ظاہر اپنے اشعار کی کسی بیاض سے کام لیا تھا، جس میں کلام جس ترتیب سے کہا گیا تھا اسی طرح درج کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ "گل رعنا" میں انھوں نے بہت سے اشعار حافظے کی مدد سے شامل کیے ہیں، ان کا حافظہ غضب کا تھا اور انھوں نے جو کچھ پہلے لکھا تھا ان کے حافظے کے نہاں خانوں میں محفوظ تھا۔

مولوی سراج الدین کے نام خط میں وہ "انتخاب" کا ایک قلمی نسخہ ان کے پاس بھیجنے کے اپنے ارادے سے انھیں مطلع کرتے ہیں، تاہم لکھتے ہیں کہ ڈاک خانے پر بھروسا کرنے کو جی نہیں چاہتا اس لیے کوشش کروں گا کہ یہ کام جان پہچان کے کسی ایسے شخص کے ذریعے ہو جائے جو کلکتے جا رہا ہو۔ غالب درخواست کرتے ہیں کہ مولوی سراج الدین کلام پر اپنی رائے کا اظہار کریں اور پھر قلمی نسخہ واپس بھیج دیں۔ دہلی میں غالب خود کو دوبارہ سابقہ ادبی روابط کے حلقے میں پاتے ہیں۔ احباب نے ان کا بڑی مسرت کے ساتھ استقبال کیا۔ اسی زمانے سے اس نئی جان پہچان کا بھی تعلق ہے، جسے مرزا کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قسمت کی کرنی، ان کی ملاقات بڑی سج دھج والے بے فکرے نوجوان مصطفیٰ خاں شیفتہ سے

ہوئی، جو وسط ایشیا کے ان تارکینِ وطن کے اخلاف میں سے تھے، جن پر مغل طبقۂ امرا کا سربرآوردہ گروہ مشتمل تھا۔ شیفتہ (سال پیدائش ۱۸۰۶ء) غالب سے عمر میں کئی سال چھوٹے تھے۔ انھوں نے بھی لاابالی نوجوانوں کی انھیں "درس گاہوں" سے سند تکمیل حاصل کی تھی جہاں کے فارغ التحصیل غالب بھی تھے اور جیسا کہ ان کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں رجونامی ایک "طرح دار طوائف" سے اپنے تعلق کی وجہ سے کسی زمانے میں ساری دلی میں ان کے نام کی دھوم تھی۔ شراب سے بھی عار نہیں تھا، تاہم مرورِ زمانہ کے ساتھ طبیعت میں متانت آئی اور خداترس مسلمان بن گئے اور چالیس کے دہے میں مکہ جا کر حج بھی ادا کر آئے۔ قدرتی بات ہے کہ تقویٰ اور خداترسی کا راستہ اختیار کرنے کے بعد، خصوصاً اس لیے بھی کہ مزاج میں ظاہرداری بالکل نہیں تھی، ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ دوسرے "گناہ میں آلودہ" ہوں اور وہ مذمت سے گریز کریں۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ جاڑوں کے ایک دن غالب کو شغل مے نوشی میں مصروف پا کر شیفتہ نے کہا کہ شریعت کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے اب وہ شراب سے پرہیز کرتے ہیں۔ غالب نے بڑی سادہ دلی سے متعجب ہو کر پوچھا "کیا جاڑوں میں بھی؟"۔

شیفتہ کا شمار غالب کے عہد کی دلی کے لائق ترین شعرا میں تھا۔ وہ مومن، آزردہ، صہبائی اور دبستان دہلی کے دیگر شعرا کے ساتھ مرکزی اہمیت کے حامل سبھی ادبی مسائل پر بحث مباحثے میں شامل ہو گئے۔ ان کے ذہنی اضطراب کا باعث اردو ادبی زبان کا مستقبل تھا، لیکن ان کے مباحث میں خصوصی اہمیت شاعری کو دی جاتی تھی۔ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کے مختلف اسالیب کی خوبیاں زیر بحث آتیں اور بالعموم اتفاقِ رائے اس امر پر ہوتا کہ دہلی کا اسلوب بہتر ہے۔ اسی بیچ میں اردو ادب میں ادبی نثر کے اولین نمونے منظرِ عام پر آنے لگے۔ غالب نے بڑی دل چسپی سے میر امن کی "باغ و بہار" کا مطالعہ کیا اور بہ ظاہر اسی زمانے میں وہ لکھنوی ادیب رجب علی بیگ سرور کی تصنیف "فسانۂ عجائب" سے بھی متعارف ہوئے۔

غالب سے سرور کی ملاقات کے بارے میں مصدقہ معلومات ہمارے پاس نہیں ہیں، تاہم مشہور صوفی غوث علی شاہ قلندر کے ملفوظات پر مشتمل "تذکرۂ غوثیہ" میں ایک لطیفہ ملتا ہے جو بعض تبدیلیوں کے ساتھ "غالب کی زندگی کے لطیفے" نامی مجموعے میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس میں ان دو ادیبوں کی ملاقات کا ذکر ہے۔ چوں کہ لطیفے کی ان دو اشکال میں صرف تفصیلات کا فرق ہے، یہاں ہم ان کو یک جا کر کے اپنی طرف سے چند توضیحات کے اضافے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

سرور دہلی آئے اور دہلی کے مضافات میں کسی جگہ ایک کاروان سرائے میں قیام کیا۔ ایک بار انھوں نے طے کیا کہ غالب سے ملاقات کریں گے لیکن ٹھیک سے پتہ معلوم نہیں تھا، راہ چلتوں سے پوچھتے پوچھتے منزلِ مقصود پر پہنچنے میں تقریباً سارا دن صرف ہو گیا۔ وہاں انھیں صاحب خانہ کے علاوہ مرزا کے کچھ احباب بھی ملے۔ سرور نے انکسار کے ساتھ محفل میں شامل ہونے کی اجازت چاہی اور غالباً اس چہ کنم میں کہ گفتگو کہاں سے شروع کریں انھوں نے یہ بیان کرنا شروع کیا کہ غالب کا گھر تلاش کرنے میں ان کو کتنی دشواری ہوئی۔ اگر وہ چاہتے بھی تو مرزا سے گفتگو کے لیے اس سے زیادہ نامناسب موضوع سوچ نکالنا شاید ان کے لیے ممکن نہ ہوتا کیوں کہ مرزا میں ایک چھوٹی سی کمزوری تھی۔ ان کو اس لاف زنی میں بہت مزا آتا تھا کہ انھیں خط لکھنے والوں کو لفافے پر پورا پتہ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں، بس "دہلی" اور "غالب" لکھو، خط پہنچ جائے گا۔ خطوط کے تاخیر سے پہنچنے کی شکایت کرنے والے اپنے احباب کی اکثر وہ یہ کہہ کر ملامت کیا کرتے کہ پتے کو لقب، نسبہ اور اس سے بھی بدتر یہ کہ محلہ، کوچہ جیسی فضول تفصیلات سے ناحق طول دے کر وہ خط کو پہنچانے کے کام میں محض رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ کیوں؟ قدرتی بات ہے کہ اس صورت میں ڈاکیے کسی ایسے غیر معروف غالب کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں جس کو صرف پتے کی مدد سے ہی ڈھونڈ نکالنا ممکن ہو۔ اس مسئلے پر گفتگو کے دوران کہ اردو زبان کی کون سی کتاب غالب کو زیادہ پسند ہے، پتہ چلا کہ مرزا، میر امن کی تصنیف "چہار درویش" کو سب سے زیادہ قابلِ قدر سمجھتے ہیں (اس کتاب کا

روسی ترجمہ "باغ و بہار" کے نام سے مشہور ہے)۔ سرور نے غالب سے دریافت کیا کہ آیا انھوں نے "فسانۂ عجائب" پڑھی ہے اور غالب نے نو وارد کے تعلق سے حقارت آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کافی رکھائی سے جواب دیا کہ اس میں لطافتِ بیان کا فقدان ہے، اس میں شہزادے اور امرا بازاری زبان اور بھٹیار خانے کی بولی بولتے ہیں۔ اس کے بعد سرور اپنا تعارف کرائے بغیر اور اپنے آنے کی غرض و غایت بتائے بنا رخصت ہو گئے۔ مرزا کے ایک دوست نے جو گفتگو کے دوران موجود تھے انھیں بتایا کہ ابھی ابھی رخصت ہونے والے مہمان اسی کتاب کے مصنف ہیں جس پر مرزا اس تیکھے انداز سے تبصرہ کر رہے تھے۔ غالب نہایت شرمندہ ہوئے اور کہا "ظالمو، پہلے سے کیوں نہ کہا!"۔ دوسرے دن مرزا نے اپنے دوست سے ان کے ہم راہ سرور کے ہاں بہ غرضِ ملاقات چلنے کی خواہش کی۔ انھوں نے اس کاروان سرائے کا پتہ چلایا، جہاں سرور کا قیام تھا، سرور سے ملاقات کی اور دوستانہ بات چیت چھیڑی، جس کے دوران غالب نے "فسانۂ عجائب" کے بارے میں بہت عمدہ رائے کا اظہار کیا اور اس کی زبان کی بہت کچھ تعریف و توصیف کی۔ سرور سمجھ گئے کہ غالب اپنے سلوک پر نادم ہیں اور یہ سرد مہری سے کیے جانے والے ان کے استقبال کے لیے ایک طرح سے معافی مانگی جا رہی ہے اور یہ بھی سمجھ گئے کہ غالب نے واقعی ان کی تصنیف پڑھی ہے اور اب اس کے بارے میں اپنی عمدہ رائے ظاہر کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ معاملہ رفت و گذشت ہوا۔

مرزا کے پاس پہلے کی طرح روپے پیسوں کی اب بھی تنگی تھی۔ اب منہ بولے بیٹے زین العابدین خاں بھی ان کی سرپرستی میں تھے۔ جب امراؤ بیگم اولاد سے مایوس ہو گئیں تو انھوں نے اپنے بھانجے کو متبنّیٰ بنا لیا۔ اس اثنا میں ان کے مہاجنوں اور قرض دہندوں کا بقایا بڑھتے بڑھتے چالیس ہزار روپے تک پہنچ گیا اور پنشن کے معاملے میں پیش رفت کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

مولوی سراج الدین احمد کے نام اپنے خط مورخہ ۳۰/ جنوری ۱۸۳۰ء میں مرزا لکھتے ہیں: "میرا ماجرا یہ ہے کہ اس خلاف آباد کی عدالت گاہ سے اپنے آپ کو یک سو کر کے اپنے غم کدے میں "نقش بہ دیوار" بنا بیٹھا ہوں۔ بزعمِ خیال میں امیدِ موہوم کا چراغ جلائے ہوئے ہوں۔ حاکمانِ صدر کی دادگری کی طرف سے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اطراف کے حکام کیا روش اختیار کرتے ہیں اور کون باتیں ان کے پیش نہادِ خاطر رہتی ہیں۔ اب اگر کچھ اور دن حالات اسی نہج پر چلتے رہے تو خاندان کے خاندان سیلابِ فنا میں غرق ہو جائیں گے۔ خاص کر اس دیار میں، جہاں خواص نے بھی چغل خوری اور افترا پردازی کا شیوہ اختیار کر رکھا ہے۔ حکام ان لوگوں کی گفتگو پر کان دھرتے ہیں۔ نہ جانے کتنے بندگانِ خدا ہیں کہ اپنے اموال و املاک کے معاملے میں خوف زدہ ہیں۔"

یہاں غالب کا اشارہ بلاشبہ فیروزپور کے نواب شمس الدین کی طرف ہے، جن کی غالب سے عداوت اور مرزا کے دعوے کے مدِ نظر ان سے خفگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ نئے رزیڈنٹ ہاکنس اور اس کے حوالی موالی کی شکل میں اب نواب کو طاقت ور حمایتی بھی مل گئے تھے۔ بے شمار مال و دولت کا مالک بن جانے کے بعد نواب شمس الدین کا اپنے سوتیلے بھائیوں کی ضرورت سے زیادہ ناز برداری کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسپیر کے الفاظ میں جب بھی نواب اصلی ظالم و جابر فرماں روا بن کر اپنی ریاست کا بندوبست شروع کرتے ان کے چہرے سے انگریزوں کے مہمان نواز اور دل موہ لینے والے دوست کا مکھوٹا فوراً اتر جاتا، مزید برآں ان کی بدچلنی کی وجہ سے کوئی عورت بھی خود کو بے خطر محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ یہ جان کر کہ ہاکنس نے اپنے پیش رو کول بروک کی اس رپورٹ کی توثیق سے انکار کر دیا ہے جو ان کے حق میں تھی، اگر غالب کو شک ہوا کہ اس کے پیچھے نواب شمس الدین کا ہاتھ ہے تو یہ امر بالکل بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ پھر مولوی سراج الدین کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "اس خراب آباد کے حاکم نے، جسے فرانسس ہاکنس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مرزبانِ فیروزپور کے ساتھ "پیمانِ یک دلی و یک جہتی" باندھ رکھا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کی مرضی کے مطابق رپورٹ صدر میں بھیج دی۔ بس اتنا

ہجر و بادہ گیا تھا کہ کلکتے میں نوجوان اسٹرلنگ بوقت ضرورت ان کی مدد کرے گا۔ لیکن ۱۸۳۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ غالب کو اس واقعے میں بد شگون دکھائی دیا۔ اسٹرلنگ کی موت پر ماتم کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "قسمت نے میری بے بسی ملاحظہ فرما لی اور اس سے قبل کہ میری رپورٹ دارالحکومت پہنچے موت کے ظالم ہاتھ اسے اٹھا لے گئے۔" اسی اثنا میں ریزیڈنٹ ہاکنس کے سکریٹری نے غالب کو مقدمہ پہنچانے والی اطلاع دی کہ ہاکنس نے غالب کے مقدمے کی بابت کلکتے رپورٹ بھیجی ہے کہ اس کے خیال میں حالتِ موجودہ میں تبدیلی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ "میں حیرت میں پڑ گیا بلکہ ایک طرح سے مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ بندۂ خدا کیا کہتا ہے، میرا مقدمہ اس سے بہتر نظرداری اور حسن سلوک کا مستحق تھا۔ سو کہ دیر خدا کہ اسٹرلنگ کے نہ ہونے کے باعث معاملے نے یہ شکل اختیار کر لی۔ ایسے کسی حکم کے صادر ہونے کی مجھے ہرگز توقع نہ تھی۔ اب کہ میں چارہ سازی کے دروازوں کو شش جہت سے اپنے اوپر بند پاتا ہوں اور تمام ستارے گویا میرے حق میں طالع ناساز بن گئے ہیں، بجز اس کے اور کیا رہ گیا ہے کہ میں انگریزی میں درخواست لکھوا کر بذریعہ ڈاک نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں روانہ کروں اور اس میں اپنا تمام احوال مو بہ مو لکھ بھیجوں۔"

ساتھ ہی ساتھ سر جان میلکم کا جواب بھی بمبئی سے کلکتے پہنچا۔ انھوں نے اپنے خط میں شقّے پر لیک کے دست خط کی تصدیق کی اور توضیح کی کہ چوں کہ شقّہ بڑی گڑبڑ میں بھیجا گیا تھا اس لیے سہواً اس پر مہر نہیں ثبت ہوئی اور بالآخر یہ کہ لارڈ لیک کو نواب احمد بخش پر پورا بھروسا تھا اور چناں چہ ایسا شخص کسی طرح سے بھی جعل سازی کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور رہ گئی مہر تو بہ صورت دیگر لیک کے دفتر میں اس کے خلاف مخبری تو ہو ہی جاتی۔ سر میلکم کی منطق اور دلیلوں میں وزن اور معقولیت بہت زیادہ تو نہیں ہے تاہم ان میں اور سر ہاکنس کی ناموافق رپورٹ میں مطابقت ضرور تھی۔ چناں چہ طے ہوا کہ عذر صحیح نہیں ہے اور ۲۷/ جنوری ۱۸۳۱ء کو اس مضمون کے احکام پر دست خط ہو گئے۔

لیکن اس کے بعد بھی غالب نچلے نہیں بیٹھے، انھوں نے حکومت پر اپنے مراسلات، یا بہ قول خود "رپورٹوں" کی بوچھاڑ کر دی لیکن اس سے انھیں حاصل بہت کم ہی ہوا۔ اپنے کلکتے والے دوست کو وہ لکھتے ہیں: "دشمن اورنگ نشیں بھی ہے اور صاحب تمول بھی، میں فقیر اور لاچار۔ دشمنوں کی وجہ سے مبتلائے اذیت ہوں اور ان میں سے بہت سے میرے خون کے پیاسے ہیں۔" انھوں نے اپنی "رپورٹیں" کمپنی کے ڈائرکٹروں کے پاس بھی اس امید میں بھیجیں کہ ان میں سے شاید کوئی دست گیری کرے۔ کیوں کہ اس زمانے کی دلی میں یہ الفاظ کہ کوئی کسی کے "خون کا پیاسا" ہے، محض ایک استعارے کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

عالمِ مایوسی میں وہ مولوی سراج الدین کو لکھتے ہیں: "ماہ مئی کی چار اور ماہ ذی الحجہ کی گیارہ تاریخ تھی (۱۸۳۰ء / ۱۲۴۰ ہجری) میرے مقدمے کی رپورٹ اس دادگاہ سے صدر روانہ ہوئی۔ ہائے ہائے کیا رپورٹ اور کیا مقدمہ! رپورٹ حبشی کے بالوں کی طرح پُرخم اندر خم اور مقدمہ عاشقوں کے حال خراب کی طرح درہم و برہم۔ رپورٹ ایک جہانِ آرزو کے لیے فتوائے خون ریزی اور رپورٹ کو اسے ریزش آبرو کا فرمان کہنا چاہیے۔"

قرض خواہ الگ مرزا کی جان کھائے ہوئے تھے۔ دوست احباب جہاں تک ہو سکتا مدد کرتے۔ ایک قرض خواہ نے عدالت میں ان کے خلاف نالش کر دی۔ خوش قسمتی سے یہاں غالب کے قریبی دوست آزردہ ہی مفتی تھے۔ قرض خواہ نے قرض کی رقم جتائی اور دعویٰ پیش کیا۔ جواب دہی کے لیے قرض دار یعنی مرزا کی طلبی ہوئی اور ان سے کہا گیا کہ قرض ادا نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ ہو تو بتائیں۔ مدعا علیہ نے اپنی صفائی میں جو بیان دیا منظوم شکل میں تھا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب ہنس پڑے اور حسب الارشاد رقم متعلقہ کی ادا بھر قرض دار کی طرف سے اور اپنی جیب سے ادا کر دیے۔

لیکن احباب کا ساتھ ہمیشہ تو رہتا نہیں۔ ایسے ہی مخلص دوستوں میں مولوی فضل حق بھی تھے جن کی دہلی سے روانگی کا صدمہ غالب کو برداشت کرنا پڑا۔ مولوی صاحب کو دہلی میں اپنی خدمت سے مستعفی ہونا پڑا تھا، لیکن اس کی وجوہ کیا تھیں، اس کا اب تک ٹھیک سے پتہ نہیں۔ ان کو جس طرح سے رخصت کیا جا رہا تھا اس کے پیش نظر اور انگریزوں کے علانیہ مخالف مسلمان علما سے مولوی فضل حق کی یگانگت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس جبار تکم گر قانون داں کے استعفے اور اس کی مخالف انگریز، وطن دوست سرگرمیوں کے درمیان کوئی نہ کوئی ربط باہمی ضرور رہا ہوگا۔ بہرحال غالب اپنے دوست کی روانگی کا ایک ہمہ گیر اجتماعی نتائج و عواقب کے حامل واقعے کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں۔ "حکام کی قدر ناشناسی اور بے تمیزی نے یہ صورت حال پیدا کر دی کہ فاضل بے نظیر اور عالم یگانہ مولوی فضل حق نے عدالت دہلی کی سررشتہ داری سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے آپ کو اس ننگ و عار سے الگ کر لیا۔ سچ یہ ہے کہ اگر مولانا کے مراتب علم و فضل اور درجات دانش و بینش کو دس گنا کم کر کے بلکہ یہ کہیے کہ سو میں سے ایک درجہ بھی لیا جائے تو بھی، سررشتہ داری عدالت دیوانی جیسا عہدہ، یہ کہیے کہ مولانا کے دون ہمت ہے۔ ۔ ۔ ۔ مولانا جس دن اس دیار سے رخصت ہو رہے تھے، میں کیا کہوں کہ اس شہر کے باشندوں پر کیا قیامت گزر رہی تھی۔۔" (فارسی سے ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی) آگے غالب اس وداعی تقریب کا حال بیان کرتے ہیں جو مسند آرائے دہلی کے ولی عہد مرزا ابو ظفر بہادر شاہ نے مولوی فضل حق کے اعزاز میں منعقد کی تھی۔ انھوں نے اپنے ملبوس خاص کا دوشالہ مولوی فضل حق کے زیب دوش کیا اور انھیں با چشم پرنم رخصت کیا۔ خط کے اختتام پر غالب اپنے مکتوب الیہ مولوی سراج الدین سے خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس خبر کو کلکتے کے اخبار "آئینۂ سکندر" میں شائع کریں۔

کلکتے سے "جام جہاں نما" نامی اخبار بھی شائع ہوتا تھا۔ اخبار کا نام ایران کے اساطیری بادشاہ جمشید کے اس مشہور جام کی مناسبت سے رکھا گیا تھا جس کی خاصیت یہ تھی کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے دکھاتا تھا اور اسے اپنے مالک کو دکھاتا تھا۔ مولوی سراج الدین "آئینۂ سکندر" کی اشاعت میں شریک تھے اور غالب نے دہلی میں اس اخبار کے مستقل خریدار فراہم کرنے کی فرمائش کرتے رہتے۔ غالب اپنے خطوط میں بیان کرتے کہ خریدار فراہم کرنے کے لیے وہ کیا جتن کر رہے ہیں اور اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں "جام جہاں نما" میں شائع ہونے والی خبروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ اس میں پہلے تو کوئی ناقابل یقین حد تک سنسنی خیز خبر بہت نمایاں طور سے شائع کی جاتی اور کچھ عرصے بعد اخبار کے سب سے غیر نمایاں گوشے میں مختصر سی تردید چھاپ دی جاتی لیکن غالب صرف طنز نہیں کرتے۔ انھیں حال ہی میں معرض وجود میں آنے والی اس صحافت کی اثر انگیزی کی فکر تھی جو ابھی تک اپنے اور قاری کے درمیان مفاہمت باہمی کے راستے ڈھونڈ رہی تھی۔

وہ مولوی سراج الدین کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں "صاحب من، میری آنکھیں "آئینۂ سکندر" کے مشاہدے سے روشن ہوئیں اور اس کی مشاطۂ عبارت نے رشتۂ تحریر میں موتی پروئے۔ عمدہ بیان، مختصر خبریں، دل پسند نکتے اور نظر فریب نگارش اس کے صفحات کی زینت ہیں۔ آپ کا سحر قلم تو میرے دل و جان پر چلتا ہے اور میں ان اوراق کو دوسروں سے متعارف کرانے میں بہترین طریقے سے کوشاں ہوں۔ اس دیار کے رہنے والے "جام جہاں نما" کی نامعتبری سے بد دل ہیں، یوں بھی یہ لوگ اخبار نویسی کا صحیح ذوق نہیں رکھتے۔ انصاف بالائے طاعت، ایسا کم اتفاق ہوتا ہے کہ "جام جہاں نما" اس ہفتے میں یہ خبر شائع کرے اور دوسرے ہفتے میں خود ہی اس کی تردید نہ کر دے۔ ایک ہفتے میں سرکار انگریزی کی، والی لاہور سے جنگ کی بات کرتا ہے کہ وہ موسم زمستاں کی آمد سے پہلے چھڑ جائے گی اور دو ہفتے بعد خود ہی یہ اطلاع دیتا ہے کہ وہ خبر غلط تھی۔ اس ہفتے میں یہ خبر چھپتی ہے کہ اکبر آباد کی مسجد جامع اور روضۂ تاج گنج کو اس قیمت پر فروخت کیا جا رہا ہے اور دو ہفتے گزرنے پر خود ہی اعلان کرتا ہے کہ فرماں روایان کونسل اس بیع و شرا کو جائز نہیں سمجھتے۔" (فارسی سے ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

نواب شمس الدین نے، جو در حقیقت غالب کے خلاف مقدمہ جیت چکے تھے، اپنے دونوں سوتیلے بھائیوں کے خلاف مہم شروع کر دی۔ کسی زمانے میں ان میں سے ایک یعنی غالب کے قریبی دوست نواب امین الدین نے طویل جدوجہد کے بعد یہ منوالیا تھا کہ لوہارو کا علاقہ، جو نواب احمد بخش نے دونوں بھائیوں کی گزر بسر کے لیے وصیت کر دیا تھا، راست ان دونوں کی ملکیت میں دے دیا جائے گا۔ حکومت نے ۱۸۲۸ء میں یہ مطالبہ اس شرط پر منظور کیا تھا کہ بڑے بھائی کی طرف سے سالانہ ایک مقررہ رقم خزانے میں ادا کی جائے گی تاکہ سن بلوغ کو پہنچنے پر چھوٹے بھائی کو سرکاری خزانے سے گزر بسر کے لیے رقم برابر ملتی رہے۔ لیکن اس فیصلے کی نواب شمس الدین نے شدید مخالفت کی اور انھوں نے علاقہ لوہارو کے کسانوں کو مال گزاری کی ادائگی سے انکار پر اکسایا۔ نتیجتاً نواب امین الدین کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ سرکاری خزانے میں اپنا حساب بے باق کر سکیں۔ ادھر یہ بہانہ بنا کر کہ سوتیلے بھائی درپیش مشکلات سے عہدہ برا نہیں ہو پا رہے ہیں (وہی مشکلات جن کے محرک نواب شمس الدین خود تھے) موخرالذکر لوہارو کے علاقے کو ۱۸۳۳ء میں دوبارہ اپنی ملکیت میں لے لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ طے ہوا کہ سوتیلے بھائیوں کو گزارے کی ادائگی کی ذمہ داری ان کی ہوگی۔ اس اثنا میں ولیم فریزر، جس کی لوہارو گھرانے سے بڑی دوستی تھی اور جو اپنے بے لوث انصاف اور مقامی حالات سے گہری واقفیت کے لیے مشہور تھا، دہلی واپس آگیا۔ فریزر نے نواب امین الدین کو کلکتے جانے اور وہیں صدر میں وراثت کے مقدمے کا فیصلہ کروانے کا مشورہ دیا۔ غالب نے نواب امین الدین کے حق میں سفارشی خطوط فراہم کیے، خط لکھ کر مولوی سراج الدین کو، بڑی دردمندی سے اپنے نوجوان عزیز کو اتنے دشوار گزار سفر پر تنہا رخصت کرنے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے، ان کے سفر کے منصوبے سے آگاہ کیا۔

فریزر، نواب احمد بخش کے بیٹوں کو ان کے بچپن ہی سے جانتا تھا، تینوں بھائی اس کے سامنے ہی بڑے ہوئے تھے۔ چناں چہ نواب احمد بخش کی وراثت کے معاملے سے وہ بے حد ناخوش ہوا۔ فریزر نے ڈٹ کر چھوٹے بھائیوں کا ساتھ دیا۔ مروجہ آداب کے مطابق شمس الدین، فریزر کے ہاں ملاقات اور سلام کے لیے گئے اور اپنی اس توقع کے اظہار کے لیے کہ خاندان کے پرانے دوست و خیر خواہ اور نیز برطانوی انتظامیہ کے اس بااثر نمائندے اور خود ان کے درمیان دوستانہ تعلقات بحال رہیں گے۔ فریزر نے نہایت درشتی کے ساتھ ان کا سلام لینے سے انکار کر دیا، ان کو ایسے پھٹکارا جیسے وہ کوئی قصوروار چھوکرے ہوں اور ان کی اس بدچلنی اور بے ہودگی پر سرزنش کی جس کی وجہ سے بہ قول فریزر عوام میں ہر طرف بر ہمی پھیل رہی تھی۔

فریزر کو گمان بھی نہ رہا ہو گا کہ غصے کو لگام نہ دے کر جو اس موقع پر اس کے لیے بالکل فطری تھا اور سیدھے سادے انسانی عدل و انصاف کی پشتی لے کر اس نے خود اپنے قتل کے حکم پر دستخط کیے ہیں۔ شمس الدین نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ انھوں نے طے کر لیا کہ واحد چارہ کار فریزر کا قتل ہے۔ یہ کام انھوں نے اپنے ایک ملازم کے سپرد کیا۔ دہلی میں مقیم ہو کر نواب شمس الدین کا یہ ملازم کریم خاں تقریباً چھ مہینے تک فریزر کا ایسے تعاقب کرتا رہا جیسے شکاری اپنے شکار کا۔ دن رات وہ اس انگریز کی گھات میں بیٹھا رہتا، لیکن کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ یارباش فریزر، اگر رات دیر سے بھی گھر لوٹتا تو ہمیشہ ہم رکابوں اور ملازمین کے جھرمٹ میں۔ نواب شمس الدین کے منصوبے کے مطابق قتل کے اس کام کو رات کے اندھیرے میں سر انجام دینا چاہیے تھا۔ کریم خاں اس جوکھم کے کام کی مشکلات کی شکایتوں کے ساتھ رپورٹ وقتاً فوقتاً اپنے مالک کے پاس بھیجتا رہا۔

اس زمانے میں قرض خواہوں سے منہ چھپانے مرزا غالب گھر میں گوشہ نشین تھے۔ ہواخوری کے لیے گھر سے کبھی نکلتے تو رات دیر گئے۔ ڈر تھا کہ قرض کی عدم ادائگی کے الزام میں قرض خواہ انھیں جیل نہ بھجوا دیں۔ تاہم قانوناً طبقۂ امرا سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو صرف اس کے گھر کے باہر اور وہ بھی غروب آفتاب سے قبل حراست میں لیا جا سکتا

تھا۔ نتیجتاً مرزا کا کسی سے ملاقات کے لیے باہر جانا اگر کسی وقت ممکن تھا تو صرف رات میں۔ ممکن ہے کہ رات کی اس سیر کے دوران ان کی اپنے پرانے دوست فریزر سے بھی کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہی ہو۔ جیسا کہ اس کی عادات و خصائل کا ذکر کرتے ہوئے منٹاف لکھتا ہے "فریزر کو مقامی آبادی کے اعلیٰ طبقوں سے میل جول میں کبھی کوئی دقت نہ ہوتی اور یورپیوں کے عام رویئے کے مقابلے میں وہ بعض امراء سے نسبتاً نہایت قریبی روابط رکھتا تھا۔"

۲۲/ مارچ ۱۸۳۵ء کو پتہ چلا کہ فریزر دہلی کے مضافات میں کشن گڑھ کے راجہ کے ہاں مہمان کے طور سے جا رہا ہے۔ کریم خاں نے کہیں پاس ہی اپنا گھوڑا چھوڑا اور فریزر کے گھر کے پاس اس کی واپسی کے انتظار میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ اس بار فریزر کے ہم راہ کوئی بھی نہ تھا۔ رات کے اندھیرے میں گولی چلنے کی آواز اور پھر موقعِ واردات سے سوار کو تیزی سے لے جاتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ فریزر گولی کھا کر گھوڑے سے گرا اور وہیں فوت ہو گیا۔ گھوڑے پر سرپٹ فرار ہوتے ہوئے موقعِ واردات سے کچھ ہی فاصلے پر کریم خاں نے اپنی بندوق کسی کنوئیں میں پھینکی اور خود اس موقع کے لیے پہلے سے تیار کی ہوئی ایک پناہ گاہ میں روپوش ہو گیا۔ یہ شمس الدین سے قریبی تعلق رکھنے والے ایک دلی والے کا رہائشی مکان تھا۔ کریم خاں اس بھروسے پر تھا کہ جب ابتدائی ہنگامہ کچھ ٹھنڈا پڑے گا، وہ لوگوں کی نگاہوں سے بچتا بچاتا اپنے گھر واپس لوٹنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ واقعی راہِ فرار سے اپنے نشانِ قدم مٹا دینے میں وہ کامیاب ہو بھی جاتا، لیکن اس کی بدقسمتی سے قتل کی تفتیش کا بیڑا جان لارنس نے اٹھایا، وہی جو بعد میں ہندوستان کے ہائی کمشنر سر جان لارنس کی حیثیت سے معروف ہوا۔ اسپیر بیان کرتا ہے کہ نوجوان اور بالکل غیر معروف لارنس اس وقت پانی پت میں تھا اور حمام میں غسل کا لطف اٹھا رہا تھا۔ جب فریزر کے قتل کی خبر پہنچی تو بیان کرتے ہیں کہ وہ فوری حمام سے کود کر باہر نکلا اور بلاتاخیر چالیس میل گھوڑا دوڑاتا ہوا دلی لپکا۔ اپنے کسی مخبر سے سر چارلس منٹاف کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ اس واقعے میں ہو سکتا ہے کہ نواب شمس الدین بھی ملوث ہوں۔ دہلی پہنچ کر تفتیش کا رخ صحیح سمت موڑا اور جلد ہی صورتِ حال کا صحیح اندازہ لگا لیا۔ اس نے واصل خاں کا گھر ڈھونڈ نکالا اور وہاں اصطبل میں اس گھوڑے کا، جس کی ابھی ابھی نعل بندی کی گئی تھی اور اس کے سائیس کا پتہ لگایا، اور پھر اسے حراست میں لینے کا حکم دیا۔ تفتیش سے ثابت ہوا کہ "سائیس۔ دراصل کریم خاں ہے۔ کریم خاں کے نام نواب شمس الدین کے خطوط دست یاب ہوئے لیکن ان خطوط میں فریزر کا ذکر اگر کہیں تھا تو کتوں کی خریداری کے سلسلے میں۔ لیکن یہ معلومات شہادت کے کام تو آ نہیں سکتی تھیں۔ تاہم کچھ عرصے بعد نواب شمس الدین کی ماں کے وطن میوات کے باشندے آنیا نامی ایک شخص نے خود کو عدالت کے حوالے کر دیا۔ پتہ چلا کہ وہ جرم میں کریم خاں کا معاون تھا اور قتل کے بعد اپنے علاقے کو لوٹ گیا تھا۔ لیکن پھر آنیا تک یہ بات پہنچی کہ نواب شمس الدین کی نیت اس کا کام تمام کرنے کی ہے تاکہ خواہ مخواہ کے ایک گواہ سے چھٹکارا ملے اور چار و ناچار وہ اقبالِ جرم کے ساتھ عدالت کے سامنے حاضر ہو گیا۔

اسپیر لکھتا ہے کہ "نواب گرفتار کیے گئے اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ کریم خاں سے اپنی خط و کتابت کی توضیح کریں۔ انھوں نے کہا کہ ان کا ارادہ خفیہ طور پر فریزر کے ہاں کتے خریدنے کا تھا تاکہ ان پر محصول کی ادائگی سے بچ سکیں۔ لیکن اس سے اس امر کی توضیح نہیں ہوتی کہ ایک کتا خریدے بغیر بھی کریم خاں نے کیوں کر دلی میں چھ مہینے گزار دیے۔"

آنیا کی گواہی سے واقعات کی باقی سبھی کڑیاں بھی جڑ گئیں، مزید برآں موقعِ واردات کے آس پاس کے علاقے میں جستجو کے بعد بندوق بھی برآمد ہو گئی۔ فریزر کے قتل نے دہلی کے انگریز باشندوں کو دہلا دیا تھا اور دلی والوں کو بالعموم بے حد متاثر کیا تھا۔ اسی زمانے میں غالب امام بخش ناسخ کو لکھتے ہیں: ادھر چار ماہ سے "نامہ نگار نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے اور آنے جانے والوں پر، وہ اپنے ہوں کہ بے گانے، اپنے گھر کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ اگرچہ میں زندانی نہیں لیکن میرے خواب و خور کا انداز قیدیوں ہی جیسا ہے۔ اگر کوئی کافر، سو سال عذابِ دوزخ میں گرفتار رہے اور اس کا ایک ادنیٰ

جسے پکار دیکھے جو میں سنے برداشت کیے ہیں، تو آپ مجھے کافر جانیں۔ بہ قول عرفی:

از بوئے تخم سوختہ، دماغ امید و یاس
زہرے کہ در پیالۂ ما ریخت روزگار

(روزگار نے میرے جام زندگی میں وہ زہراب بھر دیا ہے، جس کی بو نے تخم سے میرے دماغ امید و یاس ہی کو مختل کر رکھا ہے کہ اب میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتا)۔

میرے خرمن صبر و ثبات میں جو چنگاری پھینکی گئی ہے وہ یہ کہ میرے قرض خواہوں میں سے دو آدمیوں نے میرے خلاف عدالت سے ڈگری حاصل کرلی۔ اب یا تو ڈگری میں مندرج زر رقم حسب قاعدہ ادا کیا جائے یا پھر قرض دار قید و بند کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس باب میں شاہ و گدا سب برابر ہیں۔ سربرآوردہ لوگوں کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ کچہری کا سپاہی گھر پر جا کر انھیں گرفتار نہیں کرسکتا۔ جب تک وہ کہیں راہ میں نہ ملیں انھیں اسیر نہیں کیا جاتا۔ چوں کہ ادائے قرض کے لیے میرے پاس روپیہ نہیں تھا اس لیے اپنے اوپر یہ لازم کیا کہ اپنی آبرو کی حفاظت کی غرض سے میں ہوا ہی کی عزت سے خود کو محروم کروں اور گھر سے باہر نہ نکلوں۔ آج تک میں نے وہ قید اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے اور اپنے پیروں کو پابند اقامت بنا رکھا ہے۔

اس گوشہ گیری اور شکستہ خاطری کے زمانے میں کسی ظالم خدا ترس نے کہ ہمیشہ عذاب ابدی میں گرفتار رہے، ولیم فریزر صاحب بہادر ریذی ڈینٹ دہلی کو جو غالب مغلوب کے مربیوں میں سے تھے، شب تاریک میں بندوق کی گولی سے ہلاک کر دیا اور میرے لیے باپ کی موت کا غم تازہ ہوگیا۔ دل بے قابو ہوگیا اور میرے خیال و حال پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ آرام و راحت کا خرمن بے طرح جل گیا، وقت نے صفحۂ دل سے نقش امید کھرچ کر پھینک دیا۔ قضارا جو نشان بتلائے گئے اور اس بنیاد پر جو غلط نہیں تھی، ایک سوار کو جو والی فیروز پور کے ملازموں میں سے ہے، اس ستودہ صفات شخص کے قتل کے جرم میں پکڑا گیا۔

شہر کے صاحب مجسٹریٹ بہادر نے کہ پہلے سے مجھ سے واقف تھا اور اس زاویہ نشینی کے زمانے میں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے کہ بوم کی طرح میری پرواز صرف رات کے وقت ممکن تھی شبان گاہ میں کبھی کبھی اس سے ملنے جاتا تھا اور کچھ لمحے سکون و عافیت کے گزارتا تھا جب یہ واقعہ پیش آیا تو حقیقت حال تک پہنچنے اور اس پر پڑے ہوئے بہت سے اسرار کی پردہ کشائی کی غرض سے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہاں تک کہ والی فیروز پور مجرم قرار پایا گیا اور سرکار کے حکم سے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس کی گرفتاری عمل میں آئی اور سرکاری پولیس اس کی جاگیر پر جا کر بیٹھ گئی۔

چوں کہ میرے اور اس کے مابین نا اتفاقی چل رہی تھی اور شہر کے لوگ اس سے واقف تھے، سب کے سب نے میرے مخالف اور اس کافر نعمت کی گرفتاری کو، جس نے اپنے محسن کو مار ڈالا، میری طرف سے مخبری کا نتیجہ قرار دیا۔ یعنی مردمان شہر خاص و عام یہ وا ہمہ رکھتے ہیں کہ شمس الدین بے گناہ ہے، فتح اللہ بیگ خاں اور اسد اللہ خاں نے انگریزوں کو اس کے خلاف بھڑکایا ہے اور اس کے حق میں چند جھوٹی سچی باتیں لگا کر اس بے چارے کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ طرفہ تر بات یہ ہے کہ فتح اللہ بیگ خاں والی فیروز پور کا برادر عم زاد ہے۔ مختصر یہ کہ قصہ یہاں تک پہنچ گیا کہ مجھ پر لعنت ملامت دہلی کے یاوہ گویوں کا وظیفۂ لب بن گئی ہے۔ آغاز میں تو صرف ولیم فریزر بہادر کے قتل ہی کا افسوس تھا، اب ایک طرف قاتل مشخص ہوگیا اور ادھر بدگمانان شہر نے مجھے عاجز کر دیا۔ یزدان پاک ہے جو ستم گروں کو ہلاک کرتا ہے اور ستم رسیدہ لوگوں کو اپنی بخشایشوں سے نوازتا ہے۔ میں صبح کے وقت یہ دعا کرتا ہوں کہ اس خیرہ سر بے آزرم کو جلد از جلد اس کے کیفر کردار تک پہنچائے اور اس سربلندی طلب کرنے والے کو فرازی دار نصیب ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میری ہمت ظفریاب اور میری دعا بارگاہ خداوندی میں مستجاب ہے۔۔ (فارسی سے ترجمہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی)

عدالت نے کریم خاں اور نواب شمس الدین کو مجرم قرار دیا اور پھانسی کی سزا کا حکم دیا۔

۳/ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو جہاں نواب شمس الدین کو پھانسی دی گئی آنکھ پر ہزار آدمیوں کا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ نواب راہ خدا میں جان دینے والے شہیدوں کے لیے مخصوص ہرے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ اور ان کے سر اسی موت پانے کے بعد یہ افواہیں ہر طرف پھیل گئیں کہ پھانسی پر ان کا بے جان جسم خود بہ خود گھوم کر قبلہ رخ ہو گیا۔ ان کو قطب میں مدد کے پاس دفن کیا گیا۔ جلد ہی ان کی قبر اچھی خاصی زیارت گاہ بن گئی۔

انگریز کا یہ تقریباً کھلے عام قتل عوام کی نظروں میں قربانی نفس سے کم نہیں تھا کیوں کہ کوئی کیسے یہ مان لیتا کہ نواب شمس الدین واقعی بے سزا بچ نکل جانے کی امید رکھتے رہے ہوں گے۔ پھانسی کے وقت فی سبیل اللہ شہادت کے حلقۂ نور نے خوش عقیدہ عوام کی نگاہوں میں نواب شمس الدین کی شخصیت کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا۔

ہندوستانی سماج کے متعدد طبقات میں بڑھتی ہوئی عوامی ناراضگی کو احتجاج کی ایک علامت کی ضرورت تھی اور نواب شمس الدین ایسی ہی ایک علامت ثابت ہوئے۔ عوام کے لیے بھی اور مغل بادشاہت کی بحالی اور نظام کہن کی ترویج نو کے خواہش مند پرانے مسلمان جاگیر دار طبقے کے متعدد نمائندوں کے لیے بھی۔ اس وقت ہندوستانیوں میں اخوت اور مساوات کے ان بورژوائی نعروں کی قدر و قیمت کا، جن سے وہ انگریزوں کی وساطت سے متعارف ہو سکتے تھے، صحیح معنوں میں اندازہ لگانے کی صلاحیت رکھنے والوں کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی اور ان اصولوں کے ماننے والوں کا تو بالکل فقدان تھا۔ اس لیے فریزر کے طور طریقوں کی جمہوریت پسندی خود اس سے ربط میں آنے والے لوگوں کو ناراض کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کے علاوہ فریزر میں چاہے کیسی بھی ذاتی خوبیاں کیوں نہ رہی ہوں، زیادہ تر ہندوستانیوں کے لیے وہ بہرحال ان بدیسیوں میں سے ایک تھا جو ہندوستان کی دولت لوٹ رہے تھے، اور "دیسیوں" کی ایک بہت بڑی تعداد کی نظروں میں، جن میں اعلیٰ ترین طبقات کے افراد بھی شامل تھے، اس کی حیثیت ایک زمانے سے چلے آ رہے نظام کی بنیادوں ہی کو غارت کرنے والے کی تھی۔ عوام الناس کی نظروں میں اس ڈرامے کے کرداروں کی نوعیت ہی میں بنیادی تبدیلی آ گئی۔ مجرم اور انگریزوں کے واقعہ کاسہ لیس اور حاشیہ نشین نواب شمس الدین کو انھوں نے بے گناہ مظلوم بنا دیا اور نواب کے حکم سے مارے جانے والے فریزر کو اسی کے قاتل کی شہادت کا ذمہ دار قرار دے دیا۔

بہتان تراشی اور بدگمانی کا نشانہ بننے پر غالب کی برہمی اور تنفر بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن غالب جو اس نفرت انگیز واقعے میں کسی طرح بھی ملوث نہ تھے اور جن کا خود اس قتل ناحق کے مواخذہ سے نواب کے بچ نکلنے کی صورت میں، ان کے ظلم و تعدی کا اگلا شکار بننا بعید از قیاس نہ تھا، مستقل مزاجی کے ساتھ اس آزمائش سے بھی گزر گئے۔

دود سودائی تتق بست، آسماں نامیدہ ایم
دیدہ بر خواب پریشاں زد جہاں نامیدہ ایم
قطرہ خونے گرہ گردید، دل دانستہ ایم
موج زہر آبے بہ طوفاں زد زباں نامیدہ ایم
غربتم ناساز گار آمد وطن فہمیدہ ایم
کرد تنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدہ ایم
در سلوک از ہرچہ پیش آمد گزشتن داشتیم
کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدہ ایم
بر امید شیوۂ صبر آزمائے زیستیم
تو بریدی از من و من امتحاں نامیدہ ایم

دود سودائی گھر آیا، آسماں میں نے کہا
دیکھا اک خواب پریشاں تو جہاں میں نے کہا
قطرۂ خوں نے گرہ ڈالی تو سمجھا میں نے دل
موجِ زہراب آئی طوفاں بہ زباں میں نے کہا
ساز گار آئی نہ جب غربت تو سمجھا ہے وطن
دام نے تنگی جو کی تو آشیاں میں نے کہا
سالکی میں جو بھی پیش آیا ہوا رفت و گزشت
کعبہ دیکھا نقشِ پائے رہرواں میں نے کہا
اک امید شیوۂ صبر آزما پر زیست کی
تو گریزاں تھا تو اپنا امتحاں میں نے کہا

(ترجمہ: مظفر مجاز)

سنہ ۱۸۳۵ء شاعر کے لیے گہرے ذہنی صدموں کا سال ہونے کے باوجود اس کی ان تھک ادبی کاوشوں کو انجام تک پہنچانے والی اور اس کی مستقل مزاجی کی آئینہ دار قابل ذکر ادبی کام یابیوں کا سال بھی تھا۔ غالب کام جٹ کر کرتے تھے۔ اسی سال انھوں نے فارسی نثر کے مجموعے "پنج آہنگ" کے قلمی نسخے کو مکمل کرلیا۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان کے منصوبے کے مطابق اس تصنیف میں فارسی الفاظ کے استعمال کے بعض مشکل مقامات سے عہدہ برا ہونے کے بارے میں مختلف تجاویز اور بہ طور مثال کام آنے والی ادبی عبارتیں اکٹھا کردی گئی ہیں۔ کتاب میں دو بار اضافے کیے گئے اور اسے پھر سے ترتیب دیا گیا اور بالآخر ۱۸۴۹ء کی اشاعت میں اس کے مشمولات حسب ذیل تھے: آہنگ اول "القاب و آداب اور اس کے متعلقات" کے لیے وقف تھا، یعنی مختلف اشخاص سے تخاطب کے شائستہ طریقوں پر غور و خوض کے لیے، جس کو مہذب طور طریقوں اور مراسلت کے ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل تھی اور جس کی ثقافت کے ایک اہم شعبے فن انشا پردازی میں مہارت حاصل کرنے میں بے حد اہمیت تھی۔ یہاں غالب والد، اتالیق و مرشد اور استاد سے تخاطب کے لیے مناسب فقرے گزارش کرنے والے یا تحریری درخواست پیش کرنے والے کے تعلق سے مختلف کلمات انکسار، رسید خطوط کے شکریے اور ان کی عدم رسید یا تاخیر اور معینہ صورت حال میں محسوس کیے جانے والے مختلف جذبات کے اظہار کے لیے مناسب کلمات بہ طور مثال پیش کرتے ہیں۔ دوستانہ خط و کتابت اور بھائیوں اور دیگر اقربا سے تخاطب کے لیے شائستہ کلمات کا ایک اور زمرہ تجویز کرتے ہیں۔ خوشی کی تقریبوں کے لیے مبارک باد کے مختلف کلمات کے استعمال کی سفارش کرتے ہیں۔ ادبیات، علم السنہ اور تدوین متن کے ماہرین نیز مورخین کے لیے اس باب کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے، کیوں کہ مآخذ، دستاویزات اور نجی خط و کتابت کے مطالعے کے لیے مکتوب نگاری اور انشا کے ان پیچیدہ فقروں سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر مناسب ہوگا کہ ۱۸۳۵ء ہی میں ہندوستان کے انگریز انتظامیہ کے فیصلے کے مطابق دفاتر اور سرکاری خط و کتابت کی زبان فارسی کی بجائے اردو قرار دی گئی تھی اور اس طرح سے ہندوستان کی ثقافت کی تاریخ کے ایک مستقل باب کے نیچے خط اختتام کھینچ دیا گیا۔ یہ اقدام قومی خودآگاہی میں اضافے کی راست شہادت بھی تھا اور ساتھ ہی ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں اردو زبان کی اہمیت میں اضافے کی نشان دہی بھی کرتا تھا۔ لیکن ان حالات میں "پنج آہنگ" نے جلد ہی مستقل استعمال میں رہنے والے دستور العمل کی بجائے ایک ادبی اور لسانی یادگار کی حیثیت اختیار کرلی۔

"آہنگ دوم" میں فارسی خزانۂ الفاظ کی خصوصیات پر سوچ بچار کیا گیا ہے: فعل سے بننے والے اسما یعنی حاصلِ مصدر، فعل کی مختلف اشکال اور فارسی محاوروں کے استعمال پر بحث کی گئی ہے اور مختلف تراکیب الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ باب کے آخر میں متروک اور نادر تراکیب الفاظ کی ایک مختصر سی فرہنگ بھی دی گئی ہے۔

"آہنگ سوم" میں مختلف موقعوں اور صورتِ حال سے مطابقت رکھنے والے اور خط کی عبارت کی تزئین کا کام دینے والے منظوم قطعات پیش کیے گئے ہیں۔ اس باب کے تمام اشعار غالب کے رشحات قلم ہیں اور جیسا کہ عنوان میں بتلایا گیا ہے ان کے فارسی دیوان سے لیے گئے ہیں، جو ان دنوں کتابت کے مراحل میں تھا۔ مثال کے طور سے صورتِ حال کا تقاضا یہ ہو سکتا ہے کہ خط میں کسی ایک علاقے کی آب و ہوا کی تعریف و توصیف کی جائے، تھکان اور خرابیِ مزاج کا شکوہ کیا جائے یا پھر حسن نسوانی کی ستائش کی جائے، وغیرہ وغیرہ۔ یہاں ہم ایک شعر پیش کرتے ہیں، جس پر محض اتفاقاً ہماری نظر پڑی اور جو بہ قول شاعر "اس خط کے لیے مناسب ہے جس میں کوئی ناخوش گوار اطلاع دی جارہی ہو":

تبگن در آتش و تب و تابم نظارہ کن
غم نامہ مرا بکشودن چہ احتیاج

(میرے غم نامے کو کھولنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے اسے سپردِ آتش کر اور میرے تب و تاب کا نظارہ کر)

آخری دو "آہنگ" گراں قدر تاریخی و لسانی مواد پر مشتمل ہیں: ان میں تقریظیں، تصانیف کے بارے میں رائیں، دیباچے، خاتمۂ کلام اور ۱۸۳۵ء سے قبل تحریر شدہ غالب کے خطوط اکٹھا کر دیے گئے ہیں۔ بعد کے قلمی نسخوں اور اشاعتوں میں نئی تقریظیں اور خطوط شامل کیے گئے۔ آہنگ چہارم ان برسوں میں غالب کی ادبی سرگرمیوں کے وسیع پیمانے کا آئینہ دار ہے، نوجوان مصنفین اور شاگردوں کے تعلق سے ان کے مستقل کام کو ظاہر کرتا ہے اور ان کی ادبی دلچسپیوں کے دائرے کی نشان دہی کرتا ہے۔

اپنے اسلوب کے لحاظ سے تقریظیں اور بیشتر خطوط بالعموم نثرِ مرصع کے زمرے میں آتے ہیں، اور چوں کہ بیشتر خطوط اور تقریظ لکھتے وقت وہی "آداب" ملحوظ خاطر رہتے تھے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، یعنی نہایت شائستہ ڈھنگ سے پسندیدگی کا اظہار نہ کہ عہدِ حاضر کی بے لاگ ادبی تنقید، نتیجتاً ان میں عبارت آرائی اکثر تنقیدی چھان بین کے متبادل کا کام دیتی تھی۔ لیکن یہ عبارتیں ادبی طریقِ عمل کی جیتی جاگتی شہادتیں ہیں، یہ تنقیدی تجربوں کی تلاش کی آئینہ دار ہیں اور فنی خود آگاہی کی تشکیل کی گواہی دیتی ہیں۔ مزید برآں صحیح تاریخ کا حوالہ دست یاب نہ ہونے کی صورت میں یہ عبارتیں گراں قدر معلومات کا ماخذ بھی بن جاتی ہیں۔ مثلاً غالب کے مجموعۂ کلام "گلِ رعنا" کے قلمی نسخے کی دریافت سے قبل اس کے وجود کا علم غالب شناسوں کو اس دیباچے سے تھا جو "پنج آہنگ" میں شامل ہے اور ابھی تک دست یاب نہ ہونے والے مجموعۂ کلام "میخانۂ آرزو" کے وجود کا علم ہمیں اس دیباچے سے ہوتا ہے جو علی بخش رنجور نے خود "پنج آہنگ" کے لیے تحریر کیا تھا۔

اور بالآخر اس مجموعے کا "آہنگ پنجم"، جو غالب کے فارسی خطوط پر مشتمل ہے، جن کے حوالے اپنی اس داستان میں ہم متواتر دیتے آئے ہیں۔ ۱۸۳۵ء کے قلمی نسخے میں ان پانچ "آہنگوں" کی ترتیب اور مشمولات مذکورۂ صدر سے مختلف تھے۔

غالب کے ذہن میں متعدد ادبی منصوبے تھے۔ کم و بیش اسی زمانے میں غالب نے میر امن کے قصۂ "چہار درویش" کی طرح اردو نثر میں ایک خیالی قصہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔

رفتہ رفتہ غالب کے خلاف بہتان تراشی، بدگوئی اور افواہوں کے طوفان کا زور ٹوٹا۔ مالی مشکلات اور عارضی زاویہ تشقیقی یا نظربندی کے باوجود، نواب شمس الدین والے معاملے کی وجہ سے سماج کے اس طبقے سے تصادم کے باوجود جس کو وہ عوام کالانعام کا نام دیتے تھے، دلی میں غالب کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیاقت کے اعتراف میں گورنر کے دربار میں ان کو اعزازی نشست ملتی ہے۔ لیکن خوش حالی کی اس سطح پر گزر بسر کے لیے وسائل کی تلاش، جس کے وہ عادی ہو چکے تھے اور ان کا رتبہ جس کا متقاضی تھا، انھیں اب بھی فکر مند رکھتی ہے۔

۱۸۳۶ء میں وہ اپنی پنشن کے سلسلے میں خط و کتابت پھر سے شروع کرتے ہیں، اور اس بار ان کا تخاطب براہ راست لندن سے تھا۔ جیسے ہی ان کی پنشن کا معاملہ چلتا، ناکامیاں یوں پے در پے ان کا پیچھا کرتیں کہ ان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو کب کا جد و جہد سے کنارہ کش ہو جاتا۔ لیکن مرزا غالب اس قماش کے تو تھے نہیں۔ اس بار انھوں نے جو مطالبے پیش کیے وہ اور بھی کڑے تھے، ان پر غور کرکے مخاطب کو شاید ہنسی ہی آتی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مئی ۱۸۰۶ء، یعنی ان کے چچا کی تاریخ وفات سے ان کی پنشن کا دس ہزار روپے سالانہ کی شرح سے دوبارہ حساب کیا جائے اور اس طرح سے دو لاکھ تیس ہزار روپے جو بقایا بنتا ہے وہ انھیں ادا کیا جائے۔ غالباً وہ یہ سمجھتے تھے کہ فریزر کے قتل کا سنسنی خیز مقدمہ برطانوی عدلیہ کو ان لوگوں کے ساتھ زیادہ توجہ سے سلوک کرنے پر مجبور کر دے گا جو نواب شمس الدین خاں کے ہاتھوں نقصان اٹھا چکے تھے اور یہ کہ شقہ کی جعل سازی کے مسئلے پر اس بار زیادہ غیر جانب داری کے ساتھ غور کیا جائے گا۔ غالب کو شاید ہی اس کا ٹھیک سے علم رہا ہوگا کہ اس وقت لندن اور کلکتے میں اولاً مغلیہ دربار کی کفالت پر ہونے والے اخراجات میں کمی اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے غیر منفعت بخش اخراجات کے سدباب کے منصوبوں پر بڑے انہماک کے ساتھ غور و خوض ہو رہا تھا۔

ادائیگی کی کسی بھی رقم میں اضافہ صرف اس صورت میں روا سمجھا جاتا تھا، جب کہ اس سے کمپنی کو راست منافع کی توقع ہو اور غالب کے مقدمے کی ان کے حق میں فیصلے سے کمپنی کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا؟

مدحیہ قصائد کے ذریعے روپے بہم پہنچانے کی غالب کی کوششیں بھی بار آور ثابت نہ ہوئیں اور جیسا کہ سب جانتے ہیں، اس زمانے میں پیشہ ور شاعروں کے لیے، شاگردوں کے کلام پر اصلاح کے علاوہ، یہی واحد مروجہ ذریعۂ آمدنی تھا۔

غالب کے خط بہ نام تفتہ مورخہ ۱۹/ اگست ۱۸۶۱ء میں مذکورہ ۱۸۳۶ء میں درپیش آنے والے، المیہ اور طربیہ دونوں کے عناصر سے مملو واقعے کا تعلق ایسے ہی اپنے ایک مدحیہ قصیدے کو ممدوح کے ہاں باریاب کرانے کی ان کی ایک کوشش سے ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں کلکتے سے واپسی کے بعد مرزا نے نواب اودھ نصیر الدین حیدر کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ منشی محمد حسن کی وساطت سے بھیجا تھا۔ جس دن قصیدہ نواب کی خدمت میں پیش کیا گیا انھوں نے حکم دیا کہ شاعر کو پانچ ہزار روپے ادا کیے جائیں۔ غالب کے لیے جو اس زمانے میں کافی تنگی ترشی سے گزر بسر کر رہے تھے یہ ایک خطیر رقم تھی۔ تاہم منشی محمد حسن نے غالب کو اس کی اطلاع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کچھ عرصے بعد غالب کے ایک دوست لکھنؤ سے دہلی آئے اور ان سے قصیدے کے صلے میں ان کو واجب الادا رقم کا مرزا کو علم ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ دوست نے بڑے اصرار کے ساتھ غالب سے درخواست کی کہ وہ ان کا نام و نشان منشی محمد حسن پر، جو مستقل چپ سادھے ہوئے تھے، ظاہر نہ کریں۔ مرزا نے ناسخ کو، جو اس وقت تک لکھنؤ واپس آچکے تھے، خط لکھ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ پتہ چلائیں کہ روپے کہاں غائب ہو گئے۔ جواب میں ناسخ نے اطلاع دی کہ قصیدے کے صلے میں غالب کو واقعی پانچ ہزار روپے عطا کیے گئے تھے۔ لیکن چوں کہ رقم نائب السلطنت روشن الدولہ کے ذریعے جاری کی گئی تھی انھوں نے پانچ میں سے تین ہزار خود اپنے تصرف میں لانے میں مضائقہ نہ سمجھا، باقی ماندہ رقم "دیانت داری" کے ساتھ منشی محمد حسن کے حوالے کی اور ہدایت دی کہ وہ اس رقم میں سے جتنی مناسب سمجھیں غالب کے ہاں بھیج دیں۔ ناسخ تعجب کرتے ہیں: "واقعی کیا یہ سچ ہے کہ انھوں نے بالآخر کچھ بھی نہیں بھیجا؟" ناسخ نے خواہش ظاہر کی کہ اگر ایسا ہے تو انھیں فوراً مطلع کیا جائے۔ غالب نے اطلاع دی کہ پوری رقم کی بات ہی کہاں، انھیں پانچ روپے بھی نہیں ملے۔ اب ناسخ نے مندرجۂ ذیل حکمت عملی تجویز کی: غالب ایک خط ناسخ کے نام لکھیں، جس میں اطلاع دیں کہ انھوں نے نواب کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ بھیجا تھا، لیکن اس کا علم نہیں کہ آیا نواب کو یہ قصیدہ پسند آیا اور انھوں نے شاعر کو اس کی محنت کا کوئی صلہ عطا فرمایا۔ اس حکمت عملی کے مطابق خط موصول ہونے پر ناسخ اسے بھرے دربار میں پڑھ کر سنائیں گے اور پھر دیکھا جائے گا کہ رقم ہتھیانے والے کا ردِ عمل کیا رہتا ہے۔ غالب نے تجویز کے مطابق جیسا خط درکار تھا لکھا اور ڈاک سے روانہ کر دیا۔ لیکن دو دن کے بعد خبر ملی کہ نواب اودھ کا انتقال ہو گیا۔

۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی نے وفات پائی۔ بہادر شاہ ظفر سلطنتِ مغلیہ کے بادشاہ بنے۔ دستور کے مطابق ولی عہد کا انتخاب خود بادشاہ کیا کرتا تھا اور اکبر شاہ نے اپنے بعد تخت نشینی کے لیے چھوٹے بیٹے سلیم کو نامزد کر رکھا تھا۔ لیکن چوں کہ شاہزادہ سلیم کا انتخاب برطانوی انتظامیہ کے حسبِ منشا نہیں تھا، تخت و تاج بڑے بیٹے کو ملا، جو اس وقت تک خاصے سن رسیدہ ہو چکے تھے، شاعری کے دل دادہ تھے اور خود بھی ظفر تخلص سے شعر لکھتے تھے۔ کوئی بھی یہ سوچے گا کہ منصب شاہی پر سرفراز یہ شاعر قدرتی طور پر ہندوستان کے ممتاز ترین شاعر غالب کی لیاقت کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں اپنے دربار میں باریاب کرے گا اور بالآخر اب مرزا کو بادشاہ وقت کی سرپرستی اور اعانت نصیب ہوگی۔ پرانے زمانے سے شاہی درباروں میں "ملک الشعراء" کا منصب چلا آیا تھا، جو لائق ترین درباری شاعر کو عطا کیا جاتا تھا۔ لیکن یہاں بھی قسمت نے غالب کی ہنسی اڑائی۔ یہ سوچ کر کہ بادشاہِ وقت کی وفات کے بعد شاہزادہ سلیم تخت نشین ہوں گے کچھ عرصہ قبل غالب نے ان کی شان میں ایک شاندار مدحیہ قصیدہ لکھا تھا، جس سے، ظاہر ہے، کہ بہادر شاہ چوکنے ہوئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ

"ملک الشعراء" کی خدمت خالی بالکل نہیں تھی، اس پر مرزا غالب کی بڑھتی ہوئی شہرت کو تشویش کی نظروں سے دیکھتے ہوئے، شیخ محمد ابراہیم ذوق مضبوطی سے قابض تھے۔

جب بہادر شاہ بر سر اقتدار آئے لال قلعے کے محل اور اس کے ملحقات کی حیثیت تقریباً ایک ستھرا کیے ہوئے کھنڈر کی سی تھی۔ لگتا تھا کہ یہاں سے کئی زبردست طوفان تباہی مچاتے ہوئے گذر چکے ہیں۔

نادر شاہ مشہور زمانہ تخت طاؤس اور دوسری بیش بہا اشیا ایران لے گیا، جاٹوں اور سورج مل نے رنگ محل کے چھت کا چاندی کا پتر اتار لیا اور بے شمار ہیرے جواہرات لوٹ لیے۔ غلام قادر روہیلہ نے، جس نے شاہ عالم کو اندھا کروا دیا تھا، دفینوں کی تلاش میں محل کا سارا فرش کھدوا ڈالا اور شاندار کتب خانہ تباہ کر دیا، فن کتاب سازی کے متعدد بیش بہا نمونے نیست و نابود کر دیے۔

مغل بادشاہوں کی حکومت کی بحالی کے ساتھ ساتھ محل کی تعمیر جدید بھی ہوئی تھی لیکن اس کام میں کوئی نمایاں پیش رفت نہیں ہوئی، حالاں کہ اکبر شاہ ثانی نے کھنڈر کی مرمت کی کچھ کوشش کی بھی تھی مگر جو رقم اس کام کے لیے مہیا کی جاتی تھی وہ بالکل ناکافی تھی اور جلد ہی کھنڈر اپنی اصلی حالت میں واپس آگیا۔ ۱۸۲۴ء میں صدر پادری ہیبر محل کے ان تمام حصوں کو، جنھیں دیکھنے کا انھیں موقع ملا بے رونق، اجاڑ اور بے توجہی کا شکار بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "شاہی برج گندا، بے مرمت اور جگہ جگہ سے ڈھ گیا تھا، حوض اور فوارے سوکھ گئے تھے، اندرونی صحن، عمارتی ملبے اور طرح طرح کی ردی چیزوں سے اٹے ہوئے تھے، دیواریں چڑیوں اور چمگادڑوں کی بیٹ سے ڈھکی ہوئی تھیں۔"

بہادر شاہ نے پھر سے محل کی مرمت اور فرودگاہ شاہی کی درستی کا کام شروع کیا۔

تخت نشینی کے وقت بہادر شاہ باسٹھ سال کے تھے۔ وہ سادہ لباس پہنتے اور رہن سہن میں اعتدال پسندی سے کام لیتے تھے۔ بہت سے بدخواہ اس سادگی کو فرومایگی سے تعبیر کرتے اور یہ کہہ کر ملامت کرتے کہ اپنے حلیے سے وہ بادشاہ سے زیادہ "کوئی منشی یا مدرس" دکھائی دیتے ہیں۔ محل کے روزنامچے میں، جس میں بادشاہ کی مصروفیات درج کی جاتی تھیں، اکثر یہ اندراج ملتا تھا کہ "جہاں پناہ نے سارا دن لکھنے پڑھنے اور ذکر الٰہی میں گزارا۔"

بہادر شاہ اپنے افعال میں خود مختار نہیں تھے، آزاد سیاسی نقطۂ نظر سے وہ طبعاً بے گانہ تھے اور اہم بات یہ ہے کہ ان کے پاس واقعی ایسا نقطۂ نظر ہوتا بھی تو اسے برطانوی انتظامیہ خاطر میں کب لاتا۔

بہادر شاہ کی طبیعت کی ان خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے اسپیر یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ان کے لیے شاید جرمن شہنشاہی کی کسی چھوٹی سی ریاست کے والی کا رول زیادہ موزوں ہوتا اور بادشاہ کی شعر و ادب کی سرپرستی کے بارے میں اپنے خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ دہلی اور ویمر کا مقابلہ کرتا ہے: "بہادر شاہ ظفر کے عہد میں دہلی ہندوستان کا ویمر تھا اور غالب اس کا گوئٹے۔"

تاہم اپنی حکومت کے پہلے دس سال کے عرصے میں بہادر شاہ نے اس "گوئٹے" کو اپنے تقرب سے نوازنے میں کوئی جلدی نہیں دکھائی اور ہندوستان کا یہ عظیم شاعر مالی مشکلات کے شکنجے میں پھنسا تڑپتا رہا اور اسے نہ ہی عدلیہ کی طرف سے کوئی سہارا ملا اور نہ ہی "شعر و ادب کے سرپرست" بہادر شاہ کی طرف سے۔

غالب حقیقت سے مصالحت کے راستے بھی تلاش کرتے ہیں اور جب بھی بن پڑتا ہے اس کے خلاف بغاوت بھی کرتے ہیں:

بہ وادیے کہ درآن خضر را عصا خفت ست	وادی وہ جس میں عصا بھی خضر کا خوابیدہ ہے
بہ سینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفت ست	سینے کے بل چل پڑا ہوں گرچہ پا خوابیدہ ہے

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ ست
دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد
کہ دزدِ مرحلہ بیدار و پارسا خفتہ ست
درازیِ شب و بیداریِ من این ہمہ نیست
زبختِ من خبر آرید تاکجا خفتہ ست
بہ بین زدور و مجو قرب شہ کہ منظر را
دریچہ بازو بہ دروازہ اژدہا خفتہ ست

رات تاریک اور ہوا دشمن تو طوفاں خیز بحر
ہوگیا لنگر شکستہ ، ناخدا خوابیدہ ہے
سبحہ و سجادہ کی خاطر لرز اٹھتا ہے دل
جاگے دزدِ مرحلہ اور پارسا خوابیدہ ہے
لمبی یہ شب اور یہ میرا جاگنا ، کچھ بھی نہیں
میری قسمت کی خبر لو ، تاکجا خوابیدہ ہے
دور ہی سے دیکھ قرب شاہ کی کوشش نہ کر
ہے دریچہ باز ، درپہ اژدہا خوابیدہ ہے

(ترجمہ: مضطر مجاز)

ان حالات میں اگر غالب کو بارہا رہ ورسم پارسائی کا تو مذکور ہی کیا نکو کاری کے راستے سے بھی انحراف کرنا پڑا تو اس میں تعجب کی کوئی ایسی بات کہاں ہے۔ "عوام کالانعام کے فرسودہ رسوم و رواج۔ ان کے لیے کتنے ناقابل برداشت تھے اور جب وہ اعتدال پسندی اور پرہیز گاری، کم لیاقتی اور ہر امر میں اسلاف کی سند ڈھونڈتے رہنے کی عادت کے خلاف اپنے احتجاج کے لیے الفاظ تلاش کرتے تو ان کے قلم سے ایسے ایسے حیرت انگیز پیکرِ خیالی جنم لیتے جن کا ماخذ و منبع ایسا لگتا ہے کہ خاص ہندوستان کا ماحول، وہاں کے عقیدے اور قصے، وہاں کے رسوم و رواج اور نظریات ہیں۔ کیا انیسویں صدی عیسوی کی فارسی غزل میں ہم تخریب و تخلیق کا ناچ ناچنے والے اس شیو مہادیو نٹ راج کے پیکر خیالی کا تصور کر سکتے ہیں، جس کے متعدد ہاتھ ہیں اور جو اپنے ناچ، تانڈو، کے ذریعے اپنے قوانین کے مطابق کائنات کو نیست و نابود بھی کرتا ہے اور اس کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ صرف 'سبک ہندی' میں مقامی حقائق پر توجہ دینا ممکن تھا، گو کہ غالب کے ہاں اس کی مثالیں زیادہ نہیں ہیں۔

اس غزل میں بھی جس کے اشعار ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں ہندوستان سے مخصوص کوئی بات نہیں ہے، صرف دنیا سے اختلاف کا آئینہ دار ناچ کا پیکر خیالی ہے:

چون عکس پل بہ سیل، بہ ذوقِ بلا برقص
جارا نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص
ذوقے ست جستجو چہ زنی دم ز قطعِ راہ
رفتار گم کن و بہ صدائے درا برقص
فرسودہ رسم ہائے عزیزان فرو گزار
در سور نوحہ خوان و بہ بزمِ عزا برقص
چون خشمِ صالحان و ولائے منافقان
در نفس خود مباش و لے برملا برقص
از سوختن الم ز شکستن طرب مجوے
بے ہودہ در کنارِ سموم و صبا برقص
غالب بدین نشاط کہ وابستہ کہ
بر خویشتن ببال و بہ بند بلا برقص

جوں سایہ پل سیل پہ ، باذوق بلا ناچ
رکھ خود پہ نگاہ اور مگر خود سے جدا ناچ
کیا طئ مسافت کا جنوں، ذوقِ عمل ڈھونڈھ
رفتار کو بھول اور بہ غوغائے درا ناچ
کر ترک عزیزوں کی یہ فرسودہ سی رسمیں
کر گریہ طرب گہ میں ، ہنگامِ عزا ناچ
ہو نیکوں کا غصہ کہ منافق کا تولا
آلودہ نہ کر نفس کو ، باذوق ابا ناچ
جلنے میں الم دیکھ نہ کھلنے میں طرب ڈھونڈھ
در بزمِ سموم اور بہ آغوشِ صبا ناچ
تاچند نشاط و طرب و عیش یہ غالب
کر خود کو بلند اور بہ صد بند بلا ناچ

(ترجمہ: مضطر مجاز)

دہلی والوں کی نظروں میں اور راسخ العقیدہ اسلامی نقطہ نظر رکھنے والے غالب کے بعض تذکرہ نگاروں کی نظروں میں بھی، شاعر کے چال چلن میں اس کی مے نوشی اور قمار بازی کی لت دونوں باتیں قابل اعتراض تھیں۔ ایسا نہیں ہے کہ غالب کی

حیثیت قاعدۂ کلیہ ہے۔ کسی نادر الوجود استثنائی رہی ہو، نہ ہی ان کے چال چلن کو اس وقت کے معاشرے میں گویا کہ پوری طرح سے سرایت کیے ہوئے وقار و تمکنت کی صریح خلاف ورزی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم تاریخ ہند کے اس دور کے باکمال مبصر اور اس معاشرے کے اعلیٰ طبقات ہی کے موروثی نمائندے یوسف حسین خاں کی اس عہد کے عام اخلاقی انحطاط کے بارے میں رائے کا پہلے ہی حوالہ دے چکے ہیں۔ جس کی رو سے یہ صورت حال متاخر مغلیہ عہد کی دلّی کے عدم استحکام اور "جاگیردارانہ سماج سے نئے سماج کی طرف سفر کے ایک کرب ناک عبوری دور" کی شاہد تھی۔

بلاشبہ غالب کی قمار بازی کی لت نصابی کتابوں کے لیے مخصوص ایک مستند شاعر کی، عقیدت کے ساتھ کھینچی جانے والی تصویر سے کم ہی مناسبت رکھتی ہے اور جب کوئی راسخ العقیدہ ماہر ادبیات ظاہر دارانہ استعجاب کے ساتھ "غالب کی مے نوشی" اور "غالب کی قمار بازی کی لت" جیسے مسائل پر دادِ تحقیق دیتا ہے تو ہمیں اچھے خاصے مجوبے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

غالب تقدیر سے نبرد آزما رہے، لیکن قسمت سے آئے دن کے تصادم میں فتح صریحاً کبھی ان کا ساتھ نہیں دیتی تھی، خصوصاً اس وقت جب کہ تقدیر انگریز نوکر شاہی کے روپ میں ان کے سامنے آتی یا جاگیرداری کے ان پیچ در پیچ تنازعوں کی شکل میں، جن کا دوسرا نام دغا بازیوں، ایک دوسرے کے توڑ میں چلی گئی چالوں اور مکر و فریب کا ایک معجونِ مرکب تھا، منتصب عوام الناس کا روپ دھار کر ان کے سامنے آتی یا پھر بلند منصب پر فائز کسی جعل ساز کے حلیے میں۔ یہاں تقدیر سدا سے، تاریخی زمانے میں بھی اور زمانۂ ما قبل تاریخ میں بھی، راست باز کے خلاف ہی رہی ہے:

تو نالی از خلہ خارو تنگری کہ سپہر
سر حسینؓ علیؓ برسنان بگر داند
بہ و بجادی و اند وہ دل مدہ کہ قضا
چو قرعہ بہ نمط امتحان بگر داند
یزید را بہ بساط خلیفہ بنشاند
کلیمؑ را بہ لباس شبان بگر داند

خلش سے خار کی روتا ہے کیا، فلک نے تو دیکھ
سر حسینؓ کو نوکِ سناں پہ کھینچ دیا
خوشی سے خوش ہو نہ غم سے ہو تو غمیں کہ قضا
لیا ہی کرتی ہے اس طرح امتحان سدا
کبھی یزید کو بخشے عناں خلافت کی!
کبھی بنا کے گڈریا کلیم کو ٹالا!

(ترجمہ: مضطر مجاز)

تقدیر کے ہاتھوں رسولؐ کے نواسے اور حضرت علیؓ کے فرزند شرافت مجسم امام حسینؑ کا سر قلم ہوا اور ان کی جگہ بساطِ خلیفہ انھیں کے قاتل یزید کو ملی۔ قسمت ہی کی کرنی سے موسیٰ کلیم اللہ کو، جن کے ذریعے انسانیت کو اپنی ہدایت کے لیے دس احکام خداوندی ملے، گڈریے کے پھٹے پرانے لباس میں گلہ بانی کرنی پڑی۔ لیکن اگر قسمت پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تو اس کے ساتھ پالسا تو کھیلا جا سکتا ہے! یہاں، قمار بازی کی بساط پر غالب قسمت کو للکار سکتے تھے اور اس سے انتقام لینے کی کوشش کر سکتے تھے، کیوں کہ یہاں ان کے جوش اور ولولے کے سامنے اور ان کی ہوش مندی اور قوی یادداشت کے مقابلے میں قسمت کا بس نہیں چلتا تھا۔

غالب پانسے کے کھیلوں میں چوسر پسند کرتے تھے۔ بالعموم معاشرے کے اعلیٰ طبقات میں چوسر قابلِ مواخذہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پھر بھی کسی کی مخبری کے نتیجے میں پولیس نے 1841ء میں غالب کے گھر کی تلاشی لی۔ مرزا اور ان کے چند احباب کو تھانے لے جایا گیا اور ان پر سو روپے جرمانہ عائد کیا گیا۔ خوش قسمتی سے کوتوالِ شہر غالب کی ادبی لیاقت کا پرجوش شیدائی نکلا، اور اس نے کوشش کر کے معاملے کو جلد ہی رفع دفع کر دیا۔

مشکل وقتوں میں بارہا اس کے کام آنے والی لطیف ظرافت کے ساتھ شاعر اپنی کسمپرسی پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

بادہ بوام خوردہ و زربہ قمار باختہ
وہ کہ زہرچہ نا سزاست ہم بہ سزانہ کردہ ایم

(شراب میں نے قرض کی پی اور مال وزر قمار بازی میں لٹایا، افسوس کہ جو کچھ میرے لیے نامناسب ہے اسے بھی میں ڈھنگ سے کر نہیں پایا)
احباب اس واقعے سے بہت متفکر تھے اور انھوں نے سوچ بچار شروع کیا کہ غالب کی گزر بسر کا کوئی مستقل وسیلہ تلاش کیا جائے۔

1842ء میں مرزا کے مخلص دوست آزردہ نے دہلی کالج میں مدرسی کی خدمت کے لیے غالب کا نام تجویز کیا۔

نوٹ

غالب کا مشہور شعر ہے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس کے علاوہ اپنے ایک خط میں انھوں نے خود کو "فقیر متکبر" بھی قرار دیا ہے۔ چناں چہ اس باب کا عنوان "بندۂ آزاد و خودبیں" یا "فقیر متکبر" بھی ہو سکتا تھا لیکن میرے استفسار پر مصنفہ کتاب نے وضاحت کی کہ باب کا عنوان تجویز کرتے وقت ان کے ذہن میں اقبال کا یہ شعر تھا:

من گدائے بے نیازم مشربم این ست و بس
مومیائی خواستن نتواں، شکستن می تو ان

فاضل مصنفہ کا خیال ہے کہ یہ شعر غالب پر بھی پوری طرح سے صادق آتا ہے۔ (مترجم)۔

***

سلسلہ(ص ۹۹) نئی نسل اور اہل وطن کو ان کارناموں سے واقف کروانے کے لیے ضروری ہے کہ "نقوش تاباں" کا ترجمہ انگریزی، ہندی اور تلگو میں کروایا جائے تاکہ دورِ آصفی کے بے مثل فیاضی اور بے تعصبی کا حال اہل وطن کو بھی معلوم ہوسکے۔ سکریٹری لطافس چیریٹبل ٹرسٹ سے ہماری خواہش ہے کہ وہ اس کتاب کے ترجمے اور اشاعت کی ذمہ داری لیں سہالی اعتبار سے یہ کام بہت چھوٹا ہے مگر اہمیت اور افادیت کی لحاظ سے بہت بڑا ہے اسے جلد سے جلد محفوظ کرلینے کی ضرورت ہے۔
(محمد اسحق)

* * * * * * *

ڈاکٹر الطاف جاوید

بیگانگی

بیگانگی کی تعریف

معاشرہ کے متضاد معاشی طبقات میں بٹ جانے سے فرد کے روحانی، نفسیاتی اور معاشرتی پہلوؤں پر جو اثرات مرتب ہوتے انھیں نفسیات کی اصطلاح میں بیگانگی ذات (SELF ALIENATION) کہا جاتا ہے۔ بیگانگی کے لیے ادب میں ایک دوسری اصطلاح (ESTRANGEMENT) بھی رائج ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم فرد کی ذات یا شخصیت کی سالمیت یا ہم آہنگی کا ختم ہو کر اس کا پارہ پارہ ہو جانا یا متضاد حصوں میں بٹ جانا ہے۔ یہ وہ ذہنی کیفیت ہے جس میں فرد اپنی محنت سے، اپنی محنت کی تخلیق کردہ اشیا سے، دوسرے ابنائے جنس سے اور سب سے بڑھ کر اپنی نوعی زندگی سے بیگانہ اور علاحدہ ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کی ذات اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تذلیل زندگی کی ارزانی اور بے وقعتی، کام چوری، انسانوں سے نفرت، جارحیت، تشدد اور کرب و اذیت، خاندانی رشتوں کی تباہی، ہمسایہ کے حقوق سے لاپروائی، جنسی لذتیت کے مظاہرے، کثرت شراب نوشی، تنگ نظر قومیت و نسل پرستی کے تصورات کی گرفت اور انسان دوستی کے جذبات کی شکست و ریخت شامل ہوتی ہے۔

جب سے معاشرے کی طبقاتی تقسیم عمل میں آئی ہے اس تقسیم کی سب سے پہلی شکل آقا اور غلام کی دوسری جاگیردار اور زرعی غلام (SERF) کی اور تیسری صنعتی انقلاب کے بعد مل مالک اور مزدور یعنی اجرتی غلام (WAGE SLAVE) کی شکل میں سامنے آئی۔ ان تمام شکلوں میں جو چیز مشترک ہے وہ محنت کش کا اپنی محنت، محنت کی پیداوار، دوسرے انسانوں اور اپنی نوعی زندگی سے بیگانگی یا علاحدگی ہے۔

قرآن حکیم اور تصور بیگانگی

قرآن حکیم نے بیگانگی کے مفہوم کے لیے ظلم، اسفل السافلین، خوف و حزن اور خسران کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ان میں سب سے بنیادی اصطلاح ظلم ہے۔ شجر ممنوعہ کے قریب جانے کے بعد آدم کو جو دعا کی تلقین کی گئی اس میں "ظلم" اور خسران کے الفاظ نمایاں ہیں۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات، میں ظلم کے معنی اس طرح بیان کیے ہیں کہ "وضع لشئی فی غیر موضعہ المختص" یعنی ایک چیز کا اس مقام سے جو اس کے لیے خاص ہے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا، کمی سے ہو یا زیادتی سے، یا اس کے وقت سے ہٹ کر یا جگہ سے ہٹا کر۔" عام لفظوں میں اس کا مفہوم قانون شکنی، حدود فراموشی، دوسروں کی ملکیت پر ناجائز تصرف کرنا، حقوق انسانیت میں کمی کرنا، دوسروں پر زیادتی کرنا، اپنی ذات کی نشوونما میں کمی کرنا وغیرہ ہے۔

ان معانی کی جامعیت پر غور کیا جائے تو ظلم کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً خدا نے ذرائع رزق سب انسانوں کے لیے تخلیق فرمائے۔ قرآن نے اس کے لیے کم میں ضمیر استعمال کی ہے۔ جس میں تمام انسان شامل ہیں اور یہی ان ذرائع کی تخلیق کے خلاف ہے اور غلط مقام اور مقاصد کے لیے ان ذرائع کا استعمال ہے۔

اس غلط استعمال سے ایک طرف دولت کی فراوانی پیدا ہو گئی اور اس مزید اضافہ کے لیے دوسروں کی زمینوں اور مال و متاع پر قبضہ جمانے کے لیے جنگ و قتال اور بغیر محنت کے رزق حاصل کرنے کے لیے لوٹ مار، ڈاکہ زنی، استحصال محنت جیسی فساد زدہ شکلیں سامنے آنے لگیں تو دوسری طرف ذرائع پیداوار اور محنت کش کی اپنی محنت کی پیداوار سے محرومی کے باعث ان میں بے بسی، ناداری، افلاس اور جہالت وغیرہ نے قدم جمالیے جس سے آقا اور غلام، جاگیر دار اور زرعی غلام اور اور کارخانہ دار اور اجرتی غلام پر مشتمل متضاد معاشی طبقات وجود میں آگئے ہیں۔ جن کی باہمی کشمکش کے نفسیاتی، ذہنی، عائلی اور عمرانی اثرات سے ساری انسانی تاریخ خسران میں مبتلا ہو گئی (سورہ العصر) لہٰذا اس ساری کیفیت کو "معاشی ظلم" کہا جائے گا۔

اسی طرح قدرت الٰہی نے ہر فرد کو ہوش و خرد سے نوازا ہے۔ اسے آزاد پیدا کیا ہے، اسے تقریر و تحریر کی آزادی کا حق عطا کیا ہے۔ اپنی رائے دینے اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے لیے اس کے راستے میں کوئی قدغن پیدا نہیں کی۔ وہ پنچایتوں کی شکل میں اکٹھے ہو کر باہمی مشاورت سے اپنے معاملات فیصل کرنے کی اہلیت کے مالک ہیں مگر جب ایک یا چند افراد طاقت، فریب کاری، دیوتاؤں کے ساتھ اپنا نسبی تعلق ظاہر کر کے یا ظل اللہ کا خطاب حاصل کر کے انسانی جمعیتوں پر جبر و استبداد قائم کر کے ان کی آزادی چھین لیں ان پر شخصی آمریت، فوجی ڈکٹیٹرشپ یا ملوکیت و سلطانیت مسلط کر دیں تو یہ سیاسی ظلم ہو گا۔

تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب اقتدار اصحاب، مالدار طبقوں، پروہتوں، کاہنوں اور دوسرے مذہبی پیشواؤں نے علم و تہذیب کے ذرائع پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے عام آدمی کو جہالت اور ذہنی پسماندگی میں مبتلا کر دیا۔ اور اس صورت حال کو علم و تہذیب کے دائرے میں ظلم پسندی کہیں گے۔

اگر خدائے واحد کی صفات اور قوتوں کا سزاوار کسی مخلوق کو قرار دے دیا جائے تو یہ شرک کہلائے گا اور شرک کو قرآن نے "ظلم عظیم" (سورہ لقمان) قرار دیا ہے۔ شرک سے ایک تو انسان، نسل، قومیت، مذہب، رنگ و زبان اور تہذیب و ثقافت کے فطری اختلافات پر متحارب گروہوں میں بٹ جاتا ہے اور اپنی وحدت و اخوت بشری کھو بیٹھتا ہے۔ دوسرے اپنے سے کم تر مخلوق کے سامنے سر جھکانے، کائنات کے مظاہر کو الوہیت دے کر ان کی پرستش کرنے کی وجہ سے ان کے مطالعے سے ان کو اپنے مفاد کے لیے مسخر کرنے سے محروم رہتا ہے اپنے شرف بشریت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ہوس زر اندوزی، اقتدار پر قبضہ جمانے اور جنسی حیوانیت جیسی سفلی خواہشات کو اپنا معبود بنا کر (سورہ جاثیہ) اپنے نوعی نصب العین کو فراموش کر بیٹھتا ہے چوتھے ملوک و سلاطین اور صاحب اقتدار و دولت مند افراد کے جبر و استبداد کے خلاف بغاوت کرنے کی بجائے اپنی مجبوری، بے بسی اور کم علمی کے باعث ان کی غلامی اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا شرک کو تین چہروں والا خدا قرار دیا ہے۔ یعنی فرعون (حاکم مطلق) قارون (سرمایہ دار یا ذرائع پیداوار پر قبضہ رکھنے والا) اور بلعم باعور یا ہامان (مذہبی پیشوا) اور جو معاشرہ اس تکڈم کا شکار ہو گا وہ مشرک معاشرہ ہو گا۔ توحید میں خدا کا ایک چہرہ ہوتا ہے۔ عوام یا الناس اور امام کا چہرہ جس میں ذرائع پیداوار اور اقتدار پر عوام کا قبضہ ہوتا ہے اور خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ نہیں ہوتا۔

صوفیہ اور بیگانگی ذات

لہذا اس بیگانگی اور بیگانگی ذات کے متعلق سب سے پہلے جن دانشوروں نے نوٹس لیا وہ صوفیہ تھے۔ اس کا ثبوت ہر مذہب کے فلسفی صوفیہ، صاحب علم تارک الدنیا درویشوں اور انسان دوست دانشوروں کے تخلیق کردہ ادب میں ملتا ہے۔ بیگانگی کا تصور اس ادب میں دو صورتوں میں پایا جاتا ہے۔

پہلی صورت مالدار اور حکمران طبقوں کی ہوس زر اندوزی، جوع الارضی کی خواہش اور تعیش پسند رجحانات پر تنقید ہے، یا قوم و نسل سے بالا انسانی رشتوں کے تقدس اور وحدت کی توصیف و تلقین ہے۔ یا پھر مذہبی پیشواؤں کی ظواہر پرستی، فقیہوں اور محتسبوں کا مذہبی عقائد اور رسوم و قواعد سے اختلاف رکھنے والوں پر بے پناہ تشدد روا رکھنے کی مخالفت پر مبنی ہے۔

دوسری صورت میں فرد کی روح کا ذات خداوندی سے انفصال کی حالت میں جو فراق، مہجوری اور کرب و درد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا تفصیلی بیان پایا جاتا ہے۔ صوفیہ کے سرخیل حضرت جلال الدین رومیؒ نے فرمایا ہے کہ:

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائی ہا شکایت می کند
از نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

غلامی، جاگیرداری اور صنعتی سرمایہ داری نظامات کے عہد کا تمام ادب انھیں دو صورتوں اور کیفیات کے بیان سے بھرپور ہے۔ تاریخ میں بار بار انسان دوستی کی تمہید کے لیے تحریکیں اٹھتی رہی ہیں۔ ہمارے عہد میں بھی عظیم بھگتی تحریک، اکبر اعظم اور خواجگان چشت کی متصوفانہ جدوجہد اسی انسان دوستی کے جذبے پر مبنی تھی۔ مگر ان دانش و حکمت اور تصوف پر مبنی کوششوں میں ایک بات ہمیشہ نظر انداز کی جاتی رہی ہے وہ ہے معاشی طبقات کے باہمی رشتوں کی نوعیت سے آگہی۔ چوں کہ معاشرہ بدستور استحصال پسند اور استحصال زدہ طبقوں پر مشتمل رہا اس لیے تاریخ کے تمام انبیا حکمائے الہٰی، ممتاز فلسفی صوفیہ، انسان دوست دانشوروں، شاعروں اور فن کاروں کی کوشش معاشی و سیاسی مساوات، اخوت بشری، حریت، حسن و خیر اور پاکیزگی نفس جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار کو معاشرے میں مستقل طور پر واپس لانے میں ناکام رہیں:

ارتقا میں معاشیات کا کردار

ہیگل کے دو ممتاز شاگرد فیور باخ اور کارل مارکس تھے۔ یہ دونوں ہیگل کے پیروؤں کے بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے، فیور باخ نے انسان کا نفسیاتی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا، مگر مارکس نے تاریخ فلسفہ میں پہلی بار انسان کے ذہنی اور تہذیبی ارتقا میں معاشی عنصر کے فیصلہ کن کردار کی نشان دہی کی۔ اس آگہی سے معلوم ہوا کہ انسان نہ صرف اپنی نوعی خصوصیات میں ہی بیگانگی کے علم سے متاثر ہوا ہے بلکہ اس کی معاشی زندگی اور اس کا پیداوار عمل بھی اس کا شکار ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی محنت اور اس کی پیداوار سے بیگانہ یا محروم ہو گیا۔ کارل مارکس کے اس تھیسس سے کلی اتفاق کرتے ہوئے علامہ اقبال جو ہمارے عہد میں انسانی خودی اور اس کے بے پناہ بالقوہ امکانات کے عارف ہیں فرمایا کہ:

رازدان جزو و کل از خویش نا محرم شدہ است
آدم از سرمایہ داری قاتل آدم شدہ است

اس شعر سے بڑھ کر فلسفہ بیگانگی اور اس کے سبب پر کوئی تحریر روشنی نہیں ڈال سکتی۔ شعر میں "از خویش نا محرم شدہ است" کے الفاظ اور آدم

کا سرمایہ داری نظام ملکیت کی وجہ سے اپنے ابنائے جنس کا قاتل بننا ایک عظیم تاریخی صداقت ہے۔ جس کی قرآن تصدیق کرتا ہے۔ (سورہ العصر)

قدیم اشتراکی نظام اور بیگانگی

ذاتی ملکیت کے نظام سے پہلے قدیم لاطبقاتی یا پنچایتی نظام میں جسے جنگلی معاشرہ یا بابلی عہد بھی کہا جاتا ہے، فرد کا مفاد اور اس کے قبیلے کے مفاد میں کوئی تضاد نہیں تھا، وہ اپنے پیداواری عمل میں، اپنی ایجادات و افکار میں بالکل آزاد تھا۔ وہ اپنی جسمانی یا ذہنی تخلیقات کا خود مالک تھا، وہ کسی مالک یا آقا کا غلام نہیں تھا، اپنی مرضی سے کام کرتا اور اس سبب سے اسے کام کرنے میں لذت اور ذہنی سکون اور آسودگی احساس ہوتا تھا، کام کرنے کے عمل میں اس کے ساتھ اس کے گھر والے اور قبیلے کے افراد بھی شامل ہوتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کا آپ مالک و مختار تھا۔ صفات خداوندی اور اخلاقی نوامیس عالیہ اور اس کی فطرت کے درمیان کوئی بعد نہیں تھا۔ اس کا ہر عمل قانون الٰہی کے ماتحت تھا، لہذا ہر عمل عبادت بھی تھا اور رضاء الٰہی کا آئینہ دار اور موجب بھی۔ اس کا مذہب یا دین اس کے عمل و فکر کے علاوہ نہیں تھا۔ لہذا اسے خارج سے کسی ہدایت یا وحی کی ضرورت نہیں تھی اس کی ہدایت کا منبع یا سرچشمہ اس کی اپنی فطرت تھی۔ (سورہ والشمس)

اس عہد میں اگر قبائل کے درمیان تصادم بھی ہوتا تھا تو اس کا جذبہ محرکہ دوسروں کی زمین اور مال و دولت پر قبضہ کرنے کی ہوس نہ تھی بلکہ اس کا سبب خود حفاظتی یا بھوک۔ لہذا وہ بیگانگی ذات کے تباہ کن اور تخریبی عمل سے ناآشنا تھا۔ وہ اپنی فطرت کے تھلی زار میں آباد تھا۔

طبقاتی نظام اور بیگانگی

مگر زرعی عہد میں تمام حالات یکسر بدل گئے۔ معاشرہ، آقا اور غلام کے متضاد معاشی نظام میں بدل گیا۔ اب غلام جو اپنی محنت سے پیدا کرتا اس کا وہ خود مالک نہیں تھا بلکہ اس کا مالک آقا تھا اور وہ ایسا شخص تھا جس نے اس پیداوار میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ کیوں کہ غلام کے پاس اس کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا وہ تھی اس کی محنت جس کا وہ خود مالک بن سکتا تھا یا اسے غیر کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی زندگی قائم رکھنے کے لیے اجرت حاصل کر سکتا تھا اور یہ صورت حال عہد غلامی کے بعد جاگیرداری اور صنعتی عہد میں زرعی اور اجرتی غلام کی بھی ہے لہذا ذاتی ملکیت کے نظام میں بیگانگی کے عمل کا پہلا مظہر محنت کش کا اپنی محنت سے علاحدہ ہو جانا ہے۔

محنت کش کی اپنی محنت سے بیگانگی

بیگانگی کا یہ مظہر تاریخ انسانی میں غلام، زرعی غلام اور اجرتی غلام کی شکل میں ابھرا۔ ہر دور میں محنت کرنے والا اپنی محنت سے علاحدہ رہا ہے اور اس کی محنت ہی اس کا غیر یا حریف بن جاتی رہی ہے کیوں کہ محنت اس کی اپنی ملکیت نہیں ہوتی ہے وہ آقا، جاگیردار یا فیکٹری کے مالک کی ملکیت ہوتی ہے۔ اس لیے محنت کش کام کے دوران اپنی ذات کا اقرار نہیں کرتا بلکہ اپنی ذات کی نفی کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کام سے آسودگی اور خوشی حاصل نہیں کرتا بلکہ مایوسی، اداسی، کچھ کھو دینے کا احساس حاصل کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کی محنت اس کی اپنی مرضی سے نہیں ہوتی بلکہ جبری ہوتی ہے۔ محنت کے اس اجنبی کردار کی وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ جب تک محنت کش محنت نہیں کرتا خوش رہتا ہے اور اپنے آپ کو اپنے وجود اور اس کی صلاحیتوں اور قوتوں کا مالک تصور کرتا ہے لیکن جب وہ "اجرت" پر دوسرے کے لیے محنت کرتا اور کام کرتا ہے تو بے آرامی اور بے چینی محسوس کرتا ہے۔ وہ کام کے دوران اپنی جسمانی اور ذہنی توانائی کو آزاد محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ کام کو اپنے جسم اور ذہن کی تحقیر محسوس کرتا ہے۔ یہ جبری محنت اس کی ذات یا خودی (EGO) کی کسی احتیاج کے لیے تسکین کا

ذریعہ نہیں بنتی بلکہ فقط خارجی یا مادی احتیاجوں کی تسکین کا ذریعہ بنتی ہے اس محنت سے اس کی پوشیدہ صلاحیت اور بالقوہ ممکنات نشو و نما نہیں پاتے بلکہ یہ پژمردہ ہو جاتے ہیں اور برباد ہو جاتے ہیں یعنی اس کی فطرت کا اعلیٰ یا نورانی حصہ دب جاتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما سے محروم ہو جاتا ہے۔

پیداوار میں اضافے کے جتنے سامان اور آلات ایجاد ہوتے ہیں یہ محنت کش کی محنت کے بوجھ کو کم نہیں کرتے اور نہ ہی اس کے لیے خوش حالی اور مسرت لاتے ہیں بلکہ اس کے برعکس یہ ترقی یافتہ پیداواری ذرائع اس کی محنت کے بوجھ کو اور بڑھا دیتے ہیں اور محنت کے استحصال میں شدت پیدا کر دیتے ہیں۔ پیداواری ذرائع جتنے ترقی پاتے ہیں یہ محنت کش کی شخصیت کو مسخ کرتے اور اس کی آزاد روح کے عمل کو مسدود کر دیتے ہیں۔ یہ محنت کش کی انسانیت کو مکمل کرنے میں مدد دینے کی بجائے اس کو لاانسان UN HUMAN بنا دیتے ہے۔ وہ اپنے ان لاانسانی حالات اور ماحول سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کام میں دلچسپی پیدا کرنے کی بجائے یہ ترقی یافتہ ذرائع پیداوار اسے کام سے نفرت اور اسے بیگار میں بدل دیتے ہیں۔ کام اور ذرائع پیداوار اسی وقت محنت کار کو مسرت، اس کی شخصیت کو آزادی اور عظمت، اس کے لیے انتہائی دلچسپی اور جاں سوزی کا ذریعہ بنتے ہیں جب وہ اس کی اپنی ملکیت میں ہوں اور محنت کش اپنے آپ کو ان کا مالک اور آقا تصور کرے نہ کہ ان کا غلام اور دست نگر۔ کیوں کہ اس طرح وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے کام اور محنت نہیں کرتا بلکہ اپنے لیے کرتا ہے۔ اس نوعیت کا کام اس کی ذات کے فروغ اور روحانی تسکین کا باعث بنتا ہے نہ کہ محض مادی اور جسمانی ضروریات کی تکمیل کے لیے ایک جبر اور بیگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

محنت کش کی اپنی پیداوار سے بیگانگی

بیگانگی ذات کا دوسرا مظہر محنت کش کی پیدا کردہ اشیا اور خود محنت کش کے درمیان غیریت کی خلیج کا حائل ہو جانا۔ پیداوار اپنے پیدا کنندہ محنت کش کی حریف بن کر اس کے بالمقابل آجاتی ہے اور وہ اپنی پیداوار کا غلام بن جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ پیداوار کی نوعیت متعین کرنے، کام کے حالات اور کام کرنے کی جگہ کا انتخاب، صرف اور فروخت یعنی پیداوار کی تقسیم اور فروخت کے عمل سے محنت کش بیگانہ رہتا ہے۔ اسی سبب اشیا جتنی مہنگی ہوتی ہیں زندگی اتنی سستی اور بے وقعت ہوتی جاتی ہے۔ اشیا کی قیمت و قدر میں جتنا اضافہ ہوتا ہے انسان کی بے قدری اور کم مائیگی میں اسی نسبت سے اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ محنت کش پیداوار کی تخلیق میں جتنی جاں سوزی اور اپنی توانائی صرف کرتا ہے اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا اور نظام حیات اس کی محنت اور مشقت کے باعث جتنا طاقتور ہو جاتا ہے، اس کی اپنی ذات یا باطنی دنیا اتنی ہی کمزور اور مفلس و قلاش ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح ذرائع پیداوار کو محنت کش استعمال نہیں کرتا۔ وہ ان کا مالک اور آقا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس آلات پیداوار محنت کش کا خون نچوڑتے، اس سے جبری کام لیتے اور اسے اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ یہ ذرائع پیداوار محنت کار کے اپنے تخلیقی عمل کا محسوس مظہر نہیں ہوتے بلکہ محنت کش کو اپنا ایندھن بنا لیتے ہیں یعنی ہمارے عہد میں لوہا پگھلانے اور اسے پرزوں کی شکل میں ڈھالنے والی آتشیں بھٹیاں اور مشینیں رات کے وقت بھی جسے خدا نے سکون و آرام کے لیے تخلیق قرار دیا ہے (قرآن)، اپنے مالک کے لیے منافع پیدا کرنے اور اس کے بینکوں میں جمع شدہ سرمایہ (RESERVE) میں اضافے کے لیے محنت کش سے آرام و سکون چھین کر اس کو کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

پیداوار کا یہ استحصالی نظام، ریڈیو، ٹی وی، سنیما، اخبار اور رسالوں کے ذریعے نئے نئے فیشنوں کی تبلیغ کر کے یعنی اشتہار دے کر انسانوں کے اندر اشیا حاصل کرنے کی مصنوعی احتیاج پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ صنعت کار اپنے منافع کے لیے پیداوار کی مانگ بڑھانے کے

لیے انسانوں میں انتہائی اخلاق سوز خواہشوں اور غیر صحت مند اشتہاؤں کو پیدا کرنے کے لیے شرم ناک طریقوں کو استعمال کرتا ہے۔ وہ انسانوں کی ہر نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا اور اس کا معاوضہ حاصل کرتا ہے۔ وہ منافع میں اضافہ کرنے کے لیے لہٰذا ہم جنس انسانوں کی بے حد اخلاق باختہ نفسانی خواہشات کو پورا کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ ماڈلنگ گرلز، سرمایہ دار سماج کا شرم ناک مظہر ہیں۔ سرمایہ دار اپنی مصنوعات بیچنے کے لیے عورت کو جنسی جذبات ابھارنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

اس استحصالی نظام معشیت میں ہر نئی پیداوار اور نیا فیشن باہمی دھوکہ بازی اور ڈاکہ زنی کی نئی قوت کی نمائندگی کرتے ہیں، ہوس زر اندوزی کی اساس پر قائم شدہ معاشی نظام میں اشیا کی پیداوار جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ فرد اور قوم کی زندگی میں خوش حالی، مسرت، آزادی اور حسن و صداقت کی اقدار پیدا کرنے کی بجائے محنت کش عوام کو ذرائع پیداوار کے مالک طبقے کی لوٹ کی آماج گاہ بنا دیتی ہے جس سے بحیثیت مجموعی سیاسی بے چینی، غربت و افلاس، جہالت اور غیر اخلاقی واقعات، جنسی تلذذ پسندی، دوسرے لفظوں میں فرد کے اعلیٰ اخلاقی نوامیس کی جگہ اس کے سفلی حیوانی تقاضے لے لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پسماندہ اور کم ترقی یافتہ اقوام کے خام مال کے ذخائر اور افراد کی محنت کے زیادہ سے زیادہ استحصال کے لیے ان کو فوجی، معاشی اور سیاسی دباؤ کے ماتحت رکھا جاتا ہے، اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس سارے المناک کھیل میں اشیا کا حقیقی خالق طبقہ بے بس محض ہو کر رہ جاتا ہے۔ علاوہ اپنی پیداوار کا مالک اور اپنی مرضی سے ان پر تصرف قائم رکھنے کی بجائے ان کا غلام اور اس استحصالی نظام کے معروضی قوانین کا پابند بن جاتا ہے۔ اس نظام کو آج کل کی اصطلاح میں صارفیت (CONSUMERISM) کہا جاتا ہے۔ ایران کے ڈاکٹر علی شریعتی نے صارفیت کو ساری اخلاقی خرابیوں اور جنگوں کا باعث قرار دیا ہے بلکہ نوآبادیاتی اقوام کی نوجوان نسلوں کو ان کی اپنی تہذیبی جڑوں سے بیگانہ کرنے کا سب سے اہم ذریعہ قرار دیا ہے۔

انسان اور انسان میں بیگانگی

ابتدائی اشتراکی معاشرہ یا جنت کے نظام معشیت اور اس کے نفسیاتی اثرات سے جدا ہونے کے بعد بیگانگی ذات کے عمل کا تیسرا مظہر انسان اور انسان کے درمیان اخوت بشری کے رشتے کی شکست ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر محنت کش اپنی محنت کی پیداوار کا خود مالک نہیں ہے تو لازماً کوئی دوسرا اس کا مالک ہو گا جو وہ خود نہیں بلکہ اس کا غیر ہے۔ یہ مالک نہ تو فطرت ہو سکتی ہے کیوں کہ فطرت کے علوم اور اس کے قوانین کی تسخیر تو محنت کے عمل کا نتیجہ ہے اور نہ ہی کوئی دیوتا یا خدا ہو سکتا ہے کیوں کہ اشیا کی تخلیق تو انسانی محنت کا عمل ہے جو فطرت کے خام مواد کو اپنی ضروریات کے لیے نئی شکل دیتا ہے۔ لہٰذا اگر فطرت اور خدا محنت کش کی تخلیق کردہ اشیا کے مالک نہیں تو اس کا مالک یقیناً انسان ہے اور یہ انسان ایسا ہو سکتا ہے جس کا پیداواری عمل میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لہٰذا محنت کش کی اپنی تخلیق کردہ پیداوار سے علاحدگی یا بیگانگی فرد کی زندگی کے پراسس یا زندگی کے عمل اور اس کی نوعی زندگی سے براہ راست بیگانگی ہے۔ یعنی وہ اپنی ذات سے الگ ہو کر اپنا حریف آپ بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ دوسرے انسانوں کا بھی حریف بن جاتا ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عمرانی اور معاشی نظام کی اساس انسانوں میں باہمی تعاون اور اشتراک عمل کی بجائے بے رحم مسابقت اور جان لیوا مقابلہ قرار پا گئی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ پیداوار اپنے خالق سے رشتہ توڑ کر کسی غیر محنت کار کی ملکیت میں آجاتی ہے جو پیداوار کے سارے عمل سے خود باہر رہتا ہے۔ یعنی محنت کش اور محنت کا رشتہ سرمایہ دار (یا اسے جو بھی نام دیا جائے جیسے قرآن کے الفاظ میں مترفین ہے) اور محنت کے نئے رشتے کو جنم دیتا ہے۔

(آگے ص ۱۲ پر)

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

دکنی مثنویوں کے اہم کردار

حالی کے مثنوی کو اردو شاعری کی تمام اصناف میں سب سے زیادہ کار آمد صنف قرار دینے سے لگ بھگ ڈھائی سو سال قبل ہی اس صنف نے اپنی افادیت کا ثبوت دے دیا تھا۔ دکن میں مثنوی کو جو عروج و اقبال حاصل ہوا ہے وہ غزل کے ماسوا جس کی اپنی ایک تخصیصی حیثیت ہے۔ کسی اور صنف سخن کو شاید ہی کسی زبان، کسی علاقے اور کسی زمانے میں ہوا ہو۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مثنویاں ہر رنگ اور مزاج کے مطابق لکھی گئیں اور تعداد میں بھی بہت زیادہ۔ دیگر اصناف کے مقابلہ میں یقیناً یہ مثنوی کی انفرادیت ہے اور دکن کی بھی۔

مثنوی کو دکن میں جو قبولیت عام حاصل ہوئی اس کے کئی اسباب ہیں۔ جیسا کہ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے۔ "دکھنی زبان میں کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم ہی کا آغاز ہوا اور مثنوی کی پہلی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس کے بعد رباعی، غزل، قصیدے کا آغاز ہوا ہے" (دکن میں اردو ص ۴۲) دوم یہ کہ قصیدے کو ادھر ایسا عروج حاصل نہ ہو سکا۔ بادشاہوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے شاعروں کے کام مثنوی ہی آئی۔ چناں چہ دکن میں عشقیہ مثنویوں اور بالخصوص تاریخی مثنویوں کے زیادہ تر کردار سلاطین ہی ہیں۔ سبب شاید یہ ہو کہ اس عہد میں سارے معاشرے اور اس کی سرگرمیوں کے مرکز و محور صرف بادشاہ ہوا کرتے تھے جن کو نہ صرف دنیاوی طور پر اونچی اور امتیازی حیثیت حاصل تھی بلکہ جن کے روحانی درجات بھی خاصے بلند متصور کیے جاتے تھے۔۔۔ وہ "ظل اللہ" اور "ظل سبحانی" تھے اور ان کی پسند و ناپسندی پر رعیت کی پسند و ناپسند منحصر تھی (ہر چیز کہ سلطان پسند ہنر است) چناں چہ اہل دربار اور فن کار وغیرہ بادشاہ کی مرضی کو ملحوظ رکھتے تو ادیبوں اور شاعروں کی سعی ہوتی کہ بادشاہ کے مزاج اور ان کی مرضی کے مطابق لکھیں یا ایسا لکھیں کہ بادشاہ کو پسند آجائے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے بادشاہ ہی ان کی تخلیقات کے ہیرو ہوتے۔ مثنوی میں اس کی زیادہ گنجائش تھی۔ در پھر چوں کہ عوام میں بھی یہ صنف مقبول تھی اس لیے کہ عوامی حلقوں میں بھی بار پانے کا یہی ایک عمدہ وسیلہ تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں "اس دور میں مثنوی کی صنف اتنی مقبول ہوئی کہ ہر شاعر کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ اپنے نام کو بقائے دوام دینے اور اپنی شہرت کو چار چاند لگانے کے لیے یہی صنف سخن بہترین ذریعہ ہے۔" (تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۲۷۲)

مثنوی کی بنیاد قصے پر ہوتی ہے جس کو کردار سہارتے ہیں اور کردار اسی وقت بھرپور اور توانا ہوتے ہیں جب قصے سے ان کا ایک باطنی ارتباط ہو، کردار قصے سے پھوٹیں۔ لیکن اگر قصے میں تاریخ، معاشرت، مذہبی معتقدات اور مسائل، صوفیانہ مسالک اور اخلاقی تعلیمات پر زور دیا جانا مقصود ہو تو کردار اپنے طور پر زیست نہیں کرتے بلکہ مثنوی نگار کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جاتے ہیں۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ دکنی میں زیادہ تر مثنویوں میں تاریخ، معاشرت مذہبی معتقدات و مسائل، صوفیانہ مسالک اور اخلاقی تعلیمات کو بنیادی حیثیت دی گئی جس کی وجہ سے کردار نگاری مجروح ہو جاتی ہے مثلاً مذہبی مثنویاں۔۔۔۔ مذہبی مثنویوں کا مقصد مذہبی تعلیمات کی تفہیم اور ان پر لوگوں کو عمل کی تلقین کرنا رہا۔ ان کی اہمیت اخلاقی زاوے سے جتنی بھی ہو جہاں تک تاریخ اور واقعات کا تعلق ہے ان میں سے بیشتر میں نہ تاریخ کو ملحوظ رکھا گیا اور نہ واقعات کی صحت کو بس خلفائے راشدین، اولیاء اور بزرگان دین کے ناموں سے استفادہ کیا گیا اور عوام الناس میں ان شخصیات سے جو عقیدت پائی جاتی ہے اس کی روشنی میں من گھڑت واقعات سے بھی مثنوی کے تانے بانے بنے گئے جن کا تاریخ سے کوئی علاقہ

نہیں مثلاً راجی کی مثنوی "نامہ علی" میں حضرت علیؓ کے معجزے کا بیان کیا گیا جس کا صداقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اشرف کی "جنگ نامہ، حیدر بھی ایک فرضی داستان پر مشتمل ہے جس کے ہیرو حضرت علیؓ ہیں۔ رستمی کی مثنوی "خاور نامہ" کے مرکزی کردار بھی حضرت علیؓ ہیں لیکن یہ بھی ایک فرضی داستان ہے۔ خواص نے مثنوی "قصہ، حسینی" لکھی جس میں حضرت امام حسینؓ کے بارے میں ایک فرضی قصے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اولیاء نے "قصہ ابو شحمہ" میں حضرت عمرؓ کے فرزند ابو شحمہ کو حالت نشہ میں کسی عورت سے ہم بستر ہونے پر شرعی سزا دیتے دکھایا گیا ہے اس قصے کی حیثیت افسانے کی سی ہے۔ حتیٰ کہ سید اشرف بیابانی نے مثنوی "نوسرہار" میں جمیل جالبی کے الفاظ میں "واقعہ کربلا اور شہادت امام حسین کو اس طور پر بیان کیا ہے جو آج کے مروجہ واقعہ سے قدرے مختلف ہے۔ صنعتی نے مثنوی "قصہ، بے نظیر" میں صحابی رسول حضرت تمیم انصاری کے حالات کو اگرچہ صحت کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت نے اس مثنوی کی کردار نگاری کو متاثر کیا ہے۔ یہی حال صوفیانہ مثنویوں کا ہے جو اپنے اپنے طبقہ فکر کی نمائندگی کرتی ہیں ایسی مثنویوں میں قاضی محمود عربی کی "من لگن" ضعیفی کی "ہدایات الہندی" مرتضیٰ کی "وصل نامہ" معظم کی "شجرۃ الاتقیاء" "گنج مخفی" اور "گلزار جنت" وجدی کی "پنچھی باچھا" عشرتی کی "چت لگن" دیپک پتنگ اور نیہہ درپن" ایاغی کی "نجات نامہ" اور جانے کتنی مثنویاں ہوں گی۔ یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ شاعروں کے نزدیک نہ زبان کی خدمت مقصود تھی اور نہ ادب کی۔ وہ تو بس لوگوں کی اصلاح اور اپنے لیے ثواب دارین چاہتے تھے۔ لوگ ان مثنویوں کو پڑھتے بھی کچھ اسی لیے تھے۔ قصہ اور کردار وغیرہ کی حیثیت ذیلی تھی۔ کردار تراشے ہوئے، ٹائپ، سپاٹ، اور ابھرے ہوتے اور شاعر کے نقطہ نظر کے تابع ...... عجب صورت حال تو اس وقت پیدا ہوتی جب قصے طبع زاد نہ ہوں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ دکنی میں زیادہ تر مثنویاں غیر طبع زاد ہیں اور یہ ماخوذ ہیں زیادہ تر فارسی سے۔ غیر مذہبی مثنویوں میں دلکش اور قدرے توانا کردار مل جاتے ہیں۔ خاص طور پر عشقیہ مثنویوں میں ایسے کردار کچھ زیادہ ملیں گے جن کا مطالعہ کردار نگاری کے اصولوں کی روشنی میں قابل لحاظ ہوگا۔ وہاں یہ کردار اپنی جاذبیت کی وجہ سے قارئین کو ایک حد تک متاثر بھی کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے فخر دین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کا ذکر کروں گا۔ ان تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ یہ پہلی تصنیف ہے جو اب تک دریافت ہوئی ہے اور اس کا ایک ہی نسخہ ملا ہے جو ناقص الاوسط ہے اور جس کے آخر کے دو، تین صفحات بھی نہیں اور اس کا سن تصنیف بھی کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ میں اس کے صرف کرداروں کے بارے میں عرض کروں گا۔

اس مثنوی کے چار کردار اہم ہیں۔ کدم راؤ پدم راؤ، رانی اور اگھور ناتھ...... کدم راؤ بیرانگر کا راجہ ہے، جب ناگنی کو کوڑیال سے میل کھاتے دیکھتا ہے تو عورت ذات پر سے اس کا اعتماد اٹھ جاتا ہے حتیٰ کہ اپنی رانی کو بھی شک کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اس کے یقین دلانے پر بھی نہیں مانتا۔ کدم راؤ کو ایک عالی کردار شخص کے روپ میں پیش کیا گیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ کسی غیر عورت کے ساتھ برا کام کرنے سے زیادہ برا دنیا میں کوئی کام نہیں۔ وہ پردیسیوں کی خدمت کرتا ہے لیکن اس کی سادہ مزاجی اسے لے ڈوبتی ہے اور وہ اگھور ناتھ جوگی کے فریب میں آجاتا ہے جو کدم راؤ کو طوطا بنا کر اپنی روح کدم راؤ کے قالب میں داخل کر دیتا ہے۔ کدم راؤ آخر میں وزیر پدم راؤ کی مدد سے اپنے اصلی قالب میں آجاتا ہے۔

رانی شوہر پرست بیوی ہے۔ سلجھے ہوئے ذہن کی مالک، فریس اور متین۔ کدم راؤ کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھاتی ہے۔ اس کو رد نہیں کرتی بلکہ یہ کہتے ہوئے کہ جو کچھ اس نے کہا سچ ہے یہ بھی کہتی ہے کہ اگر میرا کوئی قصور ہے تو میں جان دینے کے لیے تیار ہوں لیکن دوسرے کا قصور مجھ پر نہ ڈالا جائے۔

پدم راؤ (جو کدم راؤ کا وزیر ہے) ہے تو مکار، لیکن دنیا دیکھا ہوا، لوگوں پر اعتماد نہیں کرتا۔ ہر چند کہ پہلے وہ اچھی نیت نہیں رکھتا

تھا لیکن بکرم راؤ کے طوطا بن جانے کے بعد جب محل میں داخل ہوتا ہے اور کدم راؤ کہ اس سے حالات بیان کر کے اپنی حقیقت آشکار کرتا ہے تو وہ کدم راؤ کی مدد پر آمادہ ہو جاتا ہے اور انگور ناتھ کو جو راجہ کے قالب میں تھا ڈستا ہے اور اس جسم میں طوطے کی روح جو دراصل کدم راؤ کی روح تھی داخل کر دیتا ہے۔ اس طرح پدم راؤ کی مدد سے راجہ اپنے اصلی قالب میں واپس آجاتا ہے۔

انگور ناتھ لاف زن، دروغ گو اور چرب زبان ہے۔ وہ انھیں ہتھکنڈوں سے راجہ کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔ کچھ یوں لالچ دیتا ہے کہ راجہ کی روح کو طوطے کے بدن میں داخل کر دیتا ہے اور اپنی روح کو راجہ کے جسم میں داخل کر کے راج کرتا رہتا ہے۔

ظاہر ہے یہ کردار روایتی ہیں۔ راجہ سادہ مزاج، کان کا کچا، مزاج میں ہٹ، وزیروں سے مشوروں اور مدد کا طلب گار۔ رانی بھی عام رانیوں کی طرح وفا شعار، عفت کوش، شوہر پرست اور محل کے معاملات میں ذہانت اور فراست کا مظاہرہ کرنے والی۔ وزیر تھا تو مطلب پرست لیکن راجہ کا وفادار اور ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کرنے کے لیے آمادہ رہتا۔ انگور ناتھ، مطلبی، فریبی اور چالباز۔ کسی طرح اپنا مقصود حاصل کرنے والا۔

عادل شاہی سلطنت میں بھی کئی مثنویاں لکھی گئیں، زیادہ تر تاریخی، معاشرتی، مذہبی، صوفیانہ مثنویاں ملتی ہیں۔

عبدل کی مثنوی (بزمیہ) "ابراہیم نامہ" (۵۰۰) اشعار پر مشتمل ہے جس میں عبدل نے ابراہیم عادل شاہ کی سوانح، اس کے ذاتی حالات، دربار، محلات، شہر کی کیفیت، اس کے باغات، ابراہیم عادل شاہ کی میزبانی اور اس کی سال گرہ وغیرہ کے حالات بیان کیے ہیں۔ معاشرتی اور تہذیبی منظر نامے سے ہم روشناس ہو جاتے ہیں لیکن کردار نگاری کی بجائے بادشاہ کی ستائش بلکہ کہیں کہیں پرستش کا انداز ہے۔ کہنا چاہیے کہ عبدل نے ابراہیم نامہ میں مثنوی کی ہیئت میں قصیدہ پیش کیا ہے۔ ہاں اس مثنوی کا شعری حسن بے مثال ہے۔

مقیمی کی مثنوی "چندر بدن اور مہیار" کئی زاویوں سے اہمیت رکھتی ہے۔ بقول نصیر الدین ہاشمی "اس مثنوی میں جو افسانہ نظم کیا گیا ہے اس کے صحیح ہونے کی تصدیق تاریخوں سے ہوتی ہے۔" (دکن میں اردو ۱۸۸)۔ راقم الحروف نے بھی آندھرا پردیش کے ضلع اننت پور کے تعلقہ کدری کے عیدگاہ قبرستان میں دو تعویذوں والی قبر دیکھی ہے جو وہاں چندر بدن اور مہیار کی قبر کہی جاتی ہے۔ اگرچہ اس قصے کو اور کئی شاعروں نے بھی اپنے اپنے طور پر لکھا ہے اور مثنویوں کی صورت میں بھی نظم کیا گیا ہے لیکن مقیمی کا قصہ کئی اعتبار سے منفرد نوعیت کا ہے۔ زبان و بیان اور زور کلام کے ساتھ کردار نگاری بھی متوجہ کرتی ہے۔ کرداروں میں چندر بدن کا باپ بھی ہے جو ابتداً اظہار ناراضگی کرتا ہے جو فطری ہے لیکن بعد ازاں چندر بدن کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے۔ جہانگر کا راجہ بھی ہے جو مہیار کا ہمدرد ہے اس کی اعانت کرتا ہے۔ پیر سیاح بھی جو راجہ کو معلوم کراتا ہے کہ مہیار چندر بدن پر عاشق ہے لیکن اس کے اہم کردار ہیں، مہیار اور چندر بدن۔

مہیار، روایتی اور مثالی عاشق کے روپ میں سامنے آتا ہے، گریباں چاک کر لیتا ہے، سر پر خاک ڈال لیتا ہے، عالم دیوانگی میں کوچہ کوچہ پھرتا ہے اور آخر کار فراق محبوب میں تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔ ایسے کردار دکنی مثنویوں میں کئی مل جاتے ہیں۔ البتہ چندر بدن کا کردار مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی قدروں کا پاس دار ہے۔ اس میں نسوانی بانکپن ہے۔ وہ رکھ رکھاؤ کی حامل ہے۔ ابتدا میں مہیار کے اظہار عشق پر آگ بگولہ ہو جاتی ہے۔ یہاں مقیمی نے عمدہ کردار نگاری کی ہے۔ آگ بگولہ ہو کر وہ مہیار سے کہتی ہے:

ہندو میں کہاں اور ترک توں کہاں

اور جب دوسری مرتبہ اس کا مہیار سے ملنا ہوتا ہے مہیار اس کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔ یہاں بھی دیکھیے چندر بدن کا کردار۔ وہ کہتی ہے:

جیتا ہے دوانے موا نہیں ہنوز

لیکن اب وہ پہلی سی چندر بدن نہیں بلکہ عشق کی آگ سے متاثر ہو جاتی ہے چناں چہ مہیار کا جنازہ جب اس کے محل کے پاس آتا ہے تب بھی وہ اظہار تغافل کر سکتی تھی لیکن وہ ایسا نہیں کر پاتی بلکہ اپنے باپ سے اجازت لیتی ہے کہ وہ جو چاہے کرے گی ۔ پھر تبدیلی مذہب کر کے خدا کو پیاری ہو جاتی ہے ۔ یوں عورت کے کردار کی پاکیزگی اور اس کے تقدس کو مقیمی نے خوبی سے اجاگر کیا ہے ۔ مقیمی کی "چندر بدن مہیار" کی تقلید میں امین نے بھی "بہرام و حسن بانو" کے نام سے "مقیمی مثال" ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی لیکن اچانک انتقال کے باعث وہ اسے مکمل نہ کر سکا ۔ بعد ازاں دولت شاہ نے اس کی تکمیل کی ۔

حسن شوقی کی مثنوی "میزبانی نامہ" کا ہیرو سلطان محمد عادل شاہ ہے ۔ یہ مثنوی بھی اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی کے لیے اہمیت رکھتی ہے ۔ حسن شوقی کی ایک اور مثنوی "فتح نامہ نظام شاہ" کے دو کردار متوجہ کرتے ہیں ۔ ایک نظام شاہ کا کردار اور دوسرا وجیانگر کے راجہ رام راج کا کردار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس مثنوی کے کردار لگ بھگ وہی ہیں جو اس دور کی مستند تواریخ میں ملتے ہیں حسن نظام شاہ ایک عالی ہمت ، بہادر ، جاں باز ، طاقت ور اور اسی کے ساتھ مہذب ، شائستہ اور عادل و عاقل سربراہ مملکت ہے ۔ راجہ رام راج کا کردار اس کے علی الرغم ۔۔۔ ظالم ، سفاک ، قاتل ، کوتاہ فہم ، بدمزاج ، گھمنڈی اور اسی کے ساتھ نو دولتیا ہونے کی وجہ سے اس میں تہذیبی سطحیت اور کمینگی بھی پائی جاتی ہے ۔ حسن شوقی نے کردار نگاری کچھ اس ہنرمندی سے کی ہے کہ مثنوی پڑھتے ہوئے حسین شاہ سے محبت اور رام راج سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔

نصرتی کی تین مثنویوں میں "علی نامہ" رزمیہ ہے ۔ نہایت طویل ۔ اس کو علی عادل شاہ کی حکومت کے ابتدائی ایک دہے کی منظوم تاریخ کہیے ۔ نصرتی نے علی عادل شاہ کی تمام جنگوں ، فتوحات اور اس کی سیاست کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ واقعات کے بیان میں تاریخی صحت کا لحاظ ہے جس کی وجہ سے علی عادل شاہ کی شخصیت پورے خد و خال کے ساتھ سامنے آتی ہے ۔ "علی نامہ" میں نصرتی نے زبان و بیان کے جوہر دکھائے ہیں ۔ اپنے زور تخیل اور فکر رسا سے اس نے ثابت کر دیا ہے کہ واقعی وہ ملک الشعرا کہلانے کا حق رکھتا ہے ۔ لیکن جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے اس کے جوہر "علی نامہ" میں کچھ کم ہی کھلتے ہیں کہیں کہیں کردار نگاری کی کوئی اچھی جھلک سامنے آتی ہے ۔ جنگ میں دلی کی فوج کو شکست ہوتی ہے اور صلابت خاں میدان جنگ میں مارا جاتا ہے ۔ یہ سن کر جے سنگھ کے دل پر جو گزرتی ہے اس سے اس کے کردار پر تھوڑی بہت روشنی ضرور پڑتی ہے ۔ یہ اشعار:

سونیا سوچ یو بات بیٹھی کر — گئی موں کھٹا ہو کہ افیوں اتر
چھپیا روز روشن اندھارا پڑیا — فلک ٹٹ کے جیوں سر پہ سارا پڑیا
رین دل میں ہو چک نے تارے توٹے — سلگ آگ انجھو ٹھار انگارے توٹے
ہوا حال جیوں رکھ کے توڑے پہ بیخ — طناباں سٹے سب او کھاڑے پہ میخ

یہی حال "تاریخ اسکندری" کا ہے ۔ یہ بھی ایک تاریخی مثنوی ہے جس میں سکندر بخت کے دور بالخصوص شیواجی سے اس کی لڑائی کا حال مذکور ہے ۔ کردار نگاری کی حیثیت سے نصرتی کی اہم مثنوی "گلشن عشق" ہے ۔ یہ نصرتی کی اولین تصنیف ہے جس میں کنک گیر کے راجہ بکرم کے لڑکے منوہر اور مہارس کے راجہ دھرم راج کی لڑکی مدمالتی کی داستان عشق کو موضوع بنایا گیا ہے ۔ مرکزی کردار بھی یہی ہیں ۔ نصرتی نے ان کے ساتھ چنپاوتی اور چندر سین کی محبت کو شامل کر کے مثنوی کے رنگ و آہنگ کو دوچند کر دیا ہے ۔ منوہر ، عشقیہ مثنویوں کے روایتی کرداروں کی طرح عشق میں بے تاب ہے ، دنیا سے بیزار اور اپنے محبوب کے فراق میں تڑپتا رہتا ہے لیکن اسی کے ساتھ داستانوں کے ہیروؤں

کی طرح طاقت ور بہادر اور جگر دار ہے۔ مہم پسند بھی ہے۔ دیو سے مقابلہ کرتا اور اس کو شکست دیتا ہے۔ قطع نظر اس کے، خطرات سے مقابلہ کرنا اس کی فطرت میں شامل ہے اور وہ ہر مقابلے میں کامیاب و کامران رہتا ہے۔ عاشق صادق کی حیثیت سے اس کی حالت دیدنی ہے، مجنوں صورت، بازاروں میں بچے اس کے پیچھے شور مچاتے، تالیاں بجاتے ہیں۔ مدمالتی کے فراق میں اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاتا۔ "گلشن عشق" کے ان اشعار سے منوہر کے کردار پر روشنی پڑتی ہے:

نہ کس سات کہنا مجھے بات بھائے — نہ کوئی بات بولے تو سن خوش لگائے
دسے دیس تو تس اندھاری مجھے — رین کالے دوزخ تھے کاری مجھے
انکھیاں کھولتا ہوں تو یک تل نہ بھائے — ڈگر موندتا ہوں تو یوں خوف آئے
کہ مت پھر پڑے دندلی سوں سنگ — سٹے پھر کے غرمن میں من کے انگ
پڑیا آہ ماہی تمن مج رھنا — گنوانا زباں ہور نہ چک موندنا

مدمالتی، حسن و ادا کا پیکر ہے۔ منوہر کے عشق میں بے تاب۔ اپنا عشق چھپا نہیں پاتی۔ اس کی ماں اس کو جب منوہر کے ساتھ دیکھتی ہے تو برداشت نہیں کر پاتی اور منتر پڑھ کر مدمالتی کی روح کو طوطے کے قالب میں داخل کر دیتی ہے لیکن اس پر بھی اس کا عشق کم نہیں ہوتا منوہر کے فراق میں جنگل جنگل ویرانہ ویرانہ ماری ماری پھرتی ہے۔ چندر سین، جس کی حیثیت معاون کردار کی ہے طوطی کو پکڑتا ہے اور مہارس نگر لے آتا ہے۔ چندر سین، طوطی کی صورت میں جب والدین سے ملتی ہے تو اصلی شکل میں آتی ہے لیکن جنون عشق ہے کہ کم نہیں ہو پاتا۔ نصرتی نے جس فن کاری کے ساتھ اس کی حالت فراق کا نقشہ کھینچا ہے اس سے نصرتی کی قادر الکلامی اور زبان و بیان پر اس کی بے اندازہ قدرت کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے مدمالتی کا کردار بھی بھرپور طرح سامنے آجاتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ سکتی تھی رہ جو جنی باج تل — نہ بھاوے سکیاں دو جو بیٹھیں تو مل
بجن ان کے دل پر اسے بار ہوئے — جو تس تے خلل ذکر دلدار ہوئے
ہو بادل اوک جوں پیے پر شراب — پوچھے کوئی اسے کچھ، دیے کچھ جواب
رکھے گرچہ تس تھارنا چار تن — دھرے جیوں کوں پن آپنے یار کن
دوجا دھیان تس دل نگے پست اچھے — نت انچھ ابیں حال میں مست اچھے
بعد میں وہی یاد کرمیں بجن — اوٹھے بول یکایک سونا جوں سپن

مدمالتی کے کردار کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ منوہر کے عشق میں بے تاب اور اس کے ہجر میں بے قرار ہونے کے باوجود شرم و حیا کا پیکر ہے چنانچہ چمپاوتی کی ماں جو مدمالتی کی خالہ ہے اس سے منوہر کے عشق کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ نہ صرف انکار کر دیتی ہے بلکہ ابتداً غصے سے برہم ہو جاتی ہے لیکن جب خالہ منوہر کی دی ہوئی موتیوں کی مالا اور انگوٹھی کا حوالہ دیتی ہے تو مدمالتی اپنے آپ پر قابو نہیں پاتی، صبر نہیں کر سکتی، اس کا جذبہ عشق "سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا" کی تفسیر بن جاتا ہے۔ احوال عشق ہونٹوں پر آہی جاتا ہے۔ مدمالتی کے کردار کا یہ پہلو بھی دیکھیے۔

بھوتے اوجب ہنت کا پارا چھنا — سو جن من میں تب سرتے دھڑ کا اٹھا
بخل موم ہاتیاں تمن استواں — سلگ تن کے قالوں میں رتے جہاں

سوپر تاب اوک روپ سارا ہوا　　سر بسر سرخ تن جو انگارا ہوا

نکل بھار چلنے اوساساں کی بھاپ　　چلیا جل او بل چک سوں آپس تے آپ

دبستان گولکنڈہ کی معروف اور اہم ترین مثنویوں میں سب سے پہلے وجہی کی "قطب مشتری" پر گفتگو ہونی چاہیے۔ "قطب مشتری" کو محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستان عشق قرار دیا جاتا ہے۔ بعض کو اس پر اعتراض ہے، چند ایک نے اس کی تردید بھی کی ہے۔ ہر چند کہ مثنوی میں جو واقعات پیش کیے گئے ہیں ان کا بھاگ متی کے عشق سے کوئی تعلق نہیں تاہم وجہی نے قطب کے کردار میں محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کی واضح جھلک پیش کی ہے کہیں کہیں اتنی مبالغہ آمیزی کے ساتھ کہ اس کا تعلق مافوق الفطرت عناصر سے ہو جاتا ہے اور مافوق الفطرت عناصر بھی کیسے کہ ان کے مقابلے میں دیو اور اژدہے وغیرہ بھی انتہائی کمزور، بے عمل اور جامد سے محسوس ہوتے ہیں، داستانی عنصر جادو ہی ہے اور تصادم، جو قصے کی جان ہوتا ہے یہاں مفقود ہے۔ اسی پس منظر میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اعتدال پسندی سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے:

"وجہی نے مثنوی میں داستان کے وہ سارے عناصر یک جا کر کے انھیں ایک ایسی شکل دے دی ہے جو ازمنہ وسطیٰ کے داستانی رنگ سے مل گئی ہے۔ اس طرح بادشاہ کا قصہ بھی بیان ہو گیا اور داستان کی روایت بھی اپنے سارے عناصر ترکیبی کے ساتھ باقی رہی۔" (تاریخ اردو ادب جلد اول ص ۳۴۷)

"قطب مشتری" کے چار کردار لائق توجہ ہیں۔ قطب، مشتری، عطارد اور مہرداں وائی۔ قطب ایک رومان پرور کردار ہے۔ عاشق بے تاب اپنے عشق کے لیے دریا پہاڑ پار کر دینے والا۔ دیوؤں اور اژدہوں سے بے خطر متصادم ہونے والا اور کامیاب و کامران بھی۔ بقول شخصے، وجہی نے قطب کی شخصیت کا بیان کیا ہے اس کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قطب کے کردار میں انفرادیت اور استحکام نہیں۔ وہ اپنے طور پر کچھ نہیں اور اپنے طور پر کچھ کر بھی نہیں پاتا۔ کم فہمی اور جلد بازی اس کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اسی وجہ سے اسے ہر موقع پر عطارد کی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ مشتری سے ملتا ہے تو دونوں ایسے مغلوب الجذبات ہو جاتے ہیں کہ عطارد ٹوکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مشتری حسین و جمیل ہے۔ وجہی نے اس کے حسن و جمال کی تصویر کشی میں اپنے قلم کا زور صرف کر دیا ہے۔ وہ ہنرمند، سلیقہ شعار، نیک سیرت اور شریف النفس ہے۔ مودب بھی کہ ساس سسر کے پاؤں چھوتی ہے۔ ہاں کہیں کہیں اس کے کردار میں الھڑپن اور جذباتیت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ شعر و شاعری، موسیقی، مصوری اور نقاشی کی شوقین ہے اور قدرداں بھی۔ عطارد کی مصوری اور نقاشی کو پسند کرتی ہے اور عطارد ہی کی بنائی ہوئی قطب شاہ کی تصویر کو دیکھ کر سو جان سے فدا ہو جاتی ہے، آنکھ سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ وجہی نے ان الفاظ میں مشتری کے عشق کی بے تابی اور شدت کا اظہار کیا ہے:

رتن تھے سو تن پر انگارے ہوے　　کہ مکھ چاند انجھو سو تارے ہوے

دو بادام تھے اس چنچل نار کے　　لگے دانے جھرنے سو انار کے

مشتری کا کردار بھی، قطب کی طرح رنگین ہے، بھرپور نہیں۔ اس کا باعث یہ بھی ہے کہ وجہی نے مشتری کو جو بنیادی طور پر ایک رقاصہ تھی، شہزادی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی تاکہ بھاگ متی کا معاشرتی موقف بہتر اور فزوں ہو۔ دوسرا باعث خان رشید کے الفاظ میں:

> وجہی کا مقصد صرف انعام حاصل کرنا تھا اس لیے اس نے داستان گوئی اور کردار نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس کی شاعرانہ صلاحیتیں غماز ہیں کہ وہ اگر چاہتا تو کرداروں کی بڑی جان دار تصویریں پیش کر سکتا تھا۔ مگر اسی بنا پر مثنوی "قطب مشتری" میں کردار نگاری معمولی ہے۔ کرداروں کی کثرت اور تنوع کے باعث ان کی شخصیتیں مناسب طریق پر نہیں ابھاری گئیں۔
>
> (اردو کی تین مثنویاں ص ۹۳، ۹۴)

مریخ خاں اور مشتری کی بہن زہرہ کے کردار ایسے ہی ہیں جن کی شخصیتیں مناسب طریق پر نہیں ابھاری گئیں، البتہ مہروان دائی کا کردار قابل لحاظ ہے اس کے مشوروں اور پند و نصائح کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بعض اصحاب نے ملازمہ ہونے کی وجہ سے اس کے ناصحانہ رویے پر اعتراض کیا ہے لیکن یہ کردار غیر فطری اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ آج بھی ہمارے معاشرے میں بعض خاندانی ملازمائیں ایسی مل جائیں گی جو گھریلو معاملات میں خاصی دخیل ہوتی ہیں اور افراد خاندان، بالخصوص صاحب خانہ ان کی آرا کو اہمیت دیتے ہیں۔۔۔۔۔ وجہی نے اس کردار پر مناسب توجہ دی ہے لیکن جو کردار سب سے زیادہ بھرپور، متحرک اور موثر ہے وہ عطارد کا ہے۔ صاحب علم و فن، فہیم و ذہین، غضب کے حافظہ کا مالک۔ یہ خلیق بھی ہے اور منکسر المزاج بھی۔ بزرگوں کی عظمت کا قائل ہے۔ ان کے فضائل بیان کرتا ہے۔ جہاں گرد ہے اس لیے تجربہ کار بھی۔ دراصل یہ کردار بشمول قطب، سارے کرداروں سے زیادہ اہم ہے (کوئی عجب نہیں اس کردار کے آئینے میں وجہی نے اپنی شخصیت دیکھنے کی سعی کی ہو) یہ ایک معاون کردار ہے اور واقعی دبیر فلک معلوم ہوتا ہے جس نے دیگر کرداروں کی سمت اور رفتار متعین کی ہے۔ قطب کے سفر پر روانہ ہونے سے قبل اس کو خطرات سے آگاہ کرتا ہے اور پھر شہزادے کو مہتاب پری کے پاس چھوڑ کر بنگال روانہ ہوتا ہے کہ فضا کو سازگار بنایا جائے ایک طرف تو قطب کے لیے مشتری کی تصویر بناتا ہے اور دوسری طرف قطب کی تصویر بناتا ہے کہ مشتری اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ یوں یہ کردار ساری مثنوی پر چھایا ہوا ہے۔ فنی نقطہ نظر سے بھی اس کو مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے جس سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔

غواصی کی تین مثنویاں ہیں "مینا ستونتی" "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" ہیں اور تینوں ماخوذ ہیں۔ "طوطی نامہ" مشہور سنسکرت تصنیف "شکا سپ تتی" سے لی گئی نخشبی کی فارسی نثری تصنیف "طوطی نامہ" سے ماخوذ بتایا جاتا ہے۔ سیف الملوک و بدیع الجمال کا قصہ بھی فارسی الف لیلیٰ سے لیا گیا ہے اور مینا ستونتی کا قصہ ہندوستانی اصل ایک قدیم داستان محبت پر مبنی ہے۔ غواصی نے فارسی سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ماخوذ قصوں میں قصے اور کرداروں کے خوب و زشت کی ذمہ داری بنیادی طور پر اصل قصہ نویس پر ہونی چاہیے، غواصی کے سلسلے میں بھی اسی کا اطلاق ہوگا۔ غواصی نے اپنے فن کے اور جو بھی جوہر دکھائے ہوں، کرداروں کو اپنے طور پر نکھارتے اور بالخصوص ان کو مقامی رنگ کا حامل بنانے میں فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثنوی مینا ستونتی کے کردار اس زاویے سے اہمیت رکھتے ہیں۔ بادشاہ بالا کنور ہے۔ اس کی حسین و جمیل لڑکی چندا، نوجوان چرواہا لورک، اس کی حسین بیوی مینا اور کٹنی دوتی ۔۔۔۔ بالا کنور کی لڑکی چندا چرواہے لورک پر عاشق ہے اور اس کو ورغلا کر فرار ہو جاتی ہے۔ بادشاہ بالا کنور مینا پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس کو ہموار کرنے کے لیے اپنی بری ساری کوششیں کرتا ہے۔ کٹنی کی خدمات بھی حاصل کی جاتی ہیں جو پاک دامن مینا کو ورغلانے میں ناکام رہتی ہے۔ بالا کنور خود جاتا ہے کہ اور چھپ چھپ کر مینا کے خیالات سنتا ہے تو اس کی شوہر پرستی اور عفت مآبی سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں اپنے غیر اخلاقی رویے سے باز آ جاتا ہے اور لورک اور چندا کو پکڑ بلانے کا حکم دیتا ہے۔ دونوں لائے جاتے ہیں۔ لورک کو مینا کے پاس بھیج دیا جاتا ہے اور چندا استغفار

مینا ستونتی کے کرداروں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اگر ہم اپنے دائرے کو تھوڑا محدود کرلیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کے صرف دو کردار اہم ہیں مینا اور دوتی ۔ اور یہ دونوں خیر و شر نیکی و بدی اور ظلمت و نور کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ اور ایک دوسرے کی شناخت ہیں ۔ مینا کا کردار ایک باوقار اور شوہر پرست بیوی کا کردار ہے ، ابھرتا ہوا اور جاندار جب کہ کٹنی کا کردار سائپ اور سپاٹ ہے ۔ ان میں سے کسی ایک کردار کو سمجھنے کے لیے دوسرے کردار کو سمجھنا ضروری ہے ۔

کٹنی ، دوتی پرکار اور فریبی ہے ۔ غواصی نے اس کردار کے اس رنگ کو تیز اور شدید رکھا ہے ۔ وہ مینا کو ورغلانے کی کوشش کرتی ہے اور چرب زبانی سے پورا پورا کام لیتی ہے ۔ زندگی کی حقیقتوں ، اس کی اچھائی برائی ، دنیا کی دل کشی ، انسانی جذبات ، ان کی واقعیت ، وزن و وقعت ، مادی زندگی کی آسائشوں ، جسم اور جسمانی زندگی کے لطف و رنگ ـ ـ ـ ـ ـ غرض یہ اور ایسی باتوں پر شوخ و شنگ انداز میں روشنی ڈالتی ہے ۔ اس کی باتیں نہیں ایک جال ہے لیکن مینا کی پاکیزگی ایک حصار کی طرح ان سے محفوظ رہتی ہے ۔ مینا کا کردار اسی سے منور ہوتا ہے ۔ دوتی کے ورغلانے پر دیکھیے وہ کیا کہتی ہے :

رکھے شرم جس کا سو او ذوالجلال　　　سکے ظلم کرنے کوں کس کا مجال
توکل رکھی ہوں میں رحمن پر　　　وہی دہنہارا ہے سب کا اجر
کسے قرب ہے جان ہور مال کا　　　منجے قرب ہے پاک رحمن کا
مرے سر پو سایہ ہے سبحان کا　　　منجے پشت ہے اپنے ایمان کا

پاکیزگی ، شوہر پرستی اور وفاشعاری جیسے اوصاف مینا کے کردار کے عناصر ترکیبی ہیں ۔ ایک اور موقع پر دیکھیے وہ اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ اس کا کردار منور ہو جاتا ہے :

اہیں پیو اپر جن اچھنگی لدا　　　نور رحمت اسی پر رہے گی سدا
اگر سور اسمان تھے آئے گا　　　اگر چاند آ منج کو ازمائے گا
اگر کوئی ملک ہووے صاحب جمال　　　اگر کوئی مقبول ہووے جگ اجال
تو لورک ہے ایلاڑ ہیں سب تمام　　　ادہر تاج میرا منجے اس سوں کام
دوجے تھے بھلا موت آنا منجے　　　بھلا ہے قبر کا بچھانا منجے
پڑائی سیج پر جا اپس کو سلاؤں　　　سو اوسج مائی میں کیوں نہ ملاؤں
مرے مت کے دریا کا لورک غواص　　　نہ لے سے کئی اس باج موتیاں کی راس
پرت کا مرے دھن پو بیٹھا ہے ناگ　　　سکے کون لینے کو تن میں ہے آگ

غواصی نے مینا کے کردار پر خاصی محنت کی ہے اور کئی طرح اس کردار کو ابھارا ثابت کیا ہے ۔ مینا کے شوہر کا قریبی دوست ایک دن غیر متوقع طور پر مینا سے اظہار محبت کرنے لگتا ہے ۔ مینا کے لیے یہ ایک سوالیہ نشان تھا ۔ دیکھیے وہ کس عمدگی کے ساتھ صورت حال کا سامنا کرتی ہے ۔ کتنا دھیما اور شستہ لہجہ ، پاکیزگی اور عفت کوشی کا نکھار لیے ۔ وہ اپنے شوہر کے دوست کو جواب دیتی ہے :

سنی سو سکی ، موں کو لا دونوں ہات　　　انجو نین میں لا کہی اے سہات
حرے ہور مرے مرد کی آشنائی　　　ہمیں ہور تمیں جیوں سگے بھان بھائی

کمی یو ہو کس دھات معنا ہوا   مگر دور آخر زمانا ہوا
نہ تھا تج کو واجب ؛ اے جان عزیز   جو ایسی کیا بات توں ، بے تمیز

مجموعی طور پر، ایک دو باتیں اور ۔۔۔۔۔ "پیناستونتی" کے کردار ہندو ہیں لیکن ان کا باطن، ان کا مزاج، ان کا زاویہ فکر، معاشرت اور رہن سہن کو غواصی نے اسلامی بتلایا ہے۔ چندا کو سزا دی جاتی ہے تو اسے سنگسار کیا جاتا ہے پینا عصمت و عفت کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کرتی ہے وہ اور نہیں کسی مسلمان عورت ہی کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ یہ غواصی کی کردار نگاری کی خامی بھی ہو سکتی ہے یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں اس زاویے سے شاید سوچا ہی نہیں جاتا تھا۔ اس زاویے کی شاید اتنی اہمیت ہی نہیں تھی۔

ابن نشاطی نے (۱۷۰۰) اشعار پر مشتمل مثنوی "پھولبن" ۱۰۶۶ھ میں مکمل کی۔ یہ بھی فارسی قصہ "بساتین" کا ترجمہ ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کے بموجب "ابن نشاطی نے اپنی مثنوی میں جو کردار کا نمونہ پیش کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔" اس رائے میں قدرے رورعایت سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم بعض کردار امتیاز ضرور رکھتے ہیں۔ یہ مثنوی تین قصوں کا مجموعہ ہے اور قدیم مشرقی طرز میں قصہ در قصہ کا نمونہ۔ اس کے اہم کردار ہیں ختن کے سوداگر کا بیٹا اور گجرات کے عابد کی بیٹی، جوگیوں کا معتقد بادشاہ اس کا دغاباز وزیر اور رانی ستونتی۔ سمن بر، ہمایوں فال ملک سندھ کا ناعاقبت اندیش بادشاہ اور اس کا مکار وزیر لیکن سچ پوچھیے تو ان میں قابل ذکر رانی ستونتی اور سمن بر کے کردار ہیں۔ رانی کے کردار میں چمک پیدا ہوتی ہے وزیر کے کردار سے، جو "برے آدمی" کی سیرت پیش کرتا ہے۔ وزیر جوگیوں کے معتقد بادشاہ کے قالب میں اپنی روح داخل کر دیتا ہے اور رانی کو رجھانے کی کوشش میں ہوتا ہے۔ رانی پاک دامن ہی نہیں فرہیں اور سمجھدار بھی ہے وہ وزیر کی چال میں نہیں آتی اور انجام کار حق کی فتح ہوتی ہے اور وزیر اپنے انجام سے دوچار۔ ابن نشاطی نے رانی کے کردار کو یوں واضح کیا ہے:

تھی رانی شاہ کوں یک ستونتی ناؤں   چند ر سورج کدھیں دیکھے نہ چھاؤں
نہیں پکڑی تھی وہ گھر کی کدھیں باٹ   نہ دیکھی کئیں پلک کے کھول کے پاٹ
کدھیں درپن میں جو مکھ دیکھے جائے   دیکھ اپنے نین کی پتلیاں کو شرمائے
کدھیں لیوے کنگوئی جو کھولنے بال   نمونا ہے کہ پنچ کا دیوے ڈال
کدھیں نرگس جو پڑتی تھی نین تل   اپس کے کھینچتی تھی مکھ پہ آنچل

اسی طرح سمن بر کو جب شہزادے کے غرق ہونے کی خبر ملتی ہے تو اس کا حال ملاحظہ کیجیے۔ اس کے کردار کا اندازہ ہوگا:

سمن بر جیوں سنی وو بس بھری بات   لڑی تیوں سانپ کے کا کچ ہوا دھات
یکایک دردسوں مارپا سو دل جوش   پڑی جوں گاے اڑ ڈا کر ہو بے ہوش
پڑی بھنیں پہ منڈی لے ڈال کریوں   ہرن جو تیر کھایا سوپڑے تیوں
لگی یوں تڑپھڑانے مار چھاتی   کہ مچھلی نیر بن جیوں پھڑپھڑاتی
لگی لڑنے کوں ، غم کی لگ چھری یوں   پنکھی کاٹے سو پڑ کر تلملے جیوں
ہوا دل ٹکڑے ٹکڑے بھوت تیوں پھوٹ   لگی لینے دکھوں سر ہور سینا کوٹ

اگرچہ بیشتر مثنویوں کی طرح "پھولبن" کا مقصود بھی مسرت زائی ہے لیکن کردار نگاری کے زاویے سے ابن نشاطی نے حق ادا کرنے کی سعی کی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ابن نشاطی کرداروں کو اس طرح ابھارتا ہے کہ وہ قاری کے دل میں منتقل اور منقش ہو جاتے ہیں

(آگے ص ۵۹ پر)

ڈاکٹر محمد علی اثر

ادارہ ادبیات اردو میں "دیوانِ ولی" کا ایک نادر مخطوطہ

ادارہ ادبیات اردو کا کتب خانہ عربی، فارسی، اردو اور خصوصاً دکنی کے ذخیرہ مخطوطات کے اعتبار سے دنیا کے چند اہم اور قابل فخر کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ اس کتب خانے میں محفوظ (۱۴۰۰) ایک ہزار چار سو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرستیں چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ممتاز محقق دکنیات اور ادارہ ادبیات اردو کے بانی ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس کتب خانے کے ایک ہزار ایک سو پچاس مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں، پانچ جلدوں میں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۹ء کے درمیان شائع کیں۔ پانچویں جلد کی اشاعت کے چوبیس سال بعد ۱۹۸۳ء میں ادارے کے مخطوطات کی چھٹی جلد کی اشاعت عمل میں آئی جسے جناب محمد اکبر الدین صدیقی مرحوم اور راقم الحروف نے مرتب کیا تھا

ڈاکٹر زور نے ۱۹۵۹ء میں ایک ہزار ایک سو پچاس قلمی کتابوں کی فہرست مرتب کرنے کے بعد اطلاع دی تھی کہ "ابھی ادارے میں تقریباً چار ہزار مخطوطات ایسے ہیں جن کی ایسی ہی توضیحی فہرست مرتب اور شائع کرنی ہے اور اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔" (۱) ڈاکٹر زور کے اس بیان کے مطابق ادارہ ادبیات اردو کے ذخیرہ مخطوطات میں پانچ ہزار سے زاید قلمی کتابیں موجود ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق ادارہ ادبیات میں قدیم اردو یا دکنی مخطوطات کی تعداد تقریباً چار سو ہے جن میں سے کلام مستبدی، لدوی اورنگ آبادی کا دیوان، مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری کی مثنوی "روپ سنگار" اور سامی کی مثنوی "سرو و شمشاد" قدیم اردو کے ایسے غیر مطبوعہ نسخے ہیں جن کا تاحال کوئی دوسرا نسخہ دریافت نہیں ہوا۔

جہاں تک ولی دکنی کے قلمی دواوین کا تعلق ہے، ادارہ ادبیات اردو میں دیوان ولی کے سات مخطوطوں کے علاوہ تین متفرق بیاضوں میں بھی اس کی غزلیں اور دیگر منظومات محفوظ ہیں۔ ادارے میں دیوان ولی کا قدیم ترین نسخہ ۱۱۲۸ھ کا مکتوبہ ہے (۲) لیکن اس مضمون میں ہم جس نسخے کو موضوع بحث بنا رہے ہیں وہ ۱۱۵۲ھ کا مکتوبہ ہے (۳) اور اس مخطوطے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کتابت ولی کے ایک ہم عصر اور باکمال شاعر ہتدی اورنگ آبادی نے کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق ولی کی وفات ۱۱۳۳ھ (۴) اور ۱۱۴۴ھ (۵) کے درمیانی عرصے میں ہوئی۔ اگر ہم ولی کے انتقال کا سال ۱۱۴۲ھ قیاس کریں تو پیش نظر دیوان، ولی کی وفات کے دس سال بعد لکھا گیا ہے۔ اس دیوان کی ایک اور خصوصیت یہ کہ ہتدی نے اس کے حاشیوں پر جگہ جگہ ولی کی متعدد غزلوں اور نظموں کا اضافہ کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان کی کتابت کے بعد کاتب کو جوں جوں ولی کی نئی غزلیں ملتی رہیں اس نے حاشیے پر ان کا اضافہ کر دیا۔ اگر دیوان ولی کے مختلف قلمی نسخوں سے ان غزلوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ان منظومات کی تاریخ تصنیف کے تعین کی راہیں کھل سکتی ہیں۔ اختلاف نسخ کے اعتبار سے بھی اس نسخے کی اہمیت غیر معمولی ہے، ایک تو اس لیے کہ اس کا کاتب ولی کا مداح، ہم وطن اور ایک اچھا شاعر ہے اور دوسرے یہ کہ اس نسخے کی کتابت عہد ولی کے قریبی زمانے میں ہوئی ہے۔ یوں تو "دیوان ولی" کی اشاعت ۱۸۳۳ء - ۱۹۵۴ء کے درمیان چھ بار عمل میں آئی ہے لیکن احسن مارہروی اور نور الحسن ہاشمی نے اس کی ترتیب و تدوین میں بڑی چھان بین اور عرق ریزی سے کام لیا ہے (۶)۔ زیر بحث مخطوطہ سے احسن مارہروی نے دیوان ولی کی تدوین میں استفادہ نہیں کیا لیکن نور الحسن ہاشمی نے اسے پیش نظر رکھا تھا۔

جہاں احسن مارہروی اور نور الحسن ہاشمی کے دواوین سے پیش نظر مخطوطے کا تقابلی مطالعہ کر کے اختلاف نسخ کی چند مثالیں پیش کی

جاری ہیں جن سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ "دیوان ولی" کے دونوں مرتبین نے قدامت اور صحت متن کے باوجود پیش نظر مخطوطے سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا ہے۔

ہتدی کا مکتوبہ شعر ہے:

کتاب العشق مکہ یو ہے صفا تیرا صفا دستا
ترے ابرو کے دو مصرعے یو اس کا ابتدا دستا
(۷)(ورق ۹)

احسن مارہروی اور نور الحسن ہاشمی کے مرتبہ دیوان میں اس شعر کا پہلا مصرع بالترتیب اس طرح ملتا ہے۔

۱۔ کتاب حسن کا یہ مکھ صفا تیرا صفا دستا (۸)
۲۔ کتاب الحسن کا یہ مکھ صفا تیرا صفا دستا

دونوں مرتبین نے اس غزل کے درج ذیل شعر کو شامل متن نہیں کیا:

ترے غم میں سو اے موہن ہوا جیوں کاہ میرا تن
نین تیرے کا یو انجن سو مجھ کوں کہربا دستا

[illegible] کے مکتوبہ نسخے میں ولی کی ایک مشہور غزل کا مصرع اولیٰ اس طرح ہے:

دو صنم جب سوں بسیا دیدہ حیران میں آ

دور مرتبین نے اس مصرع میں "بسیا" کی جگہ "بسا" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ زیر نظر مخطوطے میں ہتدی نے ولی کے درج ذیل مصرعوں میں "پیو" اور "جیو" کے الفاظ استعمال کیے ہیں جب کہ دونوں مرتبین نے "پیو" کی جگہ پی اور "جیو" کی جگہ جی کے الفاظ استعمال کیے ہیں:

۱۔ "پیو" کے ہوتے نہ کر توں مہ کی ثنا (۹)
۲۔ "جیو" بستی ہے خوش ادا کی ادا (۱۰)

پیش نظر مخطوطے میں ولی کے دیوان کی کتابت کے بعد ہتدی نے اپنا کلام قلم بند کیا ہے جس میں ولی کی [illegible] غزلوں کی تضمین بھی شامل ہے۔ ولی کی غزل پر لکھے ہوئے ایک مخمس کے دو بند دیکھیے جن سے ہتدی کی شعری صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

برہ کی رات جوں اماس ہے درد و غم اس کے بارہ ماس ہے
دودھیائی بڑی نراس ہے کوچہ یار عین کاس ہے
جوگی دل وہاں کا باس ہے

جس نے کچھ مال اپرمن پہ رکھیا اس نے خوبی اپس کے من پہ رکھیا
ہتدی نے صندل بدن پہ رکھیا اے ولی جو لباس تن پہ رکھیا
عاشقاں کے بزرگ [illegible] ہے (۱۱)

زیر نظر مخطوطے کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ کاتب نے مختلف صفحات کی سرخیوں میں ولی کا نام بھی تحریر کر دیا ہے

مرجع بعد ولی محمد، مثنوی ولی محمد، مخمسات ولی محمد وغیرہ۔ ان عنوانات سے اس بات کی مزید شہادت ملتی ہے کہ ولی کا نام ولی اللہ، محمد ولی، شاہ ولی اللہ یا شمس ولی اللہ نہیں بلکہ ولی محمد تھا۔ صاحب گلشن گفتار نے بھی یہی نام لکھا ہے اور ولی کے عزیز ترین دوست سید ابوالمعالی کے فرزند عنایت اللہ کے بکتوبہ دیوان ولی کے مخطوطے میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر زور:

"ان کلیات کی وجہ سے اس امر کا مزید ثبوت فراہم ہو جاتا ہے کہ ولی کا نام سید ولی اللہ حسینی نہیں تھا اور مولوی عبدالحق نے ولی کی تاریخ وفات کے بارے میں جس قطعہ سے معلومات فراہم کی ہیں وہ ولی اورنگ آبادی سے متعلق نہیں ہے بلکہ کسی اور بزرگ سید ولی اللہ حسینی سے متعلق ہے۔ ممکن ہے کہ کتاب "ولی گجراتی" میں جن ولی اللہ حسینی کا ذکر ہے ان سے تعلق رکھتا ہو اور وہ ولی اللہ ایک صوفی اور ولی ضرور تھے مگر شاعر نہیں تھے۔"(۱۲)

حوالے

(۱) تذکرہ اردو مخطوطات ادارہ ادبیات اردو" (جلد پنجم) ص (۵)

(۲) مخطوطہ نمبر ۸۲۱ تذکرہ اردو مخطوطات (جلد چہارم) ص (۱۷۰)

(۳) مخطوطہ نمبر ۷۷۶ تذکرہ۔ اردو مخطوطات (جلد سوم) ص (۲۹۵)

(۴) فراقی کی مثنوی "مرأۃ الحشر" ۱۱۳۳ھ کی تصنیف ہے جس میں مرحوم شعرا کی حیثیت سے ولی کا نام نہیں ملتا۔

(۵) وجدی نے اپنی مثنوی "مخزن عشق" ۱۱۴۴ھ میں لکھی جس میں ولی کا مرحوم شاعر کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔

(۶) احسن مارہروی کا مرتبہ دیوان ۱۹۲۷ء میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع ہوا تھا جب کہ نورالحسن ہاشمی کا مرتبہ دیوان ۱۹۵۴ء میں منظر عام پر آیا۔

(۷) مخطوطہ نمبر (۷۷۶) ورق نمبر (۵) الف (۸) ایضاً (۹) ایضاً ورق نمبر (۵۷) (۱۰) ایضاً ورق (۳۲) (۱۱) ایضاً ورق (۶۱) (۱۲) تذکرہ۔ اردو مخطوطات (جلد سوم) ص (۲۹۶)

ڈاکٹر داؤد اشرف

اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، لندن یونیورسٹی

(السنہ مشرقیہ اور اردو چیئر کے لیے ریاست حیدرآباد کی امداد)

ریاست حیدرآباد کے چشمۂ فیض سے ریاست اور بیرون ریاست برصغیر کے دوسرے علاقے ہی نہیں بلکہ سمندر پار بیرونی ملکوں
کے علاقے بھی سیراب ہوتے تھے۔ ریاست حیدرآباد کے آخری حکمراں آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں کی سرپرستی، امداد اور اعانت کے
ریعے انگلستان (برطانیہ)، بیت المقدس اور عرب ملکوں کے اداروں کی آبیاری بھی ہوئی ہے۔ جن بیرونی ملکوں کے علمی اداروں درس
اہوں، کتب خانوں اور دیگر فلاحی اداروں کو رقمی امداد دی گئی تھی ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ مختصر مضمون انگلستان کے ایک نام
ر تعلیمی ادارے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، لندن یونیورسٹی کو دی گئی مالی امداد کے بارے میں قلم بند کیا جارہا ہے جو آندھرا پردیش
سٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ریکارڈ کے مواد پر مبنی ہے۔ اس اسکول کو ابتدا میں تین سال تک پانچ سو پونڈ سالانہ امداد منظور
ی گئی تھی۔ امداد کی توسیع کی درخواست پر ڈھائی سو پونڈ سالانہ امداد مزید تین سال کے لیے جاری کی گئی تھی۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کو
یہ سال کی مدت (۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۴ء) تک مالی امداد جاری رکھنے کے بعد اس خیال کے پیش نظر کہ اس ادارے کو کافی امداد دی جاچکی ہے امداد کو
سدود کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس اسکول میں اردو ریڈرشپ یا اردو چیر کے قیام کے لیے مالی امداد کو بحال کرنے کی درخواست پر تین سال بعد یہ
الی امداد پھر جاری کر دی گئی۔ امداد کی کارروائی کا خلاصہ ذیل میں دیا جارہا ہے:

لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز (مدرسہ السنہ مشرقیہ) کی جانب سے مالی امداد منظور کیے جانے کے لیے آصف سابع
ل خدمت میں ایک درخواست روانہ کی گئی۔ جسے آصف سابع نے بذریعہ فرمان مورخہ ۱۲/ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ م ۹/ اکتوبر ۱۹۲۷ء واپس
رتے ہوئے اس بارے میں باب حکومت (کابینہ) کی رائے طلب کی۔ باب حکومت نے اپنے اجلاس میں غور و خوض کے بعد یہ قرار داد منظور
ل کہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کو سردست تین سال کے لیے پانچ سو پونڈ سالانہ کی امداد مناسب ہے۔ جب اس بارے میں ایک عرض
اشت مورخہ ۴/ اگست ۱۹۲۸ء آصف سابع کی خدمت میں پیش کی گئی تو آصف سابع نے اپنے فرمان مورخہ ۱۶/ اگست ۱۹۲۸ء کے ذریعے اسکول
ف اورینٹل اسٹڈیز کے لیے پانچ سو پونڈ سالانہ تین سال کے لیے منظور کیے۔

مذکورہ بالا فرمان کی تعمیل میں مدرسۂ مذکور کو پانچ سو پونڈ روانہ کیے گئے۔ جس پر ڈائرکٹر اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، لندن
یونیورسٹی نے ایک مراسلہ مورخہ ۱۸/ ستمبر ۱۹۲۸ء صدر المہام فینانس کے نام روانہ کیا جس میں امداد کی وصول یابی سے متعلق آصف سابع کی
خدمت میں اپنا عقیدت مندانہ شکریہ ادا کرنے کی درخواست کی۔ بعد ازاں مدرسۂ مذکور کے ڈائرکٹر نے اپنے دوسرے مراسلے مورخہ ۲۵/
اکتوبر ۱۹۲۸ء موسومہ صدر المہام فینانس کے ذریعے اطلاع دی کہ اس گراں قدر عطیے کی منظوری کی اطلاع مدرسۂ مذکور کی مجلس انتظامی کو دی
ئی تھی جس پر مجلس مذکور نے شکریے کا رزولیوشن منظور کیا۔ اس رزولیوشن کی نقل اپنے مراسلے میں نقل کرتے ہوئے ڈائرکٹر نے استدعا
ی کہ اسے آصف سابع کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ شکریے کے دونوں مراسلے علاحدہ علاحدہ عرض داشتوں کے ذریعے آصف سابع کے ملاحظے

میں پیش کیے گئے۔

جب منظور شدہ عطیے کی مدت ختم ہونے کے قریب تھی تو سرہار کورٹ بٹلر نے ایک مراسلہ مورخہ ۹ / جولائی ۱۹۳۱ء روانہ کیا جس میں انھوں نے لکھا کہ اسکول کی مجلس انتظامی کے صدر کی حیثیت سے ان کی یہ درخواست ہے کہ آصف سابع نے اس مدرسے کے لیے جو فیاضانہ عطیہ منظور کیا تھا وہ بدستور جاری رہے کیوں کہ آصف سابع نے اپنی دریادلی سے اس مدرسے کے لیے جو پانچ سو پونڈ سالانہ کی امداد تین سال کے لیے منظور کی تھی اس کی مدت قریب الختم ہے۔ مدرسے کی کارکردگی کے بارے میں ڈائرکٹر نے اطلاع دی کہ مدرسے کا کام عمدہ طور پر چل رہا ہے۔ سال گذشتہ ۵۵۰ طلبہ اس اسکول میں شریک تھے جن میں ۸۷ طلبہ نے عربی، ۴۰ طلبہ نے فارسی اور ۴۴ طلبہ نے اردو کی تعلیم بحیثیت مضمون حاصل کی۔ اس کے علاوہ اسلامی علوم و ادب پر بھی خاص لکچروں کا اہتمام کیا گیا تھا نیز تحقیقی کام بھی بہت ہوا ہے۔ اپنے مراسلے کے آخر میں انھوں نے لکھا کہ انھیں معلوم ہے کہ آصف سابع کے عمومی فیضان سے بہت سے ادارے اشارے کے ممتنی رہتے ہیں تاہم وہ امید کرتے ہیں کہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز پر آصف سابع توجہ مبذول فرمائیں گے جن کی جانب سے ریاست حیدرآباد اور بیرون ریاست کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی بہت سرپرستی کی گئی ہے۔

سرہار کورٹ بٹلر کے مندرجہ بالا مراسلے پر ناظم تعلیمات نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا کہ مدرسۂ مذکور کے حالات اور ترقی کے پیش نظر موجودہ امداد میں تین سال کی توسیع منظور کی جاسکتی ہے۔ معتمد تعلیمات نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ صدر المہام فینانس نے لکھا کہ سرہار کورٹ بٹلر کے مراسلے کے پیش نظر ۵۰۰ پونڈ سالانہ کی امداد مزید تین سال تک جاری رکھنے سے سررشتہ فینانس کو اختلاف نہیں ہے۔ صدر المہام تعلیمات نے تحریر کیا کہ رپورٹ سے ظاہر ہے کہ اسکول کی کارکردگی اطمینان بخش ہے اس لیے انھیں مقررہ امداد مزید تین سال تک جاری رکھنے سے اتفاق ہے۔ جب یہ کارروائی باب حکومت کے اجلاس منعقدہ یکم اگست ۱۹۳۲ء میں پیش ہوئی تو اس اجلاس میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، لندن کو پانچ سو پونڈ سالانہ کی بجائے ڈھائی سو پونڈ سالانہ امداد آیندہ تین سال کے لیے جاری رکھنے کے بارے میں قرار داد منظور ہوئی۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد صدر اعظم نے ایک عرض داشت مورخہ ۲۴ / اگست ۱۹۳۲ء میں سرہار کورٹ بٹلر کے مراسلے کا خلاصہ اس پر پیش کردہ سفارشات اور باب حکومت کی قرار داد درج کر کے اسے آصف سابع کے احکام کے لیے پیش کیا۔ آصف سابع نے باب حکومت کی قرار داد کو منظوری دی اور اس بارے میں آصف سابع کا یہ فرمان مورخہ ۶ / ستمبر ۱۹۳۲ء صادر ہوا۔ "کونسل کی رائے مناسب ہے حسبہ مذکور مدرسے کو مزید تین سال تک پانچ سو پونڈ کے عوض ڈھائی سو پونڈ سالانہ کی امداد دی جائے۔"

اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کو چھ سال تک امداد جاری رہی۔ اس کے بعد سرہار کورٹ بٹلر نے پھر اپنا ایک مکتوب معروضہ آصف سابع کی خدمت میں روانہ کیا جس کے ساتھ ایک مطبوعہ اپیل (appeal) بھی منسلک تھی۔ اپنے معروضے میں سرہار کورٹ بٹلر نے لکھا کہ انھیں آصف سابع کو مزید عطیہ کے لیے زحمت دیتے ہوئے ہچکچاہٹ کا احساس ہو رہا ہے لیکن وہ یہ بات آصف سابع کے علم میں لانا چاہتے ہیں کہ انگلستان میں السنۂ مشرقیہ کی ترقی کا یہ بہت اچھا موقع ہے۔ چوں کہ آصف سابع نے ہندوستان میں اشاعت علم کے لیے غیر معمولی سرپرستی کی ہے اور حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ قائم کر کے ایک عدیم المثال نظیر قائم کی ہے اس لیے ان کو توقع ہے کہ ان کی پیش کردہ اپیل پر مناسب غور کیا جائے گا۔ اپیل میں یہ بتایا گیا تھا کہ مدرسے کے لیے ایک عمارت دوسرے مقام پر تعمیر کی جانے والی ہے جس کے لیے مجموعی طور پر دو لاکھ پچاس ہزار پونڈ کا صرفہ عاید ہونے کا اندازہ ہے۔ موجودہ عمارت اور اراضی کے فروخت سے ایک لاکھ پچاس ہزار پونڈ وصول ہونے کی توقع ہے۔ بقیہ رقم ایک لاکھ پونڈ چندوں کے ذریعے وصول کی جارہی ہے۔ سررشتہ تعلیمات نے اس بارے میں اس رائے کا اظہار کیا کہ

سرہارکورٹ بٹلر کو اخلاقاً نفی میں جواب دینا مناسب ہے۔ سررشتہ فینانس نے لکھا کہ اس اسکول کو کم و بیش ۲۵ ہزار روپے سکہ عثمانیہ کی امداد دی جاچکی ہے جو کافی و معقول خیال کی جاسکتی ہے۔ مزید امداد کا دیا جانا باب حکومت کی صواب دید پر منحصر ہے۔ باب حکومت کے اجلاس میں بھی امداد دیے جانے کے بارے میں کوئی قرار داد منظور نہیں ہوئی اور یہ رائے ظاہر کی گئی کہ مدرسہ مذکور کی کافی امداد ہو چکی ہے۔ جب اس کارروائی کی تمام تفصیلات بذریعہ عرض داشت مورخہ ۴/ دسمبر ۱۹۳۴ء آصف سابع کی خدمت میں پیش ہوئیں تو انھوں نے اپنے فرمان مورخہ ۱۵/ اپریل ۱۹۳۵ء کے ذریعے حکم دیا کہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کو کسی امداد کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ قبل ازیں کافی رقم دی جاچکی ہے۔ اس حکم کی تعمیل میں امداد مسدود کر دی گئی لیکن کچھ عرصہ بعد سرڈینیسن راس Sir Denison Ross ڈائرکٹر اسکول آف اورینٹل اسٹیڈیز کی یاد داشت مورخہ ۱۸/ نومبر ۱۹۳۶ء وصول ہوئی جس میں اطلاع دی گئی کہ مدرسہ مذکور کے شعبۂ اردو کے لیے ریڈرشپ کے قیام کی تجویز ہے جسے دی نظامس ریڈرشپ ان اردو (The Nizam.s Readership in Urdu) کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ یہ اطلاع دیتے ہوئے استدعا کی گئی کہ اس کے لیے مالی امداد منظور کی جائے اور اگر اس درخواست کو منظوری حاصل نہ ہوسکے تو سابق میں چھ سال تک جو امداد فیاضانہ طور پر دی گئی تھی اس کو بحال کیا جائے۔ اس یاد داشت کے بارے میں صدر المہام تعلیمات نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا کہ ان کے خیال میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، لندن یونیورسٹی میں اردو ریڈرشپ کے قیام میں مدد دینا مناسب ہوگا کیوں کہ اردو زبان کی سرپرستی کرنا اس ریاست کی مستقل پالیسی ہے۔ انھوں نے مدرسہ مذکور کی امداد کو اردو ریڈرشپ کے لیے ازسرنو تازہ کرنے کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کرتے ہوئے دریافت کیا کہ سررشتہ فینانس کو کس قدر امداد منظور کرنے سے اتفاق ہے اور آیا یہ امداد درس گاہ مذکور کے شعبۂ عربی کے لیے عطا کی جائے یا شعبۂ اردو کے لیے۔ سررشتۂ فینانس نے اس بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا کہ سابقہ امداد کے بحال رکھے جانے سے سررشتۂ ہذا کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ امداد آیا شعبۂ اردو کے لیے ہو یا شعبۂ عربی کے لیے اس کی نسبت باب حکومت سے جو تصفیہ کیا جائے گا اس سے سررشتہ فینانس اتفاق کرے گا۔ جب یہ کارروائی باب حکومت کے اجلاس منعقدہ ۵/ اگست ۱۹۳۷ء میں پیش ہوئی تو اس میں یہ قرار داد منظور کی گئی کہ ڈھائی سو پاؤنڈ سالانہ کی امداد اردو چیر (Chair) کے لیے مرحمت کی جاسکتی ہے۔ سراکبر حیدری صدر اعظم نے عرض داشت مورخہ ۲۴/ اگست ۱۹۳۷ء میں سرڈینیسن راس کی یاد داشت کا خلاصہ، اس پر صدر المہام تعلیمات و سررشتہ فینانس کی رائے اور باب حکومت کی منظورہ قرار داد درج کرکے اسے آصف سابع کے ملاحظے اور احکام کے لیے پیش کیا۔ آصف سابع نے باب حکومت کی قرار داد منظور کرتے ہوئے حسب ذیل فرمان مورخہ ۱۶/ ستمبر ۱۹۳۷ء کے ذریعے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، لندن میں اردو ریڈرشپ قائم کرنے کے احکام صادر کیے۔

"کونسل کی رائے کے مطابق مدرسہ مذکور میں اردو ریڈرشپ بنام (The
Nizam.s Readership in Urdu) قائم کرنے کی غرض سے
ڈھائی سو پونڈ سالانہ ہماری گورنمنٹ کی طرف سے منظور کیے جائیں۔"

○ ○ ○

مطالعہ

سید خالد قادری

BEYOND SUPER STRUCTURALISM

(فوق ساختیات سے آگے)

رچرڈ ہارلینڈ (Richard Harland) وولنگانگ یونیورسٹی (UNIVERSITY OF WOLLONGONG) کے شعبہ انگریزی میں استاد ہیں۔ "فوق ساختیات سے آگے۔" ان کی تازہ تصنیف ہے جس میں انھوں نے اپنی پچھلی تصنیف "فوق ساختیات" میں پیش کردہ موقف پر نظر ثانی کی ہے اور اس کتاب میں ساختیات اور پس ساختیات کے نظریہ سازوں کے بیشتر مفروضات میں ترمیم اور کچھ بنیادی تبدیلیوں کے امکانات کی نشان دہی کی ہے۔ رچرڈ ہارلینڈ کا استدلال یہ ہے کہ زبان اور اس کی تفہیم کے سلسلے میں پیش کردہ بیشتر ساختیاتی اور پس ساختیاتی مطالعے "لفظ" (Word) کو ایک خود کفیل اکائی مان کر ہی کیے گئے ہیں اور لفظ و معنی کے باہم رشتے پر ہی تمام توجہ مرکوز کرنے کی وجہ سے یہ مطالعے مہلک حد تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہارلینڈ ایک مفصل اور مدلل بحث کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کسی لفظ کا مفہوم اپنی حیثیت کے اعتبار سے اس حرکت (Movement) کے دوران جب وہ اپنا انفرادی وجود ترک کر کے کسی جملے کا جزو بنتا ہے، غیر معمولی تبدیلی سے گذرتا ہے۔ لفظ و معنی کا ایسا مطالعہ جس میں لفظ صرف اپنی عمودی یا استعاراتی جہت (Vertical or Paradigmatic aspect) میں ہی زیر غور ہو، نہ صرف ناکافی ہو گا بلکہ ایسے نتائج اخذ کیے جانے کے لیے راہ ہموار کرے گا جو گمراہ کن ہو سکتے ہیں۔ ایک زیادہ مناسب اور نسبتاً معتبر رویہ یہ ہو گا کہ لفظ کو اس کی افقی یا نحوی جہت (Horizental or Syntagmatic aspect) میں دیکھا جائے۔ زبان کے ایسے مطالعے کے لیے ہم کو نحوی طریقۂ کار اپنانا ہو گا۔ مجرد لفظی اکائیوں کا زبان کے نحویاتی اصولوں کے تحت باہم مربوط ہو کر کسی بامعنی جملے کا جزو بننے کا عمل بذات خود اس سلسلے میں اب تک پیش کردہ کسی بھی یورپی یا اینگلو امریکی نظریے سے کہیں زیادہ ڈرامائی ہے۔

ہارلینڈ کی تازہ تصنیف چومسکی (Chomsky) کی لسانیات رد تشکیل (Disconstruction) اور زبان کے عمل تقریر (Speech-Act) کے نظریے جیسے وسیع تر موضوعات کو اپنے دائرۂ فکر میں لاتے ہوئے ان بنیادی مفروضوں پر سوالیہ نشان بناتی ہے جن کے تحت زبان سے متعلق تازہ ترین نظریے وجود میں آئے ہیں۔ یہاں پیش کردہ نیا طریقۂ کار جو لفظ کو اس کی نحوی جہت میں دیکھنے پر اصرار کرتا ہے، لسانیات، ادبی تنقید اور فلسفے کے مطالعے کے لیے بھی ایک نیا طریقۂ کار فراہم کرتا ہے۔ یہ طریقۂ کار جہاں ایک طرف ساختیاتی اور پس ساختیاتی فلسفۂ زبان سے مختلف ہے وہیں زبان کے تعلق سے منطقی جوہریت (Logical Atomism) منطقی اثباتیت (Logical Positivism)، مشروط بہ صداقت (Truth Conditioned) نظریے اور عمل تقریر (Speech act) جیسے نظریوں سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔ یہ زاویہ ہائے نظر اپنے اپنے طور پر ایک اہم تخالف (Opposition) ضرور فراہم کر سکتے ہیں جس کے پس منظر میں نحوی نظریۂ زبان کو سمجھا جا سکے۔ اس کے لیے زبان کے ان پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنی ہو گی جنھیں یہ تخالف، زبان کی نظریہ سازی میں ناقابل اعتنا سمجھتا رہا ہے۔

ہارلینڈ کی پچھلی تصنیف "فوق ساختیات" میں Super structuralism دراصل سہولت کے لیے وضع کی گئی ایک اصطلاح

اصطلاح ہے جو مجموعی طور پر ساختیات، پس ساختیات، نشانیات (Semeotics)) آلتھوسیرین مارکسیت، لاکاں اور فوکو کے نظریات پر لاگو کی گئی ہے۔ ان سب کے بیش تر نظریاتی مطالعوں کا ماخذ ساسیر کی لسانیات اور دریدا کا فلسفۂ زبان رہا ہے۔ ان دونوں بنیادی ماخذ کے کئی اہم پہلوؤں سے گریز ہارلینڈ کے یہاں ایک نئے نظریے کو وجود میں لاتا ہے۔

نحویہ (Syntagme) جس پر اس نئے نظریے کی بنیاد رکھی گئی ہے فوق ساختیاتیوں کے نزدیک ایک غیر اہم موضوع رہا ہے جس پر قابلِ لحاظ توجہ نہیں دی گئی۔ زبان کے اینگلو امریکی فلسفی بھی اس سلسلے میں کچھ ایسا ہی رویہ اپناتے رہے ہیں۔ جہاں ساختیاتیوں (Super strcuturalists) نے "لفظ" کی عمودی جہت سے اس درجہ شغف بڑھایا کہ اس کے نحوی طریقۂ کار کی طرف مناسب توجہ نہ دے سکے وہیں زبان کے اینگلو امریکی فلسفی "جملوں" کی اس صورت کے مطالعے میں جہاں وہ ڈسکورس (Discourse) کی اکائی بن جاتا ہے، کچھ اس سرعت سے آگے بڑھے کہ درمیان میں آنے والے کئی اہم قضیے توجہ کے محتاج رہ گئے۔

"فوق ساختیات سے آگے" میں پیش کردہ زبان کا یہ نحوی نظریہ بڑی حد تک لسانیات کے تازہ ترین مباحث سے قوت حاصل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر تخلیقی قواعد (Generative Grammar) میں زبان کے نحوی قوانین اور معنی کے نحوی عمل کے مابین پایا جانے والا رشتہ یا پھر زبان کی عمیق ساخت (Deep Structure) یا اس کے معنیاتی جزو جیسے پرانے موضوعات پر تازہ بحث۔ علاوہ ازیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادھر کچھ برسوں سے چل رہی طبعی قواعد (Natural Grammar) کی تحریک کی کارآمد معلومات بھی اس نئے نظریے نے اپنے اندر جذب کرلی ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ مطالعۂ زبان سے متعلق یہ نیا نحوی نظریہ نہ صرف ادب اور ادبی تنقید کے میدان میں رائج موجودہ نظریوں کے رد کیے جانے کی صورت میں ان کا متبادل فراہم کر سکتا ہے بلکہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ نئی تنقید سے وابستہ نقادوں کے علاوہ ساختیاتی اور پس ساختیاتی نقادوں کی ادبی تنقید کے بیش تر اصول مخالف نحوی (Asyntagmatic) رہے ہیں جب کہ ادب اپنے وجود کے ذریعے ہمیشہ زبان کی افقی یا نحوی جہت کی اہمیت کو اجاگر کرتا رہا ہے۔

○ ○ ○

یوسف ناظم

رقعے بانٹنا

جن لوگوں نے دنیا دیکھی ہے وہ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کا سب سے مشکل کام اگر کوئی ہے تو وہ رقعے بانٹنا ہے۔ رقعے تو کئی طرح کے ہوتے ہیں اور آدمی کو چھوٹی بڑی تقریبات کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ لیکن ان دعوتوں کے رقعے کسی سماجی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے کسی کے بھی ہاتھ بھیج دو یا زبانی دعوت دے دو سب روا ہے لیکن اس وقت ہم صرف شادی کے رقعوں کا ذکر کر رہے ہیں جو اصل تقریب سے پہلے ہی نوشاہ کی آدھی جان نکال لیتے ہیں۔ ہم شخصی طور پر ایک ایسے بزرگ سے واقف ہیں جو اس وقت عمر کے اس مرحلے پر ہیں جب ایک شریف آدمی ہر اچھے برے کام سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ (یہ ضروری نہیں ہے کہ اس نے زندگی میں کوئی کام بھی کیا ہو)۔ ان بزرگوار نے اپنی ساری عمر کنوارپن میں صرف اس لیے گزار دی کہ ان کے گھر میں رقعے بانٹنے کے لیے کوئی مددگار نہیں تھا۔ آپ کو یقین نہیں آیا لیکن یہ آپ کا مسئلہ ہے ہم نے جو کچھ عرض کیا وہ سچ ہے۔ عدالتی سچ نہیں بلکہ حقیقی سچ۔ اصل میں ان سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ جس معاشرے میں وہ سانس لے رہے ہیں وہ معاشرہ شادی کے رقعوں کے سلسلے میں بہت سخت گیر ہے اس لیے نوشاہ کو اپنی شادی کے دن گھوڑے پر سوار ہو کر بارات لے جانے سے پہلے یعنی کئی دن پہلے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی شادی کے دعوت نامے خود گھر گھر جا کر بانٹنے پڑتے ہیں۔ جسے بلانا ہو اس کے آگے کچھ جھینپ کر، کچھ شرما کر اور بعض صورتوں میں گھگھیا کر عرض کرنا پڑتا ہے کہ آپ اس تقریب میں آیئے گا ضرور ورنہ مجھے دہرا افسوس ہو گا اور اگر نوشاہ خود اپنی کسی کمزوری یا ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ کام خود نہ کر سکے تو رقعوں کی تقسیم نوشاہ کے والد ماجد کے ہاتھوں عمل میں آنی چاہیئے۔ (یوں بھی سارا کیا دھرا ہوتا بھی تو والد ہی کا ہے)۔ ان کنوارے بزرگ کو شاید اس بات کا بھی یقین دلا دیا گیا تھا کہ رقعوں کی تقسیم میں اگر اس طریقہ کار پر عمل نہیں کیا گیا تو شادی کے پنڈال میں زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو الیکشن کے موقع پر بوگس ووٹنگ کا کام کیا کرتے ہیں۔ ہمارے یہ شناسا اتنے خوف زدہ ہوئے کہ اپنے سر شادی کا سہرا نہیں بندھوا سکے۔ حسرت سہرے کی ان کلیوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئیں اور ان ہاروں پر بھی ہے جو ان کے گلے کا ہار نہیں بن سکے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جب بھی انھیں اپنے کسی شناسا کی شادی کی خبر ملتی ہے یہ رقعے بانٹنے کے لیے اپنی خدمات ضرور پیش کر دیتے ہیں۔

اب شادیوں میں اہمیت نفس شادی کی رہی بھی نہیں ہے۔ رقع اور رقعوں کی تقسیم کی بات زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ جب بعض مہمانوں کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ نوشاہ نے چند مخصوص لوگوں کو خود رقعے پہنچائے تھے اور انھیں اس عزت و تکریم کا مستحق نہیں سمجھا تھا تو انھیں اپنی سبکی کا احساس ہوتا ہے اور اتنا ہوتا ہے کہ عین وقت پر وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ جب نوشاہ میاں کو چار قدم چل کر ہمارے گھر آنے کی توفیق نہیں ہوئی تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ اچھے بھلے کام چھوڑ کر انھیں مبارک باد دینے جائیں اور وہ کون سا ایسا انوکھا کام کر رہے ہیں۔ شادی ہی تو کر رہے ہیں جس کے لیے کوئی قابلیت تھوڑے ہی درکار ہے۔ معزز مہمان نے جن کے خیالات اچانک بدل گئے اس شادی میں شرکت کے لیے خاصی تیاری کر لی تھی بلکہ پڑوس کے گھر سے ایک سادہ لفافہ بھی یہ کہہ کر حاصل کر لیا تھا کہ وہ بازار سے لانا بھول گئے (جھوٹ سراسر جھوٹ)۔ کسی بھی لفافے کی

قیمت اب ایک روپے سے کم نہیں ہوتی۔ اس لیے بہتوں نے شگون کا وہ روپیہ جو دس کو گیارہ اور ۵۰ کو اکیاون بنانے کے لیے رکھا جاتا ہے لفافے میں رکھنا ترک کر دیا ہے بلکہ اب پوچھنے لگے ہیں کہ یہ زائد ایک روپے کی مہمل رسم شروع کیسے ہوئی تھی۔ ویسے ہم ان کے عمل کی تائید میں ہیں کہ آج کل ایک روپے کی کفایت شعاری بھی، " چھوٹی بچت" کی تعریف میں آتی ہے۔ جو لوگ شگون کا یہ روپیہ اب بھی رکھتے ہیں وہ اس کا انتقام آئس کریم سے لیتے ہیں (کلیجے میں ٹھنڈک پڑتی ہے)۔

کچھ معاشرے اس سے بھی زیادہ فراخ دل ہوتے ہیں اور خود دولہنیں بھی اپنی شادی کے رقعے بانٹنے کی مہم میں اس لیے حصہ لینے لگی ہیں کہ مردوں سے کندھا ملا کر چلنے کی تحریک اسی طرح زور پکڑتی ہے۔ جن لوگوں نے دنیا دیکھی ہے ان میں سے اکثر کا بیان یہ ہے کہ دولہن خود رقعہ دینے آئے تو لوگ ہزار کام چھوڑ کر اس شادی میں ضرور شریک ہوتے ہیں۔ دولھے والے پریشان ہو جاتے ہیں کہ اتنے لوگ کہاں سے آگئے۔ ان کی پریشانی واجبی ہوتی ہے۔ اس استقبالیے میں آدھا خرچ انھیں برداشت کرنا ہوتا ہے اور یہ تو آگے چل کر پتہ چل جاتا ہے کہ کس کو کیا کیا برداشت کرنا پڑتا ہے۔

شادی کے رقعے تقسیم کرنا کوئی پانچ سالہ منصوبہ تو نہیں ہوتا لیکن یہ ایک منصوبہ ضرور ہوتا ہے اور فریقین جتنی بھی انھیں توفیق ہوتی ہے اس منصوبے پر کافی وقت اور روپیہ صرف کرتے ہیں۔ (ضمناً تھوڑا سا دماغ بھی)۔ پہلا مرحلہ کارڈ کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس میں چھوٹے بچے بھی حصہ لیتے ہیں اور ان کی رائے کے آگے والدین کی ایک نہیں چلتی۔ بعد میں بالغان و بزرگان خاندان کی ایک علاحدہ میٹنگ ہوتی ہے۔ آپ اسے " سبجکٹ کمیٹی" کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اس میٹنگ میں دعوت نامے کا مضمون تیار کیا جاتا ہے۔ کئی مسودے لکھے جاتے ہیں اور کئی چاک کیے جاتے ہیں۔ بچوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس کے پرزے اڑ رہے ہیں۔ آخر مسودہ جب تیار اور منظور ہو جاتا ہے تو خاندان کے سب سے زیادہ چاق و چوبند رکن کے سپرد کیا جاتا ہے کہ وہ اسے اس کارڈ پر چھپوا لے جسے بچوں نے پسند کیا تھا۔ کارڈ کی طباعت کا مرحلہ بھی نازک ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سخت ہوتا ہے۔ کوئی نامی گرامی پریس اسے چھاپنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ بہت زیادہ اصرار کیا جائے تو جواب ملتا ہے کارڈ تو ہم چھاپ دیں گے لیکن یہ کام تاریخ گذرنے کے بعد ہی پایہ تکمیل کو پہنچ سکے گا۔ چاق و چوبند رکن خاندان، مطبع کے مینجر کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ بھائی صاحب یہ شادی کا دعوت نامہ ہے اردو کا کوئی رسالہ نہیں کہ جب چاہے چھاپ دیا جائے لیکن اس سے پہلے کہ معاملہ ناچاقی کی حد تک پہنچے وہ کسی دوسرے پریس کا رخ کرتا ہے جہاں کمپوزنگ کی غلطیاں گنی نہیں جاتیں اور پروف ریڈنگ کے لیے بار بار اس طرح بلایا جاتا ہے جیسے کسی ملازمت کے لیے پہلے تحریری، پھر زبانی اور آخر میں اندرونی انٹرویو کے لیے ایک امیدوار کو طلب کیا جاتا ہے (اندرونی انٹرویو سے مراد میڈیکل ٹسٹ ہے جو بعض صورتوں میں بہت سخت یعنی بہت، نازک ہوتا ہے)۔ شادی کے رقعے بڑی مشکل سے ہاتھ آتے ہیں۔ کچھ لوگ تو اسی سلسلے میں عبداللہ دیوانے ہو جاتے ہیں۔

شادی کے رقعوں سے " اہل ڈاک" کو بھی خاص رغبت ہوتی ہے۔ کئی ڈاکیے تو اتنے اہل ذوق ہوتے ہیں کہ وہ ان رقعوں کی تقسیم پر آمادہ ہی نہیں ہوتے۔ ہوتے بھی ہیں تو اس وقت جب تاریخ عقد بخیر و خوبی گذر جاتی ہے۔ کچھ ڈاکیے ان کا البم بھی تیار کرتے ہیں اور بہت نام کماتے ہیں۔ ان ڈاکیوں کے متعلق یہ تک مشہور ہے کہ اپنے افراد خاندان کے ساتھ بیٹھ کر پہلے وہ ان رقعوں کا مطالعہ اور بعد میں تنقیدی اور تقابلی مذاکرہ منعقد کرتے ہیں۔ ہر رقعے کی ماہیت اور مالیت کے بارے میں اسی نمونے کا پروگرام پیش کرتے ہیں جو ٹی وی پر تول مول کے بول کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اور جی چاہا تو یہ رقعے ان لوگوں کو پہنچا دیتے ہیں جنھیں یہ فکر تھی کہ ان کے عزیزوں میں شادی ہو رہی ہے اور ان کے نام رقعہ اب تک کیوں نہیں آیا۔ ان میں سے بعض تو اتنے بے چین ہو جاتے ہیں کہ شادی سے تعلق رکھنے والے گھر کے کسی فرد یا مرد کو فون کر کے پوچھتے ہیں کہ آیا ان کے پاس پروفیسر ڈامانی کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ جواب میں ان کے دل کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ جب صاحب خانہ تاکید کرتے ہیں کہ دیکھو ہمارے بیٹے کی شادی میں ضرور آنا۔ (ہم خود ترجموں کے بہانے کئی شادیوں

میں شرکت کر چکے ہیں)۔

کچھ رقعے جغرافیائی ہوتے ہیں۔ مہمانوں کی سہولت کی خاطر رقعوں کی پشت پر جانے واردات کا محل وقوع اس طرح بتایا جاتا ہے جیسے شہر بمبئی میں "بیسٹ" کی گائیڈ تیار کی جاتی ہے اور جوں ہی یہ گائیڈ فروخت ہوتی ہے بسوں کے نمبر اور سمتیں (راستے) تبدیل کر دیے جاتے ہیں۔ جانے واردات پر پہنچنے کے لیے مہمان اصل شادی خانے پر پہنچنے سے پہلے کئی دوسری شادیوں میں ہو آتے ہیں۔ (ہمارے یہاں شادیوں کا جب موسم آتا ہے تو وہ لوگ بھی شادی کر لیتے ہیں جنھیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی)۔ جن لوگوں نے دنیا دیکھی ہے ان کا کہنا ہے کہ اب سمجھ دار لوگ مکان تلاش کرتے ہیں تو اس فکر میں رہتے ہیں کہ شادی خانہ پڑوس میں ہو۔ (ایسی صورت میں کسی رقعے کی ضرورت پیش نہیں آتی)۔

ایک خبر یہ بھی گرم ہے کہ اب شادی کے مطالبات میں اس مطالبے کا بھی اضافہ کیا جانے والا ہے کہ رقعوں کی تقسیم کا کام بمعہ اخراجات طباعت وسفر، دولھن والوں کے ذمے ہوں گے۔ کون ہے جو اس افواہ پر یقین کرے گا۔ ہم نے بھی اسے لطیفہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

***

(سلسلہ ص ۴۵)

یہاں دیکھیے گگن پٹن کا بادشاہ خواب میں کسی درویش کو دیکھتا ہے۔ ابن نشاطی کا کمال فن ہے وہ درویش کی تصویر اس طرح پیش کرتا ہے کہ یہ کردار جاگتا اور متحرک معلوم ہوتا ہے۔ ان اشعار کی جاذبیت بھی لائق داد ہے۔ ملاحظہ ہو درویش:

سو دیکھا خواب میں درویش کوں ایک — دنیا کے عاقبت اندیش کوں ایک
ہے تن پر پیرہن اجلا چھبیلا — کمر باندیا ہے ایک باریک شیلا
بندیا ہے چھوڑ شملا سر پو دستار — عصا پکڑیا ہے یک رنگیں طرح دار
کہ ہے مکھ پر عبادت کا تجلی — لیا ہے ہات میں اپنے مصلی
اگرچہ لوہو ہوں اب آنگ خالی — دلے سجدے کی تھی اوس مکھ پو لالی
کھڑا ہے آکویں دربار انگے او — شہنشہ کے مبارک دار انگے او
کھڑے اچھتے ہیں جیوں ہر یک کوئی آ — رضا کی انتظاری سات گویا

ابن نشاطی کے یہ اشعار پڑھتے ہوئے جوش کی نظم "مولوی" کے کئی اشعار بلاشبہ شعیشۂ ذہن پر ابھر آتے ہیں۔ جوش بھی مولوی کی کردار نگاری میں بڑے کامیاب ہیں۔

ہر چند کہ مقالہ خاصا طویل ہو چکا ہے لیکن میں نے یہاں چند نمائندہ مثنویوں اور ان کے اہم کرداروں ہی پر روشنی ڈالی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایسی اور کئی مثنویاں ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ شیخ احمد گجراتی کی لیلیٰ مجنوں اور یوسف زلیخا، ہاشمی کی عشقیہ مثنوی، طبعی کی بہرام و گل اندام، فائز کی رضوان شاہ و روح افزا، امین کی بہرام و حسن بانو، عاجز کی ملکہ مصر، محمود بحری کی گلشن حسن و دل، جنیدی کی ماہ پیکر وغیرہ۔ ان میں سے کئی ایک میں کردار نگاری کی بھی اچھی جھلکیاں ملتی ہیں من حیث المجموع کہا جا سکتا ہے کہ دکنی شاعروں نے اپنی مثنویوں میں کردار نگاری کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ اس امر کا اظہار ہے کہ شاعری ان کے لیے صرف داخل اور رنج کا اظہار نہیں رہی، انھوں نے ماحول اور معاشرے پر بھی نظر رکھی، زندگی اور زمانے کا مطالعہ کیا۔ انسان کی فطرت اور مزاج کو جانا، اس کی نفسیاتی کیفیتوں کو سمجھا، افراد کے ذہن اور ان کے باطن کا ممکنہ حد تک ادراک کیا، سماجی رشتوں پر تجزیاتی نگاہ ڈالی، انسانی تعلقات اور ان کے عمل اور رد عمل کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھا۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی مثنویوں میں کردار نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں اور ایسے کہ کردار نگاری جدید اصولوں کی روشنی میں بھی ان کا اعتبار باقی ہے۔

(یہ مقالہ نومبر ۱۹۹۲ء جامعہ عثمانیہ میں منعقدہ دکنی مثنوی پر سیمینار کے لیے لکھا گیا تھا)

شبنم شکیل

وہ دو گھنٹے

بڑے بڑے زرد پھولوں والی سفید جارجٹ کی باریک ساری سے ان کا گورا گداز بدن جھلک رہا تھا۔ ان کے سرخی مائل براؤن بال ایک ڈھیلے سے جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھی وہ بہت تن دہی سے میک اپ میں مصروف تھیں۔ ان کی پیٹھ میری طرف تھی اور میں ان کا باقی سراپا آئینے میں سے دیکھ سکتی تھی۔ اس عمر میں آکر ان کا جسم کچھ کچھ فربہی کی طرف مائل ہو گیا تھا، مگر اب بھی وہ نسوانیت سے بھرپور ایک انتہائی دل کش عورت نظر آتی تھیں۔ میں انھیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، وہ لپسٹک لگانے کے لیے آگے جھکیں تو آئینے میں سے جھانکا۔ میری محویت دیکھ کر مسکرائیں اور اپنی خاص ادا سے نچلا ہونٹ ذرا سا دانتوں میں دبایا اور جب انھوں نے بالوں کو خفیف سا جھٹکا دیا تو ان کے سفید ہموار دانت اور ناک میں لگی ہوئی ہیرے کی کیل ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ایک ساتھ جھلملائے۔

"وہ بیچارا فوٹو گرافر ایک گھنٹے سے باہر سوکھ رہا ہے تصویریں بنانے تو میری بھی جان چھوٹے اور اس کی بھی" انھوں نے بالوں میں مسکارے کا آخری ٹچ دیتے ہوئے کہا۔

ان کی آواز ذرا سی Husky تھی اور کچھ جادو بھری قسم کے عشق پیشہ مردوں کا خیال تھا کہ ان کی آواز میں بھی بہت سیکس اپیل ہے۔

"تم اپنی کافی ختم کرو میں ابھی آئی پانچ منٹ میں۔" وہ اسٹول سے اٹھیں۔

"انٹرویو ہو گیا آپ کا۔" میں نے پوچھا۔ "دو بیچارے الٹے سیدھے جواب دے دیے ہیں۔ جان کو آ گیا تھا ایڈیٹر۔ مجھے یہ سب پسند ہی نہیں۔ جو کچھ لکھو کچھ دیتے ہیں یہ لوگ۔ مفت کی کہانیاں بنواؤ۔ لینا ایک نہ دینا دو۔"

وہ کمرے سے باہر جانے کے لیے میرے قریب سے گذریں تو Poison سینٹ کا ایک خوش گوار جھونکا مجھے چھو کر گذر گیا۔

میں وقت گزاری کے لیے ان کا البم اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ان کی زیادہ تر تصاویر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اتری ہوئی تھیں۔ کچھ میوزیکل کانسرٹس کی تھیں۔ کچھ تصاویر میں وہ اپنی بیٹیوں کی ہمراہ تھیں اور بہت خوش و خرم نظر آتی تھیں۔ البم کے آخری حصے میں کسی بہت ہی پرانے گھر میں کھینچی ہوئی ان کی کچھ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں بھی تھیں۔ یہ سب ان کی نوجوانی کی تھیں۔ ان میں سے ایک پر جیسے میری آنکھیں تھم کر رہ گئیں۔ اس میں وہ مہندی لگائے باقاعدہ دلھن بنی بیٹھی تھیں۔

بمشکل انیس بیس برس کی رہی ہوں گی شاید اس وقت۔ بلا کا حسن اور معصومیت تھی ان کے چہرے پر۔ میں خدا جانے کتنی دیر اس تصویر میں کھوئی رہی۔ معصوم صورت شکل میں ذرا سی بیگم کی کوئی بیٹی ان پر نہیں پڑی۔ میں نے دل ہی دل میں افسوس کیا۔ سب اپنے والد پر چلی گئیں۔

وہ واقعی بہت جلد واپس آ گئیں۔ چلو بھئی جلدی اب میں اور میری ساری کہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ انھوں نے ... کی طرف دیکھا۔ بہت شکریہ ... میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔

وہ پوچھ کیا پوچھنا ہے ... میں ... کسی ... کے ... میں بولیں۔

"ایک چیز کی مجھے بہت کھوج ہے۔ جس پر آپ سے ہمیشہ بات کرنا چاہتی رہی لیکن آپ کی ناراضگی کے ڈر سے" میں نے بات شروع کی۔

"ایک منٹ ٹھہرو" انھوں نے چہرے پر فکر مندی کا تاثر لاتے ہوئے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"تم نے میرے انکم ٹیکس والے کام کا کیا کیا؟ یہ نہ ہو کہ فردوس کی طرح میری کوٹھی بھی نیلام........ جب تک اس طرف سے اطمینان نہ ہو، ذہن کسی اور طرف جانے کا نہیں۔"

بزنس کے سارے گُر جانتی تھیں۔

"آپ کی اپیل ٹریبونل میں منظور ہو گئی۔" میں نے انکم ٹیکس والوں کی مہر لگا خاکی لفافہ پرس میں سے نکال کر انھیں دیا۔ "کمشنر انکم ٹیکس سے بھی بات ہو گئی۔"

"پہلے کیوں نہیں بتایا" وہ چہکیں۔

"خیال نہیں رہا۔" میں نے جواب دیا۔

"بی بی اب تم خود انصاف کرو" انھوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ "ثناءاللہ صاحب۔ خدا انھیں جنت نصیب کرے۔ ان کے انتقال کے بعد میں کیسے گزارا کر رہی ہوں۔ لیکن یہ انکم ٹیکس والے میری جان نہیں چھوڑتے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے پرانے کھاتے نکال کر تنگ کر رہے ہیں۔ "اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ تم کیا پوچھ رہی تھیں۔"

ثناءاللہ صاحب کے نام کے ساتھ میری آنکھوں میں ان کی دلہن والی تصویر گھومی اور........ اور سوچے ہوئے سب سوالوں کی ترتیب ذہن میں گڈمڈ ہو گئی۔

"زرینہ باجی یہ بتائیں۔ ثناءاللہ صاحب سے آپ کا نکاح کیوں نہ ہو سکا؟"

"کیسے نہیں ہوا نکاح۔" انھوں نے حیرت اور خفگی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"چار گواہ تو ابھی لاہور میں موجود ہیں اس کے۔"

"دیکھیں آپ نے کل مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ساری باتیں سچی کریں گی۔ ریڈیو والے قمر صاحب مجھے بتا چکے ہیں۔"

"کیا بکواس کی ہے اس کمینے قمر نے"........ انھوں نے میری بات کاٹی۔

"یہ کہ آپ کا نکاح نامہ جعلی تھا۔ ثناءاللہ صاحب کی بیگم نے اسے عدالت میں چیلنج کر دیا تھا۔"

"وہ سب سازش تھی میرے خلاف" انھوں نے بہت وثوق سے کہا۔ "سیدھے سبھاؤ کون دینا چاہتا ہے جائداد میں سے حصہ۔ قمر بے وقوف کو کیا پتہ۔ تم کبھی ادریس چودھری سے بات کر کے دیکھنا۔ وہ جانتا ہے اصل کہانی۔ ایک گواہ وہ بھی تھا میرے نکاح کا........ بڑا پیارا انسان ہے بہت عزت کرتا ہے میری"

"ادریس صاحب تو اکثر آتے رہتے ہیں ہمارے ہاں"........ میں نے آہستہ سے کہا۔ "ایک مرتبہ آپ کا ذکر آیا تو بہت افسوس کرنے لگے۔ کہہ رہے تھے کہ اگر ثناءاللہ ایک ماہ اور زندہ رہتا تو زرینہ بیگم اس کی قانونی بیوی بنتیں اور کروڑپتی بھی"

زرینہ بیگم کے چہرے پر ایک سایہ سا آیا اور گزر گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ان کی آنکھوں میں نمی کی ایک جھلک بھی دیکھی۔ مجھے اپنے کمینے پن پر شرمندگی تو ہوئی، لیکن میں آج جھوٹ سننے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی........ "میں آپ کا دل دکھانا نہیں چاہتی۔" میں۔

وضاحت دینا چاہی" ۔ میرا تو بس ایک اکیڈمک انٹرسٹ ہے اس قصے میں...... میرا مطلب ہے...... میں آپ کی بڑی عزت کرتی ہوں اور
"........

وہ تھوڑی دیر چپ رہیں ۔ پھر ہلکا سا کھنکھار کر گلا صاف کیا، اور بہت نارمل آواز میں بولیں...... ٹھیک کہتا ہے ادریس چودھری
...... بس ہونے ہی والا تھا نکاح...... ۲۶/ ستمبر کو ثناء اللہ صاحب فوت ہوئے، ۱۸/ اکتوبر کو میرا بیٹا پیدا ہوا...... بد قسمت ۔"
انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "جب میرے پیٹ میں تھا تب ہی کسی نے تعویذ کر دیے تھے مجھ پر......... میرے تمھارے جیسا دماغ ہے ہی نہیں...... بس اللہ والا ہے...... "میری بہن نے بڑی مشکل سے پالا ہے اسے"
وہ پھر ٹریک سے اتریں ۔

"آپ بتا رہی تھیں نکاح ہونے والا تھا آپ کا" میں نے پوچھا ۔

"شرط رکھی تھی ثناء اللہ صاحب نے...... کہ اگر اس مرتبہ لڑکا ہوا تو نکاح کر لوں گا...... بہت شوق تھا بیٹے کا انھیں..... بڑی حسرت تھی ۔ بیگم سے بھی بیٹیاں ہی ہوئیں نا ۔"
"لیکن بی بی، ادریس تمھیں میری کہانی سناتے ہوئے اپنی حرمزدگی چھپا گیا" زرینہ بیگم کے لہجے میں اب طنز تھا ۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ جعلی نکاح نامے والی پٹی مجھے پڑھائی کس نے تھی ۔"

مجھ سے کہا تھا...... "بھابی ثناء اللہ تو تمھیں بے یار و مددگار چھوڑ کر مر گیا ۔ لیکن میں تمھیں تمھارا حق دلواؤں گا ۔ بس ایک نکاح نامہ تیار کروالو"

"صفورہ اور سعدیہ بھی تو ان کی بیٹیاں تھیں" ان کا کوئی خیال نہیں کیا ۔ میں نے پوچھا ۔

"بیٹے کی بات اور ہوتی ہے"...... "ارے ہاں"...... انھیں جیسے اچانک خیال آیا ۔ صفورہ آئی ہوئی ہے ۔ [illegible] رے پاس......
دوسرا بیٹا ہوا ہے اس کے..... لندن میں ہوتی ہے نادہ"

وہ فخر سے بولیں...... بہت یاد کرتی ہے تمھیں...... ملوگی؟ وہ میرا جواب سنے بغیر باہر نکلیں ۔

ایک حوالے سے ان کی تینوں بیٹیاں کسی زمانے میں میری شاگرد رہ چکی تھیں ۔ وہ یوں کہ میں جس کالج میں پڑھا رہی تھی ۔ اسی سے ملحقہ اسکول میں وہ تینوں زیر تعلیم تھیں اور کالج کے ضوابط کے مطابق اسکول کی دو کلاسز لینا بھی میرے فرائض میں شامل تھا ۔ میری حاضری ۔ رجسٹر میں تینوں کا SIRNAME فقیر محمد درج تھا ۔ یوں سارے اسٹاف کو معلوم تھا کہ صفورہ اور سعدیہ ایک بڑے زمین دار [illegible] اللہ کی بیٹیاں ہیں اور بڑی والی رابعہ "نثار بھینگے" کی ۔ نثار صاحب کسی معروف شپنگ کمپنی کے مالک تھے...... اور ظاہر ہے کہ بھینگے [illegible] تھے ۔ زیادہ تر ملک سے باہر رہتے تھے ۔

کالج میں زرینہ بیگم سے ان کے اسکینڈلز کی وضاحت طلب کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی ۔ بلکہ الٹا بہت سی ٹیچرز ان کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں ۔ سنتے تھے کہ ان کی بہت پہنچ ہے اور وہ ہر کام چٹکیوں میں کروا سکتی ہیں ۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ ان کے عروج کا زمانہ تھا ۔ دولت، شہرت اور مقبولیت ان کے قدموں میں بچھی ہوئی تھیں ۔ چھٹی کے وقت وہ خود کار ڈرائیو کرتے ہوئے اپنی بیٹیوں کو لینے آیا کرتی تھیں اور جب وہ اپنی شاندار خوش لباسی سمیت ... سے قدم نیچے اتارتی تھیں تو چلتی گاڑیوں کا پورا قافلہ انھیں ایک نظر دیکھنے کے لیے رک جاتا تھا ۔ ان کے بہت سے گمبھیر قصے بھی مشہور تھے ۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ جب وہ ریڈیو اسٹیشن آنے کے لیے گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھتی

تھیں تو اسی لمحے اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں پرچہ لگ جاتا ہے۔ یہ بھی سنتے تھے کہ فلاں فلاں بیگم ان کے حسن سے اس قدر خوف زدہ ہیں کہ اپنے شوہر کے سامنے ان کا نام لینے سے بھی ہد کتی ہیں مگر ساری بالا دھنے کا اسٹائل زرینہ بیگم ہی کا کاپی کرتی ہیں۔ تب ہمیں وہ چھوٹے چھوٹے دنیاوی مسائل سے بے نیاز کوئی آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں اور ان کے اردگرد اسکینڈلز کا یہ ہالہ انھیں اور بھی زیادہ پرکشش بنانے میں مددگار ہوا لگتا تھا۔ ثناء اللہ صاحب کی دو "حقیقی" بیٹیاں بھی اسی اسکول میں پڑھتی تھیں اور چاروں بہنوں کی شکل وصورت میں انتہا درجے کی مشابہت تھی، مگر یہ بات نوٹ کرنے والے بھی دم سادھے رہتے تھے۔ زرینہ بیگم کو بھی اپنی قدر وقیمت اور اپنے بااختیار ہونے کا خوب اندازہ تھا۔ چناں چہ جب وہ اپنی کسی بیٹی کی سال گرہ پر پورے اسٹاف کو مدعو کرتیں تو انوی ٹیشن کارڈ پر بڑے دھڑلے سے اپنے آپ کو مسز زرینہ بیگم لکھتیں...... اور لوگ بہت فخریہ انداز سے یہ کارڈ دوسروں کو دکھایا کرتے؛ کیوں کہ مسز زرینہ بیگم کے بچوں کی سال گرہ پر شہر کے بہت سے وزیر، امیر بھی مدعو ہوتے تھے لیکن اب عمر ڈھلنے کے ساتھ ان کے حسن کے آفتاب کو گہن لگتا جا رہا تھا اور اس کے نتیجے میں ان کی شہرت کا گراف بھی بہت نیچے آگیا تھا۔ ان کی آواز اب بھی خوب صورت تھی لیکن پاپ سنگرز کی مقبولیت کی وجہ سے ان کی کلاسیکی گائیکی پس منظر میں جاتی معلوم ہو رہی تھی۔

"صنوبرہ بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔" انھوں نے واپس آکر اطلاع دی۔ "دانت نکال رہا ہے۔"

"چلیں واپس آئے تو ملوا دیجیے گا۔ رابعہ کہاں ہے آج کل؟" میں نے پوچھا۔

"کینڈا میں...... اس کا باپ بھی وہیں ہے۔ بڑی اچھی جگہ شادی کی ہے، باپ نے اس کی...... ایک فلیٹ بھی دیا ہے جہیز میں" ...... زرینہ بیگم نے بہت خوش ہو کر کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے نثار بھینا" ...... میں نے شرمندہ ہو کر اپنی زبان روکی۔

وہ کھلکھلا کر ہنسیں...... "رک کیوں گئیں" ...... انھوں نے شرارت سے کہا...... "بھینگے کو بھینگا ہی کہا جاتا ہے۔"

"نثار سے بھی شادی وادی نہیں ہوئی میری، بس پیار محبت تھا۔"

"یہی پوچھنا چاہ رہی تھیں نا تم" ...... "ویسے انھوں نے رابعہ کا خیال بہت رکھا سگی بیٹیوں کی طرح...... نیک آدمی ہیں۔ بہت بوڑھے ہو گئے اب تو...... سفر بھی نہیں کر سکتے۔ عرصے سے پاکستان نہیں آئے۔ رابعہ کے خطوں سے خیر خیریت معلوم ہو جاتی ہے ان کی......"

"اس لحاظ سے صنوبرہ اور سعدیہ" پیچھے رہ گئیں بیچاری" ...... میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا...... "باپ کی جائداد میں سے کچھ نہیں ملا۔"

"بس یہ کوٹھی اپنی زندگی میں میرے نام لگا دی تھی" ...... وہ بولیں۔

"میں نے سنا ہے ثناء اللہ کی بیگم بہت بڑی جائداد کی مالک ہیں" میں نے سوال کیا۔

"ہاں اور کتنے ہی چھوٹے دل والی" ...... انھوں نے طنز میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بدلحاظ اور بے رحم بھی ایسی کہ کیا بتاؤں" ......

یہ بات بھی ذرا سنو بی بی...... سننے والی ہے...... میں ثناء اللہ صاحب کے انتقال پر افسوس کرنے گئی...... سوچا میرے بچوں کے باپ تھے...... آخری دفعہ منہ دیکھ لوں...... میت کے قریب نہیں پھٹکنے دیا مجھے اس نے...... نوکرانیوں سے کہا...... "نکالو اسے باہر" ...... وہاں بیٹھی ہوئی عورتوں سے کہنے لگی...... "ذرا اس کی بے حیائی ملاحظہ فرمایئے ڈوب نہیں مرتی شرم سے......"

"کیا بتاؤں کیا گزری ہے میرے دل پر اس وقت" ...... "ایسی ذلت کبھی زندگی میں نہیں اٹھائی تھی...... روتی دھوتی الٹے پاؤں باہر نکل آئی"...... زرینہ بیگم نے آنسوؤں کے ساتھ بہتا ہوا سکارا ٹشو پیپر سے صاف کیا۔

"اب تو وہ مر ہی گئے تھے۔ یہ جلن حسد ختم ہونا چاہیے تھا۔ آپ کو ڈھنگ سے بیٹھنے دیتی"...... میں نے انھیں پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

"جلن حسد کچھ نہیں تھا۔ بس اسے ڈر تھا کہ میں کسی چیز پر اپنا حق نہ جمالوں"۔ انھوں نے حقارت سے کہا۔

آنسو بہاتی ہوئی زرینہ بیگم کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آئی۔ "برا ہے پنجابی بی۔" انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا..... "اس معاملے میں پنجاب کی عورت سب سے زیادہ چھوٹے دل کی ہے۔"

"میرا تو سندھیوں، پٹھانوں، بلوچوں سے واسطہ رہا۔ ایسے بڑے دل والی ہوتی ہیں ان کی بیویاں.... تم تو خود بلوچستان میں رہ چکی ہو وہاں نواب صاحب کے بیٹے کی بسم اللہ والی تقریب میں دیکھا تھی۔ کیسی عزت دی تھا ان کی بیگم نے مجھے۔

"جی بہت عزت کی تھی آپ کی...... "میں نے جواب دیا۔

"تین بیویاں اور تین رکھیل تھیں نواب صاحب کی..... سب کی سب تقریب میں موجود تھیں..... یہ ہوتا ہے حوصلہ....." انھوں نے فخر سے کہا۔

"بڑی بیگم صوفے پر بیٹھی تھیں مجھے اپنے ساتھ بٹھایا۔ باقی سب نیچے قالین پر...... برابر نہیں بیٹھ سکتیں وہ لوگ بڑی بیگم کے.... ایک تو پندرہ سولہ برس کی لڑکی تھی بڑی پیاری صورت کی..... نواب صاحب کی رکھیل..... میرے ساتھ بہت باتیں کرتی رہی، بتا رہی تھی ...... "بڑی بیگم بہت اچھا سلوک کرتی ہیں سب کے ساتھ...... نواب صاحب تو سیاست بازی کی چکر میں کئی دفعہ اندر ہو جاتے ہیں، مگر ان کی عدم موجودگی میں، ہم سب کا خرچ اٹھاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میرے گھر کھانا پکے یا نہ پکے۔ تم لوگوں کا چولہا ٹھنڈا رہا تو سارے علاقے میں ناک کٹ جائے گی نواب صاحب کی۔"

زرینہ بیگم نے داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

اچھا یہ بتایئے وہ جو آپ کے البم میں تصویر ہے جس میں آپ دلہن بنی ہوئی ہیں وہ کس موقع کی ہے۔ میں نے انھیں اصل قصے کی جانب لانے کے لیے پوچھا۔

میرے اس سوال نے جیسے ان کے چہرے کا سارا اعتماد سلب کر لیا۔ وہ بہت تھکی، بہت کمزور آواز میں بولیں..... "اس قصے کو جانے دو۔ ہول آتا ہے اسے یاد کرتے ہوئے...... میں تو یہ بات اپنے دل سے بھی نہیں کیا کرتی...... چلو آج یہ بھی......"

"جانے دیجیے"...... میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

"میرا باپ مجھے اس پیشے میں لانا نہیں چاہتا تھا"...... زرینہ بیگم نے تھوڑی دیر فضا میں دیکھتے ہوئے، جیسے اپنے آپ کو مخاطب کیا ....، سب سے چھوٹی تھی اور بڑی لاڈلی تھی اپنے باپ کی میں...... یقین کرو سترہ اٹھارہ برس کی ہو گئی تھی لیکن خالص گھی کی پوری بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلایا کرتا تھا مجھے...... گھر کا کوئی کام کاج بھی نہیں کرنے دیتا تھا...... بڑے ناز نخرے اٹھاتا۔ میری دو بڑی بہنیں گاتی تھیں۔ جب کوئی ان کا گانا سننے آتا تو میرا باپ مجھے پچھلی کوٹھڑی میں چھپا دیتا تھا۔ تب ہم سرگودھے کے ایک چک میں رہا کرتے تھے مجھے اپنا چک اب بھی بہت یاد آتا ہے۔ زرینہ بیگم نے ایک بچے کی سی معصومیت کے ساتھ کہا۔ مگر وہ پھر فوراً ہی دوبارہ سنجیدہ ہو گئیں..... "سرگودھے کا ایک نوجوان

زمین دار عمر حیات میری بہنوں کا گانا سننے آیا کرتا تھا۔ پتہ نہیں اس نے کیسے مجھے ایک دن دیکھ لیا۔ فریفتہ ہو گیا۔ "میں تو شادی کروں گا اس کے ساتھ"..... رٹ لگا دی۔ میرے باپ نے اسے آزمانے کے لیے کہا..... "پانچ مربع زمین میری بیٹی کے نام لگاؤ"..... عمر حیات اس پر بھی تیار ہو گیا۔ میرے باپ نے سوچا..... "میری بیٹی بیگم بنے گی..... عزت کی روٹی کھائے گی"..... ہاں کر دی..... "عمر حیات نکاح کر کے مجھے اپنی زمینوں پر لے گیا وہاں اس کی حویلی تھی۔ وہاں پہنچنے کے تیسرے دن مجھ سے کہا..... "اب تمھارا اپنے گھر والوں سے ملنا جلنا ختم..... نہ تم جاؤ گی نہ وہ لوگ آئیں۔ خط لکھ دو اپنے باپ کو"..... میں بچی تھی۔ ڈر کے لکھ دیا خط..... میرے گھر والے بھی صبر شکر کر کے بیٹھ گئے۔ میرا بھلا چاہتے تھے وہ......"

"آپ کو گھر والے یاد تو آتے ہوں گے"..... میں نے پوچھا۔

"باپ بہت یاد آتا تھا۔ چھپ چھپ کر رویا کرتی۔ پھر میرے ہاں بچہ ہونے والا ہو گیا تو ذرا دھیان بٹ گیا"..... میرا بیٹا چھے دن کا تھا تو میرے باپ کو کسی نے اطلاع دی۔ وہ بیچارا محبت سے مجبور ہو کر نواسے کو دیکھنے آگیا۔ مجھے ملازمہ نے اندر آکر بتایا۔ میں بچے کو اٹھا کر ننگے پاؤں دوڑی باہر مردان خانے کی طرف..... سامنے سے عمر حیات آرہا تھا۔ میرے ہاتھ سے بچہ چھین لیا۔ بولا..... "اس کی دونوں ٹانگیں چیر دوں گا اگر باپ کی شکل دیکھی تو"..... میں روتی پیٹتی واپس آگئی۔ میرے باپ کو بھی اس جھگڑے کی سن گن مل گئی تھی۔ وہ باہر سے باہر ہی چلا گیا۔

"پھر....." میں نے پوچھا۔

"میرا بیٹا ساڑھے چار ماہ کا ہو کر مر گیا۔ اس کے دل میں سوراخ تھا پیدائشی..... ڈاکٹر کہتے تھے ذرا بڑا ہو گا تو آپریشن کریں گے۔ اس کی نوبت ہی نہیں آئی"

زرینہ بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"پھر کیا ہوا.....؟"

"میرے بچے کے قُل تھے۔ بہت عورتیں گھر میں آجا رہی تھیں۔ میں نے چپکے سے ایک کا برقعہ اٹھا کر پہنا اور بھاگی لاریوں کے اڈے کی طرف..... وہاں بولائی ہوئی پھر رہی تھی کہ سامنے نثار صاحب اپنی گاڑی میں آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں انھیں پہچانتی تھی۔ میری بہنوں سے ملنے آیا کرتے تھے۔ میں نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ سارا قصہ سنایا۔ وہ مجھے بٹھا کر گھر لے آئے میرے....."

"نثار صاحب نے تو اس دن پہلی دفعہ آپ کو دیکھا ہو گا.....؟" میں پوچھا۔

"ہاں پہلی دفعہ دیکھا....." زرینہ بیگم نے جواب دیا..... "اور پھر اگلے دو چار سال دیکھتے ہی رہے..... سارے گھر والوں کا خرچ اٹھایا۔ مجھے گانا سیکھنے کے لیے استاد رکھ کر دیا۔ پر مجھے باقاعدہ رکھا نہیں۔ ان کا کاروبار باہر تھا۔ بعد میں تو بالکل ہی باہر کے ہو کے رہ گئے۔ پر رابعہ کو کبھی نہیں بھولے..... ثناء اللہ صاحب سے بھی انھوں نے ہی مجھے ملوایا تھا، جب کینڈا جانے والے تھے..... نیک آدمی تھے اللہ بخشے نثار صاحب....."

"عمر حیات کا کیا ہوا.....؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی پانچ مربعے زمین واپس کر دی اور طلاق لے لی اس سے....."

"زرینہ جی آپ کو کبھی محبت بھی ہوئی کسی سے"..... "سچی محبت"

"محبت کا تو پتہ نہیں"...... انھوں نے ذرا سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "پر مجھے ثناء اللہ صاحب اچھے بہت لگتے تھے۔ بالکل میرے باپ کی طرح میرے نخرے اٹھاتے تھے...... مجھے سوسائٹی میں عزت، مقام سب انھوں نے دلوایا...... لاہور میں کوٹھی لے کر دی...... نوکر چاکر...... گاڑی روپیہ پیسہ...... ہر طرح سے سلوک کیا۔ ریڈیو والوں سے بھی انھوں نے ہی ملوایا۔ وہ میری گائیکی کے سچے مداح تھے۔ میں تو انھیں پاکر اپنے سارے دکھ بھول گئی تھی۔ پر اللہ نے انھیں مجھ سے چھین لیا۔ ان کے بعد تو ایسے ایسے کمینے مردوں سے واسطہ پڑا کہ میں نے عہد کر لیا کہ اپنی بیٹیوں کو کبھی گانے کی طرف نہیں لاؤں گی۔ حالاں کہ تینوں کی آوازیں میری طرح ہیں...... بس اچھے شریف لڑکے دیکھ کر جلدی جلدی تینوں کی شادیاں کر دیں۔"

"ہاں مجھے یاد ہے کہ آپ تو اپنی بچیوں کو اسکول کی کسی تقریب میں بھی گانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں" میں نے کہا۔

"بس اب بھی دعا ہے کہ اللہ انھیں دنیا کے ہاتھوں سے محفوظ رکھے"...... زرینہ بیگم نے دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں بلند کیے۔ "میں خود بھی ان چیزوں سے الگ تھلگ ہو گئی ہوں۔ بس کھانا دانا رکھا ہوا ہے۔ عمر بھی ڈھل رہی ہے۔" انھوں نے بہت MATTER OF FACT انداز میں کہا۔

"آخری آدمی کون تھا آپ کی زندگی میں...... " میں نے پوچھا۔

"کراچی کا ایک سیٹھ تھا...... بہت کمینہ...... اسی کی وجہ سے دل اچاٹ ہو گیا ہر بات سے...... "

"کیا کمینہ پن کیا تھا اس نے...... "

"بی بی اس نے مجھے تیس ہزار ماہوار پر رکھا۔ پہلی تاریخ کو جب میں نے پیسے مانگے تو پندرہ ہزار نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیے۔ میں نے کہا...... "سیٹھ صاحب باقی رقم...... "بولا "سات دن تو تمھاری طرف سے نکل گئے۔ ایک ہفتہ میں خود نہ آسکا۔ وہ پیسے کاٹ لیے میں نے...... "

"تاؤ آگیا مجھے...... کھڑے کھڑے نکال دیا اسے...... بس اس دن سے تو یہی دعا مانگتی رہتی ہوں کہ اللہ میری بچیوں کو ایسے حالات میں کبھی نہ ڈالے۔ عزت کے ساتھ بیٹھی رہیں اپنے گھروں میں...... "

"خدا نے آپ کی سن بھی لی ہے...... ماشاء اللہ تینوں اپنے گھروں میں خوش ہیں...... آپ کے دکھوں کی تلافی تو یوں ہو گئی...... " میں نے محبت سے کہا۔

"بہت خوش ہیں...... اللہ سب کی بیٹیوں کے نصیب ایسے کرے...... یورپ اور امریکہ کی سیریں...... "

ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ دھڑ سے دروازہ کھلا اور صنورہ تنتناتی ہوئی اندر داخل ہوئی "آج بھی نہیں نکلوائے آپ نے پیسے" وہ پوری طاقت سے چیخی بینک کا ٹائم گزار دیا نا۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھے ماں سے مخاطب تھی۔ اس نے مجھے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

"صنورہ اپنے کمرے میں جاؤ" پھر زرینہ بیگم نے بڑے تحمل سے کہا۔ "میں وہاں آکر بات کرتی ہوں۔"

"سات دن سے اپنے کمرے ہی میں ہوں۔ وہ پھر چیخی۔ ڈھائی لاکھ دیتے ہوئے بھی جان نکل رہی ہے آپ کی۔ ابھی پھر کال آئی ہے ظفر کی لندن سے۔ وہ کار کا سودا کر چکا ہے۔ آپ نے تو ڈھٹائی کی حد...... "اس نے میری طرف دیکھ کر زبان روکی۔

میں باہر جانے کے لیے اٹھی۔

"بیٹھ جاؤ بی بی...... " زرینہ بیگم نے حکم دیا۔

میں فوراً جھینپ گئی۔ مجھے ان کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر ڈر لگا۔ وہ اچانک بہت کمزور، بہت شکست خوردہ بہت بوڑھی نظر آرہی تھیں۔

"اسے سمجھاؤ، تمھاری تو شاگرد ہے۔" وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔ "بلیک میل کر رہا ہے اس کا خاوند اس کو بھی اور مجھے بھی۔ یہ احمق ان کی باتوں میں آجاتی ہے آخر کب تک"......

"تو میں بھی اجڑ کر گھر واپس آجاؤں سعدیہ کی طرح....." صفورہ نے چیختے ہوئے ماں کی بات کاٹی۔

"لعنت ہے ایسے جینے پر، روز ایک نیا مطالبہ۔" انھوں نے ساری کے پلو سے آنسو پونچھ کر اپنا پرس کھولا۔

مجھے یقین ہے کہ ایک آدھ آنسو اس چیک پر بھی ضرور گرا تھا جس پر انھوں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کیے۔

یم۔ٹی۔واسودیون نائر
انگریزی سے ترجمہ: قدیر زماں

پناہ گاہ کی تلاش

(ملیالم کہانی)

گھر کی تلاش میں ایک اور سفر۔
ایک اور بار ندی کا سامنا۔

ندی کے موڑ پر جہاں سے وہ گاؤں کی طرف مڑتی تھی ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ جو بات یادداشت میں نقش ہے وہ تو تارکول کے خالی پیپے ہیں جو ایک کھلے صحن میں پڑے ہیں اور ان کے چاروں طرف گھاس اگ آئی ہے۔ پس منظر میں کیسو کے درختوں پر کھلے ہوئے گھنے سرخ پھولوں پر سے گذرتا ہوا غروب آفتاب کا سنہرا عکس مشرقی صحن کے کناروں کو چھوتا ہوا۔ بہت دنوں کی بات ہے۔

ذرا فاصلے سے اس نے دیکھا تو شام کے جھٹ پٹے میں کیسو کے وہ سرخ پھول دکھائی نہیں دیے۔ وہ صرف ندی کے اس حصے کو دیکھ سکتا تھا جہاں پر راستے ملتے تھے۔ سال کا یہ کون سا مہینہ ہوگا۔ ملیالم کیلنڈر کے دن اور مہینے ماضی کی داستان بن گئے تھے۔ ندی کے بیچوں بیچ پانی تھا۔ گھاٹ پر کی کشتی دوسرے کنارے کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس نے پہلے ندی میں دور دور تک سوکھی ریت ہی دیکھی تھی۔

قدیم تباہ شدہ مندر کے ملبے پر جگہ جگہ کائی جم گئی تھی۔

ان چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کا نام کیا ہے جن میں کانٹے بھی اگتے ہیں اور ہلکے گلابی رنگ کے پھول بھی کھلتے ہیں۔ یہ پھول کانوں میں جھومر کی طرح لٹکتے نظر آتے ہیں۔ پہلے وہ ان کے نام سے واقف تھا۔ یہ جھاڑیاں، کھیتوں کے اطراف باڑ کا کام کرتی ہیں۔ اپنے جسم کو ان کے کانٹوں سے بچاتے ہوئے وہ اکثر ان میں سے گذرا تھا۔ کئی بار وہ ان میں سے گھس کر نکلا تھا۔ میری جھاڑیاں، میرے پودے، میرے ماہ و سال، میری فصلیں!

ندی کنارے سے لگے ہوئے راستے پر وہ چلنے لگا۔ ایک سرکاری جیپ کار اس کے پاس سے گذری۔ سرخ مٹی کی زمین پر اب تارکول بچھا تھا۔ جیپ کار کے گذرنے سے دھول نہیں اڑی۔ مسافروں سے کھچاکھچ بھری ہوئی ایک بس اس سے آگے بڑھی اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔

کیا وہ اپنا راستہ بھول گیا ہے؟ برگد کا وہ قدیم درخت اب وہاں نہیں تھا۔ پتھر کی وہ اونچی بینچ جس پر لوگ بیٹھا کرتے تھے وہ بھی وہاں نہیں تھی۔ وہاں پر وہ بھیڑیں بھی نہیں تھیں جو شام کے جھٹ پٹے اندھیرے میں کھیتوں سے باہر نکلنے سے جھجکتی تھیں۔

لوگوں کا ایک جمگھٹا تھا جو کشتی کو گھاٹ کے دوسرے کنارے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اسی میں سے ایک شخص نکل کر اس کے قریب آیا اور پوچھا۔ "کیا انیتا جا چکی ہے۔"؟

وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا جواب دے۔ انیتا کون تھی؟
وہاں کے۔بی۔ٹی (K.B.T.) کا انتظام نہیں تھا۔ اسی لیے کسی نے کہا کہ انیتا ذرا پہلے ہی آئے گی۔
اسے یہ جاننے کے لیے کچھ وقت لگا کہ اس سے کسی بس کے بارے میں پوچھا جارہا ہے۔
میں نہیں جانتا
وہ مزید چند غیر معروف چہروں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ندی کے دوسرے موڑ پر چھوٹے بازار تک پہنچ گیا۔ تب ہی اسے افق کے مشرقی جانب سے کچھ مبہم سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ ایک بند دکان کے پاس کھڑا ہوگیا اور سننے لگا۔ گھنے بادل آسمان پر چھانے لگے تھے۔ اس نے بادل کے گرجنے کی آواز سنی۔
کیا ورشی کم کارتی کے بیچ ہی مانسون کا آغاز ہونے والا ہے؟ مشرق کی طرف آسمان کو دیکھتے ہوئے کسی بوڑھے نے پوچھا۔ وہ شاید قدرت کے نظارے میں محو اپنے آپ سے سوال کررہا تھا۔ کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ نہ ہی وہ بوڑھا کسی کے جواب کا منتظر تھا۔
اس تنگ راستے پر اندھیرا چھا گیا۔ کہیں کہیں لیمپ کے کھمبے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی نے لیمپ روشن کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ چھپر کی بعض دکانوں کے اندر سے ہلکی زرد روشنی جھلملا رہی تھی۔
وہ ایک بند دکان کے چبوترے پر چڑھ گیا اور اس کے لکڑی کے دروازے کی طرف جھک کر کھڑا ہوگیا۔ لوگ اس کی طرف دھیان دیے بغیر اطراف کی دکانوں میں آجا رہے تھے۔
اس نے چلتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سڑک کہاں جاکر ختم ہوگی؟ مجھے کوئی بتائے کہ یہ سڑک کہاں تک جاتی ہے؟
ایک زمانے میں، میں واقف تھا۔ اب نہیں۔ راستے کا نقشہ بدل گیا ہے۔ ندی کا نقشہ بدل گیا ہے۔ لوگوں کے چہرے بدل گئے ہیں۔
تین یا چار آدمی جو اندھیرے میں وہاں سے گذرے تھے رک گئے اور پلٹ کر دیکھنے لگے۔ تھوڑے سے تکلف کے بعد وہ اس کی طرف آگے بڑھے۔
ایک کو اس نے کہتے ہوئے سنا۔ "یہ کوئی اجنبی ہے"۔
"تم کون ہو؟"۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔
"تم کہاں جارہے ہو؟"۔
اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ان میں سے ایک نے کہا۔ "آج کوئی بس نہیں جائے گی"۔
اس نے اپنی ہی آواز سنی۔ ٹھہرنے کے لیے مجھے کوئی جگہ چاہیے۔ کوئی بھی جگہ۔
انھوں نے آپس میں آہستہ سے باتیں کیں۔ پھر وہ آگے بڑھ کر آئے۔
"یہاں اجنبیوں کے ٹھہرنے کے لیے ....
دوبارہ خاموشی چھا گئی۔
یہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے۔ یہ کوئی شہر نہیں۔
"چار میل دور ایک ڈاک بنگلہ ہے"۔
اس نے کہا کہ وہ خالی نہیں ہے۔ "کیا اس کی آواز عجیب سی نہیں لگی"۔ وہ لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ وہ کچھ اور کہے۔
"رہنے کے لیے مجھے کوئی جگہ کرایہ پر چاہیے"۔
"کتنے عرصے کے لیے"؟

"تھوڑے عرصے کے لیے۔ میں۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کتنے عرصے کے لیے؟"
سننے والوں میں تجسس کے ساتھ اس آدمی کے لیے توقیر کا عنصر بھی شامل تھا۔
"آپ نے نہیں بتایا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔"
ایک شخص جو قابل دکھائی دیتا تھا اور پراعتماد بھی تھا اس کے قریب آیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندھیرے کو چیرتی ہوئی اجنبی کے کاندھے پر لٹکتے ہوئے بیاگ پر پڑیں۔ اس نے پوچھا۔
"آپ کا سامان؟"
"وہ آرہا ہو گا۔"
وہ رازدارانہ انداز میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ چند بے ربط آوازیں۔
"نمک کے آبکاری کا انسپکٹر ہو گا۔ کو تما سے کہنا چاہیے کہ احتیاط سے رہے۔"
"اوہ۔ نہیں۔ سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی ہو گا۔ ایسی صورت میں۔۔۔۔۔۔۔۔"
"بالکل اجنبی! بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ ماہر چوروں کا زمانہ آگیا ہے۔"
"کیا کوئی چور اس ڈھیٹ پن سے آسکتا ہے۔"
مقامی لوگ قریب آتے گئے۔
"کیا آپ خاص طرح کا مکان چاہتے ہیں۔ اگر صرف ایک یا دو دن کے لیے ہو تو۔۔۔۔"
"مجھے مکان چاہیے۔"
"ایسا مکان جس کی دیواریں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں۔ سو رہنے کے لیے ایک فرش۔ ایک چھوٹا سا چھت آسمان تلے۔"
"ایک ہی مکان جو خالی ہے وہ امان کا ہے۔ اس کا منیجر ابھی ابھی گیا ہے۔"
"امان کون ہے۔"
"انھیں تعجب ہوا۔ "کیا تم نہیں جانتے۔ بڑی خوب چیز ہے۔ یچ دھرمان متھا بڑا استاد۔"
دھرمان۔ اس کے بارے میں کبھی سنا نہیں تھا۔ اپو، اپا، اپونی، کٹی نارا، کٹی شنکرن۔ پرانے نام بدل گئے۔
"دھرمان کون ہے۔"
"آپ نے استاد کے بارے میں نہیں سنا۔"
وہ بڑبڑایا۔ اس کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔
"کوئی شخص ایسا نہیں جس نے اس کے بارے میں سنا نہ ہو گا۔ ابھی وہ سیب کے اوپر ہے۔"
"کوئی ایک لیمپ لے آیا۔ کسی نے پڑوس کی دکان سے چھوٹی سی ایک بنچ حاصل کی اس پر دو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔
"اس پر بیٹھ جایئے۔"
وہ بیٹھ گیا اور بڑی بے دلی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ایک اجنبی شخص کے لیے کسی مکان کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کسی نے منیجر کو چتران ترومینی کے آوٹ ہاؤز سے باہر نکل کر آتے دیکھا تھا۔
پہلے جس شخص کو پیام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا تھا اس نے واپس آکر اطلاع دی کہ اسے اس واقعے سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ دوسرا پیامبر بھی ہانپتا کانپتا پسینے میں شرابور واپس لوٹ آیا اور کہنے لگا۔ وہ آنے گا۔ منیجر آنے گا۔
"کیا تم استاد کو نہیں دیکھ رہے ہو؟"
"ہاں۔ اس کے بعد۔"

اب مقامی لوگوں نے نووارد کی طرف داری میں باتیں شروع کیں اور گاؤں والوں کی خامیوں کو گنانے لگے۔ اگر کوئی اجنبی آجائے تو یہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے کہ وہ کچھ کھا سکے۔ اس کے سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ڈاک بنگلہ ہمیشہ کسی نہ کسی مال کے محکمے یا کسی سرکاری عہدہ دار کے قبضے میں ہوتا ہے۔ یہ مسائل تو تھے ہی۔ انیتا بس سروس بھی وقت پر نہیں چلتی۔

ایک غیر متوقع سوال اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ "کیا انسپکٹر ڈیوٹی پر ہے۔"

وہ اپنا سر اٹھائے بغیر نیچے دیکھتا اور اپنے آپ مسکراتا ہوا اپنے لباس کے اندر جھانکنے لگا۔

انسپکٹر، اوور سیر سوپر وائزر۔ مقامی لوگ اپنی مرضی سے اس کا عہدہ متعین کرتے جا رہے تھے۔ سب کے سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ اصل میں ہے کون۔ اس مقام پر جو اپنی ہیئت بدل چکا تھا وہاں طرح طرح کے غیر متوقع سوالات کی بوچھار تھی۔

گاؤں والے اس کی طرف سے اپیل کر رہے تھے۔ اس کے رہنے کے انتظام میں لگے تھے۔

انتظار جاری تھا۔

انتظار اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نامعلوم چوراہوں پر کسی شخص کا انتظار۔ ایسے شخص کا جو جلد ہی آکر اسے بتائے گا کہ کس راستے پر اسے جانا ہے۔ اب وہ یہاں اس منیجر کا انتظار کر رہا تھا جو ایک ایسے ان دیکھے شخص کے لیے کام کر رہا تھا جو اپنا مکان کرایے پر دینا چاہتا تھا۔

ایک نیولا جنوب کی طرف سے دوڑتا ہوا آیا اور لوگوں کے جمگھٹے کی طرف دیکھتا ہوا سونگھنے لگا۔ تھوڑی دیر وہ یوں ہی ٹھہرا رہا اور پھر دوڑتا ہوا شمال کی طرف آگے بڑھ گیا۔

آخر کار منیجر آ ہی گیا۔ ایک بار اور اسے بے شمار سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جوابات دینے کے خیال سے وہ گھبرا گیا۔ اس کا اندر [illegible]۔ منیجر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جھولتی ہوئی قندیل اندھیرے کو بانٹ رہی تھی۔ لوگوں نے بڑے تپاک سے اس کے لیے جگہ بنائی۔

منیجر نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور سب سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں نے چابی حاصل کر لی ہے۔"

اس بات سے سب لوگ متاثر ہوئے۔ "ہم جانتے تھے کہ آپ ہی اسے حاصل کر سکتے ہیں۔"

"کیا آپ لوگ نہیں جانتے کہ گاؤں کے سربراہ کے جانے کے بعد اس نے کہا نہیں تھا کہ آئندہ وہ کسی کو مکان کرایے پر نہیں دے گا۔ کتنے ہی لوگوں نے اصرار کیا۔ کیا اس نے کسی کی سنی تھی؟ آپ کا سامان؟"

گاؤں والوں نے کہا وہ آ رہا ہے۔

"اوپر کی منزل تو چمگادڑوں اور چوہوں سے بھری ہوگی۔ نیچے کا حصہ برا نہ ہوگا۔"

گاؤں والوں نے مداخلت کی۔ "ایک آدمی کے لیے چھوٹا سا کمرہ کافی ہے۔" "قلی جب سامان لے کر آئیں گے تو انھیں راستہ تو معلوم ہوگا۔؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا

گاؤں والوں کے پاس جواب تھا۔ "ہم لوگ یہاں دکان والے سے کہہ دیں گے۔" "یہ بہتر ہوگا۔"

منیجر کی قندیل کی روشنی میں وہ پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گاؤں کے چار آدمی بھی پیچھے ہو لئے۔ سوں سوں کرتا نیولا اس وقت تک ان کا پیچھا کرتا رہا جب تک کہ اسے بھگا نہ دیا گیا۔

کھیتوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والے راستے کچے تھے۔ آسمان پر اندھیرا تھا۔ بادلوں کے گرجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کھلے آسمان کے جس حصے سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی ادھر سے مکان اور صحن میں کہیں کہیں اجالا ہو رہا تھا۔

پھیکی روشنی میں اسے سامنے لکڑی کا دروازہ نظر آیا۔ دروازے کی نقش کاری مٹ چکی تھی۔ مینجر نے مشکل سے دروازہ کھولا تو دروازے کے قلابوں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی درد سے کراہ رہا ہو۔
ٹھہرو۔ اندر کوئی قندیل ہوگی۔۔
مینجر اپنی قندیل لے کر اندر داخل ہوا۔ دوسرے دروازوں کے کھلنے کی آوازیں آتی رہیں اور سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ بھی سنائی دیتی رہی۔ مینجر ایک دوسری قندیل لے کر آیا۔ اسے جلا کر اس نے سائبان میں رکھا۔
تمھارا سامان؟
ایک اور بار گاؤں والوں نے جواب دیا۔ "وہ آرہا ہے"۔
"کھانا"۔
"راستے میں کھا چکا"۔
"وہ وہاں کنواں ہے۔۔ مینجر نے اشارہ کیا۔ "وہیں بالٹی بھی دھری ہے۔۔
اسے لگا جیسے بہت دیر ہو گئی ہے اور وہ تنہا ہے۔ اندھیرا مکان، دھواں پھینکتی ہوئی قندیل اور اس کے قبضے میں ایک زنگ آلود چابی۔
کیڑے لگے چھت سے گرتی ہوئی گرد کو جھاڑ کر کہنی پر سر رکھے وہ لیٹ گیا اور باہر اندھیرے کو گھورنے لگا۔
مینجر نے کہا تھا وہ کرائے اور دوسری باتوں کے ضمن میں بات کرنے کے لیے کل آئے گا۔ ادھوری سی باتیں کل پر جو بہت دور ہے۔ اسے بھول جائیں۔ آخر کار اسے ایک گھر تو مل گیا تھا۔ اوپر چمگادڑیں اور نیچے لکڑی کو کھا جانے والی دیمک۔ باہر سے جھینگروں کی آوزیں۔ جو بھی ہو اس نے دوران سفر ایک گھر کا خواب دیکھا تھا۔ ہاں جناب میرے لیے بھی رہنے کے لیے کوئی جگہ!
دوسری صبح کام پر جانے والے مزدور بازار کے چائے خانے پر جمع ہونے کہ اجنبی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کریں۔ وہ استاد کے مینجر کا انتظار کرنے لگے کہ وہ آئے گا تو انھیں کچھ بتائے گا۔ وہ کرائے کی رقم کے بارے میں کوئی تکرار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ کہہ کر کہ وہ مقروض رہنا نہیں چاہتا اس نے کرایہ پیشگی ادا کر دیا تھا۔ پھر وہ مکان کی صفائی کے لیے مزدور لگانا چاہتا تھا۔
مینجر کہنے لگا۔ ایک تنہا آدمی۔ ہے ضرر۔ لیکن ہمارا استاد کبھی کبھی پاگل ہو جاتا ہے۔ کبھی تو وہ کہتا ہے کہ اسے کسی کرایہ دار کی ضرورت نہیں اور کبھی کہتا ہے کہ مکان کو ڈھا کر دوسرا تعمیر کرائے گا اور کبھی۔۔۔!
گاؤں والوں نے اتفاق کیا۔ "استاد ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔۔
لوگ کرائے کے مکان کے پاس آتے رہے لیکن کوئی اجنبی کو دیکھنے کے لیے اندر نہیں گیا۔ صحن کی صفائی ہو چکی۔ کام کرنے والے صحن کے اطراف پودوں کی باڑ لگا رہے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کرایہ دار فرش پر بچھی ہوئی چادر کو ایک طرف کھینچ رہا ہے تو انھوں نے اس سے دوستی کرنے کی کوشش کی اور پوچھا۔ کیا آپ کا سامان آگیا۔
"وہ آگیا"۔
یہ سن کر وہ اطمینان سے مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ انھوں نے یہ نہیں پوچھا کہ سامان کب اور کیسے آیا۔ وہ خوش تھا۔
اس نے بڑی محنت کی۔ مزید گاؤں والوں کے آنے سے قبل اسے مکڑی کے تمام جالے صاف کرنا چاہیے۔
اس عرصے میں وہ تلی جو بازار گیا تھا سودا سلف اور گھر کے لیے برتن لے کر واپس آگیا۔
ناریل کے پتوں کا پردہ جب کھڑکیوں پر سے اٹھایا گیا تو روشنی مکان میں داخل ہوئی۔ اندر کی ناگوار بو جاتی رہی۔ اب وہ

ایک کرایہ دار کی حیثیت سے مکان پر قابض تھا۔ وہ اکڑ کر گھر کے اندر باہر ٹہلنے لگا۔

سفر پر روانہ ہونے سے قبل جس کمرے میں وہ سویا تھا اس کی یاد دھندلی پڑنے لگی۔ تھکا ماندہ لیٹ کر وہ اپنی یادداشت کو تازہ کرنے لگا۔ ریگڑ کی مٹی سے بننے والے برتن کمہار کے گھومتے ہوئے پہیے پر ملائم ہوتے گئے۔ بھٹی سے مٹی کے جلنے کی بو آنے لگی۔ اس کے چاروں طرف طرح طرح کے مٹی کے برتن رکھے تھے۔ فرش پر گوبر کے پانی کا چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس میں پیشاب کی بو مل کر اور بھی شدید ہو گئی تھی۔ موریاں باہر کی طرف جاتی ہوئی۔ جب وہ روشنی کی طرف جھانکا تو اسے بھٹی کے اندر سے دھواں نکلتا ہوا دکھائی دیا۔

اسی کمرے سے وہ اپنے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ برسوں بعد بھی زمین پر گرے ہوئے پتوں اور دھول پر سے گذرتے ہوئے اس کے پاؤں نے کوئی نقش نہیں چھوڑا تھا۔ اور پھر پانی ٹپکتے ہوئے ورانڈے، کھوکھلے بانس کے پردے، گرد اور پسینہ آلود بنچیں۔ کہیں پر ختم نہ ہونے والے راستے، بھیانک خواب۔۔۔

شام ہوتے ہوتے اس نے گلاب کے وہ پودے جنھیں قلی لے آئے تھے سامنے صحن میں لگائے۔ وہ کمرہ جس میں اندھیرا نہ تھا اس میں اس نے مٹی کے گھڑے اور دوسرے برتن رکھ دیے۔ وہ بیٹھے بیٹھے اودن میں رکھے کھولتے ہوئے پانی کو دیکھ رہا تھا۔

رات میں جب منیجر آیا اس کے ہاتھ میں قندیل تھی جس کی روشنی اندھیرے کو دور کر رہی تھی۔

" تم اچھے تو ہو۔"

" بالکل اچھا ہوں۔"

"کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔"

" بالکل نہیں۔"

منیجر نے صحن کی صفائی کے بارے میں شبہ ظاہر کیا۔ " وہ حصہ دوسروں کا ہے۔ اگر استاد کا حکم ہو تو یہ حصہ خالی کرنا پڑے گا۔" اس نے صلاح دی کہ اس پر پیسہ ضائع نہ کیا جائے۔

منیجر کے جانے کے بعد اس نے اپنے اعتماد کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے آپ پر خفا ہو کر کہنے لگا۔ " میں خالی نہیں کروں گا۔ میں اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

اس نے پڑوسیوں سے دوستی کر لی۔ باڑ سے لگے بانس کے درخت پر بیٹھنے والی زرد چڑیوں کو وہ پہچاننے لگا۔ آس پاس درختوں کے نیچے گھاس میں دانہ چگنے والی چڑیاں بھی اسے پہچاننے لگیں۔ خوشی کی بات تو یہ تھی کہ مغرب کی جانب کمرے سے قریب ایک کونے میں بیا کی چڑیوں نے گھونسلے بنانا شروع کر دیا تھا۔ ایک رات اس نے محسوس کیا کہ دور کھیتوں میں سے آتی ہوئی جھینگروں کی آواز میں بھی موسیقی کی کیفیت ہے۔

ایک دن چند گاؤں والے آئے تو انھوں نے پوچھا۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کتنے عرصے تک آپ اس گھر میں رہنے والے ہیں۔

اس نے چپکے سے جواب دیا۔ " میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

گاؤں والے حیرت میں پڑ گئے۔

ایک شخص جو استاد اور منیجر دونوں کو جانتا تھا کہنے لگا۔

" اس مکان کے شہتیر بودے ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ اس کی دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔"

کسی اور نے کہا۔ " یہاں کوئی ٹھہرنا ہی نہیں چاہتا۔"

" اب تو یہاں ایک کرایہ دار ہے۔"

بارش کا موسم شروع ہونے سے قبل مینیجر نے آکر اعلان کیا۔ وہ نیا چھت ڈالنا نہیں چاہتا۔ استاد کا کہنا ہے کہ اسے ٹپکتے رہنے دو تاکہ ڈھ جائے۔

مینیجر نے پیشگی کرایہ لینے سے تکلف کیا۔ اسے اصرار کرنا پڑا۔

بارش شروع ہوئی۔ ناریل کے پتے تیز ہواؤں سے جھول رہے تھے۔ بوندا باندی تیز بارش میں بدل گئی۔ بارش کا پانی موریوں اور گڑھوں میں جمع ہوگیا۔ کیلے اور ناریل کے درخت پانی میں نہاگئے۔

وہ کمرے کے اندر ہی خوف سے بیٹھا رہا۔ سرخی مائل پانی دیواروں کے سوراخوں سے ٹپک کر کمرے میں بہتا رہا۔ مالک مکان کی خواہش کے مطابق کیا ہر چیز ڈھ جائے گی۔ پھوس کی چھت ہوا میں اڑنے لگی اور سرخی مائل رنگ کا پانی چھت کی دراڑوں سے ٹپکنے لگا۔ بارش میں بھیگتا ہوا وہ باہر نکل آیا۔ ریگڑکی مٹی کو پانی میں بھگو کر اس کا پیسٹ بنایا اور اسے تڑخی ہوئی دیواروں میں لگانے لگا۔ اس نے کٹوروں اور برتنوں کو ایک قطار میں رکھا کہ چھت سے ٹپکتا ہوا پانی ان میں گرے۔ اندر جمع ہونے پانی کو اس نے باہر نکال پھینکا۔

بارش کا غصہ ٹھنڈا پڑا۔ تیز چلتی ہوائیں رک گئیں۔ ان کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی شیر خوار بچہ رو کر تھک گیا ہو اور خاموش ہوگیا ہو۔

مینیجر دوبارہ آیا۔ وہ نہ تو مسکرایا نہ ہی بیٹھ پایا۔ اب اسے ایک ایسے شخص سے بات کرنا تھا جو بے حد سنجیدہ ہوگیا تھا۔

" دیکھو میں نے سوراخوں کو بند کر دیا ہے۔ میں بہت جلد چھت کی بھی مرمت کراؤں گا۔ میں اس پرانے گھر کو گرنے نہیں دوں گا۔ میں اسے خالی نہیں کروں گا۔"

سورج کی شعاعیں جو بارش کے بعد نم لگ رہی تھیں چاروں طرف پھیل گئیں۔

مینیجر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ " دیکھو۔ استاد نے تمھیں یہ گھر خالی کرنے کے لیے کہا ہے۔ یہ کرایہ واپس لے لو۔"

مینیجر نے باقی کرایہ اسے واپس کرنا چاہا۔ اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ استاد ایسا ہی ہے۔ وہ کسی کی نہیں سنتا۔

مینیجر نے پیسے وہاں رکھ دیے اور باہر نکل گیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ پلٹا۔ " بہتر ہے کہ تم اسے خالی کر دو۔ استاد نے کہا ہے۔ اس کے سوا تم اب کیا کر سکتے ہو۔ استاد کی مرضی کے خلاف کسی نے کچھ نہیں کیا ہے۔"

اتنے میں گاؤں والے بھی آگئے۔ وہ بھی اس سے آنکھیں نہ ملا سکے لیکن ان کے چہروں پر ہمدردی کا جذبہ تھا۔

" ہمیں افسوس ہے کہ تمھیں مکان خالی کرنا پڑ رہا ہے۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔ یہ استاد کا مکان ہے۔ جب استاد خالی کرنے کے لیے کہے تو خالی کرنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟"

تین دن کے بعد مینیجر دوبارہ آیا۔ " لوگ تمھارا سامان باہر پھینکنے اور تمھیں نکالنے کے لیے آرہے ہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں جارہا ہوں۔"

بیچ کے کمرے میں گھس کر اس نے اندر سے کھٹکا لگالیا۔

" وہ آئیں گے۔ دھرمان ستھو سوامی ماسٹر کے کرائے کے آدمی۔"

اس نے اوون میں آگ نہیں جلائی۔ کھڑکی کے سلاخوں سے دور وہ کھیتوں کی طرف دیکھتا رہا۔ کھیت جو الگ الگ تھے۔ پھر اس نے کھڑکی کے پٹ بند کر لیے۔

اس نے سرگوشیاں کرتی ہوئی آوازوں کو قریب اور قریب آتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے پہل کی اور پوچھا۔ " کون ہے وہ؟"

وہ استاد کے بھیجے ہوئے مزدور تھے۔
وہ چپ رہا۔ وہ مشکل سے ضبط کر سکا۔
اس نے برتنوں کو باہر پھینکنے کی آواز سنی۔ ایک پر ایک گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں۔
تمہارے خلاف ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہم وہی کر رہے ہیں جو استاد نے کرنے کے لیے کہا ہے۔ بس اتنا ہی۔
ہم پہلے چھت توڑیں گے۔ اس کے بعد دیواروں کو ایک ایک کرکے گرائیں گے۔ آخر میں ہم اس کمرے کی دیوار بھی توڑ دیں گے جس میں تم نے پناہ لی ہے۔ استاد کے آنے تک تم وہاں بیٹھے رہ سکتے ہو۔"
"کیا وہ آرہا ہے؟"
"ہاں جب وہ کہہ چکا تو ضرور آئے گا۔"
انتظار ہوتا رہا۔ اس نے کھڑکی کے باہر جھانک کر دیکھا۔ صحن میں ٹوٹے ہوئے برتن اور دوسری اشیا پڑی تھیں۔ وہ تمام چھوٹی چھوٹی چیزیں جنھیں اس نے اپنے سفر کے دوران جمع کیا تھا۔ دور کھیت خالی دکھائی دے رہے تھے۔ شاید......
......اس نے دعا کی کہ استاد اپنا ارادہ بدل دے۔
میں اسے استاد مان لوں گا۔ میں اسے ہمیشہ ہی استاد کہوں گا۔ میں اس کے آگے دوزانو ہو جاؤں گا۔ میں اس کی تابع داری کروں گا۔ مجھے میری پناہ گاہ واپس دے دو۔ میرا چھت۔ میں نے اپنی آخری پناہ گاہ حاصل کی تھی۔ میں اب مزید سفر نہیں کر سکتا۔ بالکل نہیں۔ ریلوے اسٹیشنوں کی انتظار گاہیں جہاں گندے گندے گڑھوں سے بدبو پھیلتی ہے اور مسافروں کے جسم کا باسی پسینہ۔ سرد بینچیں۔ بھٹی کے جلنے کی بو۔ اب میں ان کی طرف جا نہیں سکتا۔ نہیں جا سکتا۔
وہ اپنے آپ بڑبڑاتا رہا اور اس کمرے کی چار دیواری کے اندر گھومتا رہا جس میں اس نے اپنے آپ کو بند کر لیا تھا۔
"دیکھو۔ بارش کا پانی اب ناریل کے پتوں کی چھت سے ٹپکنے والا نہیں۔"
وہ خاموش ہو جانے کے لیے زمین پر پڑا رہا۔ شفق کے غروب ہوتے ہی وہ کانپنے لگا۔ کیا خفیہ طور پر اندھیرا اندر داخل ہو رہا ہے۔ استاد کی طرح۔
بھاگنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ آوازیں کہاں سے آ رہی تھیں؟ کیا وہ جانوروں کے چلنے کی آوازیں تھیں یا انسانی قدموں کی چاپ۔ کیا مویشیوں کا گلہ واپس ہو رہا تھا۔ میلے چیتھڑوں کی ایک گٹھری وہ اپنے سینے سے لگائے وہاں بیٹھا رہا۔
خوف زدہ آواز جوں جوں قریب آتی گئی۔ اس کا اثر کم ہوتا گیا۔ بھاری قدموں کی چاپ پہلے صحن میں آئی۔ پھر سیڑھیوں پر اور اس کے بعد ورانڈے میں۔
خاموشی سے چیتھڑوں کی گٹھری کو اپنے سر کے قریب رکھ کر اور آنکھیں بند کیے وہ لیٹ گیا۔ جیسے جیسے دروازے کھلتے گئے ان کی چیخیں دردناک آواز کے ساتھ آتی رہیں راستہ بنتا گیا۔
"آیئے استاد......آیئے۔"

-000-

افتخار نسیم

سلام عقیدت

اب اختتامِ رنجِ سفر چاہیے مجھے
میں ہوں جلاوطن کوئی گھر چاہیے مجھے

پانی پہ حرف لکھوں میں اس کے سلام کے
یارب اک ایسا دستِ ہنر چاہیے مجھے

میں زیرِ لب اسی کا فقط نام کیوں نہ لوں
اپنی دعا میں بھی تو اثر چاہیے مجھے

یہ سر تو اٹ گیا ہے غبارِ گناہ سے
جھکنے کو در پہ اک نیا سر چاہیے مجھے

یہ جسم سیلِ دردِ جدائی تو سہہ چکا
اس روح کے لیے بھی بھنور چاہیے مجھے

شب نے چرا لیے مری آنکھوں سے سارے خواب
جاگا ہوا ہوں کب کا سحر چاہیے مجھے

پہچان بھی ہے میری انا بھی ہے اس کا نام
جو کچھ بھی ہوں کرم کی نظر چاہیے مجھے

کشتی ہوں سامنے ہے بپھرتی نیا گرا
ناکردہ نیکیوں کا ثمر چاہیے مجھے

کب تک فضائے دہر میں بے مدعا اڑوں
میں طائرِ فلک ہوں شجر چاہیے مجھے

امت اسی کی ہوں میں یہی فخر ہے بہت
کس نے کہا کہ لعل و گہر چاہیے مجھے

سب کچھ ہے میرے پاس بہ فیضِ رسولِ پاک
مانگوں گا ان سے اور اگر چاہیے مجھے

ہے سامنے مرے وہ درِ مصطفیٰ نسیم
اب تو بیانِ دردِ جگر چاہیے مجھے

پروفیسر اشرف رفیع

تین نظمیں

(۱)

نہ میرے پاؤں کی انگلی انگوٹھے سے بڑی ہے
نہ میرے ہاتھ کی
وہ لکیر
کہیں سے بھی کٹی پھٹی ہے
پھر تم کیوں میرے ساتھ نہیں ہو
تم میں اور مجھ میں یہ انتر
ایسا کیوں ہے
میں جو کہتی ہوں وہ غلط ہے
تم جو کرتے ہو وہ سچ ہے

(۲)

روبوٹ کی طرح
جی رہی ہوں
میں نے جینا چھوڑ دیا

(۳)

جب کوئی اور ہوتا ہے تمھارے ساتھ
تم قدم بہ قدم
ساتھ اس کے چلتے ہو
کبھی ہاتھوں کو اپنے اس طرح
دیتے ہو تم جھونکا
کہ اس کے ہاتھ سے
پہلو سے اکثر چھوتا رہتا ہے
مگر جب ساتھ میں ہوتی ہوں
میرے ساتھ
کبھی دو اک قدم پیچھے
کبھی دو چار قدم آگے

------OOOO------

غالب کی فارسی غزلیں

ترجمہ: مضطر مجاز

(۱)

زمن گرت نبود باور انتظار بیا
بہانہ جوئی مباش و ستیزہ کار بیا

نہیں ہے میرا تجھے باور انتظار آجا
بہانہ جوئی نہ کر اور ستیزہ کار آجا

بہ یک دو شیوہ ستم دل نہ می شود خرسند
بہ مرگِ من کہ بسامان روزگار بیا

دو اک ستم سے ترے دل یہ خوش نہ ہونے کا
ہماری موت کے ساماں کیے ہزار آجا

بہانہ جوست بہ الزامِ مدعی شوقت
بیا برغم دلِ ناامیدوار بیا

بہانہ جو ہے بہ الزامِ مدعی ترا شوق
کبھی خلافِ دلِ ناامیدوار آجا

ہلاک شیوۂ تمکیں مخواہ مستاں را
عناں گستہ تر از بادِ نو بہار بیا

ہلاک شیوۂ تمکیں بنا نہ مستوں کو
لپک لپک صفتِ بادِ نو بہار آجا

زما گسستی و بادیگراں گرو بستی
بیا کہ عہدِ وفانیست استوار بیا

جو مجھ کو چھوڑکے. اوروں سے ہے خلا و ملا
بجا کہ عہد وفا کب ہے استوار آجا

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار باربیا

وداع و وصل کی لذت تو ہے جداگانہ
ہزار بار بچھڑ، صد ہزار بار آجا

تو طفلِ سادہ دل و ہم نشیں بد آموزست
جنازہ گر نہ تواں دید برمزار بیا

تو طفل سادہ بد آموز ہم نشیں تیرے
نہیں جنازے پہ ممکن، سر مزار آجا

فریب خوردۂ نازم چہا نمی خواہم
یکی بہ پرسشِ جانِ امیدوار بیا

میں کیوں نہ چاہوں کہ ہوں میں فریب خوردہ ناز
کبھی بہ پرسشِ جانِ امیدوار آجا

زخوئے تست نہادِ شکیب نازک تر
بیا کہ دست و دلم می رود زکار بیا

ہے تیری خو سے مزاجِ شکیب نازک تر
کہ دست و دل چلے ہاتھوں سے اے نگار آجا

رواجِ صومعہ ہستی ست زینہار مرو
متاعِ میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

رواجِ صومعہ ہستی ہے زینہار نہ جا
متاعِ میکدہ مستی ہے، ہوشیار آجا

حصار عافیتے گرہوس کنی غالب
چو ما بہ حلقۂ رندانِ خاکسار بیا

ہے عافیت کی طلب غالب؟ آ ہماری طرح
درونِ حلقۂ رندانِ خاکسار آجا

(۲)

سرچشمۂ خوں است زدل تا بہ زباں ہائے
دارم سخنے با تو و گفتن نتواں ہائے

سرچشمۂ خوں دل سے زباں تک ہے رواں ہائے
کیا تجھ سے کہوں ؟ کہل نہیں پاتی ہے زباں ہائے

سیرم نتواں کرد ز دیدار نکویاں
نظارہ بود شبنم و دل ریگ رواں ہائے !

دیدار سے اچھوں کے یہ دل سیر نہ ہو پائے
نظارہ جو شبنم ہے تو دل ریگ رواں ہائے !

در خلوت تابوت نہ رفت است ز یادم
بر تختۂ در دوختہ چشمِ نگراں ہائے !

تابوت کی خلوت میں بھی میں بھول نہ پاؤں
تختے پہ سلی رکھی ہے چشمِ نگراں ہائے !

اے فتوئ ناکامی مستاں کہ تو باشی
مہتاب شبِ جمعۂ ماہِ رمضان ہائے !

مستوں کی یہ ناکامی کا فتوی ہے کہ تو ہے
مہتابِ شبِ جمعہ ماہِ رمضان ہائے !

باداورِ ناگفتہ شنو رفت حوالت
دردی کہ بہ گفتن نہ پذیرفت گراں ہائے !

ناگفتہ جو سنتا ہے کیا اس کے حوالے
وہ درد کہ کہنے کو نہ تھا درد گراں ہائے !

از جنت و سرچشمۂ کوثر چہ کشاید
خوں گشتہ دل و دیدۂ خوں نا بہ فشاں ہائے !

کیا جنت و سرچشمۂ کوثر سے کھلے گا
خوں گشتہ دل و دیدۂ خوں نا بہ فشاں ہائے !

در زمزمہ از پردۂ و ہنجار گزشتیم
رامش گریِ شوق بہ آہنگِ فغاں ہائے !

ہم زمزمے میں پردہ و ہنجار سے گزرے
رامش گریِ شوق بہ آہنگ فغاں ہائے !

سیماب تنے کز رمِ برق است نہادش
گردید مرا مایۂ آرامش جان ہائے !

گم جس میں رمِ برق ہے • سیماب بدن کوئی
میرا وہ بنا مایۂ آرامشِ جاں ہائے !

غالبؔ بہ دل آویز کہ در کار گہۂ شوق
نقشے ست دریں پردہ بہ صد پردہ نہاں ہائے !

اس کارگہِ شوق میں بن دل کا ہی غالبؔ
اس پردے میں ہے نقش بہ صد پردہ نہاں ہائے

زاہد کو و مسجد چہ و محراب کجائی (۳۴) زاہد کون ہے؟ مسجد کیا ہے؟ اور محراب کہاں ہے؟
عید است و دمِ صبح مئے ناب کجائی عید کا دن ہے اور دمِ صبح بادۂ ناب کہاں ہے؟

دریا ز حباب آبلہ پائی طلب نست چلتے چلتے آبلے پڑگئے حباب کے پائے دریا میں
نور نظر! اے گوہر نایاب کجائی میری آنکھ کے نور تو اے گوہر نایاب کہاں ہے؟

بوئے گل و شبنم نہ سزد کلبۂ مارا بوئے گل و شبنم کا گذر کیا میرے غم خانے میں
صرصر تو کجا رفتی و سیلاب کجائی بادِ صرصر کہاں گئی تو؟ اے سیلاب کہاں ہے؟

حشرست و خدا داور و ہنگامہ بہ پایاں حشر کا ہنگامہ ہے ختم پہ اور خدا داور ہے
اے شکوۂ بے مہری احباب کجائی اللہ اللہ! شکوۂ بے داد احباب کہاں ہے؟

آن شور کہ گرداب جگر داشت ندارد شور کہ جو گردابِ جگر میں تھا وہ کہاں غائب ہے
اے لخت دل! اے غرقہ بہ خون ناب کجائی لخت دل! اے لختِ دل! غرقِ خوں ناب کہاں ہے؟

باگرمی ہنگامۂ خواہش نہ شکیبم گرمیِ خواہش کا ہنگامہ دل کو قرار نہ بخشے
آتش بہ شبستاں زدوم اے آب کجائی آگ لگا ڈالی ہے شبستاں میں اے آب کہاں ہے!

چوں نیست نمک سائی اشکم بفغانم میری آہ و فغاں میں کیوں اشکوں کی نہیں نمک سائی
کائے روشنی دیدۂ بے خواب کجائی یعنی تیری روشنی اے چشم بے خواب کہاں ہے

غواصی اجزائے نفس دیر نہ دارد غواصی میں دیر نہیں ہوتی اجزائے نفس کی
از دل ندمے، داغ جگر تاب کجائی دل سے ہوں نادم، داغ جگر کو دیوے جو تاب کہاں ہے؟

شوریست نواریزیِ تار نفسم را میرے تارِ نفس کی نواریزی کا شور ہے برپا
پیدا نہ ای، اے جنبشِ مضراب کجائی پیدا نہیں، وہ جنبش تیری اے مضراب کہاں ہے؟

بنمائی بہ گوسالہ پرستاں یدبیضا دکھا رہا ہے کیا یدبیضا تو گوسالہ پرستوں کو
غالب بہ سخن صاحبِ فرتاب کجائی غالب بزم سخن میں کوئی مردِ فرتاب کہاں ہے

پس از عمرے کہ فرسودم بہ مشقِ پارسائی ہا (۷۸)
گدا گفت و بہ من تن در نہ داد از خودنمائی ہا

ہوئی اک عمر میری صنائع مشق پارسائی میں
مگر تو نے نہ پوچھا مجھ کو زعم خودنمائی میں

فغاں زاں بوالہوس برکش محبت پیشہ کش کز من
ربابد حرف و آموزد بہ دشمن آشنائی ہا

ارے وہ بوالہوس حرف محبت سیکھ کر مجھ سے
بنا کر پیشہ دشمن کو سکھادے آشنائی میں

بت مشکل پسند از ابتذال شیوہ می رنجد
بگوئیدش کہ از عمرست آخر بے وفائی ہا

وہ بت ہے ابتذال شیوہ سے میرے بہت نالاں
کہو اس سے کہ ہے کیا عمر کچھ کم بے وفائی میں

نیرزم التفاتِ دزد و رہزن ، بے نیازی بیں
متاعم را بہ غارت دادہ اند از ناروائی ہا

نہ پایا التفات دزد و رہزن ، بے نیازی دیکھ
کہ ساماں کو مرے غارت کریں وہ ناروائی میں

بہ روز رستخیز از جنبش حاکم بر آشوبی
تو و یزداں ، چہ سازد کس بدین صبر آزمائی ہا

بہ روز حشر میری خاک سے آشوب اٹھے گا
تو اور یزداں ! کرے کیا کوئی اس صبر آزمائی میں

کدوئے چون زمئے یابم ، چناں بر خویشتن بالم
کہ پندارم سرآمد روزگارِ بے نوائی ہا

خم مے جب کوئی پاؤں تو، لہکوں اور لہراؤں
گماں ہوتا ہے جیسے گھن لگا اب بے نوائی میں

چہ خوش باشد دو شاہد را بہ بحث ناز پیچیدن
نگہ در نکتہ زائی ہا ، نفس در سرمہ سائی ہا

ارے توبہ ! دو معشوقوں کا بحثِ ناز میں پڑنا
نگہہ گم نکتہ زائی میں ، نفس گم سرمہ سائی میں

سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقوی مائل است ، اما
ز تنگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائی ہا

مرا دل مائل تقوی ہے قصہ مختصر ، لیکن
ہے تنگِ زہد شامل میری کافرماجرائی میں

نہ رنجم گر بہ صورت از گدایاں بودہ ام غالبؔ
بدار الملک معنی می کنم فرماں روائی ہا

گدا صورت سہی میں، پھر بھی دارالملک معنی میں
گذرتی ہے مری غالب بڑی فرماں روائی میں

در بستن تمثال تو حیرت رقم استی (۵)   تمثال میں بس تیری تو حیرت ہی رقم ہے
بینش کہ بہ پرکار کشائے علم استی   بینش تو پئے کار کشائی علم ہے

غم را بہ تنومندی سہراب گرفتم   ہر غم بہ تنومندیِ سہراب اٹھایا
خود موج مئے از دشنۂ رستم چہ کم استی   خود موجۂ مئے خنجرِ رستم سے نہ کم ہے ؟

بیداد بود یکسرہ بستن بہ کمر بر   اک ظلم ہے چھوڑے یہ کمر پر ترا پھرنا
زلفے کہ زانبوہِ دل خم بہ خم استی   باندھے ہوئے دل کتنے ہر اک زلف کا خم ہے

خرسندی دل پردہ کشائے اثرے ہست   خرسندی دل پردہ در باب اثر ہے
شادم کہ مرا این ہمہ شادی بہ غم استی   خوش ہوں کہ سبب میری خوشی کا ترا غم ہے

گفتن زمیاں رفتہ و دانم کہ نہ دانی   کہنا کہ خدا جانے کہاں یاں سے گیا ہے
بامن کہ بہ مرگم زتو پرسش ستم استی   مرنے کا مرے تجھ سے سخن ؟ طرفہ ستم ہے !

این ابر کہ شوید رخ گل ہائے بہاری   اس ابر کی دھوتا ہے جو ہر روئے گل تر
از دامن ما پرورش آموزنم استی   دامن سے مرے پرورش آموزی نم ہے

در بادیہ از ریزش خوں نابۂ مژگان   اس ریزشِ خوں نابۂ مژگاں سے بہ ہر دشت
روداد مرا ہر رگ خارے قلم استی   روداد رقم میری بہ ہر خارِ قلم ہے

زان ساں کہ نظر خیرہ کند برق جہاں سوز   جس طرح نظر خیرہ کرے برقِ جہاں سوز
باحرف تمنائے تو گفتن دژم استی   اک حرف تمنا کی ترے بات دژم ہے

در عہد تو ہنگام تماشائے گل از شرم   کیا چہرہ کشا گل ہو کہ اس عہد میں تیرے
نظارہ و گل غرقۂ خوناب ہم استی   نظارہ و گل غرقۂ خوں نابۂ ہم ہے

زیں نقش نوآئیں کہ برانگیختہ غالب   کیا نقش نوی تو نے بھی کھینچا ہے یہ غالب
کاغذ ہمہ تن وقف سپاس قلم استی   کاغذ بھی دل و جان سے مشکورِ قلم ہے

افتخار نسیم

○

گھر بسا کر چھوڑ دینا کتنا مشکل ہوگیا
رفتہ رفتہ میں بھی اوروں جیسا بزدل ہوگیا

اینٹ کی دیوار چنوادی تھی روشن دان پر
بند کمرے میں کہاں سے خوف داخل ہوگیا

آنکھ پتھراتی گئی ان رت جگوں کے درمیاں
دل کبھی آتش فشاں تھا برف کی سل ہوگیا

سن کے لوگوں سے کبھی جن کا اڑایا تھا مذاق
دیکھ کر دنیا میں ان باتوں کا قائل ہوگیا

اس قدر چھایا ہے وہ میرے رگ و پے میں نسیم
کرنا چاہا اور نمبر اس کا ڈائل ہوگیا

●●●

○

بہار میں یہ زمیں کس سے پوچھ کر پہنے
گلوں کی اوڑھ لے چادر ہرے شجر پہنے

فلک پہ تازہ کھلا پھول چومنے کے لیے
میں بار بار اڑا تتلیوں کے پر پہنے

ازل سے آج تک دونوں میں جنگ جاری ہے
مرا وجود کسی اور کا ہے سر پہنے

چھپائیں راز کہاں تک یہ بند دروازے
ہر ایک شخص ہی پھرتا ہے اپنا گھر پہنے

خود اپنا آپ ہی ساحل ہوں خود سمندر بھی
زمین پر بھی ہوں میں پاؤں میں بھنور پہنے

ملا نہ عید کے دن بھی کہیں وہ مجھ کو نسیم
نیا لباس پھرا میں ادھر ادھر پہنے

افتخار نسیم

○

تو نے دے دی ہے مجھے درد کی دولت کیسی
اے مرے صاحب ثروت یہ مروت کیسی

پوچھ لینے میں برائی تو نہیں ہے کوئی
اس نے انکار کیا ہے تو ندامت کیسی

دستکیں ہوتی ہیں اک حد مقرر کے لیے
کوئی دروازہ کھلا ہو تو اجازت کیسی

منزلیں اونچی بھی پاتال سے نیچی نکلیں
میں نے رہنے کو بنائی ہے عمارت کیسی

میں برا سوچوں کسی کا بھی تو مجرم ٹھہروں
میرے اندر لگی رہتی ہے عدالت کیسی

گھر بہا لے گئی ہر فصل تو اک آئی نسیم
سوچتا ہوں کہ خدا کی ہے یہ رحمت کیسی

●●●

○

ہے جستجو اگر اس کو ادھر بھی آئے گا
نکل پڑا ہے تو پھر میرے گھر بھی آئے گا

تمام عمر کٹے گی یوں ہی سوالوں میں
وہ سامنے بھی نہ ہوگا نظر بھی آئے گا

جو گم ہوا ہے نئے شہر کے مکانوں میں
وہ دیکھنے کو کبھی یہ کھنڈر بھی آئے گا

رچی ہے میرے بدن میں تمام دن کی تھکن
ابھی تو رات کا لمبا سفر بھی آئے گا

ذرا سی دیر میں ہر شے چمک اٹھے گی نسیم
سحر ہوئی ہے تو نور سحر بھی آئے گا

●●●

صدیقہ شبنم

○

رفاقت کا جس دم اثر جائے گا
نہ سودا رہے گا نہ سر جائے گا

یہ بستی تو بس اب اجڑنے کو ہے
مسافر! تو اب کہیں نگر جائے گا؟

جو بجھنا ہی ٹھیرا دیے کا نصیب
عجب کیا ہواؤں کا گھر جائے گا

کنارے پہ کب سے کھڑا ہے کوئی
سمندر میں شاید اتر جائے گا

وفا کے قرینے کسے یاد ہیں
کسی کے لیے کون مر جائے گا

طلسمات سارے نگاہوں کے ہیں
کہاں تک یہ حسنِ نظر جائے گا

مرا گھر تو کب سے تہِ آب ہے
یہ سیلِ بلا اب کدھر جائے گا

میں شبنم ہوں جس ابر کی منتظر
وہ مجھ سے چرا کے گزر جائے گا

○

اس کو خوش بو کی طرح تازہ ہوا میں رکھا
صورتِ رنگ کبھی گل کی قبا میں رکھا

اس کی راہوں میں جلائے تھے محبت کے دیے
اس کو دنیا سے الگ، دل کی فضا میں رکھا

میرے منصف نے میرا جرم بتایا بھی نہیں
مجھ کو ناکردہ گناہوں کی سزا میں رکھا

میری راہوں میں سرابوں کا دلاسا بھی نہ تھا
اس نے اک عمر مجھے دشتِ بلا میں رکھا

بعد اس کے نہیں بھایا کوئی منظر دل کو
بجھتی آنکھوں کو سدا ہم نے خلا میں رکھا

رنگ و نکہت کا وہ سرمایہ تھا اس کو شبنم
پھول بستی میں، کبھی شہرِ صبا میں رکھا

صدیقہ شبنم

O

ساحل بھی اجنبی تھے کہ دریا مرا نہ تھا
میں جس میں بس رہی تھی جزیرہ مرا نہ تھا

مدت سے جس کو اوڑھ کے پھرتی رہی یہاں
دیکھا جو آئینہ تو وہ چہرہ مرا نہ تھا

میں شہرِ بے لحاظ میں پہنچی تو یہ کھلا
سب دوستوں میں کوئی شناسا مرا نہ تھا

تینوں طرف تھے میرے سرابوں کے سلسلے
دریا جو سامنے تھا وہ دریا مرا نہ تھا

شبنم یہ راز مجھ پہ بہت دیر میں کھلا
وہ ہم سفر تھا مرا • ستارہ میرا نہ تھا

قصہ ہے آرزو کا یا عرضِ حال کا ہے
یہ تذکرہ تو سارا رنج و ملال کا ہے

اب رتجگے کا شب بھر سامان بھی کریں کچھ
ہے شام ہونے والی منظر زوال کا ہے

جس شخص سے بچھڑ کر اتنے بکھر گئے ہم
پوچھو نہ بات اس کی وہ تو کمال کا ہے

سمٹ رہا ہے کرنوں کے دائروں میں
اس کو خبر ہے شاید لمحہ زوال کا ہے

یہ ہجر کا بدن اب یوں بھی گزر چلا ہے
مجھ کو تو خوف شبنم آئندہ سال کا ہے

مشتاق پردیسی

وہیں پہ ہیں سبھی اپنے نہ تم تنہا نہ ہم تنہا
مگر سب جھیلتے رہتے ہیں اپنے اپنے غم تنہا

کبھی وہ اپنی تنہائی کا شکوہ بھی نہیں کرتے
زباں سے کچھ نہیں کہتے، جو سہتے ہیں ستم تنہا

تمھاری یاد کو، تم کو، تمھاری بے وفائی کو
یہیں سب چھوڑ جائیں گے چلے جائیں گے ہم تنہا

ہمارے بعد تنہائی اگر محسوس ہو تم کو
تو ہم کو یاد کرلینا کبھی باچشم نم تنہا

وہ بزدل ہیں جو غم کی بھیڑ میں گم ہوتے جاتے ہیں
جنھیں خود پر بھروسا ہے، اٹھاتے ہیں قدم تنہا

مجھے مشتاق لہروں کے لیے اک ڈھال بننا تھا
مرے دل نے سہے اس واسطے رنج و الم تنہا

......ا......

اسلم عمادی

سازش ہے اہل فتنہ کی اسلم تمام تر
ناپید ہو بہار کا موسم تمام تر

آبادیوں میں شور شرابا، دخان و دود
دریا میں صنعتوں کے سبب سم تمام تر

اب تم ہمارے ملنے میں حائل ہماری راہ
اوقات الگ ہیں، فرصتیں بھی کم تمام تر

یک سر نرالی طرز کا ملبوس، شوخ و شنگ
آج اس کی وضع فتنۂ عالم تمام تر

گزرا ہے کون دیدۂ گریاں لیے ہوئے
دامن ہوائے دشت کا ہے نم تمام تر

اک چہرہ جو کہ مطلع اظہار سا لگے
گر سوچیے تو پرتو مبہم تمام تر

.....ooo.....

رؤف خیر

○

بے اختیار آنکھ سے نادیدہ دیکھنا
پرکھوں کی جائیداد کو بوسیدہ دیکھنا

دیدہ دلیری سر ہے دیدہ دیکھنا
بے آب آئینے میں ہے غلطیدہ دیکھنا

پانی پہ خد و خال کے سب جھول کھل گئے
کیا کیا ہے اپنے آپ سے پوشیدہ دیکھنا

پردہ عذاب ہے پس پردہ عذاب ہے
مشکل ہے ماورائے دل و دیدہ دیکھنا

بے آب و بے گیاہ علاقے میں آگئے
کیا دن دکھا گیا سر شوریدہ دیکھنا

اک لذت تمام ہے آنکھوں کے واسطے
بے خواب دیکھنا تجھے خوابیدہ دیکھنا

ہم نے سب اپنا درد ہنسی میں اڑا دیا
اچھا نہیں لگا اسے رنجیدہ دیکھنا

پڑتی ہے جب بھی شوخ مناظر پہ یہ نظر
آتا ہے یاد وہ ترا دزدیدہ دیکھنا

تو تو ہے شوخ طبع بلا کا رؤف خیر
تو اک مذاق ہے تجھے سنجیدہ دیکھنا

○

ہم نے کب حرف پس و پیش کا احسان لیا
مان لینا جسے چاہا ہے اسے مان لیا

آنکھ جھپکی تھی کہ سورج تھا سوا نیزے پر
خواب دیکھا کہ مسافت نے برا مان لیا

صاحبو منزل نازک سے گذرنا دیکھو
ہاتھ دامن سے اٹھایا تو گریبان لیا

کہہ دیا تیرے جھجکنے کی ادا نے کیا کیا
حرف ناگفتہ سے ہم نے تجھے پہچان لیا

•••

وقار خلیل

ادارے کی خبریں

یومِ زور ـ کا ادبی اجلاس:

داستانِ دکن کے آخری معلم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانی ادارہ ادبیات اردو کی ۳۳ ویں برسی کے موقع پر ۲۴ / ستمبر ۱۹۹۵ء کو "ایوانِ اردو" میں یوم زور کا اہتمام کیا گیا۔ صدر ادارہ پروفیسر جعفر نظام نے صدارت کی۔ اس اجلاس میں ممتاز ریسرچ اسکالر صاحبان نے کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کے گراں قدر اور نایاب مخطوطات پر مضامین سنا کر داد پائی۔

اجلاس کے آغاز میں کنوینر محمد منظور احمد نے بانی ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی حیات اور علمی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر زور ایک عملی انسان تھے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے اردو زبان و ادب کی خدمت ان کا نصب العین رہا، اور وہ زندگی کی آخری سانس تک اردو کی بے لوث خدمت انجام دیتے رہے۔

پروفیسر جعفر نظام نے صدارتی تقریر میں ڈاکٹر زور کو زبردست خراج پیش کیا اور کہا کہ ادارہ ادبیات اردو آج بھی علمی، تحقیقی اور ترقی کے باب میں بانی ادارہ ڈاکٹر زور کی روایات کو روشن کیے ہوئے ہے۔ اس ادارے کی آبیاری میں ڈاکٹر زور اور ان کے رفقاء کار کا خونِ جگر شامل ہے۔ نئے حالات میں ادارے کی ہمہ جہتی کارکردگی ادارے کے معتمد عمومی پروفیسر مغنی تبسم کی رہین منت ہے، جنھیں ڈاکٹر زور کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ پروفیسر جعفر نظام نے یوم زور کے مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ادارہ ادبیات اردو کے اہم مخطوطات اور نوادر کے بارے میں قابل اسکالر صاحبان نے معیاری مضامین سنائے ہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ ادبیات اردو نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ادارے کا قیام پروفیسر زور کا اہم کارنامہ ہے۔ ادارے کی علمی و ادبی سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم نے ادارے کے شعبہ خواتین کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بطور خاص ذکر کیا اور کہا کہ عن قریب دکنی پہیلیوں پر ایک بین کلیاتی مقابلہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ ادارے کے ترجمان نامہ "سب رس" اور ادارے کے شعبہ امتحانات کی مقبولیت کا بھی ڈاکٹر مغنی تبسم نے خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ ادارے کے ابتدائی امتحانات اردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو انشا عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ کے تعاون سے اردو خواندگی کی مہم کو گھر گھر پہنچانے میں کامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔ اس طرح ان امتحانات کے فارغ التحصیل افراد اردو اخبار اور رسالے پڑھنے کے قابل اور خطوط نویسی کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ادارے کے اردو میوزیم اور کتب خانے کی تنظیم جدید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو دوست ادارے کی بہتری میں اپنے تعاون کا پیش کش کریں۔

یوم زور کے ادبی اجلاس میں پروفیسر اشرف رفیع نے شاہ سلطان ثانی (۱۲۳۸ھ) کے دیوان پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دیوان کے ... اور ... نادر مخطوطات میں اس کی اہمیت لسانی اعتبار سے تسلیم کی جا چکی ہے۔ سلطان ثانی اردوئے قدیم کا ... اور اہم ... پروفیسر اشرف رفیع نے ادارے کے مخطوطات کی اہمیت پر اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کتب خانے کو ...

ریسرچ اسکالرس کی اولین توجہ کی طالب ہیں۔ جواں سال دکنی محقق ڈاکٹر محمد علی اثر نے دیوان ولی اورنگ آبادی کے قلمی نسخے پر اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا کہ یہ مخطوطہ صحب کتابت اور اس کے کاتب ہندی اورنگ آبادی کو ولی کا معاصر بتاتے ہوئے کہا کہ ولی کا یہ دیوان ولی کی وفات کے دس سال بعد کتابت سے آراستہ ہوا جس کے حاشیے پر ولی کے آخری زمانے کا کلام بھی درج ہے۔ اس نسخے کو ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے بھی پیش نظر رکھا اور اس کی قدامت اور صحت کو تسلیم کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال نے خان عالم خان فاروقی مدراسی کے مخطوطے کلام پر وضاحتی مضمون سنایا اور کہا کہ فاروقی (۱۲۰۷ھ) کے ہم اور قادر الکلام اردو فارسی کے شاعر تھے وہ مدراس کے ملک الشعراء مستقیم جنگ نامی کے داماد تھے۔ اس مخطوطے کی لسانی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ علی خاں فاطمی نے ادارے کے محسن نواب عنایت جنگ پر مقالہ پیش کیا اور کہا کہ عنایت جنگ، ڈاکٹر زور کے رفیق اور ادارے کے محسن تھے۔ انھوں نے اپنے نایاب ذخیرہ کتب، فرامین، اسلحہ اور عہد قدیم کی سینکڑوں نادر چیزیں ادارے کو تحفتاً عطا کیں جنھیں ادارے کے میوزیم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر فاطمی نے نواب عنایت جنگ کو حیدرآبادی تہذیب کا نمائندہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ وضع داری اور احترام آدمیت ان کا مسلک تھا، وہ علم دوست، ہنر پرور، امیر ابن امیری نہیں غریب پرور بزرگ بھی تھے۔

جناب سید جلیل الدین ریسرچ اسکالر نے ادارے کے ایک مخطوطے "مرغوب الطبع" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مترجم سید حسین علی خاں، عہد ناصر الدولہ کا ادیب تھا۔ جس نے مشہور رومانی قصہ "کام روپ و کام لتا" کا فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ داستانوں کی قدیم روایات اس قصے میں اپنا تاثر چھوڑتی ہیں، اس کی زبان دکنی ہے اور عام فہم بھی۔ ادارے کے کتب خانے میں حسین علی خاں کی تین اور تصانیف بھی ملتی ہیں۔

جناب محمد منظور احمد کنوینر یوم زور نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔ ایوان اردو کے اس ادبی اجلاس میں ادیبوں شاعروں، اساتذہ اور اسکالرس نے شرکت کی۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے یوم زور کی ریڈیو رپورٹ بھی ۲۴/ ستمبر کے نیرنگ پروگرام میں نشر کی۔

امتحانات ادارہ ادبیات اردو:

ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات اردو ماہر، اردو عالم اور اردو فاضل ۲/ اکتوبر سے ۵/ اکتوبر ۱۹۹۵ء تک (۶۰) مراکز پر ایک ساتھ منعقد ہوئے۔ حیدرآباد میں یہ امتحانات اردو اورینٹل کالج (اردو ہال، حمایت نگر) میں منعقد ہوئے، ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خاں، وظیفہ یاب منتظم شعبہ امتحانات) نے نگرانی کی۔ معتمد اعزازی شعبہ امتحانات پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اور معتمد عمومی ادارہ پروفیسر مغنی تبسم اور صدر ادارہ پروفیسر جعفر نظام کے علاوہ ڈاکٹر محمد انور الدین صدر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی اور جناب محمد سردار حیسم خاں معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے دوران امتحانات اس مرکز کا معائنہ کیا۔ یہ امتحانات اضلاع محبوب نگر، نظام آباد، ملگنڈہ، بودھن، پوچم پاڈ، پانچکٹ، بیکمال، کرنول، گلبرگہ، من پلی (بیدر) نرمل، نارائن پیٹھ، وجارہ، منڈل، سنگاریڈی، جنوب کاکنیاڈہ، کاماریڈی، مدور منڈل، وجارورا، شمس آباد، ورنگل، جانگیر پیرا، (من بوپلی) کے مراکز پر معتمدین مراکز کی نگرانی میں منعقد ہوئے

شعبۂ خواتین ادارۂ ادبیاتِ اردو کا اجلاس :

۲۹ / اکتوبر ۱۹۹۵ء کو ۱۱ بجے دن " ایوان اردو " میں شعبۂ خواتین کا ادبی اجلاس محترمہ بانو طاہرہ سعید کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ ڈاکٹر زینب حیدر نے ایرانی شاعرہ پروین اعتصامی کی شخصیت اور فن پر مقالہ سنایا ۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین نے نثری خاکہ اور پھر اپنا منتخب کلام پیش کیا ۔ مباحثے میں پروفیسر مغنی تبسم ، جناب محمد منظور احمد ، ڈاکٹر حسن ، جناب محمود حامد اور جناب وقار خلیل نے حصہ لیا ۔ محترمہ قمر جمالی نے نظامت کے فرائض انجام دیے ۔

نواب سراج الدین احمد کا جلسۂ تعزیت :

۳۱ / اکتوبر ۱۹۹۵ء کو ساڑھے پانچ (۵-۳۰) بجے شام " ایوان اردو " میں رفیق ادارہ نواب سراج الدین احمد مرحوم (وفات ۲۴ / اکتوبر) کی یاد میں ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام جلسۂ تعزیت منعقد ہوا ۔ پروفیسر جعفر نظام (صدر ادارہ) نے صدارت کی اور کہا کہ نواب سراج الدین احمد مرحوم ، ادارے کے فعال رکن مجلس انتظامی تھے ۔ انھوں نے شعبۂ امتحانات کو بہ حیثیت صدر اپنے گراں قدر مشوروں سے فعال بنایا ۔ مرحوم ایک وضع دار شخصیت تھے اور حیدرآبادی تہذیب کے نمائندہ بھی ۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ معتمد اعزازی شعبۂ امتحانات اور جناب سید رفیع الدین قادری نے مرحوم کی حیات اور شخصیت پر مضامین پڑھے ۔ نواب سراج الدین احمد کے ہم زلف جناب حبیب اللہ نے بھی مخاطب کیا ۔ پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ نے قرار داد تعزیت پیش کی جس میں کہا گیا ہے کہ نواب سراج الدین احمد نے ادارۂ ادبیات اردو کے رکن مجلس انتظامی اور صدر شعبۂ امتحانات کے عہدوں پر فائز رہ کر ادارے کی ہمہ جہتی ترقی میں برابر کا حصہ ادا کیا اور ان کی بے لوث خدمات کے پیش نظر انھیں ادارے کا رفیق بنایا گیا تھا ۔ قرار داد تعزیت دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ منظور کی گئی ۔ جناب محمد منظور احمد رکن مجلس انتظامی نے نظامت کے فرائض انجام دیے ۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا معائنہ اور تاثرات :

ڈاکٹر جیمس نائی (لائبریرین شکاگو یونیورسٹی ۔ امریکہ)

ایوان اردو میں دوسری بار حاضری کے دوران میں خاص طور سے کتب خانہ ، میوزیم کی تنظیم جدید اور کتب خانے کے گراں قدر ذخیرہ اور اسکالرس کے فائدے کے لیے ادارے کے انتظامیہ کے اقدامات سے بے حد متاثر ہوا ہوں ، میری مبارک باد قبول کی جائے آئندہ بھی یہاں آنے اور استفادہ کرنے کا شرف حاصل کروں گا ۔ (۱۷-۹-۱۹۹۵)

[illegible] (ڈائرکٹر [illegible] ریسرچ لائبریری ۔ مدراس)

میں اس ادارے کے مختلف موضوعات پر مشتمل ذخیرہ کتب اور عمدہ انتظامیہ سے متاثر ہوا ہوں ۔ یہ محققین اور دانش وروں کے لیے علم کا [illegible] ہے ۔ (۱۷-۹-۱۹۹۵)

جناب شہاب الدین خاں

ادارہ ادبیات اردو کے ذخیرہ ادب و تہذیب سے بے حد متاثر ہوا۔ کارکنان ادارہ کی خدمات قابل ستائش ہیں جنھوں نے ادب اور نئی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے کو وقف کر رکھا ہے۔

جناب یوسف کمال

ادارہ ادبیات اردو کے شعبوں کو دیکھ کر آنکھیں ششدر رہ گئیں اور بے حد خوشی ہوئی، میری دعا ہے کہ اللہ پاک اس ادارے کو قائم و دائم رکھے۔

جناب شام بارک پوری (بنگلہ دیش)

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں اردو کتابوں اور نادر مخطوطات کا ذخیرہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اب تک کسی پرائیوٹ ادارے میں اتنے اہم قلمی نسخے نظر سے نہیں گذرے۔

جناب یوسف الدین خاں (لندن)

رفیق محترم مغنی تبسم صاحب کی بڑی عنایت ہے کہ ادارہ ادبیات اردو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ قدیم مخطوطات، تصاویر، فرامین کتب کا ایسا نایاب ذخیرہ میں نے اس سے قبل نہیں دیکھا۔ محققین کے لیے یہ ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ موجودہ نسل اور آنے والی نسلیں اس ادارے سے فیض یاب ہوتی رہیں گی، اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، پروفیسر مغنی تبسم صاحب نے جس سلیقے سے ہر چیز ترتیب دی ہے اس کے لیے وہ لائق مبارک باد ہیں۔ (۱۹۹۵-۱۰-۲۵)

جناب محمد عبدالرشید انجینیر (پربھنی)

آج خاص طور سے ادارہ ادبیات اردو میں مہاراشٹرا بالخصوص مرہٹواڑہ کے اردو مدارس اور کالجوں کے تدریسی مسائل پر رہنمائی کے لیے حاضر ہوا تھا۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ اس بہانے "ایوان اردو" اور اس سے متعلق تمام شعبوں اور اس کی سرگرمیوں سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ کتابت سنٹر، اردو میوزیم اور کتب خانے کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کارکنان ادارہ خاموشی اور استقلال سے نامساعد حالات میں ایک یونیورسٹی کی سطح کا کام انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم کی فکر اور عمل اس ادارے کے تابناک مستقبل کی ضمانت ہے۔ اس ادارے کو دیکھ کر اپنے علاقے مہاراشٹرا میں اپنے کام کے سلسلے میں مزید حوصلہ ملا۔ (۱۹۹۵-۱۰-۲۵)

○ ○ ○

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجی جائیں۔ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

نام کتاب: نرمان (مجموعۂ کلام) مصنف: افتخار نسیم

سائز: ۸/اڈیمائی مجلد صفحات: ۱۵۲ قیمت: ڈیڑھ سو روپے

ناشر: ہم خیال پبلیشر فیصل آباد، پاکستان

یہ مجموعۂ کلام افتخار نسیم کی نظموں پر مشتمل ہے۔اس مجموعے کو امتیاز بخشنے والی وہ نظمیں ہیں جن میں افتخار نسیم نے تیسری جنس (جسے ناجنس قرار دیا جاتا رہا ہے اور جو آج کل Gay کے نام سے معروف ہے) کے نفسیاتی اور سماجی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔یہ جنس سماج میں ہمیشہ ملعون و مطعون رہی ہے جب کہ اس خلقی وصف میں اس کی اپنی مرضی اور اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے۔یہ تیسری جنس طعن و تشنیع کا شکار ہی نہیں رہی بلکہ اس پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔آخر اس نام کے لوگوں نے متحد ہو کر اپنے حقوق سماج میں برابری کا حصہ پانے کے لیے تحریک شروع کی۔بہت سے حقوق منوائے۔جد و جہد اب بھی جاری ہے۔

افتخار نسیم نے نہایت جرات کے ساتھ اپنے Gay ہونے کا اعلان کرتے ہوئے اپنے جذبات و خیالات کا برملا اظہار کیا ہے۔اردو میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد شاعری ہے۔A Gay Person ، خاموش اقلیت، نرمان، آج کا دن بھی ایسے ہی گزر گیا، منافقت، میرے بابا، بارش سنگ، تین چہروں والا رقاص جیسی نظمیں اردو شاعری کے قاری کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کرتی ہیں۔ان نظموں میں افتخار نسیم نے یہ احتیاط برتی ہے کہ بات ڈھکی چھپی نہ رہ جائے انھوں نے کنائے سے ضرور کام لیا ہے لیکن استعارے اور علامت سے عمداً گریز کیا ہے۔اپنی انفرادی شناخت پر اصرار کے ساتھ افتخار نسیم نے بحیثیت انسان، عالم انسانیت کے اجتماعی اور مشترکہ مسائل اور تجزیہ پر بھی توجہ مرکوز کی ہے اس مجموعے میں کئی نظمیں ایسی بھی ہیں جن پر ترجیح جنس کی کوئی چھاپ نہیں ہے جیسے قلب ماہیت، میں اندھیرے سے ڈرتا ہوں، ایک بڑے شہر میں حادثہ، کلر بلائینڈ۔

افتخار نسیم کی نظموں کی تحسین ادھوری رہ جائے گی اگر ان میں اظہار کے حسن آرائش، خیال اور صناعت سے صرف نظر کیا جائے۔افتخار نسیم ایک باشعور اور باکمال فن کار ہیں۔ان کے تجربوں میں گہرائی اور گیرائی ہے ان کا مشاہدہ تیز ہے جو اہم اور کارآمد جزئیات کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے یہ وصف ان کی تشبیہ نگاری اور پیکر تراشی میں خاص طور پر نمایاں ہوا ہے۔چند نظموں کے اقتباسات پیش ہیں۔

ایک دیے کی روشنی اس میں
پراسرار دِشائیں

کانپ رہی تھیں دیواروں پر
خواہش کی پرچھائیں

(سفر میں ایک رات کی کہانی)

میرا دشمن خشک لبوں سے
میری جانب دیکھ رہا تھا
جیسے میں اک ابر کا ٹکڑا
اور وہ دھرتی
موت کا منظر کتنا حسین تھا
آخر جھک کر میں نے اس کے
پیاسے لبوں کو چوم لیا

(ایک ذاتی فائیل سے)

ریل اک کالے ہاتھی جیسے
سرپٹ دوڑے جاتی ہے
آنکھ جھپک کر باہر دیکھو
ایک نیا منظر ہوگا
اور اگر سو جاؤ گے تو
سامنے پھر اپنا گھر ہوگا

(ریل کا سفر)

اگر کوئی انگلیاں چٹخاتا
تو دل دھڑکنا ہی چھوڑ دیتا
ہمارے پاؤں تلے سے وقت
ایسے رینگتا تھا
کہ جیسے کوئی مریض خون دے رہا ہو

(میں اندھیرے سے ڈرتا ہوں)

سطح سمندر
پر شکن ہے ایسے
جیسے کوئی بستر پر
ساری رات کروٹیں

بدلتا رہا ہو

(سلک کینوس پر الیسڈرین)

رات کی میز پہ بیٹھا
چاند کے ٹیبل لیمپ کو
روشن کیے
انجانی تحریروں کو
پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں
جہالت کی تیز ہوا سے
کاغذ اُڑ رہے ہیں

(Paper Weight)

ملوں کے دھوئیں اور ڈیوٹی کے اوقات نے
اور قید جدائی نے مل کر ہمیں وقت سے
قبل ہی کتنا بوڑھا سا نادار سا کر دیا ہے
کبھی ہم یہاں مر گئے تو بس اک تار ہو گا
ہمارے گھروں کے لیے ساری محنت کا حاصل

(نیا سال)

پروفیسر نعیم چودھری، ڈاکٹر سلمان اختر، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور انجم سلیمی کی آرا اس مجموعے میں شامل ہیں جن کے مطالعے سے افتخار نسیم کی شاعری کو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت کو متعین کرنے میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ خود افتخار نسیم نے گے تحریک سے اپنی وابستگی اور اپنے تخلیقی رویے پر روشنی ڈالی ہے۔

(مغنی تبسم)

****

نام کتاب: گوپی چند نارنگ اور ادبی نظریہ سازی مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
سائز: ۸/اٹھمائی قیمت: ایک سو پچیس روپے ناشر: ادب پبلیکیشنز، دہلی

اردو میں ساختیات کو متعارف ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ ساختیات فہمی اور ساختیاتی تنقید پر چند نقادوں نے ہی توجہ کی ہے۔ ان میں گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، سلیم اختر، قمر جمیل اور فہیم اعظمی کے نام اہم ہیں۔ ساختیات کا تعارف جیسا کہ ہونا چاہیے ابھی نہیں ہوا۔ اس کے باوجود اس ادبی تھیوری کی تشکیل میں اولیت کے کئی دعوے دار نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب اسی مقصد کے پیش نظر لکھی گئی ہے کہ سب سے پہلے پروفیسر گوپی چند

نارنگ نے ساختیات و پس ساختیات نیز مظہریت، تفہیمیت، ردتشکیل و قاری اساس تنقید کے حوالے سے برسوں کی ریاضت کے بعد اردو میں باضابطہ طور پر اس ادبی تھیوری کی تشکیل کی ہے۔ یہ کتاب پروفیسر نارنگ کے کام کی تفہیم کرتی ہے۔ اس کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں اس انٹرویو کے اقتباسات ہیں جو مصنف نے پروفیسر نارنگ سے چیکو سلواکیہ کے سفر سے لوٹنے کے بعد لیا تھا۔ اس انٹرویو میں پروفیسر نارنگ اس ادبی نظریے کو پیش کرنے میں اپنی اولیت ثابت کرتے ہیں وہ اپنے مختلف مضامین کا حوالہ دیتے ہیں جن میں انھوں نے دوسرے نقادوں سے پہلے اس تھیوری کا تعارف کروایا تھا۔ یہ سچ بھی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے متعدد مضامین صریر، نقوش، دریافت، شعر و حکمت، شب خون، فکر و نظر، کتاب نما، جواز اور سوغات وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر نارنگ یہ بھی انکشاف کرتے ہیں کہ ان کے ہاں لسانیات سے اسلوبیات اور اسلوبیات سے ساختیات اور ساختیات سے نئی ادبی تھیوری تک کے ذہنی سفر کی کڑیاں فطری طور پر ملی ہوئی ہیں انھوں نے یہ سفر ایک جست میں نہیں کیا بلکہ اس کی پشت پر ان کی تیس بتیس برس کی ذہنی ریاضت ہے۔ اس کے بعد والے ابواب میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ پروفیسر نارنگ نے پس ساختیات کے پیش رو رولاں بارتھ کو گہرائی تک جاکر سمجھا ہے اور اس کے نظریے کو کامیابی سے پیش کیا ہے اردو میں انھوں نے پہلی بار ساختیاتی مفکرین ژاک فوکو اور جولیا کرسٹیوا کے نظریات کا تعارف پیش کیا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے دریدا اور اس کے نظریہ معنیٰ سے بحث کی اور انھوں نے دریدا کے نظریہ ردتشکیل یا نظریہ افتراقیت اور بودھی فکر "شونیتا" میں گہری مماثلت دریافت کی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے ساختیاتی رویے اور ردمرکزیت کے اہم حصے قاری اساس تنقید کے نظریے اور اینگلو سیکسن نقادوں کے خیالات سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جرمن فلسفی ایڈمنڈ ہوسرل، ولف گانگ ایزر، جنیوا اسکول کی خدمات، سٹینلے فش، مائکل رفائز، جوتھن کلر نارمن ہالینڈ کے نظریات کا جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر نارنگ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس ادبی تھیوری کو اردو ادب میں برتا بھی ہے۔ فیض کی شاعری، انتظار حسین کے افسانے "نرناری" محمد منشایاد کے افسانے "تماشہ" اور وزیر آغا کے تنقیدی مضمون "عصمت چغتائی کے نسوانی کرداروں" کا ساختیاتی جائزہ بھی لیا ہے۔

پروفیسر نارنگ نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مغرب میں جو نکات آج ساختیاتی، ردتشکیل فکر کے ذریعے سامنے آرہے ہیں ان سے ملتے جلتے نکات ہندستانی فکر و فلسفے بالخصوص بدھ فلسفے میں صدیوں سے زیر غور ہیں۔ غرض ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے پروفیسر نارنگ کے کام کو اجاگر کرنے کے لیے یہ تنقیدی کتاب لکھی ہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ پروفیسر نارنگ کی کتاب "ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کی یہ ایک طرح سے شرح ہے۔ لیکن جیسا کہ خود پروفیسر نارنگ فرماتے ہیں کہ "اردو میں ساختیاتی ڈسکورس ابھی ساخت و پرداخت کی منزل میں ہے اور یہ منزل آسان نہیں اس میں وقت لگے گا۔" ہمیں اس وقت کا انتظار ہے جب یہ ادبی تھیوری پوری طرح واضح ہو کر سامنے آئے۔ ابھی تو اردو نقادوں کے ذہن بھی صاف نہیں ہیں۔ یہ بھی دیکھنا ہے کہ ساختیات نے جو انقلاب مغربی ادب میں پیدا کیا ہے ویسا ہی انقلاب اردو ادب میں بھی پیدا ہوگا؟ یا اسے صرف مغربی تنقید کی ایک ادبی تھیوری سمجھ کر پڑھا جائے گا۔ کیا یہ ادبی نظریہ اردو ادب کا حصہ بنے گا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب آنے والا وقت ہی دے گا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس نظریے کی تشکیل میں اپنی زندگی کے تیس بتیس برس لگائے ہیں اپنا خون جگر صرف کیا ہے ۔ اسے تعصب کی نظر سے دیکھنے اور اس پر اعتراضات کرنے کی بجائے اسے سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہیے ۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی یہ کتاب پروفیسر نارنگ کی پیش رفت پر روشنی ڈالتی ہے اور تنقید کی اس نئی دنیا تک رسائی کا راستہ بھی ہموار کرتی ہے ۔ پروفیسر نارنگ نے جس جگر کاوی سے نئی ادبی تھیوری یعنی ساختیات، پس ساختیات اور رد تشکیل پر ہر زاویے سے نظر ڈالی ہے اس کے پیش نظر اس ادبی نظریہ سازی کے دعوے کا انھیں بجا طور پر حق پہنچتا ہے ۔

(ڈاکٹر بیگ احساس)

****

نام کتاب خوابوں کا سویرا (ناول) مصنف عبدالصمد

سائز ۸/اٹھمائی صفحات ۵۰۸ قیمت دو سو روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

گذشتہ بیس برسوں میں جن افسانہ نگاروں نے نمایاں مقام حاصل کیا ان میں عبدالصمد بھی شامل ہیں ۔ غالباً افسانہ نگاروں کے تخلیقی سفر کے دوران ایک ایسا موڑ آتا ہے کہ وہ ناول لکھنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے ۔ اردو کے بیشتر افسانہ نگاروں نے ناول لکھے ہیں ۔ جدید افسانہ نگاروں نے بھی اب ناول کی جانب توجہ کی ہے ۔ انور خاں، حسین الحق، الیاس احمد گدی، غضنفر اور مظہر الزماں خاں کے ناول شائع ہو چکے ہیں ۔ عبدالصمد نے بہت ہی کم وقفے میں ایک کے بعد دیگرے تین ناول لکھے ہیں ۔ ان کے پہلے ناول "دو گز زمین" پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ بھی دیا گیا ہے ۔ دوسرا ناول "مہاتما" ہے اور تیسرا ناول "خوابوں کا سویرا" ہے "دو گز زمین" کا موضوع بہار کے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی و معاشرتی مسائل تھے ۔ "خوابوں کا سویرا" کا کینوس اور وسیع ہے ۔ عبدالصمد نے وہ سارے مسائل سمیٹنے کی کوشش کی ہے جو آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش ہیں ۔ تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کا گروہوں میں تقسیم ہو جانا ایک گروہ پاکستان کو اپنی منزل سمجھتا ہے دوسرا یہیں رہنے کو ترجیح دیتا ہے ۔ زمین داری کا خاتمہ ۔ جاگیر دار مسلمانوں کا ایک سے زیادہ شادی کرنا، مسلمان بچوں کی تعلیم کا مسئلہ، عیدوں اور تہواروں پر فسادات کا خوف، فسادات میں پولیس کا یک طرفہ رول، جرائم پیشہ افراد کا سیاسی پارٹیوں میں داخلہ اور اعلی عہدوں کا حصول، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، عرب اسرائیل جنگ، بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے بہاری، اردو، شاہ بانو کیس، رام جنم بھومی بابری مسجد غرض ایسے جبیوں مسائل ہیں جن کا عبدالصمد نے اس ناول میں احاطہ کیا ہے اور سارے واقعات اور کردار انھیں مسائل کو ابھارنے کے لیے پیش کیے گئے ہیں ۔ یہ ناول انوار احمد اور ان کے خاندان کے افراد کے اردگرد گھومتا ہے ۔ یہی افراد سارے ہندستان کے مسلمانوں کے مختلف طبقات کی علامت بن جاتے ہیں ۔ ان میں انوار احمد ہیں ایک دیانت دار سیاست داں خود زمین دار ہیں لیکن زمین داری نظام سے نفرت کرتے ہیں ۔ ان کے والد ضمیر احمد نے ایک طوائف سے باضابطہ نکاح کیا تھا ان کی اولاد کو تسلیم نہیں کرتے وہ اقتدار پر اصولوں کو ترجیح دیتے ہیں نتیجے میں وہ اپنے بیٹے کو

اچھے اسکول سے تعلیم نہیں دلوا سکتے اچھے کالج میں داخلہ نہیں کروا سکتے اسے علی گڈھ یونیورسٹی بھیج دیتے ہیں اور جب وہ کالج کی سیاست میں ملوث ہو کر جیل جاتا ہے تو اپنے رسوخ کا استعمال کر کے چھڑاتے ہیں۔ دوسری بار بھی جب آفاق فسادات میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کی کوشش میں گرفتار ہو جاتا ہے تو وہ اسے رہا کراتے ہیں۔ وہ حالات کے بے بس اور خاموش تماشائی ہیں۔ وہ برائی کو محسوس کرتے ہیں لیکن برائی کے خلاف لڑ نہیں سکتے۔ آفاق ہے متوسط طبقے کا نوجوان۔ جس نے اسلامیہ اسکول سے تعلیم پائی اور اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی۔ وہ ایک جذباتی نوجوان ہے۔ علی گڈھ میں جب اس کے والد اسے ضمانت پر چھڑا کر لاتے ہیں تو وہ شدید بے عزتی محسوس کرتا ہے اور دوبارہ علی گڈھ نہیں جاتا تعلیم ترک کر دیتا ہے۔ وہ فرقہ پرستی کے خلاف مورچہ بناتا ہے اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر برسراقتدار پارٹی اسے ٹکٹ دینا چاہتی ہے تو وہ انکار کر دیتا ہے۔ جب اسے فسادات کے دوران گرفتار کیا جاتا ہے وہ پولیس تشدد کا شکار ہوتا ہے تو پھر ایک ذہنی صدمے سے اس کی قوت گویائی چلی جاتی ہے۔ پھر فخرو چاچا کی موت کے صدمہ سے وہ دوبارہ بولنے لگتا ہے۔ وہ بیزار ہو جاتا ہے۔ سیاسی پارٹی میں شامل ہوتا ہے لیکن وہاں کے گھناؤنے پن کو دیکھ کر وہ بیزار ہو جاتا ہے اور کلثوم کے ساتھ شادی کا فیصلہ کرتا ہے اور اس کے ادارے سے وابستہ ہو کر دکھی دلوں پر ہمدردی کا پھاہا رکھنے کا کام سنبھالتا ہے۔ آفاق آج کے عام مسلمان نوجوان کی علامت ہے۔ جن میں حالات کو بدلنے کا حوصلہ تو ہے لیکن ابھی وقت ان کے لیے سازگار نہیں ہوا۔ تجارت اور سیاست پر خود غرض اور حریص لوگ قابض ہیں جن کا مقصد صرف دولت کمانا ہے۔ صابر احمد اور جابر احمد ہیں جنھیں ظہیر احمد کی اولاد ہوتے ہوئے بھی وہ خاندانی وقار نصیب نہیں ہوا۔ وہ وقت کی نبض کو پہچانتے ہیں۔ اپنے بچوں کو دیرہ دون اسکول میں پڑھاتے ہیں اعلی تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجتے ہیں۔ انھیں دولت کمانے کا فن آتا ہے۔ حالات سے سمجھوتہ کرنا بھی وہ جانتے ہیں۔ صابر احمد اپنے بیٹے وسیم کا نکاح کلثوم سے کر دیتے ہیں جو جابر احمد کی بیٹی ہے۔ لیکن وسیم ایک امریکن لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ کلثوم اس نکاح کو نہیں مانتی وہ طلاق کا مطالبہ کرتی ہے اور طلاق حاصل کر لیتی ہے۔ وہ سماجی کام کرنے لگتی ہے۔ صابر احمد یہ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔ پھر وسیم کی انگریز بیوی اسے چھوڑ دیتی ہے تب بھی وہ کچھ نہیں کہتے۔ کلثوم کے کام سے بھی وہ خوش ہیں۔ جب آفاق کلثوم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو بھی وہ اعتراض نہیں کرتے۔ صابر احمد اور جابر احمد کا کردار جہاندیدہ مسلمانوں کا کردار ہے۔ جن میں حالات سمجھنے کی سوجھ بوجھ ہے اور رویے میں لچک ہے وہ اصولوں میں سختی نہیں برتا کرتے۔ فخرو چاچا ہیں۔ جن کے خاندان کے سارے افراد پاکستان جا چکے ہیں۔ وہ ہندستان کی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتے وہ ہندستان اور پاکستان کے ایک ہونے اور والدہ اور بہنوں بھائیوں کے لوٹ آنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ وہ لاولد ہیں لیکن آفاق کو بے حد پیار کرتے ہیں ہر موقع پر اس کی مالی امداد کرتے ہیں۔ قوت گویائی سے محروم ہونے کے بعد جب آفاق ان سے بولتا ہے تو وہ دم توڑ دیتے ہیں۔ کلثوم ایک انقلابی لڑکی ہے جو حالات کا شکار افراد کے دکھوں کا مداوا کرنا چاہتی ہے وہ ناانصافی کے خلاف آواز ہی نہیں اٹھاتی بلکہ اپنے وسائل کے مطابق عملی اقدام بھی کرتی ہے۔ لیکن یہ کردار پوری طرح ابھر نہیں سکا۔ یہی کیا عبد الصمد کے ناول میں کوئی بھی کردار گہرا تاثر نہیں چھوڑتا۔ کیوں کہ یہ سب حالات کی پیداوار ہیں اور ان کی حرکت و عمل کا تعلق واقعات سے ہے۔ عبد الصمد کا یہ ناول کرداری ہے بھی نہیں بلکہ یہ موضوعاتی ناول

ہے اور موضوع ہی اس کی طاقت ہے۔

غرض کہ "خوابوں کا سویرا" میں عبدالصمد نے اپنے عہد کے مسائل کو یک جا کر دیا ہے۔ یہ ناول اپنے عہد کی ایک اہم دستاویز بن گیا ہے۔ اپنے موضوع اور مسائل کی پیشکشی کے باعث یہ ناول یادر کھا جائے گا۔

(ڈاکٹر بیگ احساس)

****

نام کتاب: نقوش تاباں   مصنف: ڈاکٹر سید داؤد اشرف

صفحات: ۱۲۰   قیمت: ایک سو روپے   ناشر: شگوفہ پبلیشر

آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ریکارڈ سے حاصل کردہ مواد کی بنیاد پر لکھے گئے اس کتاب کے مضامین آصف سابع کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جو نہایت سلیس، صاف ستھری اور معروضی انداز پر لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آصف سابع پر عثمان علی خان کا دور علم، سائنس اور آرٹ کی قدردانی کی وجہ سے سنہری دور کہا جاتا ہے۔ ہر مضمون کی ابتداء میں ڈاکٹر داؤد اشرف کا تمہیدی نوٹ اور آخر میں اس داد و دہش کی سرگذشت پر برمحل تبصرے اور نتائج اخذ کرنے کی وجہ سے ان مضامین کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ کتاب کے سارے ہی مضامین سرکاری اسناد سے ماخوذ ہیں اور ریسرچ کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ تمام مضامین عام نوعیت کے مضامین سے بہت زیادہ قیمتی ہیں۔ آخر میں فرامین کے عکس شامل کرنے سے اس کتاب کی تاریخی حیثیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

گوکھلے اسکالرشپ کا قیام، تلگو اکیڈیمی اور ہندو عمارات پر کتاب کی اشاعت کے لیے امداد کی منظوری، دیول اننت گیری و بالاجی کی معاشی بحالی، ہندو ملازمین کو جاتراؤں کے لیے (مسلمان حاجیوں کی طرح) رخصت خاص کی منظوری، اندور کے راجہ کی تحریک پر شیواجی کے خاندان کے ایک مندر کا تحفظ وغیرہ بادشاہ وقت کی فیاضی، بے تعصبی ہندو مسلم رعایا کے ساتھ مساویانہ سلوک کی شاہکار مثالیں ہیں۔ اسی طرح سر۔ سی۔ وی۔ رامن کی قائم کردہ اکیڈمی اور انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس بنگلور کو ۳۱ سال تک مالی امداد جاری رکھنے کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً وزارت تعلیم، صنعت و تجارت، فینانس ارباب حکومت کے جو نوٹ بملاحظۂ عالی کے لیے پیش کئے جاتے رہے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس زمانے میں سائنس کی ترقی، ریسرچ اور تعلیم کے سلسلے میں روشن دماغی اور دوراندیشی کا کیا عالم تھا۔ یہ بات ممکن تھی کہ دفتری راز کی رپورٹوں میں کوئی نہ کوئی ہندو مذہب کے خلاف تنگ نظری اور تعصب کا اظہار کر سکتا تھا مگر حیرت ہے کہ کسی نے بھی ہندو مذہب کے عقائد اور رسومات کے خلاف کسی قسم کے ریمارک نہیں کئے۔

حضور نظام کے زرین کارناموں پر آخری دور کی طوفانی و جذباتی سیاست کی وجہ سے بہت کچھ گرد جم چکی ہے۔ اہل سیاست ان سارے کارناموں کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے اسی آخری دور حکمرانی کو معیار بنائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر داؤد اشرف قابل مبارک باد ہیں کہ موصوف نے بڑی دیدہ ریزی سے ان کارناموں کو قدیم ریکارڈز کی فائلوں کی گرد صاف کر کے انھیں دن کی روشنی دکھائی۔

(آگے ص ۳۰۰ پر)

سن اجرا ۱۹۳۸ء

بہ یادگار سید محی الدین قادری زورؔ

فون: 310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۵۷ — ڈسمبر ۱۹۹۵ء — شمارہ: ۱۲

فی پرچہ	۷ روپے
زرِ سالانہ	۷۵ روپے
کتب خانوں سے	۱۰۰ روپے

مشرق وسطیٰ اور امریکہ	۳۰ ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	۱۵ ڈالر
انگلستان	۱۲ پونڈ

پبلیکیشن اسسٹنٹ: اقبال علوی

ناشر: ادارۂ ادبیات اردو

پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۸۲

کمپیوٹر کتابت: شارپ کمپیوٹرس۔

رمن راج سکسینہ، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے ایس۔ایس۔ گرافکس میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

قارئین "سب رس" کی اطلاع کے لیے

کاغذ کی قیمت اور طباعت کے اخراجات میں غیر معمولی اضافے کے باعث یکم جنوری ۱۹۹۶ء سے سب رس کی قیمت اور زرِ سالانہ میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کا تعاون ہمیں بدستور حاصل رہے گا۔

قیمت فی شمارہ: دس روپے   زرِ سالانہ (عام قارئین سے) سو روپے (کتب خانوں سے) ایک سو پچیس روپے

زرِ سالانہ: مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ: پینتیس ڈالر۔

پاکستان، برما، سری لنکا اور بنگلہ دیش: سترہ ڈالر • انگلستان: پندرہ پونڈ

کتاب: مرزا غالب

تصنیف: ڈاکٹر نتالیا پری گارینا

ترجمہ: اُسامہ فاروقی

باب:11

نوحۂ زنداں

"نہ ہندی خانے سے کترا اور نہ بھیک کے ٹھیکرے سے۔" روسی کہاوت۔

دہلی کالج کی بنیاد ۱۸۲۵ء میں پڑی تھی۔ روایتی اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ یہاں یوروپین درسی نصاب کے مطابق بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ دہلی کالج نے انیسویں کے نصف دوم کی تحریک روشن خیالی کے متعدد ممتاز نمایندے پیدا کیے۔ اردو کے کئی مشہور مصنفوں اور ادیبوں کا بھی اس کالج کے فارغ التحصیل طلبہ میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۸۴۰ء کے دہے کے آغاز میں انگریزی حکومت کے سکریٹری طامسن نے کالج کی تنظیم نو کا کام شروع کیا۔ انھی نے آگرہ سے فارسی کی تدریس کے لیے کسی اعلیٰ درجہ کے ماہر فن کو تلاش کرنے کے لیے کہا تھا۔ یہ یک وقت فارسی کے تین ممتاز ماہرین، مومن خاں مومن، غالب اور شیخ امام بخش صہبائی کے نام تجویز کیے گئے تھے۔ آگے وہ مشہور کہانی شروع ہوتی ہے کہ مرزا کس طرح نوکری کے لیے چلے۔ وہ پالکی میں سوار ہو کر منزل مقصود پر پہنچے اور کالج کے پھاٹک پر سواری سے اتر کر اس انتظار میں کھڑے رہے کہ صاحب سکریٹری ان کے استقبال کے لیے نکلیں گے، مسرت کے اظہار میں ہاتھ اٹھا کر آداب کریں گے، مناسب حال فالسفہ کلمات ادا کریں گے اور شرفا کی تشریف آوری کے موقع پر تعظیم و تکریم کے مقررہ عمل درآمد کی پابندی کریں گے۔ مگر طامسن اپنے دفتر میں بیٹھے عملے کے نئے رکن کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ جب دیر ہو گئی تو انھوں نے دریافت کروایا کہ غالب کیوں نہیں آرہے ہیں۔ غالب نے جواب دیا کہ وہ دستور کے موافق اپنے استقبال کا انتظار کر رہے ہیں۔ مہمان کی تاخیر کی وجہ معلوم ہوئی تو طامسن نے کہا "مرزا صاحب ملاقات کے لیے نہیں، نوکری کے لیے آئے ہیں، اس موقع پر تعظیم و تکریم کا وہ برتاؤ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس پر غالب نے جواب دیا کہ "سرکاری ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔" ان الفاظ کے ساتھ انھوں نے اپنی پالکی کے پردے کھینچے اور ملازمت اختیار کیے بغیر چلے آئے۔ مومن نے بھی کسی وجہ سے ملازمت کی اس پیش کش کو قبول نہیں کیا اور آخر کار امام بخش صہبائی دہلی کالج میں فارسی کے مدرس مقرر ہوئے۔

مدرس کی تنخواہ اچھی خاصی تھی اور غالب کی ماہانہ پنشن کے کم و بیش برابر۔ اس کے علاوہ اپنی ماں کے انتقال کی وجہ سے وہ اس اثنا میں اس قابل لحاظ مالی اعانت سے بھی محروم ہو چکے تھے جو انھیں برابر ملتی رہتی تھی۔

ان حالات میں، جب کہ وہ قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور جب کہ اپنی مالی حالت کو سدھارنے کے کوئی امکانات ان کے سامنے نہیں تھے غالب آداب مجلس اور فالسفہ رکھ رکھاؤ کو اولیت [illegible] دیتے ہیں اور یہ ان کی زندگی میں اپنی نوعیت کا نہ تو پہلا واقعہ تھا اور نہ ہی آخری توقع کی [illegible] کے عمل درآمد کے نقطہ نظر سے اس کا ابھی [illegible] ممکن ہے۔

بجز اس کے کہ یہ قیاس کیا جائے کہ غالب نے بس اپنی رائے بدل دی یا ان کا جی نہیں چاہا کہ تدریس کا پیشہ اختیار کریں۔ تاہم اس خیال کو اس لیے رد کرنا پڑتا ہے کہ، جیسا کہ ہم اوپر بھی ذکر کر چکے ہیں، غالب فطرتاً معلم تھے اور اپنے موضوع پر کمال کی قدرت رکھتے تھے۔ عہد جدید کی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ذات میں زبان کے حقائق کے تعلق سے علمی نقطۂ نظر، استاد کا سلیقہ اور اتالیق کی غیر مصالحت پسندی، سبھی یک جا ہو گئے تھے۔ اس کی شہادت ہمیں ان کی "پنج آہنگ" سے بھی ملتی ہے اور اپنے شاگردوں سے ان کی خط و کتابت سے بھی، مثال کے طور سے تفتہ کے نام، جو بہت لائق شاعر تو شاید نہیں لیکن محنتی اور مستقل مزاج ضرور تھے، اور اسی طرح دوسرے شاگردوں کے نام ان کے خطوط سے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ انھوں نے پالکی سے اترنا گوارا نہیں کیا، اور کیوں لکھنؤ میں، یہ معلوم کر کے کہ ان کی مناسب تعظیم و تکریم نہ ہوگی، وہ نائب السلطنت سے ملاقات کے لیے جانے پر راضی نہ ہوئے؟ تعصبات سے مبرّا، اپنی راہ کے انتخاب میں آزاد، عوام کالانعام یعنی گنوار دل اور اس کے فرسودہ رسوم و رواج سے متنفّر شخص کے روپ اور آداب مجلس کی ایسی غلامانہ پابندی میں قدر مشترک کیسے تلاش کی جائے!

اس زمانے میں جن امور کو قاعدے اور دستور کے مطابق سمجھا جاتا تھا اس میں سے بہت کچھ ہمارے لیے بعید از فہم ہے اور جنھیں قاعدے اور دستور سے انحراف گردانا جاتا تھا اور عملاً اس کا کس طرح سے اظہار ہوتا تھا یہ کچھ اور بھی زیادہ بعید از فہم ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اپنا بے حد نقصان برداشت کرتے ہوئے بھی ان حالات میں (اور ایسے حالات آگے بھی بار بار درپیش آئیں گے) غالب ہمیشہ غیر مصالحت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اور ہمارے لیے یہی کہنے کو باقی رہ جاتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان امور کی غالب کی نظروں میں بڑی اہمیت تھی، اور اگر ایسا ہے، تو ہماری نظروں میں بھی ہونی چاہیے۔

لیکن اس صورت میں عوام الناس اور جمہور کا کیا کیا جائے؟ کیا عہد جدید کے انسانیت پسندوں کے عوام الناس کے تعلق سے رویے کی امتیازی خصوصیت جمہوریت پسندی کا اونچا آدرش نہیں رہا ہے:

شوبرٹ پانی پر اور موزارٹ چڑیوں کی چہچہاہٹ میں،
اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر محو خرام سیٹی بجاتا ہوا گوئٹے،
اور ہیملٹ اپنے جھجکتے ہوئے قدموں سے سوچتے ہوئے،
جمہور کی نبض کی رفتار ناپتے تھے اور جمہور پر بھروسا کرتے تھے۔

غالب کو نواب شمس الدین کے مقدمے کے دوران اپنے تعلق سے عوام الناس کے رویے کا تجربہ ہو چکا تھا، جب کہ رذیلوں سے لے کر اشراف تک، ساری دلی ان کے خلاف ہو گئی تھی۔ لیکن غالب یہ بھی تو بہت اچھی طرح سے سمجھتے تھے کہ رذیلوں اور اشراف کا مجموعہ ہی تو عوام الناس ہے۔ طبقات میں بٹے ہوئے معاشرے میں، جس میں اس وقت تک متاخر جاگیردارانہ تعلقات برقرار تھے، رذیلوں کا طبقہ، بازاری لوگ اور چھوٹے دکان دار ہزاروں رشتوں کے ذریعے اشراف سے، سربرآوردہ علما، زمین داروں، جاگیرداروں، سربرآوردہ تاجروں اور جاگیردارانہ سماج کے روداروں کے دوسرے طبقوں سے جڑے ہوئے تھے۔

خصوصیت ظاہر کرنے والی ایک بات یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں جمہور، سماجی طبقے اور سماجی ماحول کا تصور نہیں پایا جاتا۔ شاعر اپنی تقدیر، اپنے دل آشفتہ، رقیب کی ریشہ دوانیوں، محبوبہ کی جفا سامانیوں اور بالآخر خدا کے روبرو یکّا و تنہا ہے۔ اس کے جہان شاعری میں ایک گروہ، ایک جماعت عشاق اور حرماں نصیبوں پر مشتمل ہے اور لاتعلق ان کی ضد اور ان کے مقابل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سماج بالعموم شاعر کی بصیرت کو قبول نہیں کرتا، اس کی لیاقت کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کی کسی

بھی ترنگ کو سمجھ نہیں پاتا:

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

اور اس کے باوجود معدِ یلشتام کے مفہوم میں غالب کا رخ عوام کی طرف ہے۔ اگر یہ دنیا فریبِ نظر ہے، اگر یہ عالمِ حقیقی کا محض ایک عکس ہے تو خلقِ خدا اور جہانِ آفریدہ میں حقیقت مضمر ہے اور اس جہان سے یک جائی کی تلاش میں انسان حقیقت کا راستہ پاتا ہے۔

ہر گو نہ حسرتے کہ ز ایام می کشیم	آلام وہ جو گردشِ ایام سے ملے
دردِ تہہ پیالۂ امید بودہ است	دردِ تہہ پیالۂ امید بن گئے
حق را ز خلق جو کہ نو آموز دیدرا	حق کو ہمیشہ خلقِ خدا میں تلاش کر
آئینہ خانہ مکتبِ توحید بودہ است	موزوں یہی ہے تجھ سے نوآموز کے لیے

(ترجمہ: مضطر مجاز)

بعد کی پیڑھیوں کے شعرا نے اپنی تخلیقات کے کرداروں اور میرانِ افسانہ میں افراد کو عوام، قوم اور سماج کی علامت کے طور سے دیکھنا سیکھ لیا۔ لیکن دیکھنے کے اس ڈھنگ کی بنیاد غالب کی شاعری میں احباب کے روپ میں پڑتی ہے۔ غالب کے کلام میں ان احباب ہم نوا کا ذکر نام بہ نام ملتا ہے، یہ ایک مسلمہ طریق شاعرانہ ہے اور ظاہر ہے کہ صرف اس بنیاد پر اس موضوع کے تعلق سے غالب کے کسی نئے رویے کے بارے میں کہنا مشکل ہوتا۔ مذکورہ موضوع کو نئے ڈھنگ سے برتنے کے لیے احباب کے تعلق سے ایک نئے رویے کی، ان کو فنِ شعرگوئی میں اپنے ہم خیالوں کی حیثیت سے دیکھنے کی ضرورت تھی، اس احساس یگانگت کو پیدا کرنے والے دوستی کے ایک ایسے نئے اجتماعی پیکر خیالی کی ضرورت تھی جو جاڑوں کی شام میں آگ تاپنے کے لیے یا کسی خوشی کے موقع پر مل کر جشن منانے کے لیے اکٹھا ہونے والے دوستوں کی بے تکلف محفل میں پیدا ہوتا ہے یا پھر اس دوست سے ملاقات کے موقع پر جس نے ایک زمانے میں شاعر کے کلام کے میرِ افسانہ کے ساتھ دکھ سکھ بانٹے تھے۔

ہمدم روزِ گدائی سبک از جا برخیز۔	اے میرے افلاس کے مونس جلدی جلدی اٹھ کر جا
جاں گرو، جامہ گرو، رطلِ گرانے بہ من آر	جان و جامہ کر کے گرو اک رطلِ گراں میرے لیے لا

(ترجمہ: مضطر مجاز)

غالب کے ملاقاتیوں کا اور ان لوگوں کا دائرہ جن سے غالب کی خط و کتابت تھی (جس کے بارے میں ہم صرف ان خطوط سے کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں جو ضائع ہونے سے بچ گئے) یعنی غالب کے احباب کا دائرہ بے حد وسیع تھا۔ اور بلاشبہ ان کی شاعری کو پسند کرنے والوں کی تعداد بھی بہت بڑی تھی۔ غالب نے ۱۸۴۱ء میں اپنا "دیوانِ اردو" جمع اور شائع کیا جو دراصل بڑی احتیاط سے منتخب کیے ہوئے اشعار کا مجموعہ ہے، جن کا قابلِ لحاظ حصہ ان کے ابتدائی عہد کے کلام پر مشتمل ہے۔

اسی زمانے میں انھوں نے اپنے "دیوانِ فارسی" کی اشاعت کی تیاری بھی شروع کی۔ ۱۸۳۰ء ہی میں فارسی کی تبدیل شدہ حیثیت کے باوجود، دلی کے ادبی حلقوں کی ذولسانیت برقرار تھی۔ اس زمانے میں، جیسا کہ عرشی بتلاتے ہیں، شہر میں اور لال قلعے میں پابندی سے ہر ماہ کے آخری جمعہ کو اور بعد میں مہینے میں دو بار بھی، مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔

۱۸۴۳ء کے موسم بہار اور گرما میں منعقد ہونے والے بعض مشاعروں کے بارے میں غالب کی اطلاعات دست یاب ہیں۔ شیفتہ کے نام خط میں غالب مارچ کے مشاعرے کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں: "جمعہ کا دن جب رات میں بدل گیا تو بزم سخن آراستہ کی گئی۔ چوں کہ میں نے مشاعرے کے لیے غزل نہیں کہی تھی تہی دستی کی شرم کے باعث میں سر بہ گریباں تھا۔ لیکن نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کہ ایزد تعالیٰ ان کو سلامت رکھے دو فرشتے میرے لیے مقرر کر دیے یعنی زین العابدین خاں عارف اور غلام حسین خاں محو۔ یہ دونوں بہرام اندیشہ گرفتہ میرے خلوت کدہ تنہائی میں آئے اور ہاتھی لے کر آئے اور جیسا کہ شیر کو شکار کر کے ہاتھی کی پشت پر بار کر کے لے جاتے ہیں مجھے انجمن میں لے گئے۔" آگے غالب پہلے سے دی گئی طرحی زمین میں غزل خوانی کا ذکر کرتے ہیں: "میرے دوستوں میں سے زین العابدین خاں عارف اور جواہر سنگھ جوہر نے زمینِ طرح میں دو غزلیں پڑھیں اور دلوں پر اپنی نغزگوئی کا نقش بٹھا دیا۔ میں نے وہ غزل پڑھی جو اسی دن کہی تھی اور نغمہ سرا ہوا:

صبح شد ، خیز کہ روداد اثر بنمایم
چہرہ آغشتہ بہ خون دل جگر ، بنمایم

صبح ہوئی روداد شب ہجراں کا اثر بھی دکھلاؤں
خونِ جگر سے چہرہ جو آلودہ ہے وہ جتلاؤں

(ترجمہ: مضطر مجاز)

مشاعروں میں غزلیں دونوں زبانوں میں پڑھی جاتی تھیں۔ اس دور میں غالب ایک حد تک جان بوجھ کر اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اردو غزلیں ان میں اکتاہٹ کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ "کل کہ ستارۂ ناہید (بدھ) کا دن تھا، بعد شام میں حضرت آزردہ کی بزم میں بار یاب ہوا۔ اس سے پیش تر کہ حرف مدعا میری زبان پر آتا میں نے رنجوری کے آثار کو اپنے مخدوم کی پیشانی پر آشکار پایا۔ نزلے زکام کی شکایت تھی اور اس کا اظہار ہوا تھا کہ کئی راتیں انھوں نے جاگتے ہوئے گزاری ہیں۔ مختصر یہ کہ مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے، مجھے جانے کی رخصت دی۔ میں نے مشاعرے میں بہت سے ریختہ گویوں کا مجمع دیکھا۔ لمبی لمبی غزلیں ان لوگوں نے پڑھیں، یہاں تک کہ جب میں گھر واپس آیا اور بستر پر لیٹا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ غزل خوانی کے سلسلے میں جب مجھ تک نوبت پہنچی تو میں نے "ملک نہ خواست، فلک نہ خواست" زمین میں کہی ہوئی اپنی غزل سنائی اس کے بعد طرح پر انشاء کی ہوئی فارسی غزل پڑھی۔" (ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی)۔

بہ تسلی ز وعدہ چوں باور ز صوابم نمی آید
بتوے گفت می آیم کہ سیرابم نمی آید
دلش خواہد کہ تنہا سوئے من رو نے آورد لیکن
فریب ہم زباں داشتم زیادانم نمی آید
دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمی آید
نہ دارم بادہ غالب گر سحر کاش سر راہے
بہ بینی مست ، دانی کز شبستانم نمی آید

تسلی وعدے کی کیا ہو، مجھ کو باور ہی نہیں آتا
کیا اس طرح وعدہ کاش کہ مجھ کو یقیں آتا
دل اس سے چاہتا ہے آئے تنہا وہ مری جانب
کہ دے کر ہم زبوں کو جل مرا تا واں نہیں آتا
دبیر و شاعر و رند و ندیم ، اللہ ! کیا کیا ہوں ،
مجھے فریاد پہ رحم آئے ، رونا ہی نہیں آتا
نہیں ہے بادہ غالب ، صبح دم گر مست اسے دیکھو
کہو لیتا کہ وہ میرے شبستاں سے نہیں آتا

(ترجمہ: مضطر مجاز)

مشاعروں میں عموماً غالب سے بہت قریبی تعلق رکھنے والے، ان کے شعر گو احباب اور ان کے شاگرد اکٹھا ہوتے تھے۔ ۲۶/ مئی ۱۸۴۳ء کے مشاعرے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "جمعہ کا دن تھا جب بزم سخن کی نوید سامعہ افروز ہوئی۔ شام کے وقت وہی دو مبارک فرشتے دروازے سے آئے اور مجھے اپنے ساتھ اس انجمن میں لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی کی طبیعت ناساز تھی اس لیے وہ نہیں آسکے۔ حضرت آزردہ کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا گیا۔ اگرچہ دیر سے آئے لیکن ان کی آمد نے میرے دل کو صفا اور میری زبان کو نوا بخشی۔ اس بندۂ عاجز کو "گر نیستی، والی

زمین میں قصیدہ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ اس بستی کو واپسی پر حافظ کی طرح واپس سے جلال اور عجم کے لوگوں کو دوسری میں جلا وطن کردوں۔ حضرت مقدسہ کے آنے سے میرا دل بڑھ گیا اور میری زبان کو ذوق سخن کی اجازت مل گئی۔ سحابی بھی بن بلائے وہاں حاضر تھا۔ اور اس زمین پر گرجتی۔ میں یا بی سے ایک غزل کہی تھی۔ جب میرے قصیدے کو تو شہر مدد ہوا اور کبھی ہوئی اپنی غزل کے چند اشعار سنا کے واپس بات کیا۔ اگر چند لا کر تو برا تھا ہوا۔

اب وقت آگیا ہے کہ اگر غالب کی تخلیقات کے نہیں تو بہرحال اپنی تخلیقات کے تعلق سے ان کے رویے کے ایک مخصوص پہلو کا ذکر بھی کیا جائے۔ ان کے اپنے خطوط، اقوال اور شعری اعلانات اس امر کے غماز ہیں کہ اس دور میں بظاہر وہ اردو شاعری کی طرف کوئی خاص لگاؤ نہیں محسوس کرتے تھے۔ یہ بات عجیب بھی ہے اور ناقابل تشریح بھی، کیونکہ ہندوستان میں فارسی کی جڑیں کٹ چکی تھیں، اور دربار نیز عوام شاعری کے سرپرست بادشاہ، دونوں نے، خوشحالی دیکھے ہوئے، اردو شاعری کی ترقی کا راستہ اپنا لیا تھا۔ غالب نے ابھی ابھی اپنا "دیوان اردو" شائع کیا تھا، جس کا پاتعلق لوگوں نے پرجوش استقبال کیا تھا۔ اس کے باوجود اس دور میں غالب اپنے فارسی کلام ہی کو ترجیح پر اصرار کرتے رہے ہیں تو یہ ہے کہ اس میں شاید غالب اور فنکی کی اس روایت کو کچھ کم اہمیت حاصل نہیں تھی جو اب وقت میں ایک مخصوص شکل اختیار کر رہی تھی۔ غالب اس امر پر زور دینا چاہتے تھے کہ دہلی میں شاعری، جو غالب کے لیے باعث فخر ہے، وہ غالب کے لیے بالکل دوسرے درجے کی چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کو اپنی اردو شاعری کی عظمت کا ادراک نہیں تھا۔ اور اس کے باوجود ان کا اصرار تھا کہ فارسی کلام ان کو زیادہ عزیز ہے۔ یہ ہوسکتا ہے یہ اس صاحب بصیرت کی ایک ترکیب ہو جو اپنی شاعری کے دھارے کو دریاؤں کے ساتھ ایک ایسی گرداب میں بہا رہا تھا، جس کے لیے، جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، سوکھنا مقدر تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ غالب بھی ایک ہندوستانی ہی کے بارے میں یہ سوچتے رہے ہوں، بلکہ ان کے ذہن میں یہ بات رہی ہو کہ ان کے کلام کی گونج ساری فارسی کی دنیا میں سنائی دے گی اور لوگوں کے درمیان جن کے لیے ان کے اپنے ادب کی زبان پہلے کی طرح فارسی ہی برقرار رہے گی۔ کیونکہ اور ایک پچاس سال بعد ہندوستان میں اقبال نمودار ہوتے ہیں جن کا بیسویں صدی کے آغاز کے ہندوستان میں فارسی کی طرف رجوع بھی ناقابل تشریح تھا۔ یہ شمول ہوا غالب کے ان چند بچے کھچے معاصرین کا جو اس وقت تک بقید حیات تھے یہ دعویٰ بھی تھا کہ مرزا غالب کی روح اقبال میں حلول کر گئی ہے۔

جو کچھ بھی کیوں نہ ہو، غالب ۱۸۳۰ء سے فارسی میں اپنی شعری تخلیقات کے قلمی نسخے جمع کرنا شروع کرتے ہیں اور اپنے فارسی کلام کا "دیوان" ۱۸۴۵ء میں شائع کرتے ہیں۔ اسی زمانے سے وہ اشعار بھی نسبت رکھتے ہیں جن کا تعلق نکتہ چینوں اور اولاً فنی کی طرف ہے۔ ان میں غالب اپنے فارسی کلام کو ترجیح دینے کی بات کرتے ہیں۔ غالب اپنا موازنہ ورنی مانی کے پیغمبر مانی سے کرتے ہیں، جسے ادبی روایات کی رو سے ایک عظیم مصور بھی مانا جاتا ہے، کیونکہ دین مانوی کی کتابیں نہایت عمدہ تصویروں سے مزین کی جاتی تھیں۔ روایت ہے کہ کسی زمانے میں ان تصاویر کا ایک مرقع یا ماتی کی جلا ہوئی تصویروں سے مزین ایک تصویر خانہ بھی موجود تھا۔ کبھی ان دونوں کو ایک ساتھ ارژنگ وار تنگ کا نام دیا جاتا ہے اور کبھی، جیسا کہ ہم غالب کے ہاں دیکھتے ہیں، مرقع کو ارژنگ کا نام دیتے ہیں اور تصویر خانے کو ارتنگ کا۔

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتہ	تو نے جو بزم شہنشاہ سخن رس میں کہا
کہ بہ پرگوئی فلاں در شعر ہمسنگ منست	کہیں نہ ہو پرگوئی میں اک شخص وہ ہمسنگ مرا
راست گفتی لیک سودائی کہ دہ بود جلسہ خویش	ٹھیک ہی کہا ہے مگر یہ بھی کوئی شخص نہیں
کم ترازو بانگ دل کر خرد جنگ منست	کم تر ہے بانگ دل سے ہو دف و چنگ مرا

نیست نقصان یک دو جزو است ار سواد ریختہ
کاں دوام برگے ز گلستانِ فرہنگِ منست
فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ منست
فارسی بین تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال
مانی وارژنگم و آن نسخہ ارتنگ منست
کے درخشد جوہر آئینہ تا باقیست زنگ
صیقلِ آئینہ ام این جوہر آن زنگِ منست
دشمنی را ہم فنی شرط ست و آن دانی کہ چیست
از تو نبود نغمہ در سازے کہ در چنگ منست
مقطعِ این قطعہ نیز مصرعِ مصرعِ یاد و بس
ہر چہ در گفتار فخرِ تست آن ننگِ منست

ایک دو جزو کا دیواں ہے تو کچھ حرج نہیں
بے رطب حرف وہ ، دیکھے جو تو فرہنگ مرا
فارسی دیکھ ! کہ سب نقش ہیں رنگیں اس کے
چھوڑ اردو کہ ہے مجموعۂ بے رنگ مرا
فارسی دیکھ ! کہ اقلیم تخیل کا میں
مانی ، ارژنگ ہوں ، وہ نسخہ ہے ارتنگ مرا
زنگ رہ جائے تو آئینہ کہاں چمکے گا
صیقل آئینہ ہے یہ تو وہ ہے زنگ مرا
ہم فنی شرط حریفی ہے ، وہی غالب ہے
نغمہ ور کون ہے ، چھیڑے جو یہاں چنگ مرا
مقطع اس قطعہ کا یہ مصرعِ لاثانی ہے
باعث فخر ترا ، ہے سبب ننگ مرا

(ترجمہ: مضطر مجاز)

غالب اپنے دشمن بھی آسانی سے پیدا کر لیتے تھے اور اس امر کو وہ بہ خوبی جانتے بھی تھے:

مجمل زراستی خویش می تو ان کردن (میری صاف گوئی اوروں کی رسوائی کا باعث بن رہی ہے

ستم بہ جان کج اندیش می تو ان کردن
تو صبح باش کہ مارا درین پریشانی
شکایتے ست کہ با خویش می تو ان کردن

اس سے جھوٹ کے دلائل بھی بے اثر ہو جاتے ہیں
ہمارے شکوے تجھے اندیشے میں نہ ڈالیں
اپنی مصیبتوں کے لیے الزام ہمیں خود ہی کو دینا
چاہیئے)

لیکن اپنے احباب پر ان کو پورا بھروسا تھا اور اپنے اشعار میں وہ ہمیشہ ان کی مدح سرائی کرتے ہیں:

رشک برتشنہ تنہا روِ وادی دارم
نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزم شان
اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم
چہ بما منتِ بسیار نہی از کم شان
ہند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود
باد در خلوتِ شان مشک فشان از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالبِ سوختہ جان گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدم شان

رشک آتا ہے مجھے تنہا رو وادی پر
بچ تو یہ حرم آسودہ یہ زمزم نوشاں
چھوڑ ان خستہ دلوں کو جو ترے دام میں ہیں
ان کے دکھ درد سے ، افسوس ! تو واقف ہے کہاں
ہند میں ایسے بھی ہیں خوش نفس ارباب سخن
جن کے دم سے ہوئی جاتی ہے ہوا مشک فشاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی ہی نہیں
حسرتی اشرف و آزردہ اعظم بھی ہیں یاں
ان کا اس بزم میں یہ ہم نفس و ہم دم ہے
غالب سوختہ جاں کچھ بھی نہیں ورنہ میاں

(ترجمہ: مضطر مجاز)

حسرتی مصطفیٰ خاں شیفتہ کا وہ تخلص ہے جو انھوں نے فارسی میں اختیار کیا تھا۔ ایک اور غزل میں اس شریف النفس انسان کے تعلق سے احترام کے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

فن کارانہ انداز سے ان کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ کس طرح سے اور کس حد تک اس کے کردار ان تبدیلیوں سے متاثر ہوتے ہیں
وہ تہذیبی تبدیلیوں کو یوں بیان کرتے ہیں:

"تین مرتبہ امیر گھرانوں پر مغربی تمدن کی لہریں اٹھ چکی ہیں۔ پہلے تو غدر کے بعد سر سید کے زمانے میں قابل جنگ اور مشہور الملک نے اسی زمانے میں اپنی معاشرت بدلی۔ یہ اس قسم کی مغربیت تھی جیسے ترکی اور مصر کی مغربیت آج بھی انگریزی پہناوے، انگریزی کپڑے، ڈرائنگ، لڑکیوں کے لیے فراکیں، گھر میں ہر ایک کے لیے ڈارلنگ کتے، انگریزی کھانا، شراب، ٹیلر، کرسچین آیائیں۔ غرض صاحب لوگ بننے کی تحریک۔"

مغرب کی وہ دوسری لہر اپنے ساتھ جو تبدیلیاں لائی تھی۔ اس نے حیدرآبادی تہذیب کو یوں متاثر کیا تھا:

"دوسری مرتبہ مغربیت کی جو یورش ہوئی اس نے اندر سے بدلنا چاہا۔ اس کے ساتھ قوم پرستی، خودداری، وقار اور مغرب کے ادب، علوم و فنون، سائنس وغیرہ کی اہمیت۔ اس دوسری طرح کی مغربیت کا ہمارے ناول کے کرداروں پر کم اثر پڑا کیوں کہ اس دوسرے دور کی داخلی مغربیت کے ساتھ ساتھ وہی انگریزی کپڑوں، بول چال، کلب، ناچ، وہسکی اور سوڈے کا ایک ریلا بھی آیا جو ہمارے کرداروں کو بہالے گیا۔"

مغربیت کی تیسری لہر جو حیدرآباد میں یوں داخل ہوئی:

"تیسری اور آخری مغربیت۔ اسے مغربیت کہیے یا مزدکیت یعنی اشتراکی آزاد خیالی۔ یہ تحریک پھیلی تو سہی مگر کشن پلی تک محض ایک ذہنی فیشن بن کر آئی۔ اس نے ہندوستان کے عوام میں انقلاب پیدا کیا ہو یا نہ ہو ہمارے قصے کے افراد کو اس سے سروکار نہ تھا اور نہ اب ہے۔"

اس طرح "ایسی بلندی ایسی پستی" میں وسیع کینوس پر زندگی کی تبدیلیوں کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہ ایک دور کی ایک تہذیب کی اور ایک تمدن کی تاریخ ہے۔ ناول نگار کو اس پس منظر میں زندگی کے ڈرامے کو پیش کرنے پر بے حد قدرت حاصل ہے۔ جو ناول میں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ خورشید زمانی بیگم نے فرخندہ نگر کی معاشرت میں ایک انقلاب کا آغاز کیا۔ انقلاب کا آغاز ان کی شادی کے واقعے سے ہوا۔ واقعہ صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی شادی میں خود مہمانوں کی خاطر داری کر رہی تھیں۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

"آج بھی ہندوستان بھر کے اور ہر شہر کی طرح فرخندہ نگر میں دلہنیں گھونگھٹ نکال کے، آنکھیں بند کرکے بیٹھتی ہیں۔ آج بھی مانجھے کے بعد کی تکان اور مستقبل کی وحشت اور اشتیاق سے ان کے حواس مجتمع نہیں ہوتے۔ آج بھی آرسی مصحف ہوتا ہے اور بھی رسمیں ہوتی ہیں اور رسمیں نہیں بھی ہوتیں تو یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ دلہن اپنی ہی شادی میں مسکراتی ہوئی، فیشن ایبل ساڑی پہنے، ہیر آنے والے کا استقبال کرے۔۔ خورشید زمانی کی والدہ گریس اسکروتھیں جو بعد میں سکندر بیگم بنی۔ یہ ان ہی کی انقلابی جدت تھی: "اپنی سوتیلی بیٹی کو بجائے دلہن بنا کے سکڑا سمٹا کے تار ہانے کا لفافہ بنا کے بٹھانے کے، انھوں نے زنانہ محفل کی پری بنایا تھا۔ مگر وہ زمانہ بھی تو ایسا تھا کہ انگریزوں کی ہر بات، ہر رسم، ہر رسمت تو بے حد اچھی تھی یا بے حد بری، یا؟ مہذب ہونا تھا یا کرسٹان ہونا۔ تلک اور گوکھلے تو خیر منظر عام پر آچکے تھے۔ لیکن ابھی کسی نے گاندھی (جی) کا نام بھی نہ سنا تھا اس زمانے میں تہذیب کے معنی تھے کنگ ایڈورڈ کے عہد کے سوٹ، عورتوں کے لیے فراکیں، آکس ہنگ، کبھی کبھی شراب بیر الکوڈ، بنگلہ۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ صاحب بہادروں کو بھی "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ سننا پڑے گا۔ پاکستان کا نام بھی کتم عدم میں تھا۔ اور پی سی جوشی تو ایک طرف لینن کا نام بھی قابل جنگ مشہور الملک یا سر تاج الملک نے نہیں سنا تھا۔"

آج کی اصطلاح میں پرانے شہروالیاں اس جدت کو دیکھ کر حیران ہو گئیں۔ ان کے تبصرے ان کی اپنی زندگی اور فکر کے غماز تھے۔ بیک وقت دو تہذیبی دھارے ایک ساتھ چلتے ہیں۔ عزیز احمد اسی کو نمایاں کرتے ہیں:

"شکر موں والیوں کے تبصرے سننے کے قائل تھے۔" یہ نواب لوگاں بڑے لوگاں پونیوں کو میماں بنالیے۔ دیکھو ناجی پڑھ لکھ کر فراقاں، بھتیاں۔ اب یہ ایک ایک ہور نئی بات دیکھو۔ اپنی شادی میں خودچ انتظام کرنا ہنسنا، کھل کھل کر دانتاں نکال کو، یہ بڑھ بڑھ کو باتاں کرنا۔ یہ سوب قیامت کے آثار ہیں۔"

خورشید زمانی بیگم تو خود اپنی شادی میں میم بنی پھرتی رہیں لیکن جب اپنی لڑکی کی شادی کا وقت آیا تو اسے "تار بانے کا لفافہ" پہننے پر مجبور کیا۔ عزیز احمد متضاد تہذیبی عناصر کو پیش کرکے اس کشمکش کو دکھاتے ہیں جو دو تہذیبوں میں ہو رہی تھی۔ یہ تہذیب نہ تو پوری مشرقی تھی نہ مکمل مغربی۔ بلکہ دونوں عناصر سے مل کر ایک تہذیب نمایاں ہو رہی تھی۔ اس ناول کی ہیروین اسی تہذیبی کشمکش کی پروردہ ہے:

"زمانے نے کیا عجیب الٹی ترقی کی تھی۔ ترقی کی پہلی رو کا زور ختم ہو چکا تھا۔ اور دوسری رو جس میں وہ خود بہنے والی تھی ابھی زور پکڑنے نہیں پائی تھی۔ خورشید زمانی بیگم تو اپنی شادی کے دن خود مہمانوں کی خاطر تواضع کر رہی تھیں اور وہ تھی کہ نسبت سے پہلے جب پیام بھیجنے والے اسے دیکھنے آئے تھے الووں کی طرح آنکھ بند کیے بیٹھی تھی۔ کانونٹ میں اور پھر بیچ گئی میں پڑھ کے ممی کو یہ سب نخرے کیا ضرور تھے۔ مگر سسرال والے پرانے خیال کے تھے اور خورشید زمانی بیگم نے سوچا جب اکیک ویسا لین دین۔"

تمدنی اور تہذیبی پس منظر اور حقیقی سماجی حالت کو پیش کرکے عزیز احمد نے اپنے ناول کو تاریخ بنا دیا ہے۔ کانراڈ نے کہا ہے کہ اگر ناول انسانی تاریخ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر وہ تاریخ سے زیادہ ناول کو اہمیت دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ ناول مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ سماجی مظاہر اور اس کے حقیقی طور طریقوں کو پیش کرتا ہے۔ اس کے برخلاف تاریخ دوسروں کے تاثرات اور دستاویزات پر لکھی جاتی ہے۔ اس لیے اس کا کہنا ہے چوں کہ ناول راست طور پر زندگی سے حاصل کردہ مواد پر استوار ہوتا ہے اس لیے وہ زیادہ سچا اور حقیقی ہوتا ہے۔ ناول نگار ایک ایسا مورخ ہے جو انسانی تجربات اور مشاہدات کو محفوظ رکھتا ہے، ان کو بیان کرتا ہے اور ان کی توضیح اور تشریح کرتا ہے۔ وہ تاریخی اور تہذیبی تبدیلی کو انسان کے احساس اور شعور کے آئینے میں یوں دکھاتا ہے:

"نوری ڈارلنگ یہ کس کی غلطی ہے۔ میں اٹھارہ سال کی ہوں اور اردو نہیں بول سکتی۔ تم سے اس وقت انگریزی میں باتیں کر رہی ہوں۔ تمھاری اردو پر مجھے رشک آتا ہے۔ مجھے کلمہ پڑھنا نہیں آتا۔ میں نے عمر بھر کبھی نماز نہیں پڑھی۔ بتاؤ یہ کس کی غلطی ہے میری یا ممی اور پپا کی۔ اب جیسی میں ان کے بنانے سے بن گئی ہوں... مجھ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ جس کے ہاتھ میں میرا ہاتھ پکڑا دیں اور جس سے مجھے محبت ہے اسے میں ان کے مسلمان اجنبی کے لیے چھوڑ دوں تو بتاؤ یہ ظلم ہے کہ نہیں۔"

ناول نگار انسانی تجربات کو سمیٹ کر اس طرح پیش کر دیتا ہے کہ حقیقی زندگی اپنی تمام تر جزئیات سمیت قاری کی آنکھ کے سامنے آجاتی ہے۔ مورخ ٹھوس خارجی واقعات کو بیان کرتا ہے لیکن ناول نگار زندگی کے داخلی احساسات تک بھی رسائی حاصل کرتا ہے۔ وہ مختصر طور پر کسی کی شخصیت کو اس طرح سے نمایاں کر دیتا ہے کہ تاریخ کے صدہا صفحات بھی اس کی شخصیت کا پوری طرح احاطہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد حیدرآبادی تہذیب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تصویر یوں ابھرتی ہے:

"دوسرے دن نواب مہدی یار جنگ دیوان اور نائب السلطنت راجہ راجایاں راجہ شجاعت شمشیر سنگھ بہادر کے ملاحظے میں کاغذات پیش کر رہے تھے اور راجہ راجایاں دستخط کرتے چلے جاتے تھے۔ بھوؤں کے اندر ان کی آنکھیں بوڑھی تھیں پتلیوں کے پیچھے ریڑھ کی ہڈی بوڑھی تھی۔ اور اگر بیڑی کا طلب نہ ہوتا تو کمر جھک جاتی۔ راجہ راجایاں راجہ شجاعت شمشیر سنگھ کی عمر اسی سال تھی۔ جب نواب مہدی حسن یار جنگ کی تمام تجویزوں پر دستخط کر چکے۔ جن میں سبھی قسم کی کاروائیاں تھیں۔ روزمرہ

کے احکامات کی، ترقی، تنزل، تبادلے، اسکیمیں جو یار لوگوں نے محض اپنے عزیز دوستوں کو اور عزیزوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے بنائی تھیں۔ تو انھوں نے فونٹین پین جو صاحب عالی شان بہادر نے انہیں تحفتہً دیا تھا تپائی پر رکھ دیا اور سر کو پیچھے کی طرف جھکایا۔۔

راجہ راجایاں کی شخصیت کا امتیازی وصف وفاداری، خلوص و محبت، ہے جو اس زمانے کی تہذیب کی نشانی بھی ہے۔ عزیز احمد اس تہذیبی نشانی کو یوں نمایاں کرتے ہیں:

"خدا جانے ان آنکھوں کے پپوٹوں کے پیچھے، اس دماغ کے خلیوں اور خانوں کے اندر کیا تھا۔ خاں حضرت سے بے انتہا خلوص و محبت اور وفاداری، تاج برطانیہ سے بے حد خلوص و محبت اور وفاداری غریبوں کی پرورش و فیاضی، امیروں سے اخلاق، مصاحبین سے مروت اور دنیا کی ہر عورت کے لیے محبت۔۔

اس تہذیب میں جہاں راجہ کی آن، بان اور شان شامل تھی، وہیں محنت اور خون پسینہ ایک کرکے اس تہذیب کو سرخ رو بنانے میں ان لوگوں کا سب سے بڑا ہاتھ تھا جو کام تو چھوڑ جاتے ہیں لیکن کبھی نام نہیں چھوڑتے۔ عزیز احمد ان کی بھی زندگی کو یوں پیش کرتے ہیں:

سلطان معین کشن پلی کی چھوٹی چھوٹی بلندیوں پر مکانوں کو بنتا بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ ہزاروں وڈر معلق چٹانوں کو مکانوں کے لیے پتھر میں تبدیل کر رہے تھے۔ ان کے قوی بازو اور مضبوط اوزار پتھروں پر ضرب لگاتے اور پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا۔ ہزاروں کوہ کن تھے جو کشن پلی کے عظیم الشان محلے کے لیے ستون پر ستون تراشتے چلے جارہے تھے۔ ان فرہادوں کی ہزارہا شیریں تھیں، اپنے سینے جو کبھی موٹے پلو سے ڈھکے رہتے کبھی کھل جاتے، مٹی کے ٹوکرے سر پر رکھے ادھر سے ادھر مشینوں کی طرح گھومتی رہتیں۔ بنتے ہوئے مکانوں کے پیچھے انسانی اعصاب اور قوت بازو کا بھی صرفہ شامل تھا۔ پسینہ خون، بھاری بوجھ کے نیچے دل کی دھڑکن، کبھی کبھی پیٹ میں بچہ، سر پر مٹی کا ٹوکرا اور دل کی دھڑکن۔۔

عزیز احمد ان مختلف کرداروں کو پیش کرتے ہوئے تہذیبی زندگی کی چہل پہل اور گہما گہمی دکھاتے ہیں۔ وہ زندگی کو مکمل انداز میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں زندگی کی حقیقی وسعت نظر آتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کسی بھی تہذیب کی تصویر کشی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں ہر طبقے کی زندگی کو نہ پیش کیا جائے۔ اسی وجہ سے وہ امیر اور غریب طبقے کے ساتھ متوسط طبقے کے افراد جس طرح کسی تہذیب کو فروغ دینے میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں اس کو بھی خاص طور پر نمایاں کرتے ہیں۔ کیوں کہ تہذیبی زندگی میں یہی طبقہ سب سے زیادہ فعال اور متحرک ہوتا ہے۔ وہ اس طبقے کے ایک فرد کی زبانی اس طبقے کی اہمیت کو یوں واضح کرتے ہیں:

"مجھے اپنے طبقے پر ناز ہے۔ متوسط طبقے پر۔ یہاں بغیر طبقوں والی سوسائٹی ہوگی۔ روس نہ تم گئے ہو نہ میں۔ لیکن جہاں طبقے ہیں وہاں کوئی طبقہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اعلیٰ طبقہ بھی اسی طرح ہماری نقل کرتا ہے جس طرح ادنیٰ طبقہ۔ وہ اس طرح کہ علوم و فنوں کی رہنمائی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم ایجادیں کرتے ہیں ہم کتابیں لکھتے ہیں ہم فنون لطیفہ کے بانی اور پھیلانے والے ہیں۔۔

اس طرح عزیز احمد نے "ایسی بلندی ایسی پستی" میں اس زمانے کی حیدرآبادی تہذیب کے ہر پہلو کو پیش کیا ہے۔ جس تکمیل اور وسعت کے ساتھ انھوں نے اپنے اس ناول میں اس زمانے کی تہذیب کا احاطہ کیا ہے اسی کا جواب ملنا مشکل ہے۔

•—٥•٥•٥—•

دکن کی بول چال

بول چال کی زبان ہاٹ بازار اور گھر آنگن کی زبان ہوتی ہے۔ زبان کا یہ روپ ہر خاص و عام کو عزیز ہوتا ہے۔ ہمارے شب و روز میں اس کا عمل دخل معیاری زبان کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ معیاری زبان کا چلن آج بھی پر تکلف موقعوں کی حد سے آگے نہیں بڑھ پایا ہے۔ معیاری زبان ماہرین کے وضع کردہ ٹکسالی قواعد و ضوابط کے خلاف ورزی کرنے کی جراءت نہیں کرتی کہ کہیں پایہ، اعتبار سے گر نہ جائے۔ اس بردباری کے صلے میں اسے سیاسی و جغرافیائی حد بندیوں سے قطع نظر رابطے کی زبان ہونے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے لیکن جب تک وہ زندہ رہتی ہے گھٹن کے ماحول میں اپنی سانسیں گنتی رہتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب معیاری زبان بول چال کی زبان سے کلی طور پر مغائرت برتنے لگتی ہے اور اگر معیاری زبان کی یہ بے نیازی طویل عرصے تک جاری رہتی ہے تو وہ سنسکرت کی طرح ایک دن ٹھٹھر کر ختم ہو جاتی ہے۔

بول چال کی زبان لالہ، خود رو کے مانند ہوتی ہے۔ یہ ہر پل مقامی مٹی اور ہوا پانی سے زندگی کشید کرتی ہے نیز ہر طرح کے ٹکسالی قواعد و ضوابط کی جکڑ بندیوں سے آزاد کھلی فضا میں سانس لیتی ہے۔ مقامی مٹی میں اندر ہی اندر اس کی جڑیں دور تک پھیل جاتی ہیں جس کی وجہ سے یہ ہر لحہ بدلتی زندگی کا ساتھ دینے کی اہل بن جاتی ہے۔ اس کے اپنے قواعد و اصول ضرور ہوتے ہیں لیکن قواعد کے تعلق سے اس کے رویے میں خاصی لچک ہوتی ہے یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے بول چال کی زبان مستقبل کے اندیشوں سے محفوظ رہتی ہے۔ لیکن اس کی اپنی زمین سے وابستگی اس کے دائرہ، عمل کو علاقائی حدوں سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔

دکنی اردو کا دائرہ، عمل دکن کی سرزمین کی حد تک محدود ہے۔ وسطی ہند کے پہاڑی سلسلے نے زمانہ، قدیم سے بر صغیر کی اتر اور دکن میں تقسیم کر دی ہے۔ ہندوستان کا لفظ عہد وسطیٰ میں شمالی ہند کے لیے مخصوص تھا۔ جنوبی ہند کو دکن یا ملک دکن کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ دکن کا علاقہ حالیہ مہاراشٹر، کرناٹک، آندھرا پردیش، کیرل اور مدراس کی ریاستوں کے رقبے کو محیط ہے۔ دکنی اردو ان تمام ریاستوں نیز وسطی ہند کے جنوبی حصے میں آج بھی عوامی سطح پر رابطے کی زبان کی حیثیت سے زندہ ہے۔

چوں کہ اس زبان کو رابطے کی زبان کا درجہ بول چال کی سطح پر حاصل ہے اس لیے دکن کے اس وسیع و عریض علاقے میں اس کے ایک سے زائد روپ (Dialectic Variations) پائے جاتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ ہر بارہ کوس کے بعد پانی اور بانی بدل جاتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر قبل جن پانچ ریاستوں کا ذکر کیا گیا ان میں سے ہر ریاست کی دکنی نہ صرف باقی ریاستوں کی دکنی سے مختلف ہے بلکہ خود ایک ریاست کے مختلف حصوں کی زبان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مہاراشٹر کی دکنی، دکن کے دوسرے علاقوں کی دکنی سے اس خصوص میں مختلف ہے کہ یہاں دکنی اور مراٹھی کے مابین صرفی اور نحوی نیز معنیاتی سطحوں پر عاریت کا عمل مقابلتاً وسیع پیمانے پر کار فرما رہا ہے۔ اس ریاست کے کچھ اضلاع ایسے بھی ہیں جہاں مخصوص تاریخی وجوہ سے ریاست کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں عاریت کے

عمل کی رفتار سست رہی ہے جس کی وجہ سے ریاست کے دو الگ الگ حصوں کی زبان میں اس قدر فرق پایا جاتا ہے کہ انھیں ایک زبان دو روپ ہی کہنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اورنگ آباد کی دکنی کے علی الرغم کراڈ اور سانگلی کی دکنی کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

زبان کی ان بدلتی ہوئی شکلوں کا مطالعہ لسانیات کا ایک دل چسپ موضوع ہے لیکن موضوع کی وسعت اور گہرائی کے پیش نظر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ فرد واحد کا نہیں بلکہ ماہرین کی ایک جماعت کا کام ہے۔ گریرسن کے لسانی جائزہ ہند کی نہج پر جدید لسانیات کی رو میں دکنی اردو کی بولیوں کے جائزے اور تجزیے کی ضرورت ہے۔

سر دست ہم اپنی توجہ دکنی اردو کی بول چال کے ایک ایک نمونے پر مرکوز کرتے ہیں۔ چناں چہ نمونہ مہاراشٹر کے ضلع سانگلی ایک دیہات اسلام پور میں بولی جانے والی دکنی اردو کا ہے۔ زبان کے اس نمونے میں راوی نے بمبئی سے اسلام پور کے اپنے سفر کو بیان ہے۔ نمونہ حاضر ہے:

"میں یہاں سے بمبئی میں بوری بندر اسٹیشن پر بیٹیا۔ مجے سہیادری ایکسپرس گاڑی ملی۔ ویساہی مجے ریل کا سفر لئی اچھا لگیا۔ کنتو ہمیشہ بچ ریل کا سفر اچھا لگتے ان مجے وہ پسند ہی ہے آن کر کو میں ایس۔ ٹی میں تئیں بیٹ کو ریل میں بیٹیا۔ جیسا جیسا ریل انگے جاتی تی مجے باہر کا نظارہ دیک کو لئی اچھا لگیا کیوں کہ (ہم) تئیں دیکھے سو ان ابی باتچ دیکنے میں ملے سو باتاں بوسیا۔ وہ دیک کو چ میرا پیٹ بھریا۔ مجے کھانا باسات اور وہ دیکتے دیکتچ میں [illegible] ایتا رمیا کہ کراڈ کو [illegible] آیا سو پتیاچ نہیں چلیا۔ جو میں کراڈ کے ٹیشن پر اتریا تو بمبئی سے لیتے آئیں کر کو معلوم پڑیا۔ وہاں سے Stand پر جا کر اسلام پور کی گاڑی پکڑیا اور کیسات ہی بمبئی کو لسریا۔ کی تو کتابی کرے تو آدمی جو آپچے گوں آتے تو انے کتے جی بڑے گوں میں سے آیا بچیا، ت ہی اسے اپنا گوں چ اچھا لگتے۔

ایسا آدمی دنیا میں کاں ت ہی ملینگا کیا جتے آپچے گوں شے پیار نئیں۔ اجون تی کتی ہی دنیا پھرو تمنا ایکچ بات دی شینگی ان وہ کتو یو کہ ہی یو چے تیرا پیار کس پر تو انے آپچے گوں کاچ نام لینگا کی تو گھر کو گئے بر دبر کون ت ہی تمبالو بھر کو پانی دیتچ"

اس علاقے میں دکنی اردو بولنے والوں کا لہجہ خالص مراٹھی لہجہ ہوتا ہے۔

زیر بحث نمونہ یہاں ایک طرف راوی کی اپنے گاؤں سے محبت ظاہر کرتا ہے، وہاں بین السطور میں شہر سے اس کی مرعوبیت جھلکتی ہے یہ مرعوبیت اس کے لسانی رویے پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ میں نے جب ان صاحب سے پوچھا کہ آپ نے ایک جگہ اسٹیشن استعمال کیا اور دوسری جگہ ٹیشن اس کی وجہ کیا ہے؟ جواب ملا کہ بمبئی بہت بڑا شہر ہے اس لیے بوری بندر کے ساتھ اسٹیشن استعمال ہوتا ہے اور مقابلتاً ایک چھوٹی جگہ ہے اس کے لیے ٹیشن ہی ٹھیک ہے۔ یہ ہے بول چال کی زبان کا اپنا اصول۔ عام آدمی کی منطق اپنے طور پر عام بول کی زبان کے اصول وضع کرتی ہے۔

زیر بحث نمونے کی روشنی میں لسانی سطح پر سانگلی کی دکنی اردو پر مراٹھی کے اثرات کی نشان دہی سے قبل یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس مختصر سی عبارت میں وہ تمام مراٹھی اثرات نہیں پائے جاتے جو عادت کے عمل کے تحت دکنی کے اس روپ میں در آئے اور جنھیں میں نے اپنے اس علاقے میں سفر و قیام کے دوران نوٹ کیا ہے۔ مثال کے طور پر حرف انکار "نکو" جو حافظ محمود شیرانی کے نزدیک دکنی کا کلیدی لفظ ہے، کے استعمال کا یہاں عمل نہیں تعجب کہ میں نے اسے اس علاقے میں سن چکا ہوں۔

البتہ دکنی کے دوسرے کلیدی لفظ چ تاکیدی کے ایک سے زائد نمونے ہمیں اس میں ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر :

یک ہی کے لیے اینچ
یکھتے ہی کے لیے دیکھتچ
ہی کے لیے کرچ
ے ہی کے لیے یچ
ناہی کے لیے چتیاچ

بالکل یا قطعاً کے لیے "اجی بات"، باہر کے لیے بھائیر، لوٹا کے لیے تمبالو، ہمت کے لیے لئی، لطف اندوز ہونے کے لیے رمنا، برابر
ے لیے بروبر کا استعمال خالص مراٹھی لفظوں کو جوں کا توں یا ذرا سے صوتی تصرف کے بعد قبول کرنے کی مثالیں ہیں۔
"گھر جاتے ہی" کے لیے گھر کو گئے بروبر کا فقرہ اصل مراٹھی پیرایہ، بیان کا لفظی ترجمہ ہے۔ اور کے لیے ہر بار ان کا استعمال مراٹھی
کنی روپ ہے۔

تو کے لیے صرف ت کا استعمال میں سمجھتا ہوں کہ اس علاقے کی امتیازی خصوصیت ہے۔

اسی طرح دکن کے ایک عام لفظ سینگا کا تلفظ یہاں شینگا ملتا ہے اسے بھی میں اس علاقے کی امتیازی خصوصیت سمجھتا ہوں۔ دکنی ادب
، "سی" علامت مستقبل ہے لیکن آج بول چال کی زبان میں "سی" شاید ہی کہیں علامت مستقل کا کام دیتی ہو تاہم کرناٹک کے علاقے میں
کے لیے سینگا کا لفظ رائج ہے جو سانگلی میں شینگا بن گیا ہے۔

مراٹھی مصدر उसासणे کا مشتق روپ بچیا بھی یہاں ملتا ہے۔ اسی طرح विसरणे سے دکنی مصدر بسرنا بنایا گیا اور علامت
مدر نا گرا کر امر میں یا کا اضافہ کر کے ماضی قریب بسریا بنایا گیا۔ یہ عمل غیر مراٹھی مصادر بیٹھنا اور پکڑنا کے ساتھ بھی ہوا ہے۔
تی اور آپچے خالص مراٹھی ضمیریں ہیں۔ اسی طرح आणि म्हणाले کا لفظی ترجمہ ان وہ کتو بھی اصلی مراٹھی کا لفظی ترجمہ ہے۔
جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے ابھی تک دکنی اردو کی بول چال کے تمام نمونوں کا لسانی تجزیہ نہیں ہوا ہے لہٰذا ہم ایسی لسانی خصوصیات
، وثوق اور سند کے ساتھ نہیں کر سکتے جو اس زبان کے مختلف نمونوں کے مابین قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہیں۔ جس کی وجہ سے دکن کی
چال کے موضوع پر عمومی بحث ممکن نہیں لہٰذا آج کی نشست میں اختصار کے ساتھ زبان کے ایک نمونے کے سہارے بول چال کی زبان
یت اور اس کی شناخت کے امتیازی نشانات کے خدوخال کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔

O O . O

اقبال متین

باتیں ہماریاں

یادوں کو دفینہ بنا کر نہیں رکھا جا سکتا کہ آپ کرید کرید کر ایک ایک موتی برآمد کر سکیں۔ یادیں تو قفس میں بند ایسے پرندوں کی مانند ہیں کہ ادھر در قفس وا ہوا ادھر پر پھڑپھڑانے کی آوازیں کبھی دل کو موہ کر چٹکیاں لینے لگیں کبھی اداسیاں بکھیرنے۔ آپ کو بے تحاشا بھاگ کر قفس کا در بند کرنا ہوگا۔

ایک ساتھی یاد آتا ہے۔ ایک دوست۔ ایک بھائی۔ شخصیت ایک ہی ہے۔ لیکن رنگ بڑے تیکھے ہیں۔ بکھر جائیں تو ذہن کو بکھرتا ہوا لگے۔ اتنے کھلنڈرے ہیں کہ سنجیدگی کا تصور ابھرتا ہی نہیں۔ بچپن کا بچپن۔ جوانی کا بچپن۔ سنتا ہوں کہ بڑھاپے کا بچپن بھی کچھ جلتا سا ہے

وہ میرا محسن تھا۔ بدرالنسا۔ بیگم منیرہ جسے میں بدر منیر لکھتا تھا، پکارتا تو بہت کچھ تھا، میرا اولین عشق تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ کوئی دوسرا راستہ ایسا تھا ہی نہیں کہ منیر کو کھو دینے کے بعد زندگی کا جواز نکل آتا۔ سوائے موت کے، اگر موت بھی زندگی۔

بدر منیر نے بھی مجھے بہت چاہا۔ بہت صعوبتیں اٹھائیں۔ دل پر بہت چوٹیں سہ لیں۔ آنکھ سے آنسو نہ سوکھے۔ خاندان بھر میں صرف اس ... سے اچھی نظروں سے نہ دیکھی گئیں کہ مجھے چاہا جس کی نہ تعلیم برابر نہ مستقبل کا ٹھکانا۔ اس پر میری امی کی ضد۔ نہ پھوپی امی انھیں پسند نہ منیرہ۔ میری امی جتنی محبت کرنے والی تھیں اتنی ہی اپنی تلوار تھیں۔ عیش میں خدا کو یاد ضرور رکھا طیش میں اس کا خوف نہیں کھایا۔ بہت سخت خط پھوپی امی کو لکھے۔ منیرہ کے لیے ایسے ایسے الفاظ استعمال کیے کہ زمانے تک پھوپی امی نے منیرہ کو خطوط نہیں دکھائے۔ اس کے بڑے بھائیوں کی جو یوں بھی میرے عادات و اطوار کے باعث مجھ سے بدظن تھے، بیزار تھے، امی کے خطوط پر اچٹتی سی نظر بھی پڑ جاتی تو میرا اس دنیا میں منیر کو اپنانا ممکن نہ تھا۔ دوسری دنیا کے بارے میں میرا اشتباہ مجھے مسلمانی سے خارج کروا دے گا اور میں اس پل صراط سے زندہ سلامت گزر جانا نہیں چاہتا تھا۔ کٹ کر آدھا ادھر آدھا ادھر گر جانے میں میری وفاؤں کو زندگی کی تقویت ملتی تھی۔ ایسے میں محمود مشیر خاندان بھر کا یکا و تنہا تھا جو اپنے بزرگوں کے عتاب سے بے نیاز ہو کر میری مدد کرتا۔ کبھی کبھی میرے خطوط منیرہ کو پہنچاتا اور اس کے خطوط مجھے۔ فلمی اور رومانی رسالوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ مجھے عجیب و غریب القاب لکھتی میرے من مندر کے دیوتا۔ میرے گلشن وفا کے گلاب / مجھ داسی کے راجہ / میرے مجنوں مالک و مختار / میرے آپ، میرے آپ

مجھے عجیب سی الجھن ہوتی۔ اس پر غصہ بھی آتا اس کی معصومیت پر پیار بھی، محمود مشیر تو بدر منیر سے بھی سال بھر چھوٹا تھا۔ اس کے باوجود مجھے دم دلاسا دیتا۔ ہمت بندھاتا۔ منیرہ کی پیٹھ کا بھائی۔ مجھ سے تو زیادہ ہی چھوٹا ہوا لیکن عقل عشق کے ساتھ ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ محمود مشیر کی ہمدردیاں بھی آنکھیں بھگو لیتی تھیں۔ ایک تقویت یوں بھی تھی کہ پھوپی امی اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ انھوں نے اپنے بڑے صاحب کے لیے اپنی دوسری آل اولاد کی حق تلفی کو تک روا رکھا۔

کوئی لڑکا اپنی بیوہ ماں سے جو باپ کے بعد سارے گھر کی کفیل بھی ہے مقروض بھی، بچی ہوئی جاگیرداری کا دریدہ پندار بھی ہے

غرض منڈی کی دھجیاں دھجیاں چادر کو زوفی کیے بغیر سر پر سنبھالے ہوئے بھی، خوش ہے تو بہت خوش ہے، مغموم ہے تو گردن جھکائے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور برابر کی انگلی کی مدد سے بائیں نتھنی میں جگر نگر کرتی ہیرے کی دال کو گرفت میں لے رکھا ہے اور آہستہ آہستہ گھمائے جارہی ہے لیکن سوچ کی گتھیاں نہیں سلجھتی ہیں سو نہیں سلجھتی ہیں۔ فکر و تردد کو اس درجہ خاموش اور سلسلہ در سلسلہ میں نے کم دیکھا ہے؟ نظریں جھکی ہوئی ہیں، اسی دنیائے دنی میں ہیں اور مافیہا سے الگ بھی نہیں ہیں اور الگ ہیں بھی۔ بڑے صاحب آماج ہیں تو پھوپی امی کا دل آماجگاہ۔ محمود مشیر رہتا تو سب کے ساتھ گھری میں تھا۔ سانس لیتا تھا اسی چار دیواری میں جس میں منیرہ محصور تھی اور میں پوشیدہ۔ ہم دونوں محمود مشیر کی کرامات کو چشم حیراں کا وقار سمجھنے پر مجبور تھے کہ وہ ہمارا معاون تھا، مربی تھا اور پھوپی امی کے دل میں کھلواڑ کرتا ہوا صاف دکھائی دیتا تھا۔ گھر کے بلکہ خاندان کے قریب ترین بچے اس سے حسد کرتے تھے۔ وہ جو چاہتا پھوپی امی سے منوا لیتا یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ پھوپی امی کی جگر نگر کرنے والی ہیرے کی دال نے ایک چھوٹی سی تیلی کو اپنی جگہ دے دی تھی۔ اب اس تیلی کو گرفت میں تصور کیے پھوپی امی کا انگوٹھا اور انگلی، نتھنی پر متحرک رہتے۔ تیلی کہیں گتھیاں سلجھا سکتی ہے چناں چہ سوچ نتھنی پر ٹھہری ہوئی سی لگتی تھی۔

عقد سے پہلے منیرہ سے اس درجہ قربت میرے اور منیرہ کے لیے محمود مشیر کا سب سے بڑا انعام تھی۔ انگلی کبھی دانتوں تک پہنچی ہی نہ تھی سو ہمیں انگشت بدنداں ہونا ہی نہ آیا۔ وہ اس گھر کی چھوٹی سی دنیا کا مختار کل تھا۔ چاہتا تو مجھے منیرہ سے جدا کر کے زہر پلوا دیتا۔ لیکن اس نے پھوپی امی کو بھی منیرہ کے حق میں موم بنا رکھا تھا۔ اور میں اطمینان سے دن کے کسی بھی حصے میں پکانے والی ماما رسولن بی کا شوہر غلام رسول بن کر (جی ہاں دونوں کے یہی نام تھے) پھوپی امی کے آگے پردہ کھنچوا دیتا اور چپکے سے بنگلے کی سیڑھیوں تک پہنچ جاتا۔ بعض وقت پردہ تاننے والے ہاتھ وہی ہوتے جو مجھے ان دونوں زندہ رکھنے والے ہاتھ تھے۔ ایک سرے پر منیرہ ہوتیں ایک سرے پر محمود مشیر اور پردہ تن جاتا۔ میاں غلام رسول بنگلے کی سیڑھیاں چڑھ جاتے۔ رسولن بی نیچے باورچی خانے میں اپنے کام میں جٹی رہتیں۔ بعد منیرہ اور محمود مشیر آہستہ سے بنگلے پر چلے آتے۔ پھر پھوپی امی غلام رسول کو بھول جاتیں اور رسولن بی کو تو اپنے میاں کی سدھ ہی نہ ہوتی۔ کب آئے، کب گئے۔ شام ڈوب جاتی یا رات ہو جاتی کہ پھر پردہ تان دیا جاتا اور غلام رسول چپ کے سے میاں اقبال متین کے جسم کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے اور اقبال متین اپنی روح بنگلے پر چھوڑ آتا۔

بات منیرہ کی چل نکلے گی، پھر میں اس کے ساتھ ہو جاؤں گا اور اتنا بھٹکوں گا، اتنا بھٹکوں گا کہ کسی معتبر راہ بر کو بھی اس بھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ آج تک نہیں ملا۔ ایسے میں میری کیا بساط۔ احتیاط لازم ہے۔ یادوں کی یلغار کو روکتا ہوں۔ پیش نظر صرف محمود مشیر ہے یادوں کے مواج دریا سے اسی ایک شخص کو نکال لانا ہے جو ڈوب ڈوب کر ابھر رہا ہے، ابھر ابھر کر ڈوب رہا ہے۔

سانولی رنگت، ناک نقشہ درست، لیکن اوپر کے ہونٹ میں ایسی واضح شگاف کہ موچھ بڑھا لینے پر بھی جھانک جھانک کر چغلی کھائے پھر بھی موچھوں نے اس عیب کو بڑی حد تک چھپا لیا تھا۔ حد درجہ دل چسپ شخصیت دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہو، وہ کبھی محسوس بھی نہیں کرے گا کہ دوسروں کے لیے خوشیوں کے سامان فراہم کر رہا ہے۔ اپنی پر وہ ایسی لگن میں مست جس کی کوئی قلندری ہی نہیں۔ اور چھوڑ کچھ بھی نہیں۔ محمود مشیر نے ایک منظر بنا لیا اور وہ منظر اس کے نام سے منسوب ہو کر رہ گیا۔ بس۔ زود آشنا، زود رنج، زود پشیماں۔

کسی زمانے میں وہ کمیونسٹ پارٹی کا اتنا راز داں تھا کہ خود کمیونسٹ پارٹی کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ ہم تو مخدوم اور راج، جواد اور مہندر اور رام (امولک رام) پر فریفتہ ہو کر پارٹی کے چاہنے والے بن گئے تھے۔

میں فیض کے اس شعر کی توضیح اسی رعنائی خیال کے سیاق و سباق میں کرتا ہوں:

وہ تو وہ ہے تمھیں ہوجائے گی الفت مجھ سے
اک ذرا تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

چناں چہ یہی ہوا۔ کمیونسٹ لٹریچر بعد میں زندگی میں داخل ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ میں نے کچھ کو اپنایا کچھ کو رد کیا۔ جہاں اپنے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دکھلانا یہ ہے کہ اس زمانے میں کیسے کیسے اوصاف والے کمیونسٹ پارٹی کے چاہنے والے تھے۔ محمود مشیر ان سب کا سرخیل تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کو اپنے دماغ میں بسانے والے تو مل سکتے تھے، سر پر اٹھا کر گلی گلی پھرنے والا صرف محمود مشیر تھا۔

چھلاوا تھا وہ۔ جب کمیونسٹ پارٹی کے سارے لیڈر گرفتاری سے بچنے کے لیے روپوش ہوگئے تھے۔ محمود مشیر، ان روپوش ہونے والوں سے بے نیاز، ان کی پاپوش بنا گلی گلی پھرتا تھا اور کمیونسٹ پارٹی اس کے کندھوں پر بیٹھی غوں غاں کرتی تھی۔

یہ غوں غاں پارٹی کی نہیں تھی، اس معصوم، کھلنڈرے، اکھل کھرے اور شیخی خورے لڑکے کی ایسی تمنا تھی جو دل میں بس کر محرومی بن گئی تھی۔ اس لیے کہ ہر حصول کو محرومی بنالینا اور ہر محرومی کو شادمانی کا حاصل، محمود مشیر کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ماں کا لاڈلا۔ ایسا لاڈلا کہ ماں نے قرض کیے۔ بنیوں سیٹھوں کے۔ سودی قرض کو روہیلوں، پٹھانوں کے دوہرے سود تک اٹھا کر اپنایا۔ لیکن مرتی ہوئی جاگیرداری کی اس بے مروت آبرو باختگی نے بڑے صاحب کی ہر خوشی پوری کی۔ ایسا نوجوان بھلا کمیونسٹ پارٹی کی اس دور کی صعوبتیں کیسے اٹھا سکتا تھا۔ یہ اس کے بس کا روگ ہی نہیں تھا۔ چناں چہ اس نے ساری پارٹی کو دل میں بسا کر سر پر اٹھالیا اور خود کو بہلا بہلا کر مگن رہا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں پارٹی کا ہمہ وقتی ممبر بن گیا، پھر ایسا رازداں ہوا کہ اپنے پچھے راز کی کوئی بات ہی نہیں رکھی۔

پڑے جھرے پارٹی کے لیف لٹس LEAF LETS پرانے دھرانے پیم فلٹس (PAMPHLETS) کامریڈ اس سے کہہ کر پیلیس بک ڈپو، بڑی چاوڑی کوٹھی کی کتابوں کی دوکان سے اٹھلاتا۔ ان کو کسی بیگ BAG میں رکھ لیتا اور اپنی دانست میں بہت بڑا اسکیل چھاپ لیڈر بن کر سرافراز و سربلند ہوجاتا۔ اب صرف پارٹی اور وہ رہ جاتے۔

ایک دن شاہد (۱) آیا۔ کہنے لگا کچھ دیر پہلے شق القمر (۲) ملا تھا بہت جلدی میں تھا۔ بس سیکل کو بریک لگایا اور کود پڑا۔ مجھ سے رازداری میں پوچھا۔ سب ٹھیک ہے نا۔ میں سمجھ گیا کس کے بارے میں پوچھتا ہے۔ میں نے کہا...... تجھے دن رات بس پارٹی کی فکر رہتی ہے ارے وہ مزے میں ہے یار، اس کا کون کیا بگاڑ سکتا ہے۔

شاہد نے روانی اظہار کو لگام دیے بغیر کہا۔ مجھے تیری بات یاد آگئی۔ اور میں نے شق القمر سے زیادہ قریب ہو کر سرگوشی کی۔

"ایک منٹ ٹھہر جا مشو (۳)۔ تجھ سے بہت اہم بات پوچھنی ہے"

"کہنے لگا واقعی اہم ہے تو پوچھو ورنہ میرا وقت خراب نہ کرو"

مجھے دو خطرناک مقامات پر پارٹی کا لٹریچر انڈر گراؤنڈ کامریڈس کو ان کے ہاتھ میں دینا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پولیس میرے پیچھے ہے"۔

شاہد نے کہا پولیس ہمیشہ میرے پیچھے رہے گی اور تو ہمیشہ آگے آگے۔ تجھے کون کہاں روپوش ہے اس کا تو علم ہے ہی، بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ چھپنے والوں کے لیے روپوشی کے مقام کا انتخاب پارٹی نے تیرے ہی تفویض کیا ہے۔

محمود مشیر گردن جھکا کر اپنے شگاف زدہ ہونٹ پر مونچھ کے بال برابر کرتا ہوا ہنسا ہوگا۔ اس کی تصویر میرے سامنے گھوم گئی۔ شاہد نے کہا وہ اپنی خاص ہنسی میں جا چھپا۔ کہنے لگا:

"تم لوگوں کو یہ سب کیسے معلوم ہو جاتا ہے"

"جس کو پارٹی کی اتنی فکر ہو اس کے دوستوں کو اس کی فکر کرنی پڑتی ہے میاں، شاہد نے لقمہ دیا۔

"اچھا دیر نہ کر پوچھ کیا پوچھنا ہے"

شاہد نے کہا یار سب کا پتا ہے کہ کہاں ہیں۔ مگر اپنا جواد کہاں ہے نہیں معلوم۔ وہ تو اسٹوڈنٹ فرنٹ کا ہے، ہم سب کو زیادہ ہی پیارا ہے

مشیر کی آنکھوں میں چمک [illegible] افسردگی تھا کیوں کہ اس سے ایک راز کی بات پوچھی گئی تھی اور وہ بھی طالب علموں کے ایک مقبول لیڈر کے بارے میں۔

محمود مشیر، جواب میں کہنے لگا۔

جواد؟۔ ارے جواد رضوی بول نا۔ وہ اچھا ہے دو روز پہلے ہی میں اس سے ملا تھا۔ وہ [illegible] ہم لوگ ساتھ رہے۔ طالب علموں کے مسائل پر [illegible] خیال کرتا رہا۔ کیا آدمی ہے یار۔ اسٹوڈنٹس یونین کے شباب سے ہم ایک دوسرے [illegible] ہیں۔ اچھا ہے لیکن ذرا کھانس رہا تھا شاہد نے کھانسی کی بات کی تو میں ہنس پڑا۔ جواد رضوی آج بھی فریزر میں رکھا ہوا آدمی ہے۔ کھانسی اس کو آج بھی کبھی ہو نہیں سکتی، وہ کھانسی کو ہو جاتا ہے۔ کامریڈس کے ساتھ ان کے چاہنے والے کوئی نہ کوئی بیماری کا [illegible] سمجھتے تھے کہ ان کو تکلیف میں مبتلا کر کے جدوجہد کی آزمائش سے گزارنے میں مداحوں کے انقلاب دوست رومانی تصور کو تسلی سی ملتی تھی۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ کامریڈس نے اس وقت شاہی کے ظلم و استبداد کی اذیتیں نہیں اٹھائیں۔ یہ داستان اپنی جگہ کھلی حقیقت ہے اور [illegible]۔

محمود مشیر نے جواد رضوی کو کھانسی میں مبتلا کر دیا تو اسے اپنی ان تھک ذمہ داریوں کا خیال آیا۔ اس نے جھٹ سے سنبھلتے ہوئے کہا اب اس سے زیادہ میں آپ کو کچھ نہیں بتلا سکتا۔۔۔ چلوں۔ اور سیکل کے پینڈل پر پیر رکھ کر وہ یوں سوار ہوا، یوں نظروں سے اوجھل ہوا۔

محمود مشیر میری اہلیہ بدر منیر کا چچیرا بھائی ہے۔ اکثر ہم سے ملنے آتا رہتا ہے۔ ایک بگولے کی طرح، چھلاوے کی طرح۔ ہر صورت میں منیرہ سے منٹ دو منٹ اور اگر پارٹی کی کوئی راز داری ساتھ نہ ہوئی تو پندرہ بیس منٹ بیٹھ رہتا ہے۔ ہنستا ہے، ہنساتا ہے، میرا گھر بسانے والے ہاتھوں میں سب سے مضبوط ہاتھ محمود مشیر کے ہیں۔ ان دنوں ہم دلے خان نواب کی دیوڑھی کے سامنے چنچل گوڑہ کے چھوٹے سے مکان میں کرائے سے رہتے تھے۔ کامریڈ جواد رضوی میرے پاس روپوش تھے۔ غالباً یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ میں نے کچھ دنوں تک منیرہ سے بھی چھپا رکھا تھا کہ کمرے میں [illegible] شخص کون ہے جو اخبار چاٹتا ہے اور کچھ لکھ پڑھ لیتا ہے۔ میں کسی قیمت پر یہ نہیں چاہتا تھا کہ محمود مشیر کو جو پارٹی کا [illegible] ہے، کسی طرح بھی اس روپوشی کی بھنک پڑے۔ منیرہ کی اور اس کی دلی وابستگی مجھے جواد کے تعلق سے زیادہ محتاط [illegible] رہنے والے دوست کے تعلق سے پہلے پہلے کچھ بوکھلائی رہیں جو گھر میں اس طرح رہتا ہے جیسے اپنی ہی [illegible] نے اس کو اپنا راز داں اس حد تک بنالیا کہ محمود مشیر کو بھی [illegible] ہو۔ اسی لیے میں نے حسینی شاہد سے اس بات کی ٹوہ لینے کے لیے [illegible] کہ وہ محمود مشیر سے جواد کے بارے میں پوچھے۔

جواد دن دن بھر کچھ بے آرام سا رہتا تھا۔ میں اس کو چھیڑتا تھا۔

کس بات کی فکر ہے تمھیں۔ چنچل گوڑہ جیل بہت قریب ہے، تم جب چاہو اس چھوٹے سے [illegible] اس درجہ وسیع جیل خانے میں منتقل ہو سکتے ہو کہ تم کہیں رہو تمھارا خیال کہیں رہے۔

دن بھر کی یوسف کا ازالہ کرنے کے لیے ایک رات جواد نے کہا۔

ذرا چھپتے چھپاتے ، بچتے بچاتے ، اندھیرے اندھیرے میں کہیں ٹہل کر آئیں ۔ میں ہنس پڑا کہ وہ کس درجہ محتاط ہے ۔ سیدھے سیدھے ٹہلنے کی بات کرتا تب بھی ہم احتیاط تو برتتے ہی ۔

گھنی داڑھی اور داڑھی پر جھکی ہوئی مونچھیں ۔ جواد رضوی واقعی اپنے چہرے کی مونچھ اور معصومیت کھو چکا تھا ۔ بہ یک نظر اس کا پہچان لینا بہت مشکل تھا ۔ اچھا خاصا شریف قسم کا ڈاکو لگے تو کیا ہو ۔

ہم گلی سے باہر نکل کر سیدھی جانب مڑے تھے کہ محمود مشیر [illegible] آواز دی ۔ میں نے جواد سے کہا تم ذرا آگے بڑھ کر اس اندھیرے میں ہو جاؤ ۔

محمود مشیر پاس آکر سیکل سے اترا ۔ ہمیشہ کی طرح بہت جلدی میں تھا ۔ کہنے لگا ، پارٹی کے بہت اہم کاغذات ساتھ ہیں ۔ اکثر سائکلو اسٹائل کیے ہوئے ہیں ۔ اہم کامریڈس کو رات کے ایک بجے سے پہلے پہنچا دینا ہے ۔ سوچا ادھر سے گزرتے تجھ سے اور منیر سے مل لوں ۔ ایک ہی سانس میں جواد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ۔

مولوی صاحب کون ہیں ۔

میں نے کہا ۔ کیا بتاؤں یار ۔ بس مولوی صاحب ہیں ۔ پاس والی مسجد میں رہتے ہیں ۔ کمیونسٹوں سے بیر ہے ۔ مجھے دو ایک بار کامریڈ دیوراج کے ساتھ دیکھ لیا تھا ۔ میری اصلاح کرنے کے لیے آتے ہیں اور جان کھا جاتے ہیں ۔ عاقبت کو اس طرح لا کر سامنے رکھ دیتے ہیں جیسے عقوبت کی سزا و جزا کا سارا انتظام انھیں کو سونپ دیا گیا ہے ۔ مجھے یقین ہے تجھے پہچان گئے ہوں گے اور داڑھی کو چھپانے کے لیے دو قدم آگے بڑھ گئے ۔

اس نے اپنے اوپری ہونٹ کو سیدھی ہتھیلی کی دوب میں چھپایا ۔ ذرا سا گردن جھکائی اور ۔ ایہی ، ایہی ۔ گویا اپنی ہنسی دبا رہا ہو ۔ کبھی کبھی پھٹے ہوئے ہونٹ سے سیٹی سی بج جاتی تھی ۔ اب بھی بجی ۔ لیکن اس احتیاط میں سارے مضمرات شامل ہیں ۔

گردن اٹھا کر بہ یک وقت ہونٹوں کا شگاف جس میں ہنسی پھنس گئی تھی اور آنکھوں کا احساس برتری میری طرف پھینکا ۔

"مولوی صاحب مجھے کس طرح جانتے ہیں ؟"

"تجھے کون نہیں جانتا یار ۔ تو ہی نہیں جانتا خود کو ۔"

اب وہ مسرور و مطمئن تھا ۔ اس کا پرولتاری مشن پورا ہو چکا تھا ۔ کمیونسٹ پارٹی [illegible] میں بول بالا کر دیا تھا اس نے ۔ جیسے دو چار قریبی دوستوں کے پاس اسے چکر لگانا تھا تاکہ اسی طرح سے کام کی تکمیل ہو جائے جس طرح [illegible]

اچھا چلوں ۔ سیکل کے ہنڈل کو ابھی دبوچا ہی تھا کہ میں نے یاد دلایا ۔ ارے منیر ۔

پھر مل لوں گا یار ۔ بہت کام پڑا ہے اور سیکل بھی پرولتاری ہے ۔ پرولتاری اس کا بہت مانوس لفظ تھا ۔ وہ اس ایک لفظ میں محمود اور کمیونسٹ پارٹی کو اپنی دیوانگی کا استعارہ بنا لیتا اور مطمئن ہو جاتا ۔

سیکل پر سوار ہونے لگا تو میں نے کہا جس راستے سے آئے ہو ادھر سے مت جاؤ ۔ وہ رک گیا [illegible] پوچھا ، کیوں تجھے خدشہ ہے ۔ میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے کہا ۔ اچھا ، ادھر سامنے کی گلی سے نکل جاتا [illegible] ادھر بڑھنے کھڑے مولوی صاحب کو بغور دیکھنے کی کوشش کی ۔

میں جواد کے قریب پہنچا تو جواد نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا ۔ وہ اس سے بڑی غرور [illegible] پریشان تھا ۔ پوچھا ، کون تھا وہ

میں نے کہا تم مطمئن رہو۔ بڑا معصوم سا مجوبہ ہے وہ۔ میرا اور منیر کا دور کا رشتہ دار ہے۔

"وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا"۔

میں نے کہا وہ ہر جواں سال مولوی کو اسی طرح دیکھتا ہے جو اس بھری جوانی میں مذہب سے اپنی والہانہ محبت کے سبب گھر کا آرام تج کر مسجد میں رہتا ہے۔ اسے تم سے ہمدردی ہے لیکن اس سے کسی کو ہمدردی نہیں۔ وہ زیادہ ہمدردی کے لائق ہے۔ اس لیے کہ تمھاری پارٹی اس کی لیلیٰ ہے اور تم ایسے مجنوں کو نہیں جانتے جو لیلیٰ کو ایک نظر دیکھے بغیر محبت کیے جارہا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی زبان میں تم جیسے مولوی کے لیے اس کا خیال ہے کہ:

دل سی شئے دین پر فدا کردی
چوتیے پن کی انتہا کردی

جواد رضوی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر ذرا سا مسکرایا۔ پھیکی سی ہنسی۔ پھر کچھ سوچ کر کہا۔ چلو اب واپس گھر چلتے ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی کا نشہ اترا تو انٹرمیڈیٹ میں ناکام ہو کر محمود مشیر نے اپنی کامیابی کی پارٹی دی۔ میں، لطیف ساجد، حسینی شاہد اور غلام دستگیر جمیل نے مزے کیے۔ موقع ملا تو ضامن آغائی بھی آگیا تھا۔ کسی نے کھانے پر اکتفا کیا کسی نے پی کھا کر دعائیں دیں۔ اس نے پھوپی امی کو اس طرح باور کرا دیا کہ وہ اب یونیورسٹی کا طالب علم ہو گیا ہے۔ ہم نے بھی دعوت کھائی تھی۔ حق نمک ہمیں بھی ادا کرنا تھا۔ بڑے صاحب کی اس کامیابی نے پھوپی امی کو خوشیوں کی کائنات دے دی تھی۔ کوئی ملے، رشتے دار ہو کہ ہم جولی وہ کسی نہ کسی ڈھنگ سے اسے سنا دیتیں۔

بڑے صاحب بی۔ اے میں پڑھ رہا ہے اور محمود مشیر پھوپی امی کو سلطنت نظامس کالج کا باج گزار بنا چکا تھا۔ وہ خوشی خوشی بی۔ اے کی تعلیم کا تاوان ادا کرتیں اور محمود مشیر جھنڈے گاڑتا پھرتا۔ پھوپی امی انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے جگ مگ کرتی ناک کی دال مراقبے میں پھراتی رہتیں جو واقعی ان کی نتھنی میں تنکا بن کر چمک دمک کھو چکی تھی۔ محمود مشیر گل چھرے اڑاتا رہتا اور قرض کا تو وہ پھوپی امی کی ناک تک اونچا ہوتا رہتا۔ لیکن بڑے صاحب ان باتوں سے بے نیاز تھا۔ نظامس کالج میں اس نے اس ٹھاٹھ سے داخلہ لے رکھا تھا کہ نہ کالج کے اساتذہ کو خبر ہوئی نہ پرنسپل کو۔ وہ ایک نوٹ بک ہاتھ میں لے کر کالج چلا جاتا۔ لڑکیوں اور لڑکوں سے دوستیاں بڑھاتا۔ ان پر خرچ کرتا اور ہر دل عزیزی کے صداقت نامے وصول کرتا پھرتا۔ اب سارا نظامس کالج محمود مشیر کی جاگیر بن گیا تھا۔ کسی ایک کلاس کی تخصیص اس کے لیے تھی ہی نہیں اور سارے خاندان میں یہ بات ٹھسے سے چل نکلی تھی کہ حسینی نواب (محمود مشیر کا عرف) بی۔ اے میں پڑھ رہا ہے۔ ان دنوں نظامس کالج ڈگری کالج بن گیا تھا یا نہیں وہ بھی اسی سے پوچھنا پڑے گا۔

میاں سردار جو محمود مشیر کی پیٹھ کے بھائی تھے اس کی پیٹھ پیچھے واویلا مچاتے پھرتے۔ ماں کے یک طرفہ التفات سے دل برداشتہ رہتے لیکن احتجاج کی ہمت نہ ہوتی۔ اسی دل برداشتگی نے ایسا استغنا مزاج میں پیدا کیا کہ بے سروسامانی اور کس مپرسی سے سمجھوتہ کر کے پیری مریدی کے ہو رہے۔ اسد بابا جیلانی کے نام سے معتقدین پیدا کیے اور مقبول ہوئے۔ بلا تخصیص مذہب مریدوں کا حلقہ پیدا کیا لیکن آدمی بہت بھولے بھالے تھے۔ ذرا سی ذہانت سے کام لے سکتے تو آج جو چار چھ لاکھ کی جائداد ہے پچاس ساٹھ لاکھ کی ہو سکتی تھی۔ گھر بیٹھے تعویذ گنڈے ہر لحاظ سے برے نہ تھے کہ وہ اندرا گاندھی کے پیچھے اپنا غیبی علم لگا بیٹھے۔ لٹ لے کر پیچھے پڑ جانا تو سنا تھا۔ پیشین گوئی لے کر پیچھے پڑنا اسد بابا جیلانی کی ایسی کرامت تھی جس نے کبھی کوئی اعجاز نہیں دکھایا۔ مراقبے سے گردن اٹھائی تو ایک روز سیاست میں داخل ہو گئے۔ ان کی ساری سیاست اندرا گاندھی کی موت کے پیچھے گھومتی تھی۔ ہمیشہ اپنے مریدوں میں بیٹھ کر اندرا گاندھی کی موت کی تاریخ کا اعلان کر دیتے۔

تاریخ ٹل جاتی ۔ کچھ ماہ بعد دوسری تاریخ کا اعلان ہوتا ۔ تاریخ ٹل جاتی ۔ مراقبے میں جاتے ۔ تیسری تاریخ کا اعلان قطعیت کے ساتھ ہوتا ۔ تاریخ ٹل جاتی ۔ اب مرید بھی اندرا گاندھی کی موت و زیست کی اس کش مکش سے بے نیاز ہوگئے تھے ۔ پانچویں بار اسد بابا جیلانی نے اندرا گاندھی کی موت کا آخری فیصلہ سنا دیا اور تاریخ متعین کر دی ۔ بہت سارے مرید آزردہ بھی ہوئے اور چند ایک دل برداشتہ بھی کہ اسد بابا کا دعویٰ ان کے لیے ناگواری کا باعث ہوا لیکن یہ آخری تاریخ بھی ٹل گئی تو اسد بابا جیتے اندرا گاندھی کی موت سے دست بردار ہوگئے اور ایک رات مراقبے اور ریاضت سے سر اٹھایا تو صبح ہوتے ہوتے دنیا سے اٹھ گئے ۔ اور اندرا گاندھی دلی میں اپنے سنگھاسن پر براجمان رہیں۔

اسد بابا کی اولاد بھی اس گن سے محروم رہی جو مذہب کی آڑ میں تفضیلت کا حصار بنا کر مزار شریف پر ہری پیلی کپڑے کی دھجیوں سے عرضیاں لٹکواتی ہے اور عرس میں مرادیں برلاتی ہے ۔

دیکھیے میں کہاں سے کہاں جا پہنچا ۔ لیکن اسد بابا بھی محمود مشیر کا ایک پرتو تھے ۔ وہ بھی ملنگ تھے ۔ ان کی باتیں پر کبھی ۔

سنا ہے کہ اقساط میں محمود مشیر نے ڈگری حاصل کر لی ۔ میں نے باتیں، بماریاں میں کبھی لکھا تھا ۔ یہ وہی محمود مشیر ہے جسے بچپن میں مستقبل سنوارنے کے لیے اقبال متین کی صحبت میں چھوڑا گیا تھا ۔ لطیفہ یہ ہے کہ میں نے محمود مشیر کا مستقبل سنوارا تو اس طرح سنوارا کہ گریجویٹ ہو کر اچھی خدمت پر ایسٹ افریقہ "مانگاسیکا" چلا گیا اور میں انٹرمیڈیٹ سے آگے نہ بڑھ سکا ۔

پھوپی امی نے جتنی بے آرامیوں کو ہنستے بولتے، نتھنی پر ناک کی دال پھیرتے محمود مشیر کے لیے آرام جاں کیا، محمود مشیر نے "مانگا" جا کر اپنی ماں کو خوشیوں اور آسائشوں سے اس طرح نہال کر دیا کہ وہ پھر اصالت جنگ کی بیگم بن کر امارت و توقیر کو جوتیاں چٹواتی رہیں ۔

محمود مشیر بے حد دل چسپ، دوست نواز، یار باش، مخلص اور بے ریا آدمی تھا ۔ خاندان بھر میں جہاں بھی جاتا سب ہی اس کی بھگت کرتے تھے ۔ اس نے بچپن ہمارے ساتھ "ماندگی بشیر آباد" میں گزارا تھا ۔ امی کا چہیتا تھا ۔ میری اس کی تو دانت کاٹی روٹی تھی ۔

ایک دن میری امی نے اس سے کہا ۔ تیرے لیے اچھا رشتہ ڈھونڈا ہے ۔ خوش رکھے گی ۔ گھرانا بہت کھاتا پیتا ہے ۔ چاہتی ہوں رشتہ کر دوں ۔ لڑکی دیکھنے میں اچھی خاصی ہے ۔ جیلانی (۴) کو پسند آئے گی ۔ ذرا سا اس کی بتیسی کا اوپری حصہ اونچا ہے ۔ وہ بھی اچوک تھا ۔ کہا آپ فکر مت کیجیے ۔ میں نے پہلے ہی سے اپنے ہونٹوں میں اس کے دانتوں کے لیے جگہ بنا رکھی ہے ۔

امی بے اختیار ہنس پڑیں ۔ قریب کر کے سر پر ہاتھ رکھا دعائیں دیں ۔ کہا دلہن (۵) کو سناؤں گی ۔ اس کو پاس بٹھالیا اور اپنا کا انتظار کرنے لگیں ۔ وہ برخورداری سے سے بیٹھ رہا ورنہ اپنے ہم عمروں میں اس کو کسی نے نچلا بیٹھتے نہیں دیکھا ۔ بیٹھا تو بیٹھ رہتا ۔ اٹھ جاتا تو نہ ٹکتا ۔ آپ سوچتے رہ جاتے کہ کبھی اچھے سے پالا پڑا ہے ۔ سنکی تھا، زود رنج تھا لیکن سنک کو مزاج کا حسن بنا رکھا تھا ۔ شاید اسی لیے اس زود پشیمانی بھی مثالی تھی ۔

کمیونسٹ پارٹی کو صحیح راستے پر جاتا ہوا دیکھ کر اس نے اپنے غلط اور ٹیڑھے راستے سیدھے کر لیے تھے اور اپنی ساری توانائیاں نظامس کالج میں بیل بوٹے اگانے اور تراشنے میں مستور کر دی تھیں ۔ آخرش سنا ہے کہ ڈگری حاصل کی اور افریقہ کے جنگلوں کے خوبصورت بنگلوں میں عہدہ داری کی ۔

افریقن گورنمنٹ نے معقول پنشن مقرر کی تو اپنے وطن مالوف سے بے وفائی برتی اور پاکستان کا ہو رہا ۔ صرف مجھے نہیں ہمارے خاندان کے ہر فرد کو محمود مشیر کے ترک وطن کرنے کا صدمہ ہے ۔ جیسے اس نے ہماری دل چسپیوں کی گٹھری اپنے ساتھ باندھ لی ۔ میں نے ایسی بھٹکی ہوئی نیکی نہیں دیکھی جس کے ساتھ بھٹکنے کو جی چاہے ۔

حواشی ۱ ۔ ڈاکٹر حسینی شاہد ۲ ۔ محمود مشیر جس کو کٹے ہوئے ہونٹ کی مناسبت سے شاہد نے یہ نام دیا تھا جو ہم سب دوستوں میں مقبول ہو [illegible] ۔ [illegible] کا مخفف ۔

راشد آزر

مصطفیٰ شہاب

نظام کالج، حیدرآباد دکن کی مزاحیہ جگ بندی اور آج کی زندگی کے تجربوں کے سنجیدہ، جدید طرزِ اظہار کے درمیان مصطفیٰ شہاب کی زندگی کے کئی سال ترکِ وطن سے جڑی ہوئی اتھل پتھل اور پھر کسبِ معاش کے نشیب و فراز اور بینک میں ملازمت کی بے لطف مصروفیت میں گذر گئے۔ لندن میں اپنے قیام کے دوران کئی سال تک ان کو نہ اردو کے ادبی رسالے پڑھنے کو ملے اور نہ اردو کی ادبی یا شعری محفلوں میں شرکت کی۔ پھر فیض احمد فیض اور ن۔ م۔ راشد وغیرہ سے ملنے اور ان کی محفلوں میں شریک ہونے کا موقع ملا اور یہ ان کے ادبی ذوق کے دوبارہ جاگنے کا سبب بنا۔ لندن میں عظیم شاعروں اور ادیبوں کی صحبتیں ملیں، جن میں [illegible]، افتخار عارف، حبیب حیدرآبادی (مرحوم) اور ان کی بیوی صدیقہ شبنم، اکبر حیدرآبادی، ڈاکٹر ضیاالدین شکیب جیسے [illegible] (مرحوم) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، اور پھر یوں ہوا کہ ذہیر اللہ، مشتاق احمد یوسفی، بصیرت ندوی، فارغ بخاری، احمد فراز، [illegible] دوسروں سے ملنے، ان کو سننے اور ان سے بات چیت کرنے کا موقع ملا تو ان کے اندر کا سویا ہوا گمنام شاعر ایک سنجیدہ [illegible] تیز عمر کا سیانا پن لیے نمودار ہوا اور مصطفیٰ کو شعور [illegible] کر دیا۔

ستر سال کی عمر تک جو تجربے ان کے دل و دماغ میں جو [illegible] اظہار کا وسیلہ ڈھونڈ رہے تھے تازہ شعری اظہار کی شکل میں لاوے کی طرح بہہ نکلے۔ اب یہ [illegible] مصطفیٰ علی خان سے مصطفیٰ شہاب بن چکا تھا۔ ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ء کی تین سال کی قلیل مدت میں مصطفیٰ شہاب نے چار چھ نظمیں اور تقریباً ایک سو غزلیں کہی ہیں۔ مصطفیٰ اور شہاب ایک ہی جسم کے دو رونے میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور یہ دو شخصیتوں کا تضاد ایک دوسرے سے [illegible] دوسرے پر اثر انداز ہو کر کبھی کبھی دونوں کو ایک دوسرے میں ضم بھی کر دیتا ہے۔ شہاب ایک [illegible] ہے اور آنے والی عمر کا شعور بھی رکھتا ہے۔ مصطفیٰ ایک کاروباری شخصیت ہے جو زندگی [illegible] سے نمٹنا بھی جانتی ہے۔ لیکن ان تلخ تجربوں کے جذباتی اظہار کا سلیقہ نہیں رکھتی، اسی لیے [illegible] کہ شہاب مصطفیٰ کے تجربوں کے خزانے سے جو جواہر لگے اٹھا لیتا ہے اور ان کو [illegible] مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ مال مصطفیٰ کا ہے یا شہاب کا۔

(راشد آزر)

○ ○ ○

۳۱

مصطفیٰ شہاب

○

کب اس سے بچھڑنے کو تھی چشمِ تر آمادہ
رستہ تھا کٹھن لیکن میں تھا سفر آمادہ

اس شدتِ گریہ میں کس طرح کمی آئے
یا درد ہی راضی ہو یا چارہ گر آمادہ

ساون کی ہواؤں کا تب ہوگا سفر پورا
ہو جائے برسنے کو بادل اگر آمادہ

میں ہوش رہا بچی پریوں کی کہانی گو
سننے کو نہیں ہوتا کوئی مگر آمادہ

میں سچ سے گریزاں ہوں اور جھوٹ پہ نادم ہوں
وہ سچ پہ پشیماں ہے اور جھوٹ پر آمادہ

شاید کہ بدل جائیں رستوں کی بھی تقدیریں
وہ ساتھ ہی چلنے کو ہوتا اگر آمادہ

ہر لفظ شہاب آیا اشکوں کی ردا اوڑھے
اور میں تھا مسرت کے اظہار پر آمادہ

○

اپنی بات کو پہلے تول
پھر اس کو دھیرے سے بول

صبح کیا دروازہ بند
شام ہوئی مئے خانہ کھول

بعد میں سب گورکھ دھندا
پہلے قاضی کے دو بول

دھن والوں کی بستی میں
تیرا دھن تیرا کشکول

تن پر کپڑے بے سلوٹ
من کے بھیتر لاکھوں جھول

جانے کیوں ہے وقتِ شہاب
پیٹ رہا ہے اپنا ڈھول

○ ○ ○

مصطفیٰ شہاب

○

میری صبح و شام میں تھی جو کمی کچھ کم ہوئی
دن کٹا تو لگ رہا ہے زندگی کچھ کم ہوئی

یا وہ رخصت ہوگیا ہے یا مری آنکھیں گئیں
یا اندھیرا بڑھ گیا یا روشنی کچھ کم ہوئی

ٹوٹے شیشوں سے ملا جب سنگ باروں کو جواب
تب کہیں شیشہ گروں کی برہمی کچھ کم ہوئی

میں بھی کچھ مصروف سا تھا وہ بھی کچھ خاموش سا
وقت بھی کم ساتھ گزرا بات بھی کچھ کم ہوئی

داؤ پر میں تھا کسی کے ہاتھ میں پانسا شہابؔ
ہار کر لوٹا تو میری بے بسی کچھ کم ہوئی

○

وہ لہو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا
میری خو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا

خوف اک بلندی سے پستیوں میں رلنے کا
آب جو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا

دفعتاً رگِ جاں سے بولتا ہے وہ قطرہ
جو سبو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا

اک خوشی کا آنسو بھی میرے دیدۂ تر کی
آبرو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا

دل وہ ایک پاگل ہے جو شہاب دنیا کی
آرزو میں رہتا ہے اور نظر نہیں آتا

○ ○ ○

مصطفیٰ شہاب

○

دھوپ سی عمر بسر کرنا ہے
ایک دیوار کو سر کرنا ہے

آنکھ تو صرف شہادت دے گی
دل کو تصدیق سحر کرنا ہے

ڈر سے لرزاں ہیں خزاں میں پتے
کل ہواؤں کا سفر کرنا ہے

ان فصیلوں کو بنانا ہے کھنڈر
فوج کو شہر بدر کرنا ہے

صرف جگنو سا چمکنا ہے شہاب
کب مجھے کار خضر کرنا ہے

○

خواب میں تھا میں کھڑا سانپوں کے بیچ
چونک کر جاگا تو تھا سانپوں کے بیچ

شام اس کی بھی زباں پر زہر تھا
جس کا سارا دن کٹا سانپوں کے بیچ

ساحروں کا کس طرح ٹوٹے بھرم
کوئی تو پھینکے عصا سانپوں کے بیچ

ہم نے مل کر ڈھونڈ لی راہِ بقا
سانپ مجھ میں، میں رہا سانپوں کے بیچ

جی رہا ہے سانپ نگری میں شہاب
کھو کے اپنے دست و پا سانپوں کے بیچ

○ ○ ○

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

عامر موسوی مرحوم

"دھندلکے" اور "تار نفس" کے شاعر عامر موسوی کا اصلی نام سید مجتبیٰ حسن موسوی تھا۔ وہ حیدرآباد کے ایک معزز علمی گھرانے میں ۱۲/ جنوری ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے۔ عامر موسوی کا خاندان سادات موسوی سے ہے۔ ان کے والد محترم میر عباس موسوی کامل قدیم مکتبہ فکر کے شاعر تھے۔ کامل مرحوم میر محمد حسین خاں فاضل کے شاگرد تھے۔ عامر موسوی کے دادا سید بہاؤالدین حسین ایرانی نژاد تھے۔ ان کے جد اعلیٰ میر محمد حسین خاں فرہنگ دولت ایران، میر عالم وزیر اعظم ریاست حیدرآباد کی دعوت پر ایران سے حیدرآباد دکن آئے اور میر عالم کے دور میں جاگیر اور منصب سے مفتخر تھے۔

عامر موسوی نے علمی ادبی فضا میں اپنی آنکھ کھولی۔ اسی ماحول کا اثر تھا کہ زمانہ طالب علمی ہی میں شعر کہنے لگے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد کے مدارس میں ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں عامر موسوی نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ کام۔ کامیاب کیا۔ شاعری میں وہ حضرت برق موسوی کے شاگرد تھے۔ بی۔ کام۔ کامیاب کرنے کے بعد وہ ایک عرصے تک ریجنل ریسرچ لیباریٹریز میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کارگزار رہے۔ یہ ملازمت اس حساس شاعر کی مرضی کے مطابق نہ تھی۔ اسی لیے انھوں نے کہا تھا:

جس کام کے واسطے نہیں ہم لوگ　　　ہم سے وہی کام لے رہی ہے دنیا

اگست ۱۹۶۳ء میں عامر موسوی کا پہلا مجموعہ "دھندلکے" شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں کا مجموعہ "آدھا آدھا" بھی زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ "ثمینہ" کے نام سے انھوں نے اسی زمانے میں ایک ناول بھی لکھا تھا جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

"دھندلکے" کے مقدمے میں حضرت برق موسوی نے لکھا تھا:

> "سید مجتبیٰ حسن عامر موسوی میرے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی، اگرچہ میری استادی ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی لیکن یہ بات میرے لیے سرمایہ نازش ہے کہ وہ میرے شاگرد ہیں۔" (دھندلکے ص: ۷)

"دھندلکے" میں عامر موسوی کی ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۳ء تک کی تخلیقات شامل ہیں۔ "دھندلکے" کا انتساب عامر موسوی نے اپنے مربی ڈاکٹر مرزا احسن علی خاں مولف ماثم طبابت، ریاست حیدرآباد کے نام کیا جو ممتاز شاعر راشد آذر کے والد پروفیسر حسین علی خاں کے بھائی تھے۔

وہ عامر موسوی کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ "دھندلکے" میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔

۱۹۶۴ء میں عامر موسوی انگلستان چلے گئے اور "ایر انڈیا" کے اسٹور ڈپارٹمنٹ کے انچارج بنائے گئے۔ فکر معاش نے انھیں جلاوطن کیا۔ انگلستان کے نئے اور اجنبی ماحول میں خود کو ڈھالنے کی کوشش نے ان کے شعری ذوق کو کچھ عرصے کے لیے سرد کر دیا تھا لیکن وہاں کے ادبی ماحول نے ان کے ذوق سخن کو ابھارا اور وہ وہاں کے مشاعروں اور ادبی محفلوں میں باقاعدہ شریک ہونے لگے۔

عامر موسوی کا دوسرا مجموعہ کلام "تار نفس" کے نام سے اگست ۱۹۷۷ء میں میری نگرانی میں شائع ہوا۔ عامر موسوی نے پاکیزگی کے ساتھ "تار نفس" کا انتساب اس معنی خیز جملہ میں کیا ہے: "غم زدہ غم گساروں کے نام۔"

۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۶ء کا کلام "تار نفس" میں شامل ہے۔ اس مجموعے میں کوئی مقدمہ یا دیباچہ نہیں ہے۔ "زخسارہ" کے عنوان سے عامر

موسوی نے اپنا ایک مختصر سا "پیش رس" شامل کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"میں ذاتی طور پر کسی اور کے دیباچے، پیش لفظ یا مقدمے کو کسی بھی شعری مجموعے کے لیے لازم و ملزوم نہیں سمجھتا تو پھر ---- میں یہ کیسے گوارا کرلوں کہ میری اپنی کتاب خود میرے ہی ہاتھوں، دیباچہ گری، پیش لفظی یا مقدمہ بازی کی شکار ہو جائے۔" (تار نفس ص: ۱۵)

انگلستان میں انھیں ن۔م۔راشد، ساقی فاروقی، افتخار عارف، صدیقہ شبنم اور اکبر حیدرآبادی جیسے شعرا کا قرب حاصل رہا جس کی وجہ سے ان صحبتوں اور محفلوں نے ان کے ذوق شعرگوئی کو جلا دی اور وہ تیزی کے ساتھ فن کے اعلیٰ مدارج طے کرتے گئے۔

عامر موسوی حضرت برق موسوی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ وہ جب بھی انگلستان سے حیدرآباد تشریف لاتے حضرت برق موسوی کے غیر مطبوعہ کلام "ید بیضا" کی اشاعت کے بارے میں دریافت کرتے۔ ان ہی کی شخصی دل چسپی کی وجہ سے "ید بیضا" زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ کاش کہ یہ کتاب ان کی زندگی ہی میں شائع ہوتی!

دو سال قبل جب وہ حیدرآباد تشریف لائے تھے میں نے اپنے غریب خانے پر ان کو مدعو کیا تھا۔ اتفاق سے ان کے گہرے دوست مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین بھی حیدرآباد میں تھے۔ میں نے "مجتبیٰ حسن اور مجتبیٰ حسین کے ساتھ ایک شام۔ دونوں کے نام" کا انعقاد کیا تھا جس میں دونوں مجتبیٰ صاحبین کے ساتھ ساتھ پروفیسر یوسف سرمست، سید مسعود احمد چیف اکاؤنٹس آفیسر زندہ طلسمات، مجتبیٰ حسن کی بیگم سیدہ نکہت، ان کے بڑے بھائی باقر موسوی معہ اہلیہ، مجتبیٰ حسن کے سمدھی ممتاز مزاح نگار حمایت اللہ اور ان کی شریک حیات صاحب طرز ادیبہ ڈاکٹر رشید موسوی بھی اس محفل کی رونق تھے۔ اس محفل میں عامر موسوی نے متعدد غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے لطیفوں اور چٹکلوں سے محفل کو گرما دیا۔ وہ محفل آج بھی میرے ذہن میں بالکل ترو تازہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کل ہی کی بات ہے۔

عامر موسوی کی شادی ۱۴/ اگست ۱۹۵۵ء میں سیدہ نکہت بنت سید رضی موسوی سے ہوئی۔ عامر موسوی کے چار صاحب زادے ہیں: سید نجیب حسن موسوی نیاز امریکہ میں الکٹرانک انجنیر ہیں ان کی شادی ممتاز مزاح نگار حمایت اللہ اور محترمہ رشید موسوی کی دختر فاطمہ موسوی سے ہوئی۔ دوسرے فرزند سید مجیب حسن موسوی نیاز لندن لندن میں کمپیوٹر پروگرامر ہیں ان کی شریک حیات شہناز بنت بہاء الدین حسین ہیں تیسرے صاحب زادے سید شکیب حسن موسوی شاذ، فزیالوجی سے پی ایچ۔ ڈی کر چکے ہیں ان کی شادی عسکری حسن موسوی کی دختر فاطمہ موسوی سے ہوئی۔ چوتھے فرزند سید اریب حسن موسوی اعزاز ایم بی بی ایس کے سال آخر میں زیر تعلیم ہیں۔

عامر موسوی میرے قریبی عزیز تھے۔ وہ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ رشتے میں وہ میرے چچازاد بھائی تھے اور خالہ زاد بھائی بھی۔ ہمارے خاندان میں ان کی شخصیت غیر نزاعی رہی۔ وہ خوردوں اور بزرگوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ ہمارے خاندان میں حضرت برق موسوی کے بعد عامر موسوی آخری شاعر رہ گئے تھے۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کو ہم سے ۱۲/ نومبر ۱۹۹۴ء کو صبح ۷-۳۰ بجے جدا کر دیا۔ بستر مرگ پر انھوں نے اپنی زندگی کا یہ آخری شعر پڑھا تھا۔

رحمت ہے گویا درد کی شدت بھی یا خدایا ۔ ہے اختیار لب پہ تیرا نام آگیا

راقم الحروف نے "حق بہ حق دار رسید" کے مصداق "ید بیضا" کو مرحوم چچازاد بھائی عامر موسوی کے نام معنون کیا ہے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

"دھند لکے" اور "تار نفس" کے علاوہ عامر موسوی کا غیر مطبوعہ کلام، ایک غیر مطبوعہ ناول اور ایک مذہبی تصنیف "نذر و نیاز" ان کی شریک حیات محترمہ سیدہ نکہت (حسن بھابی) کے پاس محفوظ ہے جسے وہ جلد شائع کروانا چاہتی ہیں۔ اس غیر مطبوعہ کلام میں سے دو غزلیں، ایک نظم اور دھند لکے اور تار نفس سے چند منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

بے گھرا

میرا گھر نو گھروں کے بیچ میں ہے
سامنے سے سڑک گزرتی ہے
زندگی کی بھلائی لے کر
اور مقابل میں دوسری جانب
چار سو باغ ہیں ، بغیچے ہیں
بیچ اس باغ ، ان بغیچوں کے
دن میں آباد ، رات میں روشن
جیتی اور جاگتی عمارت ہے
جس کو کہتے ہیں سب سیوک سنٹر
اس عمارت کے صدر دفتر میں
سیکڑوں فائلوں کے بیچوں بیچ
نام کی میرے فائل ہے ، جس پر
صاف لکھا ہے میرے گھر کا پتہ
لیمپشن روڈ ایک سو گیارہ
جانے کیوں پھر بھی بے گھرا ہوں میں ؟

ہاں مگر میری فکر کہتی ہے
ایک سو گیارہ سال بعد کبھی
فکر ہوگی مری زمانے کو
اب بھی کہتا ہے یہ یقین مرا
ایک سو گیارہ سال بعد کبھی
لوگ نکلیں گے ڈھونڈنے مجھ کو
ایک سو گیارہ گھر کے ماتھے پر
نیلگوں ایک گول تختی پر
نام میرا لکھا ہوا ہوگا

○ ○ ○

غزلیں

○

اعتبارِ شوق اک دھوکا سہی
اعتبارِ شوق پر ہے زندگی
سونی یادو تم سے پہلو ہے بسا
سونی یادو تم سے کیا پہلو تہی
دل ہُوا چھلنی تو نغمے چھن پڑے
بانس میں روزن پڑے تو بانسری
بے کسی میں بھی بڑا کس بل ہے دوست
موت کیا ہے زیست کو ٹھکرا کے جی
ہم خدا بھی مان لیں گے آپ ک
آپ جیسے ہو تو جائیں آز
کیا یدِ بیضا سے کم ہے داغِ د
معجزہ رکھتا ہوں ظاہر موسو

○

دن کو کہہ دیں رات ہم سمجھے ؟
آپ کی یہ بات ہم سمجھے ؟
ہم کہ اک رہنِ قفس اہل
آسماں ہے ساتھ ہم سمجھے
کیا سمجھ میں آئے ذاتِ
ماسوائے ذات ہم سمجھے
عشق سے باز آتے ہم دیوانے
تھی سمجھ کی بات ہم سمجھے
الغرض ہے زیست مرہون
غایتِ غایات ہم سمجھے
بات سب کی بات سے ہے
تیری خاطر بات ہم سمجھے

○ ○ ○

منتخب اشعار

نمائش سے بھلا اہلِ ہنر کو کام کیا عامر
آدمی ذات پات رکھتا ہے

سلام اس بزم کے آداب کو بس دور سے اپنا
ہونٹ سینا، اشک پینا، غم چھپانا ہی پڑا
خود سے بیگانہ ہوگئے عامر
مرے اشک خود تم نے دامن سے پونچھے
دہرائیں آؤ دار و رسن کی حکایتیں
کسی بھوکے کی روٹی لے اڑا وہ چاند کا راہی
فکر کا حد پہ جاکے لوٹ آنا
زندگی مات دے تو دے ہم کو
اور اک غم نے زیست کو دے دے کے رفعتیں
گزاری زندگی ہر حال میں ہنستے ہوئے ہم نے
یہ پر بہار تصور ہے کس سمن بر کا
ڈوب جائے کہیں عامر نہ سفینہ اپنا
سہارا ہے سہاروں نے پایا
عرفانِ حق کی شرط مقدم ہے حبِّ ذات
نامکمل ہی رہا قصۂ حیات و موت کا
کیا تصور جہاں کے میرے بغیر
زنجیر ذات ہوگئی جس کے گلے کا ہار
مگر اسیرِ غمِ دوراں کا قفس ہے عامر

متاعِ اہلِ دانش گرمیِ بازار کیا جانے
آدمیّت کی کوئی ذات نہیں
جہاں پہ سانس حلقۂ ماتم بن کے رہ جائے
آپ نے جب حال پوچھا مسکرانا ہی پڑا
کیا ابھی شوقِ آشنائی ہے!
تھمے گی نہ اب آنسوؤں کی روانی
رکھا ہے کیا فسانۂ ہجر و وصال میں
ذرا اس ارتقاءِ آدمی پر غور تو کیجے
ارتقا ہے یہ انحطاط نہیں
موت کی تو کوئی بساط نہیں
ہم طالعِ مشیتِ یزداں بنا دیا
خدایا میری دنیا لائقِ وابستگی کیا تھی!
تخیلات میں خوش بو سمٹ کے آئی ہے
آج پھر پاس کنارا ہے خدا خیر کرے
اجل کے سہارے جیے جا رہے ہیں
آگاہیِ صفات تو اک بعد کی ہے بات
کچھ یہاں باقی رہا اور کچھ وہاں باقی رہ
تو نہیں ہے تو کائنات نہیں
جینے کو جی رہے ہیں فنا ہوگئے ہیں
غالب و میر کا گھر ہو تو غزل ہوتی ہے

○ ○ ○

راشد آزر

(ادھر کچھ عرصے سے مجھے زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربے اکسار ہے تھے کہ ان کو نظم کروں لیکن میں نے محسوس کیا کہ مروجہ زبان اور طرزِ اظہار ان تجربوں کو شعری سانچے میں ڈھالنے کے متحمل نہیں ہیں۔ ان عام قسم کے تجربوں کے اظہار کے لیے ان کی نوعیت کی مناسبت سے زبان کا استعمال ضروری تھا۔ چناں چہ جہاں کسی تجربے کے اظہار کے لیے اردو یا انگریزی سلینگ (Slang) کی ضرورت تھی وہاں میں نے سلینگ استعمال کیا اور جہاں عام بول چال میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کی ضرورت محسوس کی وہاں ان الفاظ کو بلا جھجک استعمال کیا۔ میں نے جذبات کے اظہار کی ضرورت اور نوعیت کے لحاظ سے سنجیدہ شاعرانہ زبان بھی استعمال کی ہے۔

مزاحیہ شاعری میں انگریزی الفاظ کو قافیہ اور ردیف کے طور پر ایک ممتاز مزاحیہ شاعر مصطفیٰ علی بیگ نے استعمال کیا ہے۔ سنجیدہ شاعری میں نظم کے مصرعوں کے درمیان سچویشن (Situation) کی ضرورت کے لحاظ سے روزانہ عام طور سے بات چیت میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ اور سلینگ کو جگہ دینے کا یہ پہلا تجربہ ہے جو میں قارئین کی تنقید کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ یا تو یہ ٹرنڈ سٹر (Trend Setter) ہوگا یا اس کو خوقِ فضول سمجھ کر نظرانداز کر دیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں یہ میرے لیے زیاں کا سودا نہیں ہے۔)

(راشد آزر)

درونِ پردہ

"یہ کون ہے
یہ پلاج
آنچل جو اپنا لہراتی آ رہی ہے
یہ کون چیکو ہے ساتھ اس کے
جو اتنا گھگیا کے
اس سے یوں بات کر رہا ہے
کہ جیسے وہ اس کو اَون کرتی ہے
یا وہ چمچہ ہے اس کا
جھجک جھجک کے ہر قدم پر
وہ اس کا ہر حکم مانتا ہے"

○

"وہ جوکر
بے روزگار شوہر ہے اس کا
وہ اک کماؤ بیوی ہے
بے حد اَونیسٹ
اپنی محنت سے اپنے شوہر کو پالتی ہے
اور اس کے بدلے
وہ ایسے گھٹیا ریماکس سنتی ہے
اور سہہ کر
جو دل ہی دل میں وہ مسکراتی ہے
اس کے ہونٹوں کا اک کنارہ
خفیف سی اک کجی سے اپنی
ہمارے رازوں کا علم
ہم سب کو بخشتا ہے"

یہ کون ہے

یہ کیسی روشنی ہے میرے سامنے
کہ جیسے کوئی
ٹارچ لائٹ لے کے
میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے
رات کا اندھیرا چیرتا ہوا

○

یہ کون ہے

○

یہ ایکسٹرا سنسری ہدایتیں
ہیں زندگی کی بایو میگنٹک حقیقتیں

○

اگر میں اپنی بے ہدایتی کی رہنمائی میں
سراب آرزو کی جستجو میں چل رہوں
تو ٹارچ بند
لائٹ ختم
راہ گم
تلاش کا افق
سیاہ خانہ عذاب جاں
نظر سے منزلیں نہاں
ہمت لغزشوں میں ڈوب جائے

○

کون ہے ؟
ٹارچ لائٹ لے کے
تھ ساتھ چلنے والا
تا ہے ؟

اندھیرا

یہ مدھم روشنی ہی ٹھیک ہے
گھر میں چراغاں مت کرو
میں سوچ میں ڈوبا ہوا ہوں
بس اکیلا چھوڑ دو مجھ کو

○

ارے یہ لائٹ کا سوئچ آف کر دو میرے کمرے میں
زیادہ روشنی میں
فکر کی کڑیاں بکھر جاتی ہیں
لمحے پھیل کر برسوں کے افسانوں میں ڈھل جاتے ہیں
ایک اک ایسڈ ٹیسٹ اپنے سبھی ڈیٹیلز کھو دیتا ہے
اور ماضی کی اک موہوم
اک ہیزی سی پکچر
خیال کے پردے پہ رہ جاتی ہے باقی
بہت سی ویگ یادوں کی کہانی
لیکس کھو کر
ذہن کو کنفیوز کرتی ہے

○

اندھیرا حال کو ماضی و مستقبل سے یکسر
جوڑ دیتا ہے
مرے کمرے کی ساری لائٹس آف کر دو
مجھے ڈسٹرب مت کرنا

کمپیوٹر بگ

(COMPUTER BUG)

شام کو ہپ[20] مس نازاں محسن نے اپنے
دفتر میں ٹِک ٹِک کر کے
کمپیوٹر میں میرا نام بھرا
اور میرا سارا بایو ڈیٹا[21]
اک فلوپی[22] میں فیڈ[23] کیا
اور سوچا
مجھ کو ایک پروپوزل[24] بھیجے

○

کمپیوٹر بگ[25] نے فلوپی میں
میرا ڈیٹا
بزنس مینجمنٹ ایکسپرٹ[26] کے
ڈیٹا سے بدلا اور میرا
سارا ڈیٹا وائپ[27] کیا

○

صبح کو اس کی موڈ اسسٹنٹ[28] آفس آئی
اور روٹین[29] میں اس نے سارا
انفارمیشن[30] پوسٹ[31] کیا

○

اس کا پروپوزل
مینجمنٹ ایکسپرٹ کو پہنچا
کرسپانڈنس کورس[32] میں اس کو
پوئٹک اسکلز[33] کی ہنٹس[34] کے بدلے
اسٹاف[35] کو ہینڈل[36] کرنے کی
اڈوائس[37] ملی

○ ○ ○

حوالے:

1.own 2.Joker 3.honest
4.remarks 5.torch
6.extra sensory
7. bio-magnetic
8.light 9.switch 10.off 11.incident
12.details 13.hazy 14.picture
15.vague 16.links 17.confuse
18.lights 19.disturb 20.hep
21.Bio-data 22.floppy 23.feed
24.proposal 25.Computer bug
26.business management expert
27.wipe 28.mod assistant
29.routine 30.information 31.post
32.correspondence course
33.poetic skills 34.hints 35.staff
36.handle 37.advice

سید خالد قادری

ان پڑھ

اس دن جب میرے منگیتر نے مجھ سے فون پر پوچھا کہ کیا میں نے گاندھی جی کی وہ سوانح حیات پڑھ ڈالی جو اس نے مجھے لاکر دی تھی اور کہا تھا کہ میں اسے پڑھوں تو میں نے معذرت خواہانہ انداز میں اسے بتایا کہ میں نے کوشش تو کافی کی مگر وہ کتاب مجھ سے پڑھی نہیں گئی۔ شاید ایسا اس لیے ہوا ہوگا کہ مجھے روحانیت، سیاست، عدم تشدد اور ستیہ گرہ وغیرہ کے موضوعات سے کچھ زیادہ دل چسپی نہیں --- یہ سن کر میرے منگیتر نے لائن کے دوسری طرف سے خفگی بھرے انداز میں سوال کیا۔ "کیا میں جان سکتا ہوں کہ تمھیں کس بات میں دل چسپی ہے؟"

"اپنے ذاتی مسائل میں" - میں نے جواب دیا۔

"تمھارے وہ ذاتی مسائل کیا ہیں۔؟" اس نے طنزاً کہا۔

"میرے ذاتی مسائل میرے اپنے ہیں کسی دوسرے کو ان سے کیا سروکار" میں نے چڑ کر جواب دیا۔

اس پر اس نے ہمیشہ کی طرح مجھے ایک طویل لکچر دے ڈالا۔ "مسائل ذاتی نہیں ہوتے۔ مسائل عملی ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ذاتی مسائل دراصل مسائل ہی نہیں ہوتے۔ مسائل صرف وہی ہیں جو ذاتی نوعیت کے نہ ہو کر سماجی نوعیت کے ہوں جیسے آرٹ اور ادب کے مسائل، سیاست، تہذیب اور کلچر وغیرہ کے مسائل --- وہ موضوعات جن میں انسان دل چسپی رکھتا ہے اپنی خاطر نہیں بلکہ خود ان موضوعات کی خاطر چاہے وہ اس کے لیے کارآمد ہوں یا نہ ہوں۔ اور تم چوں کہ اپنے علاوہ کسی اور چیز میں دل چسپی نہیں رکھتی ہو اس لیے تمھارے کوئی مسائل نہیں ہو سکتے ---"

میں نے یہ کہہ کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا کہ فلسفہ جھاڑنے اور مجھ پر اپنی علمی برتری جتانے کے علاوہ اسے مجھ سے کوئی اور دل چسپی نہیں۔

میں نے فون رکھ کر نظریں گھمائیں تو دیکھا کہ میری ماں اپنی مخصوص کرسی میں بیٹھی تھی۔ بظاہر وہ اخبار پڑھ رہی تھی مگر شاید اس نے میری باتیں سن لی تھیں۔ گو کہ ہم دونوں اپنا اپنا الگ وجود رکھتے ہیں مگر ہم میں کافی مماثلت ہے۔ بس فرق ہے تو اس بات کا کہ میری ماں عمر میں مجھ سے بیس سال بڑی ہے۔

ماں میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"تمھارے کیا مسائل ہیں؟" اس نے پوچھا

"ماں! جب میں چھوٹی تھی تو میں نے اکثر تمھیں ان مردوں سے جو تم میں دل چسپی لیتے تھے یہ کہتے سنا تھا کہ تمھارے مسئلے تمھارے اپنے ہیں دوسروں کو ان سے کیا بحث۔ میں نے تمھارا وہی جملہ چرا کر ذہن میں محفوظ رکھا تھا اور آج ---۔ شاید تم سمجھ گئی ہوگی۔"

"اصل میں میرے مسائل کیا ہیں یہ میں خود بھی ٹھیک سے نہیں سمجھتی۔ بس ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندر ایک بے چین کر دینے والی حرارت ہے جسے جب تک میں کسی کے حوالے نہ کر دوں یا کسی کام میں خرچ نہ کر دوں مجھے سکون نہ مل سکے گا۔" میں نے ماں کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

"کسی زمانے میں میرا بھی یہی مسئلہ تھا۔" ماں نے کہا۔

"لیکن میں اپنے اندر کی اس حرارت کو جو مجھے اس عمر میں مضطرب رکھتی تھی کسی کو بھی سونپنے کو تیار نہ تھی۔ میں اسے صرف ایک

ایسے انسان کے حوالے کرنا چاہتی تھی جو مجھ سے محبت کرتا ہو۔"

"پھر کیا تمھارا یہ مسئلہ حل ہوا؟" میں نے ماں سے پوچھا

"نہیں۔" اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "میں نے ایک کے بعد دوسری شادی کی۔ مجھے دولت اور آرام و آسائش کی ہر چیز مل گئی۔ مگر محبت! محبت مجھے نہیں ملی۔"

"کیوں" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ہر لڑکی اپنے شباب کی وہ زاہد حرارت جو اسے مضطرب رکھتی ہے کسی مرد کو سونپنا چاہتی ہے اور اس کے بدلے میں وہ محبت پانا چاہتی ہے۔ مگر اسے ملتا کیا ہے صرف اپنے دنیاوی مسائل کا حل۔۔۔ گھر بار دولت اور آسائش کے سامان۔۔۔ یا پھر کبھی کبھی وہ بھی نہیں۔ مگر اس میں کسی کا قصور نہیں۔ بس یوں ہی ہوتا ہے اور شاید ہوتا رہے گا۔"

ماں کی یہ باتیں سن کر نہ جانے کیوں مجھے غصہ آگیا۔

"لیکن میرے معاملے میں سارا قصور تمھارا ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تم نے بچپن سے جوانی تک مجھے غلط تربیت دی۔۔۔ تم نے مجھے غیر تعلیم یافتہ رکھا۔۔۔ اس گھر میں میں نے آج تک کوئی کتاب نہیں دیکھی میں نے کچھ نہیں پڑھا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔۔۔ اور۔۔۔ شاید اسی وجہ سے میں اپنی ذات کے علاوہ کسی اور چیز میں دل چسپی نہیں لے پاتی۔ میں جاہل ہوں ماں۔ اور اس کی ذمہ دار تم اور صرف تم ہو۔"

میری ماں شاید مجھے اس وقت غصے سے زیادہ ہمدردی کے قابل سمجھ رہی تھی۔

"ہمارے زمانے میں بیٹیوں کی تربیت کا مفہوم الگ تھا۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "انھیں پڑھا لکھا کر دنیا کو سمجھنے کے قابل بنانا اس میں شامل نہ تھا۔ بلکہ سچ پوچھا جائے تو اس کا مقصد الٹا تھا دماغ کا زیادہ استعمال کیے بغیر خاموشی سے دوسروں کی اطاعت۔ عورت کے عمل کا دائرہ یہاں ذہنی نہیں صرف جسمانی تصور کیا جاتا تھا۔ اس طرح میں نے تم کو وہی تربیت دی جو اس وقت رائج تھی۔"

ماں کی ان باتوں نے مجھے مزید مشتعل کر دیا۔

"منطقوں اور دلیلوں سے تمھیں کوئی نہیں ہرا سکتا ماں!" میں پھر چیخی۔

"کیا اتنی معمولی سی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر انسان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت خود اپنے لیے سوچنے سمجھنے کا حق ہے اور اس کے لیے اس کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ وہ اپنے اطراف کی دنیا کو جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ جن انسانوں کے ساتھ جینا ہے ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتا اگر اس کی تربیت اس طرح ہوئی ہو جیسی کہ میری جہاں وہ اپنی ذات کے باہر کسی اور چیز میں دل چسپی لینے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔۔۔"

اب میں اعصابی طور پر تھک چکی تھی۔ بیزارگی کے عالم میں اٹھ کر میں اپنے کمرے میں آگئی اور دروازہ بند کر کے بستر پر دراز ہو گئی۔

میرا ذہن بری طرح منتشر تھا۔ میں مسلسل وہی باتیں سوچ رہی تھی جو میرے منگیتر نے مجھ سے فون پر کہی تھیں۔ حالاں کہ میں جانتی تھی کہ اس طرح مجھے کم علم اور جاہل ثابت کر کے وہ مجھے اپنی خواہشات کے تابع بنانا چاہتا ہے۔۔۔ اپنے ہاتھوں کا کھلونا۔۔۔ یہ احساس کہ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔۔۔ شاید ہر انٹیلکچوئل مرد ایسی عورتوں سے جو جسمانی یا ذہنی طور سے ان کے تابع نہ ہوں اسی طرح انتقام لیتا ہے۔۔۔ اپنی برتری ثابت کرنے کا اس کے پاس ایک ہی طریقہ ہے کہ عورت کو بے وقعت، جاہل اور ناکارہ قرار دے دے۔

لیکن کیا میرے بارے میں میرے منگیتر کی کہی ہوئی باتیں بڑی حد تک سچ نہ تھیں۔ کیا یہ حقیقت نہ تھی کہ اپنی ماں کی دی ہوئی ناقص تعلیم کے نتیجے میں میں اپنی ذات کے دائرے کے باہر کسی اور چیز میں دل چسپی لینے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ بستر پر لیٹے ہوئے یہ

اتیں سوچتے سوچتے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اپنی بے بسی پر آنسو بہاتے بہاتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

جب میں جاگی تو دن کی روشن دھوپ کھڑکیوں کے شیشوں سے چھن کر اندر آرہی تھی۔ چہرے پر پھسلتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے ب کے خشک ہو چکے تھے۔ "ماں! کاش کہ تم نے مجھے بچپن سے یہ سمجھایا ہوتا کہ حقیقی مسائل ذاتی نہیں سماجی ہوتے ہیں اور یہ کہ ذاتی مسائل راصل مسائل ہی نہیں ہوتے۔" میں نے ایک آہ بھر کر اپنے آپ سے کہا۔

یہ عجیب بات تھی کہ جب یہی سب میرا اسنگیتر کہہ رہا تھا تو میں نے بیزار ہو کر فون رکھ دیا تھا مگر سچ تو یہ تھا کہ اس کا پڑھایا ہوا سبق مجھے پوری طرح یاد ہو چکا تھا۔

موڈ تبدیل کرنے کے لیے میں بیوٹی پارلر چلی گئی جہاں سے واپسی میں سجی سنوری دکانوں کے شوکیسوں میں جھانکتی ہوئی نہ جانے س طرح اور کب میں نے اپنے آپ کو اس بلڈنگ کے سامنے کھڑا پایا جس میں ایک فلم کمپنی کا آفس تھا۔۔ اس کمپنی کے ڈائرکٹر کے لیے میں قتاً فوقتاً کام کر چکی تھی۔ حالاں کہ مجھے پیسوں کی کبھی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی مگر کام میں صرف اس لیے کرتی تھی کہ اپنے آپ کو معاشی ور پر آزاد محسوس کر سکوں۔ یہاں میں کبھی ضرورت پڑنے پر ایکسٹرا کا رول کر لیتی تھی یا پھر آفس میں شارٹ ہینڈ ٹائپسٹ کے طور پر جس کا یں نے ڈپلوما لے رکھا تھا۔

کمپنی کے ڈائرکٹر روشن لال کے ساتھ کام کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو پوری طرح محفوظ سمجھتی تھی کیوں کہ وہ ان مردوں میں سے تھا جو عورتوں کا استعمال یا استحصال صرف اپنے آرٹ کے لیے کرتے ہیں اپنی ذات کے لیے نہیں۔

میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو پانچویں منزل کی بالکنی سے ایک مختصر داڑھی اور لمبے بالوں والا آدمی مجھے ہاتھ کے اشارے سے اوپر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ یہ روشن لال تھا۔ اوپر پہنچنے پر وہ مجھے انتہائی گرم جوشی سے ملا۔

"تم صحیح وقت پر آئی ہو۔" وہ میرے شانے پر لہراتے ہوئے بالوں کو پکڑ کر زور سے ہلاتے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا۔

"میں گاندھی جی کی زندگی پر ایک فلم بنا رہا ہوں۔ یہ لو یہ کتابیں۔" اس نے میری طرف تقریباً آدھی درجن کتابیں بڑھاتے ہوئے کہا انھیں ایک ہفتے کے اندر دیکھ کر میرے لیے گاندھی جی کی زندگی پر دو سو صفحات کی ایک رپورٹ بنا کر لے آؤ جس کی مدد سے میں اپنی سکرپٹ تیار کر سکوں۔ تمھیں ایک ہفتہ سے ایک دن بھی زیادہ نہیں دیا جاسکتا۔ اور ہاں جس دن تم یہ رپورٹ لے کر آؤگی اسی دن تمھارا انچ ہزار کا چیک آفس میں تمھیں تیار ملے گا۔"

مگر! یہ اتنی ساری کتابیں! ان میں کیا ہے؟" میں نے نروس ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ان میں گاندھی جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات ہیں"

"لیکن میں گاندھی جی کے بارے میں بہت کم جانتی ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں کسی بھی دنیاوی موضوع کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ میں بہت کم علم ہوں۔ ایک طرح سے غیر تعلیم یافتہ۔ یا پھر یوں کہا جائے کہ تقریباً جاہل۔" میں نے اپنی کم مائگی کا اعتراف کرنا چاہا۔

"تم نے کہاں تک پڑھا ہے!" روشن لال نے پوچھا۔

"میں کالج نہیں جاسکی۔ بس اسکول کے بعد میری پڑھائی ختم کر دی گئی" میں نے بے بسی سے کہا۔

"اسکول تک۔ ارے واہ۔ تمھاری اتنی تعلیم تو میری ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔" اس کا لہجہ پہلے کی ہی طرح پر جوش تھا۔ "یہ کتابیں لے جاؤ اور ایک ہفتے کے اندر انھیں دو سو صفحات میں نچوڑ کر لے آؤ۔ تمام اہم باتوں کے ساتھ۔ یاد رہے مجھے صرف اہم باتیں چاہئیں

اور ہاں! اب تم جاؤ ۔ میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں ۔ " اس کے بولنے کے انداز میں اعتماد کے ساتھ ساتھ ایک عجیب قسم کا حکم بھی تھا ۔

میرا حال اب اس مشین کا سا تھا جیسے ابھی ابھی اوورہال (Overhaul) کیا گیا ہو اور جو بٹن دباتے ہی اپنا کام شروع کر دے گی گھر پہنچ کر کب میں اپنے کام کرنے کی میز پر بیٹھ گئی مجھے پتہ ہی نہ چل سکا ۔ یہ بات بڑی عجیب سی تھی کہ جب میرے منگیتر نے ایسا ہی کام خود اپنی ذاتی دل چسپی سے مجھے کرنے کو کہا تھا تو میں اپنے آپ کو اس کی طرف مائل نہ کر سکی تھی ۔ اور اب جب کہ اسی قسم کا کام ایک طے شدہ معاوضے کے عوض مجھے کرنے کو دیا گیا تھا تو میں کام کروانے والے کی پوری طرح تابع بن گئی تھی ۔ پھر بھی میں اپنی کم علمی سے بھی خوف زدہ تھی ۔

لیکن جیسے ہی میں نے پہلی کتاب کھول کر اس کی اہم باتیں نوٹ کرنا شروع کیں اچانک ایک معجزہ ہوا ۔ اپنی کم علمی کے تعلق سے میرا سارا خوف نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ۔ اس کے برخلاف میں اپنے اندر ایک غیر معمولی اعتماد محسوس کرنے لگی ۔ مجھے ایسا لگنے لگا جیسے یہ کام میں بڑی آسانی سے کر لوں گی ۔ اب میرا دماغ کسی ایسی مشین کی طرح تھا جیسے کسی طاقت ور بیٹری سے جوڑ دیا گیا ہو ۔

وہ دو سو صفحات ٹائپ ہونے تک میں گاندھی جی کی زندگی کی تمام اہم تفصیلات سے پوری طرح واقف ہو چکی تھی ۔ میرے لیے اس میں اب کچھ بھی نیا یا قابل تحقیق نہ بچا تھا ۔ ہر چیز بالکل صاف تھی ۔ میں نے ان دو سو صفحات میں وہ تمام حقائق جمع کر لیے تھے جن سے ان کی زندگی کا مکمل خاکہ بنتا تھا ۔ ۔ مگر یہاں جو بات میرے منگیتر کی سمجھ میں شاید ہی کبھی آ سکتی تھی اور جسے میں خود بھی دوسروں کو نہ سمجھا سکتی تھی وہ یہ تھی کہ میں اپنا یہ کام اتنی آسانی سے صرف اس لیے کر سکی کہ گاندھی جی کی زندگی میرے لیے ذاتی دل چسپی کا موضوع نہ تھی ۔

جب وہ ٹائپ کیے ہوئے صفحات لے کر میں روشن لال کے آفس پہنچی تو وہاں ایک عجیب قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی ۔ شاید اس وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا ۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد ٹائپ اسکرپٹ آفس کی میز پر رکھا اور خاموشی سے واپس گھر چلی آئی ۔

تقریباً ایک ہفتہ گذر جانے کے بعد مجھے کمپنی کے آفس کی طرف سے ایک لفافہ ملا جس میں میرے نام پانچ ہزار کا چیک اور روشن لال کی مختصر تحریر تھی ۔

" Well done - My doll - Very Well done"

میں نے میز پر سے گاندھی جی کی زندگی سے متعلق وہ تمام کتابیں اٹھائیں اور انھیں کونے میں رکھی ایک ایسی الماری میں ڈال دیا جسے میں برسوں میں ایک آدھ بار ہی کھولتی ہوں ۔ اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ذہن کی سلیٹ سے وہ تمام باتیں اچانک مٹ گئیں ہیں جنھیں میں نے ان کتابوں سے اخذ کیا تھا ۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اپنی پرانی حالت پر واپس آ گئی تھی ۔ ایک کم علم ، بے وقعت اور تقریباً غیر تعلیم یافتہ وجود جو کہ میں بچپن سے اب تک تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اب میرے ذہن کی سلیٹ بالکل خالی تھی ۔ جیسے ایک لمحے میں سب کچھ محو ہو گیا تھا ۔ ۔ ۔ میرا سر بری طرح چکرانے لگا ۔ ۔ ۔

میں میز پر رکھے ہوئے ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھ گئی اور اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ایک اطالوی کہانی سے ماخوذ)

○ ○ ○

شکیلہ رفیق

دھوکا

جہاں تک عشق کرنے کا سوال ہے اس کے لیے تو ایک ماہ کی مدت کچھ بھی نہیں۔"

مگر ----

یہ بخار ---- یہ منحوس تو ڈیڑھ ماہ سے ڈٹا ہوا ہے ---- بات قابل تشویش تو ہے، مگر ---- صرف تشویش کرنے سے کیا حاصل!

----اس مسئلے کا حل بھی ڈھونڈنا چاہیے نا!

کیا حل ڈھونڈا جائے؟

تمام ٹیسٹ ہو گئے، بلڈ ٹیسٹ، یورین، ایکس رے، الٹراساؤنڈ، اسکیننگ، حتیٰ کہ حلق میں نلکی ڈال کے پورے پیٹ میں ہلچل مچادی اور ---- ۔

کچھ بھی نہ نکلا ----!!

پھر یہ کیسا بخار ہے؟ ---- جو اسے اندر ہی اندر توڑ رہا ہے۔ مسلسل ہلکی ہلکی حرارت پتھر پہ پڑنے والی وہ بوند نہ بن جائے جو بس ٹپ ٹپ ٹپکا ہی کرتی ہے اور پھر ----

اس نے گھبرا کر فون اٹھالیا، جو اس طویل مدت میں سب سے زیادہ ساتھ دینے والا دوست رہا۔ اس نے ایک بزرگ رشتہ دار کا نمبر گھمایا ---

" اے ہے! یہ کیسا بخار ہے۔ دو مہینے ہونے کو آئے اور نہ اترا!! اور پھر کچھ نکلا بھی نہیں ---- میری مانو تو میرے ساتھ چل کے میرے عامل صاحب سے مشورہ کر لو ---- ایسا تعویذ دیں گے کہ اگلے ہی دن ہی ہلکی پھلکی ہو جاؤ گی ---- پھر سب سے بڑی بات یہ کہ پہلی دفعہ میں ایک پائی بھی نہیں لیتے ---- البتہ اس کے بعد کا معاملہ صورت حال پر منحصر ہے۔ اب جیسا مسئلہ ہو بھئی ----"

"جی ضرور ----"

اس نے فون بند کر دیا ---- بیماری کے کھنچاؤ میں بھول ہی گئی تھی کہ ان کے ہر مسئلے کا حل ان کے عامل صاحب ہیں ---- پھر ---- ایک بہت پرانی دوست یاد آ گئی جو ہمیشہ ایسے ہی مواقع پر یاد آتی ہیں۔

" کیا کہا ---- ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ---- تو یہاں کیا کر رہی ہو۔ تمہارے پاس برٹش پاسپورٹ ہے نا ---- لندن جا کر فل چیک اپ کرواؤ۔"

"یہاں کی بات مت کرو ---- یہاں کے ڈاکٹر اور یہاں کا چیک اپ ---- ہونہہ! سب ماشاء اللہ ہے ---- ناتجربہ کار، لاپروا کہیں کے ---- کچھ بھی ڈھنگ کا نہیں۔"

"اچھا ---- سوچتی ہوں اس بارے میں۔"

یہ کال بھی ضائع گئی ۔۔۔۔اب وہ بڑی بہن کی دوست سے مخاطب تھی ۔۔۔۔ مکمل احوال سن کر وہ بولیں۔
نماز پڑھتی ہو ۔۔۔۔؟"
جواباً وہ خاموش رہی ۔۔۔۔ نماز پڑھنے کا ڈھنڈورا پیٹنا ۔۔۔۔ اور جو نہیں پڑھتا اس کے پاس تو یوں بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوگا ۔۔۔۔ پھر اس کی آواز آئی۔
"ہر نماز کے بعد ایک تسبیح "یا سلام" کی پڑھ لیا کرو ۔۔۔۔ انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔۔۔۔ اوپر والے سے بڑھ کر کوئی ۔۔۔۔"
"جی ۔۔۔۔" یہ بات کچھ دل کو لگی۔
"مگر ۔۔۔۔ اس کے لیے پنج وقتہ نماز ہونا شرط ہے۔" انھوں نے کہا۔
"بہتر ۔۔۔۔!"
اچانک اسے ایک شناسا کا خیال آیا۔ اوہ ۔۔۔۔!DISPRIN کو تو میں بھول ہی گئی ۔۔۔۔ اصل نام جس کا فریحہ ہے۔ دنیا کے مسئلے کہ حل وہ ڈھونڈ نکالتی ہے ۔۔۔۔ اسی لیے اس کا نام ڈسپرین رکھا ہوا تھا سب نے ۔۔۔۔ نمبر قدرے تلاش کرنے کے بعد ملا۔
"سب سے مشورہ کر لیا۔ سب کی باتیں سن لیں؟"
"ہوںہہ ۔۔۔۔"
"ایک آدھ"
"اچھا ۔۔۔۔ اب میری سنو گی؟"
"تو فون کس لیے کیا ہے؟"
"ایک بکرا منگاؤ اور اپنا صدقہ دے دو۔"
"صدقہ ۔۔۔۔؟" وہ ہنسنے لگی ۔۔۔۔ "مجھے کس کی نظر لگے گی۔"
"احمق ہیں آپ ۔۔۔۔ اصدقہ صرف نظر کا نہیں ہوتا۔ بیماری، آزاری اور دیگر چیزوں ۔۔۔۔ سب سے بڑھ کر جان کا ہوتا ہے، من!"
"یار! ۔۔۔۔ ان دنوں اسپیشلسٹوں کو دکھانے اور معائنے کرانے میں جیب خالی ہو گئی ہے ۔۔۔۔ اب تو اتنا بڑا خرچہ بتا رہی ہے۔
"خرچہ تمھاری جان سے بڑھ کر ہے۔"
"اگر میں کہوں اس وقت ایسا ہے تو۔"
"یار میری اس قسم کی باتوں سے مجھے ہمیشہ ہی اختلاف رہا ہے ۔۔۔۔ بے کار میرا وقت ضائع کیا۔"
خلاصت ہو کوئی حل سوچو ۔۔۔۔ یہ خفا ہونے کا نہیں، مسئلے کا حل سوچنے کا وقت ہے۔"
اور پھر آخری بات کے ساتھ ہی اتفاق بھی ہوگا یعنی جب تک شفا نہیں ہو جاتی معمولی سی رقم کسی ضرورت مند کو روزانہ دی جائے ۔۔۔۔ بات سوا روپے روزانہ سے شروع ہوئی ۔۔۔۔ اول تو سوا روپیہ اب ہوتا ہے نہیں، دوسرے اتنی معمولی رقم کسی کو دینا ہتک محسوس ہوئی اور بات تیرہ روپے پر جا کر ختم ہوئی۔

اسی رات سونے سے قبل اس نے اپنے تکیے کے نیچے تیرہ روپے رکھے جو صبح کسی ضرورت مند کو دینے تھے ---- اور پھر اس کا ذہن ضرورت مندوں کے بھنور میں جا پھنسا ---- فی زمانہ ضرورت مندوں کا تعین کرنا ہے کتنا دشوار!!

چوراہے پر کھڑا ہٹا کٹا ملنگ۔

پھٹے برقعے میں ملبوس وہ عورت جس کی گود میں کالا ننگا بچہ روئے جا رہا ہے ---- منڈا لڑکا، جس کا ہاتھ دانستہ کہنی سے توڑ دیا گیا ہے

ران پر پاؤ بھر قیمتی ڈاکٹری بینڈیج کے ساتھ باندھے وہ سوالی جس کی آنکھوں سے ہیروئن جھانک رہی ہے۔

سفید شٹل کاک برقعے سے باہر نکلا ہوا ایک ہاتھ جس کے ساتھ جڑا جسم مجسمے کی طرح ساکت ہے۔

چار پہیے والی چھوٹی سی گاڑی پہ تیزی سے ادھر سے ادھر بھاگتا معذور فقیر جس کی بھاری جیب وزن سے لٹک رہی ہے۔

گونگا ---- کاغذ پہ حالِ دل تحریر کیے جس کی ماں قریب المرگ ہے۔

معصوم و کمسن لڑکے اور لڑکیاں جو "دے دے بی بی ---- اللہ حج کرائے گا ---- اللہ جوڑی سلامت رکھے ----" کے سوا شاید کوئی اور جملے نہیں جانتے۔

ضرورت مند کسے سمجھا جائے۔

مستحق کون ہے؟

ان میں سے کسے روز تیرہ روپے دیے جائیں؟

بہت غور و فکر کے بعد اسے اپنے گھر میں کام کرنے والی ماسی سب سے زیادہ مناسب نظر آئی۔ ابھی پچھلے ماہ کی ہی تو بات ہے۔ جب اس کی بیماری کا دوسرا یا تیسرا روز تھا اور ماسی اپنا کرتہ اٹھا کر اسے وہ نیل دکھا رہی تھی جو رات اس کے میاں نے بڑی محنت سے اس کی [illegible] پہ ڈالے تھے ---- اور پہلی بار اسے احساس ہوا کہ میلی آنکھوں میں بھی حسرتیں بستی ہیں۔ اس سے قبل وہ جب بھی کام کر [illegible] تی تھی مالکن مصروف ہوتی۔ نہ اس کے پاس باتیں کرنے کا وقت تھا نہ مسائل سننے کا۔ لیکن اس روز بستر پر پڑے پڑے یہ سب کچھ سننا اتنا کھلا بھی نہیں۔ اور اب تو مجبوریوں، ضرورتوں اور بے کسی کے یہ قصے سنتے سنتے ڈیڑھ ماہ سے اوپر ہو چکا تھا۔ شوہر نشے کا عادی، نوجوان بیٹا نام نہاد سیاسی لیڈروں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب دو بیٹیاں رہ گئی تھیں جو نہ بچہ تھیں نہ جوان۔ دونوں روزانہ ماں کے ساتھ آتیں اور ساتھ ہی چلی جاتیں۔ آدھی سے زیادہ تنخواہ شوہر اڑا دیتا۔ باقی رقم میں جس طرح کھانا، پینا، دوا دارو، کپڑا لتا ہوتا ہو گا۔ وہی واقف ہو گی۔

ہاں! ماسی نذیراں ہی اس رقم کی اصل مستحق ہے۔ کم از کم کچھ عرصے کے لیے تو اس بے چاری کے دلدر دُور ہو جائیں گے۔

"یہ کیا بی بی ----؟"

اگلی صبح نذیراں اپنی ہتھیلی پہ رکھے تیرہ روپے دیکھ کر حیرت و مسرت کی امتزاجی کیفیت میں تھی ہتھیلی کے ساتھ آنکھیں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔

"رکھ لو ---- کام آئیں گے۔"

"بڑی مہربانی بی بی! ---- اللہ آپ کو صحت دے۔"

نذیراں نے کہا اور آمین کی آواز اس کے دل سے آئی ---- اسے طمانیت کا احساس ہوا کہ رقم درست ہاتھوں میں پہنچ گئی۔

اسے شروع ہی سے کتابیں اور چہرے پڑھنے کا شوق تھا اور ایک مدت سے جاری رہنے والے اس شوق کے باعث ہی وہ آج ماسی کے اندر کر اسے کھوجنے کامیاب رہی تھی۔

اصل ضرورت مند؟ ۔۔۔۔درست طور پر مستحق عورت۔

جو نظر کے سامنے ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ کام کو مانگنے پر ترجیح دیتی تھی ۔۔۔۔ اس کے اس سے گھر والے ناخوش تھے مگر وہ مطمئن تھی کہ اس نے درست سمت سوچا ہے۔

تیرہ روپے والے سلسلے کو جاری ہوئے آج شاید تیرہواں ہی روز تھا۔ ابھی تک کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی ۔۔۔۔ دوا، علاج اور سب کچھ ساتھ ساتھ جاری تھا۔

نذیراں ماسی اس معمول کی رقم کی اب اتنی عادی ہو چکی تھی کہ سلام بی بی کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں تکیے سے جا ٹکراتیں۔ اور وہ سیدھے ہوئے انداز سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر پیسے چھوتی جو فوراً اس کے ہاتھوں میں آجاتے۔ ماسی جلدی سے رقم دوپٹے کے چیکٹ پلو میں جتی اور خاموشی سے کام شروع کر دیتی۔

مالکن چند لمحے اس کا چہرہ پڑھتی جو طمانیت کے باعث لوہے کی مانند تمتمارہا ہوتا۔ پھر ۔۔۔۔ وہ کروٹ بدل کر کوئی کتاب پڑھنے

" ماسی کو اس طرح پیسوں نوازنے سے تو بہتر تھا کہ بکرا ہی کر دیا جاتا" ۔۔۔۔ ایک جمعہ کو حامد نے نذیراں کی ہتھیلی پر دھرے ے روپے دیکھے تو کہے بنا نہ رہ سکا۔

" تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں ۔۔۔۔ " اس نے اپنے سینے پہ انگوٹھا رکھا ۔۔۔۔ " ابھی مہینوں اور بیمار رہوں گی۔ " تیوریوں پر بل اس تھے۔

" یہ مشرق کی ۔۔۔۔ بہتر ہمیشہ منفی کیوں سوچتی ہیں؟ " بل اس کی تیوریوں پہ بھی کم نہ تھے۔

"ہاں بالکل سوچوں گی ۔۔۔۔ بات ہی تم نے ایسی کی ہے ۔۔۔۔ یہ چاہتے ہو کہ جو ہونا ہے جلد ہو۔"

"مشکل یہ ہے کہ میں تمہاری سوچ پہ پہرے نہیں بٹھا سکتا ہے۔ جو جی چاہے سوچو ۔۔۔۔ ہونہہ ۔۔۔۔!"

" یہ ۔۔۔۔ میں سوچ ہرگز نہیں رہی ہوں ۔۔۔۔ بلکہ حقیقت بتا رہی ہوں۔"

" ہائی واوے ۔۔۔۔ آپ کو اس حقیقت کا علم کب اور کیسے ہوا؟"

"آپ کے ان بلوں سے جو آپ کی تیوریوں پر نظر آرہے ہیں ۔۔۔۔ تنگ آگئے ہو میری بیماری سے اور ۔۔۔۔"

"فضول کی باتیں مت کرو میں ۔۔۔۔"

"اور چاہتے ہو کہ جلدی سے آر یا پار ۔۔۔۔ مجازی خدا ہیں صاحب ۔۔۔۔ جنھیں نہ اپنے فرائض سے غرض ہے نہ متعلقین سے پیار ۔۔ عجب وضع کے ہوتے ہیں یہ مشرق کے مجازی خدا ۔۔۔۔"

اور ۔۔۔۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

" سوچتی رہو ۔۔۔۔ جو جی چاہے ۔۔۔۔ نہ ڈاکٹر بدلو ۔۔۔۔ نہ دوا ۔۔۔۔ نہ صدقہ ۔۔۔۔ بس دیتی رہو اسے تیرہ روپے جب تک جی چاہے۔"

"اچھا ---- تم نے کیا کیا ہے اب تک ---- بس میرا ہی قصور ---"

مگر ----

وہ تو کرے سے جا چکا تھا۔

دماغ ٹھنڈا ہوا تو حامد کی تمام تو نہیں مگر کچھ باتیں درست معلوم ہوئیں ---- خواہ مخواہ لڑ بیٹھی ---- لتنے تو پریشان ہیں میرے لیے ---- معافی مانگ لوں گی رات کو ---- ایک منٹ میں مان بھی تو جاتا ہے یہ شخص ---- یہی سب سوچتے ہوئے جانے کب نیند آ دھمکی ----

اگلی صبح نذیران کو تیرہ روپے دیتے ہوئے اس نے ہاتھ میں تھمی کتاب میں انگلی سے نشانی بنائی اور کہا:

"ارے ماسی ! دعا بھی تو مانگا کر میری صحت یابی کی ---- چپ چاپ پیسے رکھ لیتی ہے روزانہ ----" اور پھر کروٹ لے کر "کھودو بابا کا مقبرہ" میں گم ہو گئی۔

"ارے بی بی ! ---- اتنی دعا کرتی ہوں ---- آپ کو کیا پتہ ؟"

"یہ مالکن بھی بالکل چترس ہے۔ بھلا کیا میں اس کے اچھا ہونے کی دعا کر کے اپنی لگی لگائی روزی سے ہاتھ دھولوں ----"

○ ○ ○

نقد و نظر

[تبصرے کے لیے دو کتابیں بھیجی جائیں ۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ۔]

نام کتاب = سبزہ ۔ معنی بیگانہ (مجموعہ ۔ کلام) مصنف: فضا ابن فیضی ضخامت: دو سو چوبیس صفحے
قیمت: ایک سو پچیس روپے ناشر: ابو الکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر ۔ ۴ ، جوگا بائی ، نئی دہلی ۲۵ سائز = ۸ / اڈیمائی

سبزہ معنی بیگانہ فضا ابن فیضی کی غزلوں کا مجموعہ ہے ۔ فضا ابن فیضی کہنہ مشق شاعر ہیں " ۔ ان کا مزاج مہذب ہے اور ان کے کلام
ں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے ۔ وہ نئے پرانے تجربوں کو جدت اظہار کے ساتھ بڑے سلیقے سے پیش کرتے ہیں ۔ انھوں نے بعض کہنہ مشق
ں گو شعرا کی طرح اپنے موضوعات کو شعوری کاوش سے محدود نہیں کیا ہے بلکہ ان کے شعری ورثے سے ان کی شخصی پسند نے جو منتخب کیا
، اس نے ان کے موضوعات کی حد بندی کی ہے ۔ ان کے زیر تبصرہ مجموعہ ۔ کلام میں جدت اظہار کے ایسے نمونے بھی ملتے ہیں جو ان کے کلام
تازگی کے ضامن ہیں مثلاً:

یوں تو فصیل جاں سے وہ باہر نہ آئے گا ٹوٹے ، بدن سے لپٹا ہوا خول تو ذرا
نفس نفس کو مرے ساز بے زبانی دے نظر نظر کو عطا کر سرودِ بے آہنگ
ترے مرے ہیں اسالیب ، لفظیات شکستہ بہت کٹھن ہے کہ اب شعر بھی ، سلیقے سے کہہ لیں
سارا قصور لفظوں کی ترتیب کا نہ تھا کچھ ہم بھی تھے خیال کے ابلاغ کی طرح
موقع وہاں شعور کی ترتیب کا نہ تھا سب اپنے پیکروں کی نمائش میں محو تھے
مسافر کا رخت ہونے لگا یہ ہجرتوں کا سفر ہے کہ وقت کا کوئی جبر اثاثہ گھر کا ،

فن شعر گوئی میں فضا ابن فیضی کا شمار بزرگ شعراء میں ہوتا ہے اس لیے اس منزل پر شاعر کو زبان کے برتنے میں بہت احتیاط کرنی
ںا ہے کیوں کہ آج جب کہ کاتا اور لے دوڑی کا رویہ عام ہوتا جارہا ہے یاوہ گوئی کو فن کے نام سے اور اغلاط کو نئی زبان کے حیلے سے سند
انے کی کوشش کرنے والوں کو کہیں حوالے دینے کا بہانہ نہ مل جائے ۔ جی تو چاہتا ہے کہ جہاں سہو ہے اسے میں سہو کاتب مان لوں ایسا
فضا ابن فیضی جیسے کہنہ مشق شاعر سے نہیں ہو سکتا ۔ صرف چند مثالیں دی جارہی ہیں ۔ صفحہ ۲۶ پر "اک شعلہ اپنے قد کے برابر جلا ہوا ۔ "
۔ ۲۹ پر "نظریہ بہ وزن فخریہ" استعمال کیا ہے ۔ صفحہ ۵۰ پر "کر نصب اپنی صلیبیں مجھ پر "نصب بہ وزن بخت ہے بہ وزن صفت نہیں ۔
بر یہ مصرع یوں ہو "نصب کر اپنی صلیبیں مجھ پر" اور سہواً غلط چھپ گیا ہو ۔ صفحہ ۵۲ "ہوا اکثر یہی ، حالات رستہ کاٹ جاتے ہیں" ۔ یہاں
نہیں ، ہوتا ہے یا ہوتا رہا ہے کا محل ہے ۔ اسی صفحے پر "یہ کیا تم کو خبر کیا اس نے سبزے پر لکھا ہے ۔ "یہ کیا تم کو خبر ! صفحہ ۲۰ پر "ہر مسافر

ہے تھکن سے چور، خالی۔ مسافر خالی! ایسی بے احتیاطی نئی نسل کو گم راہ کر سکتی ہے، اس لیے اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔
(راشد آزر)

نام کتاب: ڈاک گھر مرتب: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ضخامت: ۵۶ صفحات
قیمت: ۲۲ روپے مطبع: الائیڈ ایجنسی، گلی گڑھیا، کوچہ چیلاں، دریا گنج، دہلی

زیر نظر کتاب "ڈاک گھر" رابندر ناتھ ٹیگور کے بنگلہ ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے اور اس اردو ترجمے کی مترجم راحت آرا بیگم ہیں موصوفہ نے اس کا ترجمہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں کیا تھا جس کو آج ۷۰ سال ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے اس ڈرامے کا کوئی اور اردو ترجمہ اتنا قدیم نہ ہوگا ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کے اس انکشاف سے حیرت ہوتی ہے کہ یہ ترجمہ آج تک نہیں چھپا تھا اور اب ان کی توجہ سے شائع ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اس مسودے کو ایڈٹ کیا اور ضروری معلومات کے ساتھ اس کو مزین کیا۔ انھوں نے ڈرامہ، ڈرامہ نگاری فن، ترجمہ نگار کا تعارف و احوال، نیز اس ترجمے کا دوسرے اور اردو ترجمے سے مقابلہ و موازنہ کر کے داد تحقیق دی ہے۔

کتاب کے آغاز میں ترجمہ نگار کی تحریر درج کی ہے۔ راحت آرا بیگم نے ۲۷/ دسمبر ۱۹۲۷ء کو اپنے شوہر کے ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا۔ انھوں نے ٹیگور سے ان کے اس ڈرامے کے ترجمے کیا بھی ذکر کیا تھا اور وہ اس سے بہت خوش ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے ان لوگوں کو کچھ دن شانتی نکیتن میں ٹھہرنے کو کہا۔ اس واقعے سے اس ترجمے کی تاریخی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

راحت آرا بیگم کی سوانح پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک جلیل القدر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے شوہر اس زمانے کی ممتاز ترین شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے نانا نواب عبد اللطیف نے بنگال کے مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے میں حصہ لیا۔ راحت آرا بیگم کو اردو، انگریزی اور بنگالی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ افسانے، ڈرامے لکھتی تھیں اور شاعری سے بھی انھیں رغبت تھی۔ تخلیقی کاموں کے علاوہ انھیں سماج سدھار کی بھی دھن تھی۔ وہ عوامی کاموں میں حصہ لیتی تھیں۔

مذکورہ ترجمہ ان کی کم عمری کی تحریروں میں ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اس زمانے میں سپرد قلم ہوا تھا جب ہندوستان نحیف و نزار جسم غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور اس کی کمزور روح قفس غلامی سے چھٹکارا پانے کے لیے بے قرار تھی۔ چناں چہ ان دنوں ہر فن کار اس موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھ رہا تھا۔ اقبال کی "قیدی پرندے کی فریاد" اسی زمانے کی نظم ہے۔ ٹیگور نے اس ڈرامے میں آزادی کی خواہش کو جس بے ساختگی کے ساتھ اور فطری طور پر پیش کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ یہ ان کا شاہکار ڈراما ہے۔ اس میں بیمار بچہ غلام ہندوستان کی علامت ہے اور کبیراج یعنی اس کا معالج انگریزوں کی اس حکمت عملی کی علامت ہے جس کے ذریعے غلامی کے پھندے بڑھتے جا رہے تھے اور عام لوگوں کی زندگی اجیرن ہو رہی تھی۔

تمہید میں بتایا گیا ہے کہ اس ڈرامے کی تمام یورپ میں بہت پذیرائی ہوئی۔ انگریزی کے علاوہ اطالوی، جرمن، وغیرہ میں بھی اس کے
چکے ہیں اور اسے مختلف تھیٹروں میں کھیلا گیا۔ ہندوستان میں ٹیگور کے صد سالہ جشن کے موقع پر پروفیسر مجیب نے "تین ناٹک"
ے رابندر ناتھ ٹیگور کے جن ڈراموں کا ترجمہ کیا ان میں ڈاک گھر بھی ہے۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کا خیال ہے کہ پروفیسر مجیب نے اس کا براہ راست بنگلہ سے ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس کے انگریزی ترجمے سے ترجمہ
راحت آرا بیگم کا ترجمہ براہ راست بنگلہ سے ہے یہی اس کی خوبی ہے۔ غالباً موصوفہ نے لفظی ترجمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اس
ے مفصل بحث کرتے ہوئے یہ نکتہ بھی اٹھایا ہے کہ راحت بیگم اور پروفیسر مجیب کے یہاں کرداروں کے ناموں کے ترجمے میں فرق
، اور بعض مقامات پر بھی متن کا فرق و امتیاز ظاہر ہوا ہے۔ اصل میں ترجمے سے متعلق ماہرین کے دو اسکول ہیں۔ ایک اسکول کہتا ہے
لفظی ہو یا متن کے عین مطابق ہو اور اصل زبان سے لگا کھاتا ہو۔ یعنی ترجمے کو ترجمہ معلوم ہونا چاہیے تخلیق نہیں۔ دوسرا اسکول کہتا
دہ ترجمہ وہ ہے جو بذات خود ایک فن پارہ بن جائے اور اصل کا پورا تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ موجودہ ترجموں میں جو
ہوا ہے غالباً وہ انھیں دو نقطہ ہائے نظر کا ہے۔ بہر حال راحت آرا بیگم کے ترجمے کو تقدم حاصل ہے اور اس کی ایک تاریخی حیثیت بھی

یقین واثق ہے کہ اردو حلقوں میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی اس تحقیق و تدوین کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

(محمد یعقوب عامر)

○ ○ ○

نتائج امتحانات ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد

منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۵ء

اردو ماہر ۔ (درجہ اول) مرکز دھارو منڈل 09 ۔ فصیحہ سلطانہ 12 ۔ محمودہ بیگم 13 ۔ رضوانہ سلطانہ 14 ۔ عائشہ سلطانہ مرکز درگاہ جہانگیر پیراں 34 شاہدہ بیگم 35 ۔ حبیب النساء 37 ۔ بشیر النساء مرکز شمس آباد 61 ۔ اظہر عالم 63 ۔ محمد عبدالستار 64 ۔ محمد کبیر الدین صابری 65 ۔ سید ایوب قادری ۔ 68 محمد برہان غوری 69 ۔ رفعت النساء بیگم 70 ۔ عائشہ صدیقہ 72 ۔ عشرت النساء بیگم مرکز کرنول 76 ۔ دلشاد فاطمہ 77 ۔ یاسمین 78 ۔ شیخون بی بی 79 ۔ ریحانہ بیگم 82 ۔ کے محمد ناصر مرکز کلواکرتی 87 ۔ ماہید اختر 88 ۔ رحیم النساء بیگم مرکز محبوب نگر 91 ۔ عبدالصمد 92 ۔ عبدالعلیم مرکز نرمل 96 ۔ محمد مذکر علی 97 ۔ محمد ابراہیم مرکز حیدرآباد 103 ۔ محمد علیم الدین احمد 105 ۔ محمد خواجہ حمید الدین کلیم 111 ۔ عبدالناصر 119 ۔ امتہ الرحیم 123 ۔ حافظہ سلطانہ 130 ۔ حازیہ حنیف مرکز نظام آباد 137 ۔ فیصل محمد صدیقی 138 ۔ محمد شاہد 139 ۔ محمد نثار الدین 140 ۔ احمد صفوان رسول 142 ۔ نشاط فرحین 143 ۔ شازیہ فرحین 145 ۔ عائشہ صدیقہ 146 ۔ اسماء فاطمہ 147 ۔ اسرار فرحین 149 ۔ شاہدہ فرحین 150 ۔ آمنہ بیگم 151 ۔ عرفانہ سلیم

درجہ دوم: 2, 3, 7, 8, 10, 11, 15 تا 20, 26, 27, 28, 30 تا 33, 38 تا 46, 51, 52, 56, 57, 62, 67, 71, 73, 80, 81, 86, 104, 117, 118, 127

درجہ سوم: 6, 47, 66, 74, 75, 116, 125, 126, 131

فیل: 11[illegible], 113, 114, 132, 134, 135

اردو عالم ۔ (درجہ اول) مرکز بودھن 206 ۔ نکہت پروین 207 ۔ [illegible] مرکز [illegible] ۔ 211 عبدالرشید 212 ۔ محمد داؤد خان 213 ۔ ایم ۔ اے ۔ نعیم 214 ۔ عبدالجبار 215 ۔ مذکر حسین 216 ۔ انجم سلطانہ 217 ۔ بشریٰ تحسین 220 ۔ تسنیم سلطانہ 221 ۔ واجدہ بیگم 222 ۔ ماجبیہ آفرین 223 ۔ مرضیہ طلعت مرکز ٹیکمال 227 ۔ محمد وحیر الدین 228 ۔ محمد صابر علی 231 ۔ کوثر سلطانہ 232 ۔ حلیمہ بیگم مرکز درگاہ جہانگیر پیراں 236 ۔ سید منہاج مرکز سنگاریڈی 256 ۔ محمد حاجی ۔ 257 سید انور علی مرکز عادل آباد 282 ۔ قدسیہ عظمت مرکز گلبرگہ (کرناٹک) 317 ۔ سید ولی الدین ۔ 318 سید امجد علی مرکز محبوب نگر 322 ۔ محمد یحییٰ 325 ۔ ساجدہ بیگم 326 ۔ چودھری رابعہ ۔ 328 محمودہ بیگم 329 ۔ شاہدہ بیگم 330 ۔ امتہ العزیز صادقہ مرکز من پلی (بیدر) 336 ۔ سعید الرحمن 337 ۔ یاسمین بیگم 338 ۔ رضوانہ بیگم 343 ۔ محمد ضمیر الدین مرکز نارائن پیٹھ مرکز نظام آباد ۔ 361 محمد احمد 362 ۔ محمد اظہر الدین انصاری 363 ۔ محمد عارف الدین 364 ۔ محمد جنید 367 ۔ سید

ب الدین 370 - یاسمین بیگم 371 - کنیز فاطمہ 373 - عائشہ سرتاج 374 - فہیم النساء بیگم -
37 تبسم بیگم 376 - رحمت النساء بیگم 377 - یاسمین خاتون 378 - مہرالنساء بیگم 379 - قمرالنساء
م مرکز نلگنڈہ 381 - محمد سرفراز اللہ خان 382 - حلیمۃ النساء بیگم 386 - نصرت سلطانہ مرکز حیدرآباد
39 - محمد ساجد حسین 394 - محمد احمد محی الدین 404 - ریاض احمد 411 - محمد عبدالسلام 426 تبسم بیگم

جہ دوم: 203, 204, 205, 210, 218, 219, 238, 240 تا 245, 248, 249, 251, 252
25, 264, 271 تا 278, 283, 286, 288, 293, 294, 295, 296, 298 تا 300, 302 تا
30, 321, 323, 324, 327, 352, 355, 356, 383, 395, 399 تا 401, 403, 405, 406,
40 تا 410, 413, 418, 422, 423, 429, 439 تا 441 -

جہ سوم: 260, 425 -
سیل: 233, 266, 267, 279, 284, 331 تا 333, 387, 314, 315, 446, 447, 449 تا 451

دو فاضل - (درجہ اول) مرکز مدور منڈل 581 - گوہر سلطانہ محمدی مرکز من ہلی بیدر 632 - محمد منیر
مد مرکز نامن پیٹھ 653 - فیاض احمد مرکز نظام آباد 677 - المجدی المشہود 678 - اسری فاطمہ مرکز
ر آباد 728 - سید غوث علی سعید 731 - محمد عمر خاں مرکز کونول 936 - مشتاق احمد خاں

جہ دوم: 506, 508, 511, 513, 514, 516, 521 تا 523, 540, 544, 546, 547 تا 549,
55, 552, 556, 572, 575 تا 577, 579, 580, 582, 587 تا 595, 601 تا 601, 606 تا 610,
61, 614 تا 620, 631, 633 تا 640, 642 تا 646, 651, 652, 654 تا 660, 661, 662 تا 664,
6 تا 671, 676, 679, 681 تا 686, 703, 704, 706, 713, 717 تا 719, 722 تا 725, 727,
7, 733, 755, 756, 761, 766, 767, 901, 903 تا 914, 916 تا 918, 920, 921 تا 935, 937,
9, 940 تا 942, 944 تا 951, 953, 954, 957 تا 960 -

جہ سوم: 507, 527 تا 529, 538, 542, 543, 611, 648, 666, 672, 705, 712, 746, 902, 915, 955 -

سیل: 517 تا 520, 524, 526, 530, 531, 541, 545, 553, 563, 567 تا 569, 621 تا 627, 629,
688, 734, 736, 739, 741 تا 743, 774, 775, 777, 782, 784, 785, 789, 821 -

یاب پارٹ ا: 801 تا 804, 806 تا 808, 810 تا 813, 815, 817 تا 819, 822 تا 830, 833, 835 تا
8, 839, 841, 844 تا 850, 857, 858, 860 تا 863, 865, 866, 868, 869 تا 871
8, 876, 879 تا 882, 885, 886 -

○ ○ ○

وقار خلیل

وفیات

اختر حسن: برصغیر کے نامور صحافی، ادیب، دانش ور، استاد اور مترجم اختر حسن مرحوم نے حیدرآباد کے علمی، ادبی، صحافتی اور تہذیبی افق کو نصف صدی سے زیادہ زمانے تک اپنے وجود حیات و حرکت سے روشن رکھا۔ لکھنا لکھنا اہم لکھنا اور ہر نئی کتاب کا مطالعہ شب و روز کا معمول رہا۔ اختر حسن، زندگی کے آخری دنوں میں فالج کا شکار ہوئے تقریباً پانچ سال صاحب فراش رہے اور پھر ۱۷/ ستمبر ۱۹۹۵ء کو ۸۲ سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔

اختر حسن ۱۹۱۶ء میں حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں پیدا ہوئے، آباو اجداد کا وطن "موہان" (یوپی) تھا۔ حضرت حسرت موہانی، اختر صاحب کے چچا ہوتے تھے۔ آپ کے والد مولوی اکبر حسن تحصیل دار کے عہدے پر فائز رہے۔ اختر حسن جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے فارسی سے یم۔اے۔ کی ڈگری لی اور پھر مختصر عرصے کے لیے قاضی عبدالغفار کے مشہور زمانہ روزنامہ "پیام" سے وابستہ ہوے۔ کچھ عرصہ بعد ورنگل کالج میں اردو اور فارسی کے لکچرر رہے۔ پھر ۱۹۴۶ء میں روزنامہ پیام کی عنان ادارت سنبھالی، ترقی پسند مصنفین حیدرآباد کے معتمد عمومی کی حیثیت سے اختر صاحب نے نئی نسل کے قلم کاروں کی رہ نمائی کی۔ ۱۹۵۲ء میں احمد مہدی کے ساتھ روزنامہ "عوام" جاری کیا۔ سالار جنگ لائبریری کے اسکالر بھی رہے۔ ۱۹۵۰ء میں حیدرآباد کی پہلی اسمبلی کے رکن منتخب ہوے اور حیدرآباد میں ترقی پسند رجحانات کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ موقع اور حالات کی مناسبت سے اختر حسن صاحب نے اپنے آپ کو مصروف عمل رکھا۔ انوار العلوم کالج میں لکچرر رہے۔ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش کے اردو جرنل "ماہ نامہ آندھرا پردیش" کی ادارت کی۔ ریاستی اردو اکیڈمی کے عرصے تک جوائنٹ سکریٹری رہے۔ مشہور ہفت روزہ اردو "بلٹز" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

اختر حسن مرحوم صاحب طرز ادیب، عالم اور دانش ور ہی نہیں اردو کلچر کا مظہر مجموعہ تھے۔ شعر و ادب، ترجمہ اور تحقیق کے باب میں اختر حسن کی تحریریں اور کتابیں ان موضوعات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بھرپور استفادے کا باعث قرار پاتی ہیں۔

اختر حسن صاحب کی مطبوعہ تصانیف و تراجم میں قطب شاہی دور کا فارسی ادب، غالب کی فارسی مثنوی چراغ دیر کا منظوم ترجمہ، ملگ کے ممتاز شاعر شیشندر شرما کی طویل نظم کا ترجمہ، میری دھرتی میرے لوگ اور مقالوں کا مجموعہ نقد و نظر شامل ہیں۔ اختر حسن صاحب کی بہت سی غیر مطبوعہ تحریریں محفوظ ہیں جنھیں شائع کیا جانا چاہیے۔ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش اس کام کو سرانجام دے سکتی ہے۔

شمس کنول: ستر سال کی عمر میں ۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو طویل علالت کے بعد علی گڑھ میں رحلت کر گئے۔ اور آبائی وطن بجنور میں سپرد لحد کیے گئے۔ شمس کنول مرحوم اردو کے جیالے صحافی تھے۔ صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ "انقلاب" بمبئی سے کیا۔ اور پھر اپنا ایک ماہنامہ "گگن" بمبئی سے شائع کرنا شروع کیا۔ یہ ماہنامہ منفرد نوعیت کے مضامین اور مدیر کے شذرات کے سبب علمی، ادبی حلقوں میں مقبول رہا۔ اس کے خصوصی ضخیم شمارے "عالمی مذاہب نمبر" اور "ہندوستانی مسلمان نمبر" دستاویزی حیثیت اور اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ آخری زمانے میں شمس کنول نے علی گڑھ سے ایک ماہنامہ "افق تا افق" شائع کرنا شروع کیا تھا اور چند ایک شمارے شائع بھی ہو چکے تھے مگر صحت اور مالیہ نے

عدم استحکام کے باعث اس رسالے کو جاری نہ رکھا جاسکا۔ مرحوم صاحب طرز ادیب، صحافی اور نیک نیت انسان تھے۔

سید نظیر علی عدیل: حیدرآباد کے کہنہ مشق غزل گو شاعر سید نظیر الدین عدیل ۲۰ / نومبر ۱۹۹۶ء کو رحلت کر گئے۔ عدیل مرحوم کے والد سید خیرات علی صاحب قاضی تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۲۸ / مئی ۱۹۲۹ء ہے۔ عدیل نے جامعہ عثمانیہ سے انٹرمیڈیٹ اور جامعہ نظامیہ سے منشی فاضل کامیاب کیا۔ سیول سپلائز اور امداد باہمی کے محکموں میں کارگزار رہے۔ کوآپریٹو سب رجسٹرار سیول سپلائز کے عہدے سے ۱۹۸۰ء میں سبک دوش ہوئے۔ وہ ایک قادر الکلام سخن ور تھے۔ حضرت امجد اور حضرت صفی اورنگ آبادی سے سلسلۂ تلمذ تھا۔ فکر و فن کے اعتبار سے مکتب صفی کے اہم شعرا میں گنے جاتے تھے۔ ایک شعری مجموعہ " قوسِ قزح " شائع ہوا ہے۔ عدیل مرحوم کے تلامذہ میں نئی نسل کے چند ایک اچھے شعرا بھی ہیں۔ طبعاً عدیل مرحوم احساسات اور جذبات کے شاعر تھے۔ اخبارات و رسائل میں کلام چھپتا رہا ہے۔ عہد عثمانی کی شعری و ادبی تاریخ و تہذیب کے ایک ورق کی حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

فضل تابش: اردو کے ممتاز ڈرامانگار، افسانہ نویس اور شاعر فضل تابش ۱۰ / نومبر ۱۹۹۵ء کو وفات پاگئے۔ فضل الرحمن خاں تابش ۵ / اگست ۱۹۳۳ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ اردو سے ام۔ اے۔ کرنے کے بعد ۱۹۶۹ء میں لکچرر ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۱ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ میعاد ختم ہونے کے بعد دوبارہ کالج سے وابستہ ہوئے اور اگست ۱۹۹۳ء میں وظیفے پر سبک دوش ہوئے۔ ان کا مجموعہ کلام "روشنی کس جگہ سے خالی ہے" ۱۹۹۴ء میں مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے فضل تابش بہت اچھے شاعر تھے۔ بالخصوص غزل میں انھوں نے اپنا ایک منفرد رنگ پیدا کیا تھا۔

○ ○ ○

بنگلہ دیش کے ادیب شیام بارک پوری ایوان اردو میں
دائیں سے بائیں ۔ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر محمد انور الدین، ڈاکٹر مغنی تبسم، شیام بارک پوری،
محمد منظور احمد منظور اور وقار خلیل

ڈاکٹر عبدالسمیع (لاس اینجلز) ڈاکٹر محمد مقبول حق (ٹیکساس) اور مسز شاہین حق نے
جولائی ۹۵ء میں ادارہ ادبیات اردو کا معائنہ کیا۔
تصویر میں بائیں سے دائیں: پروفیسر جعفر نظام، ڈاکٹر عبدالسمیع، ڈاکٹر محمد مقبول حق، مسز شاہین حق،
رابعہ پرمانند سنگھی اور پروفیسر مغنی تبسم

December 1995

R.No. 10922/57
Regd. H/HD 134

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad - 500482 (A.P.)

Grams : "Exhibition"
Phone : 503553
503015

نمائش سوسائٹی

کل ہند صنعتی نمائش

نمائش میدان، مکرم جاہی روڈ۔ حیدرآباد-001 500

نمائش ہر سال پہلی جنوری سے پندرہ فروری تک منعقد کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی سب سے بڑی ہمہ مقصدی نمائش اور جنوبی ہند کے بڑے تجارتی جمگھٹوں میں سے ایک ہے جس میں 46 دنوں کے دوران پندرہ کروڑ روپے کی مجموعی بکری ہوتی ہے اور پچیس لاکھ سے زیادہ افراد اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

ایک غیر منفعتی ادارہ جو اپنی آمدنی تعلیم کے مقصد بالخصوص خواتین کی تعلیم پر صرف کرتا ہے اور حسب ذیل ادارہ جات کی مالی مدد بھی کرتا ہے۔

1- عثمانیہ گریجویٹ اسوسی ایشن۔ حیدرآباد
2- انٹالک کمیٹی۔ حیدرآباد
3- کملا نہرو پالی ٹکنک برائے خواتین۔ حیدرآباد
4- سروجنی نائیڈو ونیتا مہاودیالیہ۔ حیدرآباد
5- سردار پٹیل کالج۔ سکندرآباد
6- لال بہادر کالج ورنگل۔ ضلع ورنگل
7- سری لکشمی نرسمہا سوامی کالج، بھونگیر۔ ضلع نلگنڈہ
8- سری وینکٹیشور کالج، سوریہ پیٹ۔ ضلع نلگنڈہ
9- کستوربا گاندھی کالج برائے خواتین۔ سکندرآباد
10- سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف کامرس۔ سکندرآباد
11- ویویشوریا انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ۔ سکندرآباد
12- راجیو گاندھی انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، نرمل۔ ضلع عادل آباد۔
13- روی نارائن ریڈی انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ۔ ضلع نلگنڈہ
14- شنکرجی میموریل گرلز ہائی اسکول۔ حیدرآباد
15- سری رام لنگیشور سوامی کالج گھٹ چرالا، ضلع رنگاریڈی
16- ایل۔این گپتا میموریل ڈسپنسری، نمائش میدان حیدرآباد

تجارت، کاروبار اور صنعت کی تشہیر اور مارکٹنگ کے لیے بہترین مواقع فراہم کرتی ہے۔ کل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد میں ہر سال منعقد کی جاتی ہے۔ یہ نمائش ریاست کے عوام کے لیے نئے سال کا تحفہ ہوتی ہے۔

نہال سنگھ
(اعزازی سکریٹری)